منہ وَل کعبے شریف
(سفرنامہ حج)
مستنصر حسین تارڑ

مستنصر حسین تارڑ

سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

"ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر"

اپنا نہیں شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
اُس در پہ نہیں بار تو کعبے کو ہی ہو آئے
(غالبؔ)

ترتیب

''طائف''

''منورہ مدینہ''

''روضۂ رسولؐ''

”حضرت چلے حرم کو.. اب آپ کا خدا ہے...
حاجی لوک مکّے نُوں جاندے“

رات کے کسی پہر جو سمندر تھا جو دکھائی کہاں دیتا تھا گمان کا سمندر تھا جس پر ہم اُڑان کرتے چلے جا رہے تھے۔ اُس کی جگہ زمین کا ظہور یوں محسوس ہوا کہ ایک تاریک چادر پر کہیں کہیں روشنیوں کے بجھتے بجھتے جگنو نظر آنے لگے.. جیسے سیاہ اوڑھنی پر کہیں کہیں پرانی مانند ہوتی مکیش ٹانک دی گئی ہو.. جانے کونسی بستیاں خواب میں تھیں.. پتہ نہیں کن نیند میں اُتری ہوئی آبادیاں پر سے ہم گذرتے تھے جب میرے سر کے عین اوپر جو سپیکر نصب تھا اُس میں سے سعودی ایئر لائن کے پائلٹ کی آواز جہاز کی نیم تاریک خاموشی میں تیری ”خواتین و حضرات میں آپ کی توجہ چاہتا ہوں.. اب سے ٹھیک دو منٹ بعد جہاز کے بائیں جانب جو کھڑکیاں ہیں وہاں سے مکہ کا شہر نظر آنے لگے گا...“

میری پٹ پٹ کھلی آنکھیں مزید کھل گئیں..

میری نشست بائیں جانب ہی تھی اور کھڑکی سے پہلو میں تھی..

کھڑکی کے ساتھ ناک چپکائے میں نیچے تکتا رہا۔ آنکھیں جھپکنے سے گریز کرتا رہا کہ کہیں پپوٹوں کے بند ہو کر کھلنے کے دوران زمانے نہ گذر جائیں.. میں کسی اور زمانے میں نہ چلا جاؤں..

مکہ...

مکہ...

مکہ مکرمہ...

مُنہ وَل کعبے شریف!

میری پلکیں کھڑکی کے شیشے پر دستک دیتی تھیں.. میں نے پلکوں سے دریار پہ دستک دی ہے... یار کا کوئی اعتبار نہ تھا کہ در کھولے یا نہ کھولے...

نیچے تو کچھ نظر نہیں آتا تھا.. کھڑکی تاریکی سے بڑھ کر سیاہی تھی جس میں کچھ بھی نظر نہ آتا تھا.. شائد

اوروں کو کچھ نظر آ رہا ہو جب کہ میرے اور مکہ کے درمیان میرے اعمال کی سیاہی تھی جس کا پردہ تھا..

شائد دوسرے مسافروں کو اس لیے وہ چوکور گھر نظر آ رہا ہو کہ وہ نظر رکھتے تھے اور میری نظر آلودہ اتنی تھی کہ دھندلا گئی تھی اور کچھ نظر نہ آتا تھا..

بے شک یار کا اعتبار نہ تھا لیکن دستک دیتے رہنے میں حرج ہی کیا تھا..

اور پھر کچھ نظر آیا۔

لاہور ایئرپورٹ کے انٹرنیشنل لاؤنج میں جب میں داخل ہوا اور اپنے چھوٹے بیٹے سُمیر کی درازقامتی کے سائے سائے داخل ہوا تو میں وہاں جدہ کی پرواز کے منتظر.. تلاوت کرتے.. مونگ پھلیاں ٹھونگتے.. سوفٹ ڈرنکس چڑھاتے.. چپس کڑکڑاتے.. تسبیحیں پھرولتے۔ اپنے موبائل فونوں پر کاروباری ہدایات دیتے یا مکمل طور پر آسودگی کے عالم میں صوفہ نشستوں میں خوابیدہ منہ کھولے خوابیدہ لوگوں میں.. ایک اجنبی کی مانند داخل ہوا.. کہ وہ سب کے سب احرام میں لپٹے ہوئے تھے کہ یہ ایک حج فلائٹ تھی..

اگرچہ ہم دونوں بھی حج کی نیت سے ہی گھر سے نکلے تھے سُمیر نیلی جین اور ٹی شرٹ میں تھا اور میں اپنے دیسی شلوار کرتے میں.. احرام میں نہ تھے.. کیوں نہ تھے؟.. اس لیے کہ ہمارے پاس حج ویزا نہ تھا ملاقاتی ویزا تھا.. ہم پر یہ پابندی نہ تھی کہ لاہور سے ہی اپنے آپ کو کفن میں لپیٹ لیں بلکہ ہم نے جدہ پہنچ کر احرام باندھنا تھا.. کہ ملاقاتی ویزا دراصل حج میں نقب لگانے کے مترادف ہے.. ہم نے جدہ کے باسیوں میں شمار ہونا تھا اور یوں مقامی لوگوں کی مانند ایک جنسی حج پر فارم کرنا تھا.. جانا تھا ملاقاتی ویزا پر اور پھر سمگل ہو جانا تھا.. کہیں میرے بیان سے آپ یہ قیاس نہ کرلیں کہ ہم کوئی غیرقانونی قسم کا مخدوش ساحج کرنے کو تھے..

جی نہیں.. یہ خالصتاً ایک شرعی حج تھا اگرچہ نسبتاً مختصر تھا..

چنانچہ سُمیر اور میں اُس ہجوم میں سراسر اجنبی تھے.. اپنے لباس کے باعث ہم بہت برگزیدہ بھی محسوس نہیں کر رہے تھے کہ لباس کا برگزیدگی سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔

احرام پوشوں نے ہم دونوں کو شک کی نظروں سے دیکھا..

شائد ہماری نیت پر شک کیا..

لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ جین اور ٹی شرٹ میں یا شلوار کرتے میں ملبوس ہونے کے باوجود ہماری حج کی نیت بہتوں کی نسبت زیادہ پکی اور پیڈی تھی..

جدہ کو اُڑان کرنے والی پرواز کا اعلان ہو گیا..

جہاز کی سیڑھیوں تک پہنچانے والی ایئرلائن کوچ آہستہ خرامی سے رواں تھی اور اُس کے اندر بھی ہم دونوں اجنبی تھے کہ دیگر مسافر بلند آوازوں میں... اللّٰھم لبیک لبیک... پکار رہے تھے..

نہیں صرف میں اجنبی تھا کہ سُمیر کو سر اٹھا کر اوپر دیکھتا تھا تو اُس کے ہونٹ لرزش میں تھے..
اُس نے نظر نیچے کر کے مجھے دیکھا اور خاموش پایا. لب بستہ پایا تو سرزنش کے انداز میں بولا
''ابا. تلبیہ پڑھیں.''
میں یہ نامانوس لفظ پہلی بار سن رہا تھا'' کیا پڑھیں؟''
''تلبیہ... کہیے کہ میں حاضر ہوں.. اے میرے رب میں حاضر ہوں.''
''لیکن بیٹے ابھی تو ہم لاہور ایئرپورٹ پر ہیں.. اور احرام میں بھی نہیں ہیں تو کیسے حاضر ہیں. کیا یہ ضروری ہے؟''
''ہاں ابا.'' اُس نے صرف اتنا کہا اور کوچ کے دیگر مسافروں کا ہم نوا ہو گیا..
مجبوراً مجھے بھی.. اللھم لبیک.. کا ورد کرنا پڑا. لیکن اس حاضری کی لَو میں میرا دل نہ تھا. خود بخود رُجحان نہ ہوتا تھا.. بلکہ میں کچھ کچھ بیوقوف محسوس کر رہا تھا. میں سُمیر کے کہنے پر پکار تو رہا تھا لیکن ہر لمحے مجھے خدشہ رہتا تھا کہ یکدم کوچ کے سارے مسافر چپ ہو جائیں گے اور میری کھکھیائی ہوئی بے تکی آواز... اللھم لبیک لبیک.. پکارتی کوچ میں تنہا بے سُری دربدر ہو گی اور وہ سب میری اس حماقت پر مسکرانے لگیں گے..
درست کہ خانہ کعبہ کی جانب سفر کرتے ہوئے لبیک لبیک پکارنا تو جائز ہے لیکن ابھی لاہور میں ہوتے ہوئے کس طرح حاضر ہوں، حاضر ہوں پکار کر حاضری لگوائی جا سکتی ہے.. لاہور اور خانہ کعبہ کے درمیان تو بہت طویل فاصلے ہیں.

جہاز کے اندرون میں داخل ہوئے تو یکدم مجھے تو بہرحال لیکن دیگر احرام پوش برگزیدہ حضرات کو بھی.. سعودیہ ایئرلائن کی فضائی میزبانیں جس انواع و اقسام اور ہوش ربا سر لپیٹے کی تھیں، انہیں یکدم میں حاضر ہوں پکارتے ہوئے یکدم دھچکا سا لگا. کچھ تو اس دھچکے سے سنبھل گئے لیکن میں اُن میں تھا جو سنبھلے تو سہی پر ذرا دیر میں سنبھلے.. یہ خواتین دراصل شامی اور یمنی نژاد تھیں کہ سعودی بہو بیٹیوں کو اس قسم کا غیر شرعی پیشہ اپنانے کی اجازت نہیں.. جب بہت ہی معقول ادائیگی سے دیگر عرب خواتین غیر شرعی اور وہ بھی بہ سر و چشم غیر شرعی ہونے کو تیار ہوں تو اپنی سعودی خواتین کو ہوا لگوانے سے فائدہ..

جہاز جونہی ہوا میں ہُوا. ہوا ہوا. تو ان میزبان خواتین نے فوری طور پر متوقع حاجی خواتین و حضرات کو خوب کھلایا پلایا.. جو وہ نہ کھانا چاہتے تھے وہ بھی کھلایا اور جو نہ پینا چاہتے تھے وہ بھی پلا کر شتابی سے فارغ کر دیا اور اس کے ساتھ ہی جہاز کی تمام لائٹس آف کر دی گئیں..
مکمل خاموشی چھا گئی..
ایک نہایت ہی ہلکی روشنی کے سوا مکمل تاریکی تھی. یعنی ایک نامکمل تاریکی تھی.
جس میں بیشتر مسافر اپنی اپنی اونگھ میں چلے گئے..

لگتا یہی تھا کہ سب لوگ نیند میں اُتر گئے ہیں..

میں کیسے یقین سے کہہ سکتا تھا کہ سب لوگ نیند میں چلے گئے ہیں..اس پرواز میں جانے کیسے کیسے یقین والے تھے جو بظاہر نیند میں تھے لیکن مجھ سے کہیں بیدار تھے پر ظاہر نہ کرتے تھے..

زندگی بھر مجھ میں جو ایک ساختیاتی خامی دیگر بے شمار خامیوں کے ہمراہ رہی ہے کہ میں کسی بھی سفر کے دوران.. چاہے وہ ریل گاڑی کا ہو یا ہوائی جہاز کا.. بے شک پہروں پر محیط ہو.. میں اس دوران سو نہیں سکتا.. میرے آس پاس کے مسافر مدہوش ہو کر ایک دوسرے کے شانوں پر سر رکھے.. جھولتے ٹکراتے.. میری آغوش میں گرتے نیند میں غافل ہوں لیکن میں.. ایک لمحے کے لیے بھی چاہتے ہوئے بھی ہنگامہ کا شکار نہیں ہوتا.. پٹ پٹ آنکھیں جھپکتا اِدھر اُدھر دیکھتا رہتا ہوں۔

کھڑکی کے شیشے کے ساتھ ناک چپٹی کیے پٹ پٹ کھلی آنکھوں کی پلکوں سے دستک دیتے ہوئے میں اپنے تئیں نیچے دیکھ رہا تھا.. لیکن کیا پتہ کہ اوپر دیکھ رہا تھا کہ اتنی گھنی تاریکی تھی جہاز کو گھیرے ہوئے کہ کسی بھی سمت کا سراغ نہ ملتا تھا.. نیچے یا اوپر کی کوئی تخصیص نہ تھی..

اگر نیچے کچھ نظر نہ آیا تھا تو اسے نظر نہیں آنا تھا کہ جو کچھ نظر آنا تھا اعلان کے مطابق دو منٹ بعد نظر آنا تھا..

آپ اگر عبث انتظار میں پلکوں سے دستک دیے چلے جاتے تھے تو وہ جو در تھا اُس نے تو دو منٹ کے بعد ہی وا ہونا تھا!

اور یہ کیسے دو منٹ تھے کہ گذرتے ہی نہ تھے..

''خواتین وحضرات.. میں آپ کی توجہ چاہتا ہوں'' پائلٹ کی آواز پھر گونج کر کانوں میں اُتری..

اور میرا جی چاہا کہ میں برادر جہاز نگہبان سے کہوں کہ.. بھائی جان آخر آپ کو کتنی توجہ اور درکار ہے.. ہم تو مشتاق ہیں آپ کہیے تو سہی کہ اور کیا کہتے ہیں... ہماری دستک دیتی پلکوں کا کچھ خیال کریں۔ کہیے!

اور انہوں نے کہا ''جہاز کے بائیں جانب نیچے نظر کیجیے.. مکہ کا شہر نظر آرہا ہے..''

کہاں نظر آرہا ہے..

کدھر..

کچھ بھی نظر نہیں آرہا..

نیچے ایک نابینا گھٹا ٹوپ تاریکی ہے.. اس کے سوا کچھ اور نہیں.. کچھ بھی نظر نہیں آرہا..

میں کھڑکی کے شیشے پر آنکھیں جھپکتا اپنے تئیں اپنی نظر کو نیچے اُتارنے لگا کہ اے بینائی اگر تو بینائی ہے تو یہ وہ لمحہ ہے جب تو یہ ثابت کر سکتی ہے کہ تو سچ مچ بینائی ہے.. اور پھر اُس نابینائی میں کچھ بینا ہوا.. دیدہ بینا ہوا..

میری نظر جہاز سے اُتر کر رات کی تاریکی میں اُترتی گئی اور پھر اُس نے دیکھا کہ بہت نیچے ایک ہلکی سی تمازت تھی.. روشنی تو نہیں روشنی کی دلیل تھی..

جیسے صحرا میں بہت دور ایک الاؤ نظروں سے اوجھل ہو پر اُس کی پرچھائیاں اُس کے وہاں ہونے کا پتہ دیتی ہوں.. ایسے نیچے ایک روشنی تھی جو پہاڑوں کی اونچ نیچ میں سے ظاہر ہو رہی تھی.. پہاڑیاں اس روشنی.. بے حد ہلکی روشنی کے باعث سیاہ ہو کر واضح ہو رہی تھیں اور ان کے درمیان میں کہیں وہ الاؤ روشن تھا جو اوجھل تھا..

اس کے سوا کچھ سجھائی نہ دیتا تھا.. کوئی عمارت.. کوئی شاہراہ.. کوئی شہر.. یا اس کی روشنیاں.. محض روشنی کی ایک علامت ان پہاڑیوں میں سے ایک ہلکی دھند کی مانند پھوٹ رہی تھی..

تو وہاں روشنی تھی..

جیسے بائبل میں روشنی کا بیان ہو رہا ہو کہ.. تب تاریک پانیوں پر اس کی روح تیرتی تھی.. ہر سُو اندھیرا تھا اور پھر اذن ہوا کہ روشنی ہو جا.. اور وہاں روشنی تھی..

لیکن یہاں وہ روشنی نہ تھی جہاز کے نیچے.. جو آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے.. ہر شے کو الگ الگ کر کے واضح کرتی ہے بلکہ روشنی کی دھند کا ایک شائبہ تھا.. سیاہ پہاڑیوں میں پوشیدہ اُس شہر میں سے جو ایک پیغمبر پر بہت نامہرباں ہوا اور اس کے باوجود وہ اسے دنیا کی تمام بستیوں سے زیادہ عزیز تھا..

شہر تو نہیں.. شہر والے.. نامہرباں ہوئے..

جب وہ شہر والوں کی پہنچ سے نکل گئے تو انہوں نے اپنی اونٹنی قصوئی کو روکا جو انہوں نے ابھی کچھ دیر پہلے اپنے یارِ غار سے خریدی تھی، مڑ کر مکہ کو دیکھا "اللہ کی اس زمین پر تم سب بستیوں سے مجھے زیادہ عزیز ہو اور اللہ کو بھی عزیز.. اگر میرے لوگ مجھے تم سے نکال نہ دیتے تو میں کبھی تم سے جدا نہ ہوتا"

مکہ کی سفارش اتنی بڑی ہے کہ ہماری مجال نہیں کہ ہم بھی اسے عزیز نہ رکھیں.. ابھی وہ شہر نہیں آیا تھا جو خود بھی اور اس کے لوگ بھی قصوئی کے سوار پر مہربان ہو گئے تھے.. تو ہم ان میں سے کس کو عزیز رکھیں..

یہ جو ہلکی روشنی کی دھند سیاہ پہاڑوں میں سے جنم لے رہی تھی.. یہ کچھ شناسا سی لگتی تھی.. کوہ طور کی ایک جھاڑی میں سے پھوٹنے والی روشنی کی طرح لگتی تھی.. جھاڑی میں بھی ایک اوجھل الاؤ جلتا تھا اور اپنی روشنی سے اپنے ہونے کا پتہ دیتا تھا..

ویسے جہاز کے پروں کے بہت نیچے جو گہرائی تھی اور جہاں وہ نامعلوم سی روشنی جلوہ گر تھی وہ نور نہ تھی بلکہ میری آنکھوں سے پوشیدہ پہاڑیوں کی اوٹ میں آئے ہوئے شہر مکہ کی شاہراہوں، رہائشی علاقوں، تجارتی عمارتوں کی عام سی بجلی کی روشنیوں سے جنم لے رہی تھی.. اور اس میں اُس کے گھر کی ایک روشنی بھی نہ تھی کہ وہ بے چراغ ہے.. جو خود چراغ ہو اُسے تو چراغ کی حاجت نہیں ہوتی.. عجب روشنی تھی..

یہ منظر کچھ انوکھا اور یکتا نہ تھا.. رات کو پرواز کرنے والے جہازوں سے ایسے درجنوں شہر گزرتے دکھائی دیتے ہوں گے.. اسی طور وہ پہاڑوں میں پوشیدہ ہوں گے اور ایسی ہی ہلکی دُھند روشنی اُن میں سے بھی پھوٹتی ہوگی.. لیکن یہ روشنی عجب تھی اور کسی نامعلوم کہکشاں کے آثار روشنی تھی صرف اس لیے کہ یہ کوئی شہر نہ تھا.. مکہ تھا..

آنے والے دنوں میں ابھی بہت سے منظر ایسے آنے تھے جن میں سے کچھ نے مجھے مایوس کرنا تھا اور کچھ نے میری آنکھوں کے آگے یوں کھلنا تھا کہ میری ٹانگوں میں سے جان کھینچ لینی تھی جیسے مرتے ہوئے کسی شخص کی جان ٹانگوں سے نکلتی ہے اور دماغ تک جاتی ہے..اور پھر چلی جاتی ہے..لیکن جہاز کے نیچے سے گزرتے ہوئے پہاڑوں میں روپوش ایک شہر کے الاؤ سے جنم لینے والی یہ ہلکی ہلکی سفید دھند جس طور میرے حواس پر اثر انداز ہوئی ایسے آئندہ کھلنے والے کسی اور منظر کا اثر نہ ہوا..جب پہلی بار مکہ نظر آیا اس کی عمارتیں شاہراہیں اور مینار سامنے ایک حقیقت کے طور پر ظاہر ہوئے تب بھی یہ اثر نہ ہوا کہ اتنی بلندی سے جو نظر آتا تھا، وہ حقیقت سے پرے گمان کی سرحدوں تک جاتا تھا، پہاڑوں میں سے پھوٹتی مدھم روشنی ایک پردہ تھی..اور پردے کے پیچھے جو کچھ تھا..یا جو تھا اس کا حسن بھی اس لیے سحر طراز تھا کہ وہ عیاں نہ تھا پردے کے پیچھے تھا..

شہر مکہ..بلکہ یوں کہیے کہ اس کے پردے میں سے پھوٹنے والی روشنیوں کے آثار گذر گئے..گزر گئے تو پھر سے تاریکی لکھی گئی جسے میں پڑھ نہ سکتا تھا..نابینائی پھر سے لوٹ آئی اور راج کرنے لگی..

بے مہر..نامہربان..بے رنگے اور سرد چہروں والے..حج کے لیے آنے والے ''بیوقوف'' مسافروں کے لیے ایک چشم حقارت رکھنے والے ایئرپورٹ اہلکاروں کے پس منظر میں سُمیر نے اپنے بڑے بھائی کو تلاش کر لیا..

''وہ سلجوق بھائی جان...''

''کہاں؟''

''وہ امیگریشن کاؤنٹر کے پار..وہ..''

اور تب مجھے اپنے بڑے بیٹے کا فکرمند بھی اور پُرمسرت بھی..چہرہ دکھائی دیا، وہ ویسے ہی بے تابی سے ہاتھ ہلا کر مجھے متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا جیسے چھٹی کے وقت جب میں اُسے سکول سے لینے جاتا تھا تو بچوں کے کلاس روموں سے اُبلتے ہوئے جم غفیر میں بہتا ہوا مجھے منتظر دیکھ کر ہاتھ ہلاتا تھا کہ ابو میں یہاں ہوں..اگرچہ اس کی پہلی پوسٹنگ جرمنی میں متوقع تھی کیونکہ اس نے جرمن زبان کا ڈپلومہ حاصل کیا تھا لیکن وزارتِ خارجہ نے یہ مناسب جانا کہ اسے جدہ میں نائب کونسل کے عہدے پر تعینات کر دیا جائے..ویسے تو وہ ہر نوجوان کی مانند یورپ کے کسی ملک میں سفارتی تعیناتی کے خواب دیکھتا تھا اور ذرا بجھے دل سے جدہ آیا تھا لیکن یہاں پہنچ کر جب اسے قربت نصیب ہوئی..متعدد بار خانہ کعبہ کے اندر جا کر نوافل ادا کرنے کا موقع ملا..روضہء رسولؐ میں داخل ہو کر بابا کی سرخ اور سبز پوشاک کو چھونے اور اس پر جمع شدہ خاک کے ذرّے چننے کی سعادت نصیب ہوئی تو وہ ایسا شانت اور مطمئن ہوا کہ مجھے خدشہ ہونے لگا کہ کہیں وہ بہت ہی بنیاد پرست مولوی نہ ہو جائے..

مجھے یاد ہے کہ جب پہلی بار وہ روضہء رسولؐ کے اندر گیا اور اس کا نصیب روشن ہوا تو فون پر اس نے

ع

صرف اتنا کہا ''ابا... میں نے زندگی بھر راتوں کو جاگ جاگ کر جتنی محنت کی تھی، جتنا پڑھا تھا، جتنی بھی مشقت کی تھی.. آج مجھے اس کا پھل مل گیا. اُس سے کہیں بڑھ کر.. مجھے اب زندگی سے اور کچھ نہیں چاہیے.''

رات کے اس پہر بھی.. تین بج چکے تھے.. جدّہ شہر.. مائی حوّا کا شہر.. اس کی کشادہ شاہراہیں تیز روشنیوں سے منور.. رات کو دن کرتی تھیں۔ سلجوق کی کار جس پر سی ڈی یا ''کور ڈی ڈپلو میٹک'' کی خصوصی نیلی نمبر پلیٹ آویزاں تھی مجھے فخر سے ہمکنار کرتی تھی اور اڑتی چلی جاتی تھی کہ سلجوق کار چلاتا نہ تھا اڑاتا تھا.. اور چنداں پرواہ کرتا تھا کہ برابر میں بیٹھے ہوئے والد صاحب اس تیز رفتاری کے باعث یکدم حرکت قلب بند ہونے سے انتقال بھی فرما سکتے ہیں۔

مجھے اس کی لاپرواہی کا رنج ہو رہا تھا..

اور اسے ملنے کی خوشی میں کچھ ملال سا بھی حلول کر رہا تھا کہ مجھ سے گلے ملنے اور حال احوال دریافت کرنے کے فوراً بعد وہ میرے وجود اور موجودگی سے غافل ہو گیا تھا اور اپنے چھوٹے بھائی سمیر کے ساتھ.. جس نے اسے کبھی اپنا بڑا بھائی تسلیم نہیں کیا تھا سوائے طنزیہ انداز میں ''بھائی جان'' کہنے کے اور جو ہمیشہ اسے ''یار سلجوق'' کہہ کر مخاطب کرتا تھا، محو گفتگو ہو گیا، مجھ سے مکمل طور پر غافل ہو گیا کہ.. یار سمیر تم نے فلاں گلوکارہ کی ویڈیو دیکھی ہے.. جسٹر ہے یار.. بی ایم ڈبلیو کا جو تازہ ترین ماڈل ہے اس کے بمپر دیکھے ہیں.. اور یار پیرس کے فلاں ڈیزائنر کی سمر کولیکشن میں جو سرخ ٹی شرٹ ہے یار کیا شرٹ ہے یار.. پچھلے ہفتے امریکی سفیر نے جو ڈنر دیا تھا اس میں اُردن کا سفیر وہ والی نیلی جین پہن کر آیا تھا جس کا اشتہار ''ٹائم'' میگزین میں چھپتا ہے.. اور اس کی بیوی یار!

مجھے ملال کے ساتھ کچھ طمانیت بھی ہوئی کہ بچہ ابھی مکمل طور پر ایک بیزار بنیاد پرست نہیں ہوا.. زندگی کی حرارت رکھتا ہے۔ لیکن قدرے مایوسی بھی ہوئی کہ اس دوران حج کا ذکر تک نہ آیا تھا..

ہم دونوں حج کی نیت سے آئے تھے اور سلجوق اگرچہ پچھلے برس حج ادا کر چکا تھا لیکن وہ دونوں تازہ ترین گلوکاراؤں، کاروں اور فیشن ڈیزائنرز کی باتیں کرتے چلے جاتے تھے.. حج کا ذکر تک نہ کرتے تھے..

جدّہ کے معروف ترین شاپنگ سنٹر ''جم جون'' کے برابر میں ''پیپسی فیملی کمپاؤنڈ'' کے اندر پام کے جدّہ کی تیز ہوا میں جھولتے درختوں کے درمیان میں نیلاہٹ میں رنگے سوئمنگ پول کے کنارے سلجوق کا ایک مختصر سا فرانسیسی طرز کا ولا تھا جس میں داخل ہوتے ہی اس نے عقیل گلزار کی فلم ''ساتھیا'' کا ویڈیو آن کر دیا اور ''مدھم مدھم تیری ہنسی'' گونجنے لگی..

عقیل اس لیے کہ سمیر نے گلزار کا ایک سکیچ بنا کر انہیں روانہ کیا تو جواب میں جہلم کے قریب قصبہ

دینہ کے دیرینہ باسی نے اسے شکریے کا ایک طویل خط لکھا جس کے آخر میں ''تمہارا مستقل گلزار'' درج تھا۔ اور یہ کہ بیٹے آپ کو ممبئی سے کسی بھی چیز کی خواہش ہو تو میں تمہارے لیے روانہ کر سکتا ہوں۔۔ اور ثمیر نے اس پیشکش پر غور کرتے ہوئے اشور یہ رائے کو مدنظر رکھا تھا لیکن پھر عمروں میں واضح فرق کے باعث اس چیز کی خواہش کو ترک کر دیا تھا۔ ساتھیا۔۔ مدھم مدھم تیری ہنسی۔ سن کے ہم نے پی لی ساری ہنسی۔۔

یہ ہم کیسے حج پر آئے تھے کہ جدہ کی رات میں جو صبح میں بدلنے والی تھی ہم پر ایک کافر کی شاعری اثر کرتی تھی۔۔

''اماں حوّا کا شہر''

جدّہ کے بارے میں ایک کہاوت ہے کہ..

جدّہ میں سمندر ہوتا ہے اور اس کے علاوہ اور سمندر ہوتا ہے.

جدّہ میں گرمی ہوتی ہے اور اس کے علاوہ اور گرمی ہوتی ہے..

اگر مجھ سے دریافت کیا جائے کہ جدّہ کے بارے میں آپ کے ذہن میں کیا کہاوت ہے تو میں اسی کہاوت میں اضافہ کرتے ہوئے عرض کروں گا کہ..

جدّہ میں روشنیاں ہوتی ہیں اور بے شمار روشنیاں ہوتی ہیں۔

جدّہ میں نئی نکور دلکش لشکتی ابھی نئے پن کے کنوار پن کی مہک میں رچی کاریں ہوتی ہیں اور ہوتی ہی چلی جاتی ہیں.. اس کے علاوہ اور کاریں ہوتی ہیں..

جدّہ میں لوگ دن رات چکن کھاتے ہیں اور کھاتے ہی چلے جاتے ہیں..

جدّہ میں سپر سٹورز۔ فیشن ہاؤسز اور شاپنگ مالز ہوتی ہیں اور ان کے علاوہ بھی ہوتی چلی جاتی ہیں۔

جدّہ میں کاروں اور جہازی سائز کے فور وہیلرز کے ڈرائیور مرد ہوتے ہیں اور مرد ہی مرد ہوتے ہیں کہ خواتین کو ایک کمتر مخلوق کی حیثیت سے ڈرائیونگ کی اجازت نہیں اور اس پابندی کے دفاع میں بھی علماء کرام نے بہت سی ''مصلحتوں'' کا انکشاف کیا ہے جو سعودیوں کے سوا کسی اور کی سمجھ میں نہیں آتیں۔

جدید جدّہ کی شاہراہیں اور فٹ پاتھ نہایت نفیس اور صاف ستھرے ہوتے ہیں کہ انہیں بنگلہ دیشی غلام بھائی دن رات جھاڑتے پونچھتے رہتے ہیں اور نہایت قلیل معاوضے پر یہ جمعداری کرتے ہیں.. اگر کوئی سعودی اپنی کار میں سے گھڑیوں بھرا، انگوٹھیوں بھرا سونے سجا ہاتھ نکال کر ان غلام بھائیوں کی جانب کچھ ریال پھینکتا ہے تو وہ اس مسلمان بھائی کی خیرات سڑک سے اٹھا کر چوم کر جیب میں ڈالتے ہیں اور جھک کر کورنش بجا لاتے ہیں.. اس کو ''ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے..'' کہا جاتا ہے..

جدّہ جدید کی کسی شاہراہ پر میں نے سائیکل تو کیا موٹر سائیکل بھی نہیں دیکھی.. اگر ایک موٹر سائیکل حبلیہ میں دیکھی تو وہ بھی ایک لیموزین سے زیادہ طویل اور دو منزلہ قسم کی تھی..

جدید جدہ میں میں نے اپنے قیام کے دوران کسی ایک فرد کو.. کہیں بھی.. سمندر کے کنارے پکنک مناتے ہوئے.. کسی ریستوران میں.. کسی شاپنگ مال میں.. کہیں بھی کسی ایک فرد کو کوئی کتاب پڑھتے نہیں دیکھا.. اخبار پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا.. یہ قبیحہ رواج پڑھنے پڑھانے کا کہیں نظر نہیں آیا..

میں جدہ کے سب سے بڑے بک سٹور میں گیا تو وہاں سٹیشنری تو بہت تھی، کتابیں اتنی کم تھیں کہ شاید میری سٹڈی میں زیادہ ہوں گی.. صرف ایک پاکستانی ناشر سنگ میل کے شوروم میں ہزار گنا زیادہ ہوں گی..

سیاہ عباؤں میں ڈھکی عربی بہنیں صرف سٹورز اور شاپنگ مالز میں نظر آئیں.. کسی فٹ پاتھ پر چہل قدمی کرتیں بچوں کے ساتھ کھیلتی نظر نہیں آئیں.. یا پھر کاروں کی پچھلی نشستوں پر نظر آئیں..

میں نے اس دوران کسی ایک ہنستی ہوئی خوش و خرم خاتون کو نہیں دیکھا.. شائد وہ بھی گھروں میں ہنستی ہوں گی.. گھر کے باہر شاپنگ کرتے ہوئے نہ ہنسنے اور نہ خوش رہنے میں بھی کوئی مصلحت ہوگی..

اور جدہ کے پورے طول و عرض میں کہیں بھی کوئی باقاعدہ قسم کا پارک یا باغ نہیں ہے.. پارک میں چونکہ نسان، مرسڈیز، بی ایم ڈبلیو اور فراری وغیرہ میں بیٹھ کر سیر نہیں کی جا سکتی اس لیے پارک کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی.. جدہ میں جو جہازی سائز کے بل بورڈ ہیں ان پر چسپاں اشتہاروں میں انسانی شبیہ کا استعمال ممنوع ہے.. البتہ بچوں کے دودھ یا ملبوسات کے اشتہاروں میں یہ چھوٹ دی گئی ہے کہ بچہ دکھا دیا جائے، بچی تو بالکل نہیں..

بین الاقوامی شہرت یافتہ فیشن ہاؤسز کے شوکیسوں میں نسوانی ملبوسات کی نمائش کے لیے جو قد آدم مجسمے یا مینی کوئنز ایستادہ ہوتے ہیں تو ان کے بدن تو نہایت متناسب اور شہوت سے بھرے ہوتے ہیں لیکن ان کے سر نہیں ہوتے.. اس میں تو یقیناً کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہوگی.. یہی مصلحت ہوگی کہ عورت ذات بہرحال بے دماغ اور بے سر ہوتی ہے.. صرف بدن ہوتی ہے تو اس کا سر دکھانے سے فائدہ.. ان بے سر نسوانی مجسموں کی چھاتیوں پر پیرس سے درآمد شدہ انگیائیں اور زیرجامہ ملبوسات نہایت ہی رقت آمیز ہوتے ہیں..

کچھ شاپنگ سٹورز میں موئے مردوں کا داخلہ ممنوع ہے.. صرف خاندان کے ہمراہ اندر جایا جا سکتا ہے.. سٹورز کے اندر بھی سر کے بالوں کی.. یعنی خواتین کے سر کے بالوں کی نمائش ممنوع ہے اور مذہبی پولیس ایسی بے راہرو خواتین پر کڑی نظر رکھتی ہے جو سر کے سکارف کو یونہی ڈھلک جانے دیتی ہیں تاکہ ہزاروں ریال خرچ کر کے انہوں نے نیویارک میں رائج جو تازہ ترین ہیئر ڈو بنوایا ہے، اس کی کچھ تو ستائش ہو سکے.. ایسی خواتین اگر نظر آ جائیں تو مذہبی پولیس ایک ہلکے سے بید کے ساتھ انہیں پیٹنے سے گریز نہیں کرتی.. اس کے باوجود کچھ مغرب زدہ خواتین جن میں اکثریت لبنانی اور اُردنی ہوتی ہیں یہ خطرہ مول لے لیتی ہیں اور خلق خدا صرف ان کے بال دیکھ کر ہی راضی ہو جاتی ہے..

جو پاکستانی ایک مدت سے یہاں مقیم ہیں، ان کا کہنا ہے کہ جدہ تو ریاض کی نسبت ایک نہایت ہی لبرل اور فراخ دل شہر ہے.. چنانچہ میں نے ریاض کو دیکھنے کا جو منصوبہ بنایا تھا، اسے فی الفور ترک کر دیا کہ

میرے لیے جدّہ ہی بہت تھا۔۔ یاد رہے کہ میں صرف ماڈرن جدّہ کا احوال بیان کر رہا ہوں کہ میرا سابقہ اسی کے ساتھ تھا۔

جدہ اتنا سخت گیر اور بنیاد پرست شہر بھی نہ تھا، اس کے جدید حصے سے الگ تھلگ ایک پرانا جدہ جو ''بلد'' کہلاتا تھا، آباد تھا اور وہاں وہ سب کچھ تھا جو جدید شہر میں نہ تھا۔ خوب چہل پہل تھی۔۔ فٹ پاتھوں پر لوگ تھے۔۔ موٹر سائیکلیں تھیں۔۔ زیادہ تر غیر ملکی تھے۔۔ ہندوستانی، پاکستانی، فلپینو، بنگلہ دیشی، افریقی، انڈونیشین جو اپنے ملکوں کی غربت سے فرار ہو کر سعودیوں کی غلامی میں چلے آئے تھے اور اپنی خوشی سے چلے آئے تھے۔

''بلد'' دو نمبر شاپنگ کے لیے نہایت ہی آئیڈیل تھا۔

یہاں سے خرید کردہ سوٹ کیسوں کے بخیے ان کو پہلی بار سامان سے بھرنے کے بعد اٹھانے سے اُدھڑ جاتے تھے۔۔ گھڑیوں کے بازو چوبیس گھنٹے درست وقت بتانے کے بعد گر جاتے تھے۔۔ یہاں پر جو پان فروخت ہوتے تھے، ان کا چونا بھی نزدیکی زیرِ تعمیر عمارتوں کے ملبے سے حاصل کیا جاتا تھا۔ ہم نے حج کی تیاری کے لیے یہاں سے نہایت دیدہ زیب۔۔ مروجہ قیمت سے نصف پر جوتیاں سینڈلز خریدیں اور جب انہیں پہلی بار پہننے کی کوشش کی تو ان کے سٹریپ ہاتھ میں آ گئے اور ان کے منہ کھل گئے۔۔

اس کے باوجود جدید جدہ کی پُر آسائش صاف ستھری مُردنی کے مقابلے میں ''بلد'' زندگی کی حرارت سے ہمکتا تھا۔

''بلد'' کے سوا ''عزیزیہ'' بھی تھا۔۔

یہ ایک چھوٹا پاکستان تھا۔

یہاں ''قانونی'' کی نسبت ''غیر قانونی'' زیادہ تھے۔۔

اس کی مرکزی سڑک کے گرد پاکستانی ریستورانوں کی یلغار تھی۔ لگتا تھا جیسے لاہور کی فوڈ سٹریٹ یہاں منتقل ہو گئی ہے۔۔ وہی تکے کباب۔۔ کڑاہی گوشت۔۔ حلوہ پوری۔۔ بریانی اور تنور سے برآمد ہوتی گرم گرم روٹیاں۔۔

لیکن ہم ذرا معزز لوگ تھے۔۔ ایک ڈپلومیٹ کے والد صاحب تھے۔ چنانچہ زیادہ وقت جدید جدہ کے جھمیلوں میں گزارتے تھے اور کبھی کبھار چوری چھپے ''بلد'' یا ''عزیزیہ'' میں آ نکلتے تھے تاکہ وہاں جو ہمارا دم گھٹتا تھا، اسے بحال کر سکیں۔۔

سلجوق ظاہر ہے ایک فرمانبردار بچے کی مانند والد صاحب کی خدمت خاطر میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتا تھا۔۔ بلکہ اکثر اوقات والد صاحب اس کی فرمانبرداری سے تنگ آ جاتے تھے کہ کوئی ایک آدھ کسر تو ہو جو وہ نہ اٹھا رکھے۔ لیکن وہ باز نہ آتا تھا۔ ہمیشہ بھگدڑ میں رہتا تھا۔۔ مجھے اور سُمیر کو بھگائے رکھتا تھا کہ اوئے سُمیر۔ قبلہ اباجی آج آپ کو لبنانی ریستوران میں سری پائے کھلاتے ہیں۔۔ لبنان کے بے مثل جوس ریستوران میں لیے چلتے

ہیں!! ادھر آئیں اباجی یہ ایرانی طعام گاہ ہے۔ آپ کو چلو کباب چکھاتے ہیں۔ سلاد ایسی کہ جنت میں بھی نہ ہوگی ایسی کھلاتے ہیں اور یہ ''البیک'' ہے جس نے کے ایف سی کو مات کر دیا ہے۔ سعودی چیلن ہے۔ اس کے چکن آسٹریلیا اور ڈنمارک سے آتے ہیں اور سعودی عرب کا بہترین چکن اور فرنچ فرائز یہاں سے ملتے ہیں اور یہ ''چلیز'' ہے۔ جدہ میں تقریباً واحد ریستوران یعنی ''مرچیں'' جہاں ہفتے کے دو دن مردوں اور عورتوں کے لیے الگ الگ خانے نہیں ہوتے اور یہاں میکسیکو کے بہترین پاپڑ ملتے ہیں۔ یہ جو پیزا ہٹ اور کینٹکی فرائڈ ہے یہ تو پاکستان میں بھی عام ہے اور در بدر ہے لیکن وہاں ''سٹاربک کافی'' تو نہیں ہے۔ وہ آپ کو پلاتے ہیں... اگر باہر کھانے کا موڈ نہیں تو یہ روز بخاری چکن اور ڈھیر سارا پلاؤ پیک کروا لیتے ہیں اور گھر جا کر نوش کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ بخارہ سے ہجرت کر کے یہاں آنے والے بخاریوں نے اس روز بخاری کو رائج کیا۔ اور ہم پاکستان میں ہر بخاری کو کتنی عقیدت سے ملتے ہیں۔ حالانکہ اگر وہ جینوئن بھی ہوں تو صرف بخارا کے ہوتے ہیں۔ وہاں وہ کیا ہوتے تھے، یہ کون پوچھتا ہے۔ اس روز بخاری چکن اور پلاؤ کے ایکسپرٹ اب افغانی برادران ہیں جو روس کے خلاف جہاد کرتے کرتے ادھر آ نکلے اور اب یہاں سے جانے کا نام نہیں لیتے۔ جدہ کی شاہراہوں پر جو گورے چٹے بظاہر مسکین سے بچے بھیک مانگتے نظر آتے ہیں، وہ انہی جہادیوں کی آل اولاد ہیں۔

ہم نے جدہ میں جتنے بھی رات کے کھانے تناول فرمائے تو گھر سے باہر ایسی ہی نوعیت کی طعام گاہوں میں تناول فرمائے اور ایک روز اسی مسلسل تناولی سے تنگ آ کر میں نے سلجوق سے کہا ''برخوردار۔ تم ابھی تک ہمیں لبنانی۔ مصری۔ ایرانی۔ پاکستانی۔ امریکی اور میکسیکو وغیرہ کی خوراک کھلاتے رہے ہو تو جہاں ہم ہیں۔ یعنی یہ ہمارے عزیز از جان عرب بھائی ان کی اپنی بھی کوئی خوراک ہے یا ابھی تک کھجوروں پر گذارہ کرتے ہیں۔ یہ کیا کھاتے ہیں۔ جو یہ کھاتے ہیں وہ بھی تو کھلاؤ کہ یوں پیٹ پوجا بھی ہو جائے گی اور کچھ ثواب بھی کمایا جائے گا۔''

''نو پرابلم ابا۔'' چنانچہ سلجوق مجھے اور میمونہ کو اپنی کار میں لاد کر مارو مار کرتا پتہ نہیں جدہ میں کہاں لے گیا۔ ابھی میں اس سلجوق کی بے چین طبیعت کا تھوڑا سا تذکرہ کرتا ہوں۔

اب یہ جو موجودہ سلجوق دی ڈپلومیٹ تھا، یہ جب لاہور میں تھا تو بہت دھیما اور متانت خصلت کا تھا۔ اپنے آپ یہ فیصلہ نہ کر سکتا تھا کہ اس چوک سے بائیں مڑنا ہے یا دائیں جانب نکل جانا ہے۔ ہمیشہ تذبذب میں رہتا تھا لیکن جدہ میں ایک طویل قیام کے بعد اس کی متانت، بے چینی میں ڈھل گئی تھی۔ بقول منیر نیازی۔

بے چین بہت رہنا، گھبرائے ہوئے رہنا
اک آگ سی سینے میں، دہکائے ہوئے رہنا

تو سلجوق میں بھی بے چینی بہت بڑھ گئی تھی۔ گھبرایا ہوا رہتا تھا اور شاید اس کے نتیجے میں وہ مسلسل اور تیز رفتار ڈرائیونگ کا دلدادہ ہو چکا تھا۔ سٹیئرنگ پر بیٹھتا نہیں تھا وہاں آباد ہو جاتا تھا۔ اٹھنے کا نام نہ لیتا تھا۔ ایک

عجیب روحانی کیف میں مبتلا بے تکان ڈرائیو کرتا ہی چلا جاتا تھا تو میں نے ایک روز پوچھ ہی لیا کہ بیٹا کیا تمہیں تنخواہ تمہاری کار کے سپیڈ دمیٹر پر درج فاصلوں کے حساب سے ادا کی جاتی ہے کہ جتنا زیادہ سفر کرو گے، اسی حساب سے تنخواہ ملے گی اور گر ایسا نہیں تو تمہیں کیا ہو گیا جوتی.. ریلیکس یار!

لیکن جُوتی یار ریلیکس نہیں کرتا تھا مسلسل بے تکان اور پر مسّرت موڈ میں ڈرائیو کرتا چلا جاتا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ رات کو سٹیئرنگ الگ کر کے اسے سینے سے لگا کر سو جاتا..

تو سلجوق میری اس فرمائش پر کہ آج کسی خصوصی عرب طعام گاہ کی زیارت کرواؤ ہمیں بار و مار کرتا جانے جدہ کے کس کونے کھدرے میں واقع ایک ریستوران میں لے گیا.. یہاں خاصی آمد و رفت تھی، رونق تھی.. ریستوران کے مالک نے مزید تین گاہکوں کو سامنے پا کر کسی مسّرت کے اظہار سے شدید گریز کیا بلکہ ایک بیزاری بھرا اشارہ اوپر کی منزل کو کیا کہ آ گئے ہو تو اوپر دفع ہو جاؤ..

دیگر ریستورانوں میں تو فیملی رُوم الگ ہوتے ہیں.. مرد سوئے ایک طرف اور کل خدائی دوسری طرف پردے میں رہنے دو بلکہ ایک روز "البیک" میں اپنا جدے کے قیام کا مسلسل بائیسواں چکن تناول کرتے ہوئے احساس ہوا کہ ہم جہاں کہیں جاتے ہیں اس ریستوران میں اکثر میں معمر ترین بابا ہوتا ہوں بلکہ بابائے واحد ہوتا ہوں اور ارد گرد صرف نوجوان نسل ہوتی ہے جو ظاہر ہے عربی میں "چکن چاہیے چکن چاہیے" کے نعرے لگا رہی ہوتی ہے.. میں نے سلجوق سے اس وقوعے کے بارے میں استفسار کیا تو وہ کہنے لگا کہ ابا.. آپ کی عمر کے بابے اول تو گھر سے باہر ہی نہیں نکلتے اور اگر باہر آتے ہیں تو فیملی کے ساتھ آتے ہیں اور فیملی پورشن میں بیٹھتے ہیں..

میں پوچھنے لگا تھا کہ اگر بابے کی فیملی نہ ہو، کنوارا ہو تو پھر کہاں بیٹھتا ہے پھر خیال آیا کہ عرب شریف میں یہ امکان کہاں.. شاذ ہی کوئی ایسا "مسکین" ہو گا جو محض ایک بیوی کا مالک ہو.. اور ایسے مسکین کو تکنیکی طور پر کنوارا ہی گردانا جاتا ہے.. یہ بھی معمول ہے کہ بیٹے کی شادی کے موقع پر کمپی ٹیشن میں آ کر والد صاحب نے بھی سہرا باندھ لیا کہ خرچہ تو ہو ہی رہا ہے بے جا اسراف سے اجتناب کیا جائے..

اور یہ ریستوران جس کا پتہ نہیں کیا نام تھا.. اسے "عربی غربی" وغیرہ کہہ لیجیے تو اس میں بابے وافر تعداد میں موجود تھے کہ یہ صرف مرد حضرات کے لیے مخصوص تھا.. یہاں میز کرسی کا اہتمام نہ تھا بلکہ سراسر فرشی نشست کا بندوبست تھا.. کچھ کٹہرے سے بنے ہوئے تھے جن میں براجمان حضرات دکھائی نہ دیتے تھے، صرف اُن کے حقّے نظر آتے تھے جنہیں یہاں "شیشہ" کہا جاتا ہے.. ہم تینوں ایک ایسے ہی چوکور کٹہرے کے اندر داخل ہوئے اور قالین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے.. میں نے ایک گاؤ تکیے کے ساتھ ٹیک لگانے کی خاطر اس پر کہنی جمانے کی سعی کی تو وہ لڑھک گیا اور کہنی بھی پھسل گئی کہ وہ شاید پتھر کا بنا ہوا تھا.. اتنی دیر میں ویٹر نے دو بڑی بڑی طشتریاں پلاؤ سے لبریز ہمارے درمیان میں رکھ دیں اور پلاؤ پر کچھ نیم سوختہ مختصر مرغ آرام کر رہے تھے جو

شاید میرے ہم عمر تھے۔ ساتھ میں کچھ غیر جانب دار ذائقوں کی چٹنیاں وغیرہ بھی تھیں.. یہ روسٹ مرغ بڑے نہ تھے البتہ بڑے بہت تھے..اور چاولوں کی مقدار اتنی زیادہ تھی کہ ہمارے ہاں کی چھوٹی موٹی بارات ذرا ہاتھ کھینچ کر کھائے تو کافی ہو سکتے تھے..

صرف جدہ میں ہی نہیں پورے سعودی عرب میں ماشاء اللہ خوراک کی اتنی فراوانی ہے کہ جتنی کھائی جاتی ہے اتنی ہی ڈسٹ بنوں میں پھینکی جاتی ہے. بعض اوقات مرغ چکھ کر صرف اس کی سالمیت کو زک پہنچا کر بقیہ حصے سے منہ موڑ لیا جاتا ہے..اس ضائع شدہ خوراک کو اگر سنبھالا جائے..اگرچہ کیوں سنبھالا جائے تو افریقہ میں قحط کی صورت حال بہت بہتر ہو سکتی ہے..

ہمارے احاطے یا کٹہرے کے اندر ایک چھوٹے سے بورڈ پر ریستوران کی جانب سے یہ خوش خبری دی گئی تھی کہ اگر مزید چاول درکار ہوں تو وہ بلا معاوضہ مہیا کیے جائیں گے. مزید چاول؟ یقیناً یہاں کھانا تناول کرنے والے حضرات ان طشتریوں میں سے ابلتے ہوئے ڈھیروں چاول شکم میں اتار کر بھی کچھ ناآسودہ سے محسوس کرتے ہوں گے اور مزید چاول طلب کرتے ہوں گے ورنہ اس بورڈ کا کیا جواز ہو سکتا تھا..

بہر حال ہماری طشتریاں تو شدید بد پرہیزی کے باوجود تقریباً اور بیجنل حالت میں چاولوں سے لبریز رہیں...اس کے بعد سویٹ ڈش کے لیے..کہ وہاں صرف ایک ہی سویٹ ڈش سرو کی جاتی تھی. گرم سویاں شہد میں نچڑتی ہوئیں...جو واقعی ذائقہ رکھتی تھیں.

پھر قہوہ آ گیا..

قہوے کے بعد میں نے سلجوق سے پوچھا کہ جی برخوردار اب کیا کریں..

"اب یہاں آرام فرمائیں..سو جائیں..جو جی میں آئے کریں والد صاحب..

اور واقعی ذرا ادھر ادھر تانک جھانک کی تو کھانے سے فراغت حاصل کرنے والے حضرات سخت جان تکیوں سے ٹیک لگائے اونگھ رہے تھے..کچھ باقاعدہ خوابیدہ تھے.

"میں تو آرام نہیں کرنا چاہتا..

"آپ کو عرب میں وہی کرنا چاہیے جو عرب کرتے ہیں.. پلاؤ اور چکن کھانے کے بعد اونگھ جاتے ہیں تو کم از کم اونگھ جائیے کہ یہی رواج ہے. اونگھ نہیں سکتے تو حقہ پیجیے."

ایک روز میں نے اس مسلسل ہوٹل بازی اور قہوہ خانہ بازی سے تنگ آ کر سلجوق سے کہا "یار جوقی...اس جدید شہر سے الگ تھلگ یہاں کوئی ایسی جگہ بھی تو ہو گی جو ابھی تک اپنی قدامت میں قائم ہو.. جہاں عام قسم کے دقیانوسی خیالات کے پرانے دنوں کی یاد میں آہیں بھرنے والے جدہ کے قدیم باسی بیٹھتے ہوں گے..اپنے اُس شہر کے کھو جانے پر متاسف جسے ریال کی ریل پیل اور مغرب کی یلغار نے بحیرہ احمر..میں

دھکیل دیا تھا.. کہیں تو بیٹھتے ہوں گے ..قہوہ پیتے ہوں گے ..حقے گڑگڑاتے اپنی اس غربت کو یاد کرتے جب عزت نفس بھی ہوا کرتی تھی..''

''ہاں ایسی جگہ ہے..''

اور یہ جگہ بھی پرانے جدہ کے اسی علاقے ''بلد'' کے پہلو میں تھی جہاں دو نمبر شاپنگ کی گہما گہمی ہوا کرتی ہے۔

یہیں کہیں آس پاس وہ مسجد بھی تھی جہاں نماز جمعہ کے بعد مجرموں کے سر تلوار سے قلم کیے جاتے تھے یا ہاتھ کاٹے جاتے تھے ..عوام الناس کو پہلے سے اطلاع کی جاتی تھی کہ آئیے جوق در جوق آئیے بال بچوں کو بھی ہمراہ لائیے اور مجرموں کے سر دھڑ سے الگ ہو کر خاک میں خون آلود حالت میں تڑپتے دیکھئے اور عبرت حاصل کیجیے..

میں نے جدہ کے قیام کے دوران ''عرب نیوز'' میں ایک نہایت معروف عرب جلاد کا تفصیلی انٹرویو پڑھا..اُس کا کہنا تھا کہ یہ ایک معزز پیشہ ہے اور اس نے عمر بھر اتنے سر کاٹے ہیں جتنے تربوز بھی نہیں کاٹے ہوں گے۔ یہ ایک منافع بخش پیشہ بھی ہے کیونکہ پہلے وقتوں میں تو لوگ سرکاری جلاد بننے کے لیے سفارشیں کرتے تھے لیکن اب بہت کم لوگ اسے اختیار کرتے ہیں..اسے دُکھ تھا کہ اُس کے بچوں میں سے کوئی بھی اس پیشے کو اپنانے پر تیار نہیں اور اُس کی وہ تلواریں ضائع ہو جائیں گی جنہیں وہ سر کاٹنے کے بعد نہایت اہتمام سے ایک خاص محلول کے ساتھ دھوتا ہے اور سنبھالتا ہے۔ اسے اس بات پر فخر تھا کہ وہ مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچا کر اسلام کی خدمت کر رہا ہے اور اس نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ اس کی تلوار کسی بے گناہ کی گردن کاٹ رہی ہے کیونکہ یہ فیصلہ تو قاضی حضرات کی گور گردن پر تھا۔اس نے مختلف مجرموں کی نفسیات پر روشنی ڈالی کہ مقتل کی جانب جانے اور گردن کو جھکانے کے دوران اُن کا کیا ردِ عمل ہوتا ہے لیکن اس نے ایک نوجوان عورت کی بہت تعریف کی..وہ سر اٹھا کر نہایت سکون سے چلتی ہوئی بغیر کسی سہارے کے اپنے قدموں پر قدرے فخر سے چلتی ہوئی آئی اور میری تلوار تلے اپنا سر جھکا دیا..پھر عین وقت پر حکم آیا کہ سزا پر فی الحال عمل نہ کیا جائے تو اس عورت نے اسی سکون اور فخر سے سر اٹھایا۔ کسی قسم کی مسرت کا اظہار نہ کیا اور واپس چلی گئی۔ دو مرتبہ ایسا ہوا کہ میں اس کی گردن پر وار کرنے کو تھا کہ کسی قانونی پیچیدگی کے باعث سزا مؤخر کر دی گئی..تیسری بار آخری بار تھی اور میں نے اس کا سر قلم کر دیا.. مجھے وہ اب تک یاد ہے..وہ کیسی عورت ہوگی جو نہ پشیمان تھی اور نہ ایک ہولناک موت کو سامنے پا کر متزلزل اور حواس باختہ..اس کا کیا جرم تھا..کیسا جرم تھا کہ وہ ہنستی خوشی مقتل کی جانب بڑھتی تھی..ایک بار نہیں تین بار..

میرے جیسے پیشہ ور ادیب بھی دراصل ایسے ہی جلاد ہوتے ہیں..بے رحم ہوتے ہیں..جذباتیت کا شکار نہیں ہوتے۔دور کھڑے نہایت خود غرضی سے مشاہدہ کرتے رہتے ہیں اور ان کرداروں کو اپنی کہانیوں اور

ناولوں میں ڈھال دیتے ہیں.. مجھے بھی یہی خیال آیا کہ اس بے خوف عورت کی زندگی اور بالآخر تین بار مقتل کی جانب سکون اور اطمینان سے بڑھنے پر ایک کیسا شاندار ناول لکھا جا سکتا ہے..

کسی زمانے میں جدہ کے اس پرانے علاقے میں دور دراز کے حاجی بابا اُترتے تھے۔ سمندری جہازوں سے اترتے تھے، قیام کرتے تھے اور پھر منہ وَل کعبے شریف کر لیتے تھے.. ان گئے وقتوں کی چند بھولی بسری.. کم از کم میری نظروں میں نہایت دیدہ زیب قدیم عمارتیں اور وہ سرائیں جہاں حاجی ٹھہرتے تھے، ابھی تک جانے کیسے اپنے آپ کو بل ڈوزروں سے بچائے ہوئے تھیں.. خوفزدہ اور دبکی ہوئی تھیں۔ نہایت ''پرائم لینڈ'' پر تھیں اور سپر سٹورز اور شاپنگ مالز کی دیویاں گھات لگائے بیٹھی تھیں اور ان فرسودہ عورتوں کو ملیامیٹ کر کے کروڑوں ریالوں کے راج سنگھاسن پر براجمان ہونے کے لیے بے چین تھیں..

ان آخری سانس لیتی ہوئی چند عمارتوں کے آگے ایک کھلی جگہ تھی.. روشنی یہاں کم تھی.. روشنی کے کھمبے بھی پرانے زمانوں کے تھے.. اس احاطے میں پلاسٹک کی کرسیاں اور معمولی میزیں تھے لیکن وہاں بیٹھنے والے معمولی نہ تھے۔ مغرب اور تنگ نظری کے عقیدوں کی یلغار سے پہلے کی عرب تہذیب کے بجھتے ہوئے نمائندے تھے.. قہوے کی چسکیاں بھرتے.. شطرنج نما ایک کھیل میں مگن.. حقے گڑگڑاتے.. احاطے کے سامنے جو شاہراہ تھی اس پر اڑتی ہوئی کاروں اور ان میں براجمان بابا ہوئے ہیں نہال لوگوں سے لاتعلق.. اپنے آپ میں گم..

میں نے جدہ میں پہلی بار اس بے فکری کو شاہت اور بے پرواہ حالت میں پایا.. انہیں واقعی دنیا کا اور کوئی کام نہ تھا.. ہمیں اپنی پرائیویٹ دنیا میں داخل ہونے اور کرسیوں پر بیٹھتے انہوں نے دیکھا تو ہو گا لیکن انہیں کسی کے آنے یا چلے جانے سے کچھ فرق نہ پڑتا تھا..

پرانی کارواں سراؤں کے پہلو میں.. چندوی آئی پی نشستیں تھیں.. دیوان نما نشستیں تھیں جو مکمل تنہائی کے خواہش مند حضرات کے لیے مختص تھیں۔ وہ ان پر بیٹھ سکتے تھے یا ٹانگیں سمیٹ کر ان پر استراحت فرما سکتے تھے.. ویٹر ان کا خاص خیال رکھتے تھے.. یہاں تک کہ حقہ یا شیشہ سامنے رکھ کر ان کی نال صاحب استراحت کے منہ تک لے جاتے تھے.. جیسے کسی زمانے میں پاک ٹی ہاؤس کے پار ایک نکڑ پر جو پہلوان پان فروش تھا، وہ پان آپ کو تھماتا نہیں تھا آپ کے منہ میں رکھتا تھا..

آس پاس ایک ہی ویٹر تھا..

اگر آپ اسے ویٹر کہہ سکتے ہیں تو!..

اسے بھی کسی کی کچھ پرواہ نہ تھی.. کوئی بدو.. اور وہ بھی کوئی افیونی سا بدو تھا.. جو بھلے زمانے میں حاجیوں کے قافلے لوٹ کر رزق حلال کماتا تھا اور اب مجبور ہو کر اس شہر میں قید ہو کر رہ گیا تھا جہاں لوٹ مار کی ذمہ داری شاہوں نے اور مغرب والوں نے لے لی تھی.. وہ اپنے بدن ناتواں میں لرزتا اور جھولتا کبھی اس میز پر قہوہ دھر جاتا اور کبھی جھولتا ہوا اُس میز کا حقہ تازہ کرنے لگ جاتا.. اب یہ جو حقہ تھا تو یہ یہاں شیشہ کہلاتا تھا..

صرف اس لیے کہ اس کی زیریں منزل جس میں تمباکو کی کثافت اپنے آپ میں حل کرنے کی خاطر پانی بھرا ہوتا ہے، وہ ہمارے ہاں کے حقے کی مانند پیتل یا تانبے کی نہیں تھی بلکہ سراسر شیشے کی تھی۔ چنانچہ آپ نال سے منہ لگا کر جب کش کھینچتے تھے تو دیکھ سکتے تھے اس شیشے میں بھونچال سا آ جاتا ہے اور بلبلے اٹھ کر. ہلا گلا کرنے لگتے ہیں۔

ہمیں یہاں آرڈر کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

ہمارے کہے بغیر خواہش بغیر وہ جو مخنی بدّو بھائی تھا، اس نے قہوے کی پیالیوں کے فوراً بعد ایک شیشہ ہماری میز کے پہلو میں آویزاں کر دیا لیکن اس شیشے کا سر نہ تھا یعنی یہ ٹوپی یا چلم کے بغیر تھا. محض شیشے کا دھڑ تھا. سر نہ تھا..

''والد صاحب.. آپ کونسے ذائقے کا تمباکو پینا پسند کریں گے؟'' سلجوق نے نہایت مؤدب برخورداری سے استفسار کیا۔

''بھئی میں تو محض ایک قدیم ثقافت کی قربت حاصل کرنے اور اس کی بُو باس سونگھنے کے لیے چند کش لگانا چاہتا ہوں.. تو ذائقے سے مطلب. یعنی مے سے غرض نشاط تو نہیں.. بس تمباکو ہو اور عربی قسم کا ہو۔''

''ابا.. یہاں پر کوئی ایک تمباکو نہیں ہوتا. مختلف ذائقے ہوتے ہیں. مثلاً سیب کے ذائقے والا.. انگوروں یا باداموں کے ذائقے والا. سٹرابیری یا خربوزے کی مہک رکھنے والا.. جو بھی آپ پسند کریں..''

''تم بھی پیو گے؟''

مجھے کامل یقین تھا کہ وہ شرمندہ ہو کر کہے گا کہ نہیں ابا جی.. بھلا آپ کے سامنے.. لیکن اس نے بلا تامل کہا ''ہاں جی.. میں تو سیب کے ذائقے والا تمباکو پیوں گا۔''

''یہ بچہ کچھ چوز ہو گیا ہے۔'' میں نے افسردہ ہو کر سوچا۔ ''بے شک ڈپلومیٹ ہو چکا ہے لیکن اپنے والد صاحب کو بلا جھجک کہہ رہا ہے کہ میں تمباکو پیوں گا۔''

ہمیں تو کبھی جرأت نہ ہوئی۔

اگرچہ میرے والد صاحب اولاد کو ہمہ وقت ڈانٹنے والے.. اپنی بزرگی کی دھونس جمانے والے اور منع کرنے والوں میں سے نہیں تھے.. پھر بھی ہم ایک حجاب تو رکھتے تھے.. یہ کیسی نسل ہے کہ بے حجاب ہو گئی ہے..

ابا جی کاروبار سے لوٹتے تھکے ماندے اور نڈھال.. فیلٹ ہیٹ اتار کر سفید بالوں پر ہاتھ پھیرتے. سوٹ ہمیشہ تھری پیس زیب تن کرتے اور صرف رینکن ٹیلر سے سلواتے. شوز انہیں چینی ہاپسن کے پسند ہوا کرتے تھے.. وہ گھر پہنچتے ہی ٹائی سمیت ان تمام ''اشیاء'' سے نجات حاصل کرتے اور لٹھے کا ایک کھڑ کھڑاتا تہبند اور آدھے بازو کی بنیان زیب تن کر کے ایک ''الانی'' چارپائی پر بیٹھ جاتے جس پر اگر امی جان نے کوئی کھیس یا چادر بچھائی ہوتی تو تو وہ اسے اٹھوا دیتے کہ ان کے نزدیک الانی بان کی چارپائی کی بُنت ان

کے تھکے بدن کو بھاتی تھی۔ گرمیوں میں بان کی بُنت میں سے ہوا کا چلن ان کے گرمی سے ستائے ہوئے بدن کو ٹھنڈک دیتا۔ تب میں اپنی ڈیوٹی سنبھال لیتا۔ ان کا بھاری بھرکم نہایت مرصع اور دیدہ زیب حقہ گھسیٹتا ہوا غسل خانے میں لے جاتا اور اسے تازہ کرنے لگتا۔ خوب خوب نہلاتا۔ پانی بدلتا اور پھر ابا جی خود آ جاتے اور نال سے منہ لگا کر گڑگڑاتے ہوئے فالتو پانی خارج کر دیتے۔ یہ بھی ایک آرٹ تھا کہ کتنا پانی نکالنے سے کش لگاتے ہوئے زیادہ زور بھی نہ لگے اور اتنی شتابی سے بھی سانس نہ کھینچا جائے کہ تمباکو جل جائے۔ نال سے منہ لگا کر پانی کا تناسب درست کرنے کی مجھے اجازت نہ تھی۔

چلم بھی وہ خود تیار کرتے۔

اور یہ تو واقعی ایک فائن آرٹ تھا۔ وہ اس کی تیاری میں کسی اور کی مداخلت برداشت نہ کر سکتے تھے چاہے عزیز ترین حقہ شناس دوست ہی کیوں نہ ہو۔ ٹوپی یا چلم کے گلے میں کس قسم کا دیسی گڑ دھرنا ہے اور اس پر کھبل تمباکو کو ہتھیلیوں میں کتنا مسل کر اس پر بچھانا ہے اور انگوٹھے سے اسے کتنا دبانا ہے اور آخر میں انگیٹھی میں سلگتی چھال سے چلم کو کتنا اور کس انداز میں بھرنا ہے کہ نہ تو وہ صرف اتنی ٹھوس دھری جائے کہ ہوا کا گذر مشکل ہو جائے اور نہ اتنی چھدری کہ ایک ہی کش سے اس کی چنگاریاں یکدم سلگنے لگیں اور وہ بھسم ہو جائے۔ اسے اب فائن آرٹ نہ کہا جائے تو اور کیا کہا جائے۔

والد صاحب اپنی بان کی چارپائی پر دراز ہو کر اس تازہ شدہ سلگتے ہوئے حقے کی نال منہ میں دبا کر ایک کش لیتے اور افلاک کی سیر کرنے لگتے۔

ہمیں تو کبھی جرأت نہ ہوئی کہ والد صاحب سے نال وصول کر کے ایک کش ہی لگا لیتے اور اب نصف صدی کے بعد میرا بیٹا نہایت دھڑلے سے مجھے بتا رہا ہے کہ وہ تو سیب کے ذائقے والا تمباکو پیے گا۔

چنانچہ جدہ کے "بلد" میں۔ ایک نیم روشن چوک میں جو اطالیہ میں ہوتا تو پیاتزا کہلاتا۔ شرلاٹے بھرتی کاروں کے برابر میں۔ متروک شدہ حاجی عمارتوں کے زیر سایہ۔ بدو منحنی ہماری چلم بھرتا تھا اور ہم باری باری شیشہ پی رہے تھے۔

نمیر تو دو تین کش لگانے کے بعد ہی ریٹائر ہو گیا۔

البتہ سلجوق نے نہایت پروفیشنل انداز میں اپنی نے سنبھالتے میرا ساتھ دیا۔ ہر پانچ دس منٹ بعد جب چلم کی آگ مدھم پڑ جاتی تو بدو منحنی ہمارے کہے بغیر اسے اتار کر لے جاتا اور تازہ آگ بھر کر لے آتا۔

ہم یہ شیشہ گری کا نازک کام دیر تک کرتے رہے جس کے نتیجے میں اگلے دو روز مجھے مسلسل کھانسنا تھا۔ لیکن ثقافت کی یگانگت کی خاطر اتنی قربانی تو دینی ہی پڑتی ہے۔

سعودی عرب میں اور ظاہر ہے جدہ میں بھی نماز کے اوقات میں ہر شے معطل ہو جاتی ہے۔

آپ کسی شاپنگ مال میں ہیں تو اس کے داخلے کے دروازے بند ہو جاتے ہیں..
روشنیاں مدھم کر دی جاتی ہیں..
دکانوں کے شٹر گر جاتے ہیں..
ریستورانوں میں بیٹھے ہوئے افراد باہر نہیں جا سکتے اور باہر سے کوئی اندر نہیں آ سکتا..

سعودیوں کو نماز کی لت پڑ چکی ہے.. اُن کی خصلت میں شامل ہو چکی ہے.. زندگی کا ایک معمول ہے جیسے کھانا پینا، سونا جاگنا، گفتگو کرنا یا شاپنگ کرنا.. ایسے نماز پڑھنا.. انہوں نے اس کی ادائیگی کو اپنے حواس پر سوار نہیں کیا.. وہ ان لوگوں کی مانند نہیں ہیں جو بار بار گھڑی دیکھتے ہیں.. دوسروں سے پوچھتے ہیں کہ اذان تو نہیں ہو گئی.. اگر ہو گئی ہے تو وہ مسجد کس مسلک کی ہے جہاں سے اذان ہوئی ہے.. وضو کہاں کیا جا سکتا ہے.. قبلہ کس جانب ہے.. اور پھر دیگر بے نمازیوں پر ایک پُر تقدس نظر حقارت ڈالتے ہوئے اس کی ادائیگی میں مشغول ہو جاتے ہیں.. کچھ لوگ البتہ ایسے ہوتے ہیں جن کے بارے میں پتہ ہی نہیں چلتا کہ وہ کب محفل سے اٹھے اور کب واپس آ کر شامل ہو گئے.. وہ غل غپاڑہ کرنے سے اجتناب کرتے ہیں.. سعودی بھی اُنہی لوگوں میں شامل ہیں۔ یہ الگ بات کہ ریستوران، سپر سٹورز اور دکانوں میں مقید تمام لوگ نماز نہیں پڑھتے۔ کچھ بے چینی سے ٹہلتے رہتے ہیں.. کوئی مشروب نوش کرتے رہتے ہیں، فرنچ فرائز کھاتے رہتے ہیں اور منتظر رہتے ہیں کہ کب نماز کا وقفہ اختتام کو پہنچے اور کب وہ باقاعدہ زندگی کا آغاز کر سکیں۔

شنید ہے کہ کچھ برس پیشتر تک بہت سختی تھی.. بے نمازیوں کو مذہبی پولیس نہ صرف ہانکتی تھی بلکہ ان پر بید بھی استعمال کرتی تھی، لیکن اب وہاں امریکی اثر کے تحت اس معاملے میں جمہوریت رائج ہے کہ جس کا جی چاہے پڑھے اور جس کا جی نہ چاہے اطمینان سے سٹار بک کافی پیئے یا اپنی کار میں بیٹھ کر میڈونا کے گانے سنتا رہے.. زبردستی کا زمانہ گزر گیا ہے۔ ''آزادیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ..''

ویسے جس تسلی اور بے پروائی سے زندگی کے ایک معمول کی مانند اپنے آپ کو ہیجان میں مبتلا کیے بغیر سعودی یہ مختصر فرض نمازیں ادا کرتے ہیں اگر پاکستان میں بھی اسی قسم کی سہولت ہو تو مجھ ایسا شخص بھی کوئی نماز قضا نہ کرے..

بیشتر سٹورز اور شاپنگ مالز کے داخلے پر اسرائیل کے ہاتھوں شہید ہونے والے فلسطینی نوجوانوں کی بیواؤں اور بچوں کی مدد کے لیے فنڈز جمع کرنے والوں کے کاؤنٹر ہوتے ہیں اور میں نے دیکھا کہ کوئی ایک آدھ سعودی ہی ایسا ہو گا جو کچھ نہ نذر کیے بغیر اندر جاتا ہو.. خاص طور پر خواتین دل کھول کر چندہ دیتی ہیں۔ اپنے بھرے ہوئے پرس الٹا دیتی ہیں.. یہ محض اتفاق نہیں کہ اسامہ بن لادن ایک سعودی ہے یا گیارہ ستمبر کو امریکہ کی عزت نفس ہمیشہ کے لیے مجروح کرنے والے بیشتر نوجوان سعودی تھے.. یہ الگ بات کہ یہ مجروحیت ہم سب کو بہت مہنگی پڑی ہے۔

جدّہ میں غلاموں کی بہتات ہے..

سڑکیں صاف کرنے والے.. فٹ پاتھوں اور سٹورز کی صفائی پر مامور خاکروب.. ڈرائیور.. چھوٹے موٹے کاروبار کرنے والے.. شاپنگ مالز کے سیلز مین۔ مکینک۔ فیکٹریوں اور کھیتوں میں مشقت کرنے والے.. بلند و بالا عمارتیں تعمیر کرنے والے.. اینٹ گارا ڈھونے والے.. ایک زیر تعمیر سکائی سکریپر جسے میں نے خاص طور پر پرکھا تو وہاں جو سینکڑوں مزدور، راج، انجینئر اور سپروائزر وغیرہ موجود تھے، ان میں سے ایک بھی سعودی نہ تھا.. تو یہ سب موسم کی سختیوں کو برداشت کرنے والے اور مقامی آبادی کی نفرت سہنے والے سب کے سب غیر ملکی ہوتے ہیں.. غلام ہوتے ہیں!

مجھے ایک حوالہ یاد آتا ہے کہ صحرائے نجد میں تیل کی پائپ لائن بچھانے اور پھر ایک سو پچیس ڈگری کی دوزخ حدّت میں کھلے آسمان تلے اس پائپ لائن کو ویلڈ کرنے والے بیشتر کاریگر لوؤں میں سورج کی حدّت کا شکار ہو جاتے تھے.. اور پھر صرف یہ پاکستانی تھے اور وہ بھی پٹھان تھے جو اس نارِ جہنم میں اپنے ویلڈنگ راڈ بھی نارِ جہنم سے جلائے اس پائپ لائن کو ویلڈ کرتے تھے اور ان سختیوں کو سہار جاتے تھے..

یہ غلام ایسے نہ تھے جنہیں اغوا کیا گیا تھا.. زبردستی غلام بنا لیا گیا تھا اور انہیں ان کی مشقت کا معاوضہ نہ دیا جاتا تھا.. انہوں نے تو بخوشی یہ غلامی قبول کی تھی.. بلکہ غلام ہونے کے لیے لاکھ جتن کیے تھے.. ان میں سے بیشتر اگر اپنے اپنے ملکوں میں آزاد ہوتے تو بھوکے مرتے.. تین وقت کی روٹی کے لیے ترستے.. کبھی ایک پکے مکان کا خواب نہ دیکھ سکتے.. اپنی بیٹیوں کو بیاہ نہ سکتے.. تو یہ سعودیوں کی مہربانی تھی کہ انہوں نے ان کو غلام کے طور پر قبول کر لیا تھا..

ایک اور حوالہ یاد آ رہا ہے کہ پاکستانی فوج کے ایک افسر نے کسی ایسی ہی تضحیک آمیز صورت حال کو برداشت سے باہر پا کر سعودیوں سے کہا تھا.. ٹریننگ ہم تمہیں دیتے ہیں، تمہارے ملک کی حفاظت ہم کرتے ہیں.. جانیں قربان کرتے ہیں، جب بھی جب آپ مصر کے خلاف جنگ کر رہے تھے تو اسے جواب ملا تھا ''تم ہم پر کیا احسان کرتے ہو.. جہاں ہم تمہارے ملک سے خاکروب اور گندگی اٹھانے والے امپورٹ کرتے ہیں ویسے ہی تمہاری فوج بھی امپورٹ کر لیتے ہیں کہ ہم تمہاری خدمات کا اتنا معاوضہ دیتے ہیں کہ تم پاکستان میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے.. ہم تو تمہیں نہیں بلاتے، تم منت سماجت کر کے آتے ہو.. تو تم ہمارے غلام ہو.. غلام احتجاج نہیں کر سکتے۔''

سلجوق کی رہائش گاہ سے کچھ فاصلے پر سمندر کے کنارے، ایک نہایت پُر وقار سفید مسجد کے گنبد و مینار جدّہ کے آسمان کو چھوتے تھے۔

سلجواس مسجد کے امام کا بہت دلدادہ تھا۔ اس امام کے والد نے یہ مسجد تعمیر کروائی تھی اور وہ جدہ کے امیر ترین افراد میں شمار ہوتا تھا۔ سلجوق کا کہنا تھا کہ وہ نوجوان امام بیشتر سعودیوں کی مانند ایک نہایت پُرتعیش زندگی گزار سکتا تھا کہ اسے کوئی کمی نہ تھی.. اور اس کے باوجود وہ بہت سادہ اور عبادت گزار تھا اور بہت بیباک تھا.. اتنی کمال کی قرأت کرتا تھا.. اور اس کی قرأت بے رُوح اور میکانکی نہیں ہوتی تھی۔ وہ عہد موجود کے بے حس مسلمانوں کی پسماندگی اور علم سے ان کی دوری اور جہالت کو اس قرأت میں یوں پروتا تھا کہ رُلا دیتا تھا.. خود بھی روتا تھا اور دوسروں کو بھی اشک بار کر دیتا تھا..

جمعہ کی نماز ادا کرنے کے لیے ہم اسی مسجد میں گئے..

مسجد کی وسعت، صفائی ستھرائی اور پاکیزگی اپنی جگہ.. کہ ہم تو حیران ہوتے تھے کہ خدا کے گھر میں بھی اتنا سکون ہو سکتا ہے.. نہ کوئی دہشت ہے اور نہ نارِ جہنم کا کوئی خوف.. جیسے اپنے گھر میں ہوں..

نمازِ جمعہ ابھی شروع ہوئی اور اگلے لمحے ختم ہو گئی.

اتنی شتابی سے پڑھی گئی کہ ہم تو مطمئن نہ ہوئے..

ہم تو تب مطمئن ہوتے تھے جب ہم غلطی سے مقامی مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے جاتے تھے۔ مولوی صاحب خطبے کے دوران چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیتے تھے۔ ہمیں لعن طعن کرتے.. جہنم کی نوید سناتے.. اپنے مسلک کے دفاع میں تلوار بہ کف.. اتنا طویل خطبہ دیتے کہ ہم پچھتانے لگتے..

تب ہم مطمئن ہوتے..

یہاں تو خطبہ بھی مختصر اور نماز بھی اس سے مختصر.

ہم پچھلی صفوں میں تھے.. نوجوان امام کو دیکھ نہ سکتے تھے لیکن ان کی قرأت ایسی سریلی رس بھری اور دل کی جھیل پر جمی شکوک کی جو کائی تھی، اسے ہٹا کر نیچے جو نیلگوں سمندر احساسات کے تھے، ان میں حلول کر جانے والی ایسی تھی کہ ہم زندگی بھر انہیں سنا کرتے اور اس دوران پہلو بھی نہ بدلتے.. ایسی قرأت تھی..

ہمارا زیادہ وقت تو تحلیہ میں گذرتا..

تحلیہ کیا ہے..

بس شیشہ ہی شیشہ ہے.. کاریگری ہی کاریگری ہے.. ہزاروں سورجوں کی روشنی ہی روشنی ہے.. ریال کی کرامات ہیں۔ دولت کے ایسے معجزے ہیں جو کسی بھی پیغمبر کے گمان میں نہیں آ سکتے تھے..

دنیا میں کوئی ایسا فیشن ہاؤس نہ تھا.. بے شک وہ پیرس.. لندن.. روم یا نیویارک سے جنم لیتا ہو.. جس کا یہاں اپنی جنم بھومی سے بڑھ کر شاندار اور پُرشکوہ شوروم نہ ہو.. اس دنیا میں کسی عورت کے سر سے پاؤں تک جو بھی پہناوا ہے.. لباس.. زیر جامہ.. زیور.. گھڑیاں.. شوز.. جرابیں.. ہیرے جواہرات جو کچھ بھی ایک عورت کو

سجاتا ہے وہ یہاں پر ہے۔۔اور کسی بھی مرد کو جو بھی ملبوس۔۔ٹی شرٹ۔۔جین۔۔جیکٹ۔۔سوٹ۔۔قمیض اور بنیان جو بھی درکار ہو سکتی ہے یہاں ہے۔۔بے شک ایک پاکستان کی بنی ہوئی شرٹ۔۔کسی پیرس کے ڈیزائن گورو کی تخلیق کردہ ایک شرٹ۔۔پاکستانی روپوں میں سات ہزار کی ہو۔۔یہاں تحلیہ میں مہیا ہے۔۔

اور تحلیہ کے شیشے کے شوکیسوں میں بغیر سر کے بقیہ بدن کی اشتعال انگیزی کے ساتھ وہ بُت کھڑے ہیں۔ منی کوئنز ایستادہ ہیں۔ جن پر ان بین الاقوامی فیشن گھروں کے تازہ ترین ملبوسات سجے ہیں۔

تو ان کے بدن تو ہیں۔۔سر نہیں ہیں۔

اور یہ مورتیاں۔ منی کوئنز۔ جن کے صرف بدن تھے۔۔سر نہیں تھے۔۔یہ سعودی عورت کی بھرپور نمائندگی کرتی تھیں کہ ان کے بدن جائز تھے۔ لیکن جہاں سوچ کا منبع تھا۔ سر تھا۔ وہ ناجائز تھا۔ غیر شرعی تھا۔۔

جیسا کہ میں پہلے بھی شرمندگی سے عرض کر چکا ہوں کہ ان مورتوں پر سجے زیر جامہ انتہائی ہیجان خیز اور مختصر ہوتے ہیں۔

مجھے شک ہے کہ عرب بھائی چہرے کو کم ہی قابل توجہ سمجھتے ہیں۔ محض اس کے نیچے جو بدن ہے صرف اسے دیکھتے ہیں۔

آخر اس قسم کے ہیجان خیز اور مختصر لباس پہنتا کون ہے؟

یہ کوئی نہ کوئی تو پہنتا ہوگا

ورنہ ان کی نمائش کا کیا جواز ہے۔۔

ایک مستند روایت کے مطابق یہ عرب خواتین کے محبوب پہناوے ہیں اور پرائیویٹ پارٹیوں میں حجاب کی بجائے فیشن گھروں کے یہی خصوصی لباس ہوتے ہیں اور بے حجاب ہوتے ہیں۔۔

تحلیہ ایسے ہی ملبوسات کی نمائش گاہ ہے۔ شاپنگ مالز کے شیشہ گھروں اور مغربی ریستورانوں سے سجا ہے اور وہاں جو فرد نظر آتا تھا بیش قیمت سواریوں میں نظر آتا تھا۔ فٹ پاتھوں پر چلتا کوئی نظر نہ آتا تھا۔ اگر کوئی دکھائی پڑتا تھا تو وہ غلام دکھائی دیتا تھا جو اللہ کے ان پسندیدہ بندوں کو حسرت کی نظر سے دیکھتا جھاڑو لگاتا تھا۔۔

تحلیہ دراصل سعودی معاشرے کا ایک تخلیہ تھا۔

ایک اور پریشانی بھی مجھے لاحق ہوئی اور میں اس کا جواز تلاش کرنے میں ناکام رہا۔۔ایک ایسے شخص کو جو حسن نظر رکھتا ہو۔۔ذرّے میں آفتاب دیکھنے والا ہو اور حسن کی اک ذرا سی ہوا کے چلتے ہی ڈھیر ہو جاتا ہو اسے بھی کم از کم جدہ میں کسی خوش شکل اور دیدہ زیب چہرے کو دیکھنے کی حسرت ہی رہتی ہے۔۔چاہے وہ چہرہ مرد کا ہو یا عورت کا۔۔

آل سعود کے بیشتر افراد نہایت خوش شکل اور مردانہ وجاہت کے حامل ہیں۔ شاہ فیصل کی عقابی ناک اور سحر انگیز آنکھیں بھلا کون بھلا سکتا ہے.. شاہ فہد کے کھنڈر بھی بتاتے ہیں کہ عمارت عظیم تھی.. وہ یقیناً ایک زمانے میں بے حد وجیہہ تھے اور بے وجہ تو صنف نازک ان پر نثار نہیں ہوتی تھی اور جو نہیں ہوتی تھی وہ بھلا فرمان شاہی کی تاب کہاں لاسکتی تھی وہ بھی ہو جاتی تھی.. کراؤن پرنس عبداللہ بھی کسی حد تک خوش شکل رہے ہیں.. تو پھر بقیہ سعودیوں کو کیا ہو گیا ہے..

ان کے چہروں پر ریالوں کا حسن تو ہے لیکن ناک نقشے کی کشش مفقود ہے۔ ریستورانوں یا شاپنگ مالز میں جتنے بھی نوجوان دیکھے انہیں ایک بار دیکھنے کے بعد دوسری بار دیکھنے کی خواہش نہیں رہتی تھی.. کچھ تو سپاٹ اور بے رُوح.. بُدھو سے لگتے تھے یا بدّو سے دکھتے تھے.. جدہ میں جو نسل نظر آتی ہے میں نہیں جانتا کہ بقیہ عرب سے اُس کا کیا رشتہ ہے کہ تمام تر عقیدت کے باوجود وہ بہت ہی معمولی لگتی ہے..

یہ تو مردوں کا سوال ہے لیکن خواتین کے بارے میں کچھ کہنے سے میں قاصر ہوں بلکہ گریز کرتا ہوں کہ حج کی نیت سے آیا ہوں۔ پھر بھی جب کبھی وہ سامنے آئیں تو ڈھکی چھپی عبا پوش ہی آئیں اور اگر کوئی شکل نظر آ ہی گئی تو تصویر نظر نہ آئی بس یونہی سی نظر آئی.. البتہ ان میں سے اگر کوئی حسن نظر کے پیمانے پر اتری تو یہی بتایا گیا کہ یہ اوّل تو لبنانی ہیں ورنہ شامی ہیں اور مصری بھی ہو سکتی ہیں.. کیونکہ سعودی دو چار بیویوں سے کم تو ٹھہرتے ہی نہیں جب تک سانس چلتا ہے بیویاں چلتی ہیں بے شک انہیں سنبھالتے سنبھالتے دم نکل جائے.. پہلی تو روایتی قبائلی بیوی ہوتی ہے۔ اس کے بعد وہ بین العرب ہو جاتے ہیں اور ان کی اوّلین پسندیدہ دلدار کی سرزمین لبنان کی ہوتی ہے پھر وہ شام، اردن، فلسطین اور مصر وغیرہ سے رجوع کرتے ہیں۔ اکثر ویک اینڈ یعنی جمعرات جمعہ کو رجوع کرتے ہیں اور بقیہ ہفتہ روایتی بیوی کے ساتھ گذارتے ہیں.. میرے جیسے یک زوجہ حضرات کو ''مسکین'' کے نام سے پکارا جاتا ہے کہ یہ بے چارہ صرف ایک بیوی افورڈ کر سکتا ہے.. چنانچہ اکثر بیویاں جان بوجھ کر شاہ خرچیاں اور فضول خرچیاں وغیرہ کرتی ہیں تا کہ خاوند کے پاس مزید ایک اور بیوی کے لیے مناسب سرمایہ باقی نہ بچے

چونکہ کسی قسم کی شکل یا شبیہہ جاندار کی بنانے کی اجازت نہیں اس لیے ساحل کے ساتھ ساتھ تو تجریدی مجسمے دکھائی دیتے ہیں اور بڑے چوکوں میں کچھ اور ہی دکھائی دیتا ہے.. ایک چوک میں ایک جہازی سائز سمندری جہاز ہے.. کہیں بڑی بڑی صراحیاں یا فانوس آویزاں ہیں.. ایک مشہور عالم چوک ایسا ہے جس کے درمیان میں کئی منزلہ بلند ایک سائیکل سعودیوں کی ''حِس جمال'' کی مظہر ہے.. البتہ ان آرائشوں کا ایک فائدہ تو ہمارے پاکستانی غلاموں کو ہوا ہے کہ وہ عربی میں چوکوں کے نام یاد رکھنے سے تو قاصر ہیں اس لیے انہیں ''جہاز چوک''، ''لوٹا چوک'' یا ''سائیکل چوک'' کے نام سے پکار لیتے ہیں۔ اس بہت بڑی سائیکل کے

بارے میں ذرا ضعیف الاعتقاد پاکستانیوں کا کہنا ہے کہ یہ بابا آدم کی سائیکل ہے.. چونکہ جدہ میں اماں حوا کی قبر کے آثار بھی ہیں تو یہ توجیہہ سمجھ میں آتی ہے کہ ان کے پاس جانے کے لیے بابا جی یہی سائیکل استعمال کرتے ہوں گے..ایک دوست نے قسم کھا کر مجھے یقین دلایا کہ اس نے کچھ پاکستانیوں کو اس سائیکل کے سائے میں نفل ادا کرتے بھی دیکھا تھا!..واللہ باعلم الصواب..

میرے اس طویل بیانیہ میں آغاز کے سوا جدہ پہنچنے پر کہیں بھی حج کا ذکر نہیں آیا۔کہیں بھی ایک گھنٹے کی مسافت پر مکہ اور چھ گھنٹوں کی مسافت پر واقع مدینہ کی چاہت کا اظہار نہیں ہوا..

آپ کو گمان گذرتا ہوگا کہ یہ کیسا شخص ہے کہ گھر سے حج کی نیت سے نکلا ہے اور اب کس لہو ولعب میں مبتلا ہو گیا ہے۔تہلیہ کے فیشن گھروں اور شاپنگ مالز کے پھیرے لگتا ہے.. لبنانی، امریکی اور ایرانی ریستورانوں کے طواف کرتا ہے۔ سٹاربک کی کافی پیتا ہے اور اپنے بیٹوں سے نظر چرا کر سیاہ پوش خواتین کو نظروں میں جانچتا ہے اور مجال ہے اس نے اس دوران کسی عبادت..نماز، روزے یا تزکیہ نفس یا پرہیز گاری کا ذکر کیا ہو یا جس مقدس مقصد کے لیے وہ یہاں آیا ہے اس کی خوش بختی کا کچھ اظہار کیا ہو..مسلسل لہو ولعب میں مبتلا داد عیش دے رہا ہے..

ایسا ہرگز نہیں ہے..

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن تیرے خیال سے غافل نہیں رہا

بے شک میں رہینِ ستم ہائے جدہ رہا لیکن اُس کے خیال سے غافل نہیں رہا..میں تو محض یہ چاہتا تھا کہ شہر جدہ کو نپٹا دیا جائے اور پھر ایک بار جو منہ وَل کعبے شریف کیا جائے تو پھر رُخ بدلا نہ جائے..اُدھر ہی رہے..میں نے گھر سے نکلنے سے پیشتر اپنی بساط کے مطابق حج کے بارے میں پورا ہوم ورک کیا تھا اور اس ورک کا آغاز بھی ہوم سے کیا تھا..یعنی اپنی بیگم سے صلاح مشورہ کیا تھا..کیسے..میں عرض کرتا ہوں..

"ہدایت نامہ حج برائے الحاد پرست مسافراں.. احسن بھائی اور افضل بھائی"

جیسے آپ کسی دورافتادہ جھیل یا بلند برفانی پہاڑ کے دامن میں پہنچنے کی نیت کریں تو آپ کے پاس وہاں تک کی رہنمائی اور مشورے کے لیے دو سرچشمے ہوتے ہیں..ایک تو آپ ان مقامات کے بارے میں مستند گائیڈ بکس اور تاریخی کتب کا مطالعہ کر کے اپنے راستے کا تعین کرتے ہیں اور دوسرا یہ کہ جو کوہ نورد ابھی حال ہی میں اس جھیل یا برفانی بلندی تک ہو کر آیا ہو، اس کے سامنے سرنگوں ہوتے ہیں کہ سرکار آپ تو زیارت کر آئے اب ہمیں بھی راہ دکھلا دیجیے.. چنانچہ پہلے تو میں نے بک سٹوروں سے اور سابقہ حاجی خواتین وحضرات سے حج کے بارے میں متعدد کتابچے اور پمفلٹ حاصل کیے اور ان کا گہرے استغراق سے تفصیلی مطالعہ کیا..لیکن کچھ پلّے نہ پڑا..ان کتابچوں میں حج کے دوران ہر مقام پر پہنچ کر.. یا اس تک پہنچنے کے سفر کے دوران..اٹھتے بیٹھتے.. کھانا کھاتے..سوتے جاگتے..کسی شہر میں داخل ہوتے.. وہاں سے نکلتے..کسی مقدس مقام پر پہلی نظر پڑتے.. پانچوں نمازوں اور تہجد کے علاوہ ڈھیر ساری مسنون..افضل اور احسن دعائیں اور عبادتیں درج تھیں..اور ان میں سے کسی ایک کی ادائیگی کے بغیر ذرا سی غفلت سے پورا حج مشکوک ہو جاتا تھا..اور اس پر طرّہ یہ کہ سب کی سب دعائیں اور حاضریاں عربی زبان میں تھیں جو نہ تو مجھے زبانی یاد ہو سکتی تھیں اور نہ ہی ان کے معانی میرے دل سے نکل سکتے تھے..اور نہ دماغ پر اثر انداز ہو سکتے تھے کہ یہ میری سمجھ سے باہر تھیں..اس کے علاوہ ایک طویل فہرست "یہ کرنا ہے" اور "یہ نہیں کرنا" کی تھی..اور اگر کہیں بھی آپ نے جو نہیں کرنا وہ کر جاتے ہیں تو ایک بکرا قربان کیجیے تو معافی ہو گی.... یہ تمام ناقابل فہم مقدس الجھنیں تو اپنی جگہ..کسی نہ کسی طرح سلجھ ہی جائیں گی لیکن اس سفر کی منازل کونسی ہیں..جانا کہاں ہے..کتنے روز قیام کرنا ہے..پھر کوچ کب کرنا ہے اور مناسک کیا ہیں یہ سب کچھ سلجھتا ہی نہ تھا..کوہ نوردی کا پہلا اصول ہی یہی ہے کہ آپ جانتے ہوں کہ کس شب آپ کونسی منزل پر قیام کریں گے..کتنے دنوں کا سفر ہے..راستہ آسان ہے یا دشوار..اگر آپ نہیں جانتے تو ساری عمر بھٹکتے رہیں گے، منزل تک نہیں پہنچیں گے..تو میں نے مجبوراً اپنی بیگم سے رجوع کیا جو ابھی پچھلے برس اس فرض

کی ادائیگی سے سبکدوش ہو کر حاجن ہوئی تھیں۔۔

میمونہ بیگم سوائے میرے دنیا بھر کے معاشرتی، تہذیبی اور دیگر علوم پر بہت دسترس رکھتی ہیں اور دینی علوم تو اس کی گھٹی میں پڑے ہوئے ہیں یعنی اس کے والد چودھری عبدالرحمٰن خان یعنی ہمارے سسر جن کا دیدار ہمارے نصیب میں نہ تھا کہ وہ ہماری شادی سے بہت پہلے فوت ہو گئے تھے اور اس میں بھی مشیت ایزدی تھی اور ہماری بھلائی تھی کہ اگر وہ حیات ہوتے تو بے شک اپنی لاڈلی بیٹی کو گھر میں کنواری بٹھائے رکھتے لیکن میرے جیسے مخدوش کردار کے حامل آوارہ گرد شخص کے پلّے ہرگز نہ باندھتے۔۔ وہ نہ صرف علی گڑھ کے ایم اے ایل ایل بی وغیرہ تھے بلکہ صوبائی سول سروس میں ایک سخت گیر منتظم ہونے کے حوالے سے کُل پنجاب سول سیکرٹریٹ میں سخت "بدنام" تھے۔۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ حضرت عمر فاروقؓ کے عدل کے پیروکار ہیں۔ ظاہر ہے ایسے عدل کی موجودگی میں میرے جیسے بے اصول بندے کی گنجائش کہاں ہوتی۔۔ نہ صرف چودھری صاحب بلکہ ان کے اہل خانہ بھی ممتاز صوفی بزرگ مولانا احمد علیؒ لاہوری کے پیروکار تھے بلکہ وہ مولانا کے خلیفہ اول تھے اور معروف دینی مجلّے "خدام الدین" کے ایڈیٹر بھی تھے۔ میں نے اتنی تفصیل صرف اس لیے بیان کی ہے کہ میری بیگم کا دینی حوالہ ذرا مستحکم ہو جائے۔ میمونہ جب سکول میں پڑھتی تھیں تو اپنے والد کی علالت کے دوران اس مجلّے "خدام الدین" کو ایڈٹ بھی کرتی تھی۔ قرآن پاک بھی اس نے مولانا احمد علی کی زوجہ سے پڑھا تھا اور مجھ ایسے بظاہر الحاد پرست کے گھر میں تینتیس برس گزارنے کے باوجود اگرچہ اسے پورا قرآن حفظ تو نہیں تھا لیکن کسی ایک آیت کے حوالے سے وہ فوری طور پر رواں ہو جانے کی صلاحیت اب بھی رکھتی تھیں۔ تو میں نے ان سے رجوع کیا۔

اور زندگی میں پہلی بار دین کے معاملے میں رجوع کیا جو گزشتہ رجوع سے مختلف نوعیت کا تھا۔۔ یوں بھی اتنے اہم دینی معاملات زندگی میں پہلی بار ہی سامنے آئے تھے۔۔

"میمونہ بیگم آپ چونکہ ایک تجربہ کار حاجن ہیں تو براہ کرم رہنمائی فرمائیے کہ یہ جو حج ہوتا ہے، یہ کیسے کیا جاتا ہے؟"

"جب جاؤ گے تب سمجھ میں آئے گا۔ میرے بتانے سے تمہیں کچھ سمجھ نہیں آئے گا۔ آج تک میرے بتانے سے کچھ سمجھ میں آیا ہے۔۔ کچھ ہو تو سمجھ میں آئے۔"

میں اس بے عزتی کو پی گیا کہ حج کا معاملہ تھا اور چاپلوسی پر اتر آیا۔ "میں پوری کوشش کروں گا مونا بیگم۔ بس تم ہی مجھے پار لگا سکتی ہو۔۔ پلیز سمجھاؤ تو سہی کہ کہاں جانا ہے۔۔ کدھر جانا ہے۔۔ کب جانا ہے۔۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ حج کے لیے جانا ہے۔۔ پلیز۔۔"

"پہلے تو حج کی نیت کرنی ہے۔۔"

"وہ تو میں نے کب کی کر لی۔۔"

'' جدہ سے تم براہ راست منیٰ جاؤ گے جسے مُونا بھی کہتے ہیں..''

''سبحان اللہ پھر تو ہمارا حج یہیں گھر میں ہو گیا کہ تم بھی تو مُونا ہو..''

''اگر مسخریاں کرو گے تو نہیں بتاؤں گی۔''

''سوری..''

''تو جدہ سے تم منیٰ پہنچو گے.. وہاں لاکھوں خیمے ہوں گے.. اور ان میں سے ایک میں تم ہو گے.. وہاں تم تین دن گزارو گے..''

''اور ان تین دنوں میں کیا کرنا ہوگا؟''

''عبادت کرنی ہوگی.. نمازیں پڑھنی ہوں گی..''

''پانچوں نمازیں پڑھنی ہوں گی؟''

''کم از کم..''

''میرا تو کچومر نکل آئے گا اتنی نمازیں پڑھتے پڑھتے.. بہت ضروری ہے؟''

''ہاں.. بہت ضروری ہے۔''

''ٹھیک ہے یہ مشقت بھی کر لیں گے.. سہہ لیں گے اس کے سوا منیٰ میں اور کیا کریں گے؟''

''کچھ بھی نہیں..''

''صرف نمازیں پڑھیں گے اور عبادت کریں گے.. اور کیا کریں گے؟''

''کھائیں پئیں گے.. خیمے میں جو دیگر لوگ ہوں گے ان کے ساتھ گپ لگائیں گے.. محدود غسل خانوں کے سامنے قطاریں لگائیں گے جہاں کبھی باری آتی ہے اور کبھی نہیں آتی۔''

میں ہراساں ہو گیا کہ میری زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ غسل خانہ تھا۔ ''اگر باری نہیں آتی تو پھر کیا کرتے ہیں؟''

''صبر کرتے ہیں۔''

''اس حالت میں کیسے صبر ہو سکتا ہے.. بوجھ اور دباؤ کی مجبوری میں؟''

''وہاں سب کچھ ہو جاتا ہے.. صبر بھی آ جاتا ہے۔''

''بہر حال.. تو منیٰ میں تین دن پڑے رہتے ہیں۔''

''مسلسل نہیں.. ایک روز عرفات کے میدان میں جاتے ہیں۔''

''درست.. تو وہاں کیا کرتے ہیں؟''

''دعائیں کرتے ہیں..''

''دعاؤں کے لیے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ مناسب مقام نہیں ہیں جو عرفات میں جا کر دعائیں

کرتے ہیں.. کیوں کرتے ہیں؟"

"بس کرتے ہیں۔"

"پھر؟"

"پھر مسجد نمرہ میں ظہر اور عصر کی نمازیں ملا کر پڑھی جائیں گی.. خطبہ حج پڑھا جائے گا اور آپ حاجی ہو جاؤ گے.."

"بس اتنی سی بات تھی جسے فسانہ کر دیا.."

"ہاں.."

"بھئی وہاں عرفات میں کچھ حساب کتاب تو ہوگا.. سو فیصد نتیجہ تو نہیں ہوگا.. آپ کی عبادتوں اور نیتوں کے پرچے چیک ہوں گے کہ یہ پاس ہو گیا اور یہ فیل ہے.. یہ حاجی ہو گیا اور یہ جوں کا توں وطن لوٹے گا.. کوئی تخصیص تو ہوگی.."

"نہیں سبھی حاجی ہو جاتے ہیں۔"

"یعنی کوئی فیل نہیں ہوتا؟"

"نہیں.."

"چلئے حاجی ہو گئے.. تو پھر چھٹی؟"

"حاجی تو ہو گئے لیکن ابھی چھٹی نہیں مل سکتی.. عرفات سے واپس منیٰ میں نہیں آتے.. راستے میں مزدلفہ میں رات گزارتے ہیں.."

"کیوں؟"

"حج پر جاتے ہوئے یہ نہیں پوچھتے کہ کیوں.. بس گزارتے ہیں۔"

"وہاں بھی قیام کے لیے خیمے ہوں گے؟"

"نہیں.. وہاں کسی بھی چھت تلے رات گزارنا منع ہے.. وہاں کھلے آسمان تلے شب بسر کرنی ہوگی.."

"لیکن کہاں؟"

"کہیں بھی.. سڑک کے کنارے.. فٹ پاتھ پر.. کسی پہاڑی کی اوٹ میں.. جہاں بھی جگہ ملے وہاں.. رات کی تاریکی میں کنکریاں چنیں گے اور پھر سویرے سویرے وہاں سے کوچ کر کے منیٰ پہنچیں گے.. شیطانوں کو کنکریاں ماریں گے.. قربانی دیں گے.. سر منڈھائیں گے.. عید کریں گے.. احرام اتار کر اپنے لباس زیب تن کریں گے"

"ٹھہرو منیٰ.. میرا مطلب ہے مونا.. معاملات بہت ہی پیچیدہ ہوتے جاتے ہیں.. یہ جو مقام ہے مزدلفہ.."

''مزدلفہ۔''

''تو وہاں کھلے آسمان تلے کسی فٹ پاتھ یا سڑک پر رات گزارنے کی کیا تک ہے.. میرا مطلب ہے اس میں کیا مصلحت ہے..اور کیا پورے بیس پچیس لاکھ کفن پوش خواتین وحضرات سب کے سب یونہی دربدر ہوتے ہیں کھلے آسمان تلے سوتے ہیں. تو یہ سب لوگ پانی کہاں کرتے ہیں؟''

''پتہ نہیں.. میں نے اس معاملے میں وہاں کوئی تحقیق نہیں کی.. کہیں نہ کہیں وہاں غسل خانے تو ہوتے ہوں گے، پر مجھے پتہ نہیں..وہاں بھی صبر کرنا پڑتا ہے..لیکن کیا رات ہوتی ہے''

''فٹ پاتھوں پر..سڑکوں پر اور میدانوں میں کھلے آسمان تلے کیسی رات ہو سکتی ہے میمونہ بیگم.''

''سلجوق کے ابا.. میں تمہیں ایک بات بتاتی ہوں بلکہ اقرار کرتی ہوں کہ پورے حج کے دوران اگر کسی شب میں معجزے رونما ہوتے ہیں تو مزدلفہ کی رات میں ہوتے ہیں؛ اس کھلے آسمان تلے میں نہ صرف تم سے اپنے خاندان سے بلکہ اس دنیا سے بھی آزاد ہوئی۔ اس دنیا کی پہلی عورت ہوئی اماں حوا ہوئی مزدلفہ کی رات میں..کیوں ہوئی؟..یہ میں نہیں جانتی لیکن ہوئی..''

''اچھا تو مزدلفہ سے اگلی سویر منیٰ واپس آ گئے.. جہاں شیطان کو کنکریاں مارتی ہیں..ویسے میمونہ بیگم آپس کی بات ہے کسی کو بتانا نہیں کہ حج کی تمام رسوم میں سے یہ جو سلسلہ ہے ناں شیطان کو کنکریاں مارنے والا اس میں تو مجھے کوئی دانش نظر نہیں آتی.. ایک اچھا بھلا ذی شعور انسان ایک عام سے پتھر کو شیطان سمجھ کر اسے کنکریاں مار رہا ہے.''

''وہ عام سا پتھر...شیطان ہوتا ہے۔''

''کیسے ہوتا ہے بھئی..''

''دیکھو جب تم وہاں جاؤ گے تو سمجھ میں آئے گا. میرے بتانے سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا..واقعی وہ پتھر نہیں ہوتا شیطان ہوتا ہے..''

''چلو دیکھا جائے گا..لیکن اس حج کے شیڈول میں مکہ مدینہ تو کہیں آتا ہی نہیں..''

''وہ نہیں آتا..''

''کیوں نہیں آتا..یہ کیسا حج ہے۔ میرا تو یہی خیال تھا کہ ان دونوں شہروں میں گھومنا پھرنا ہی حج ہے تو ان کا حج سے کوئی تعلق نہیں؟''

''براہ راست تو نہیں.. کہ حج بنیادی طور پر عرفات میں مکمل ہو جاتا ہے..البتہ طواف وداع کے لیے اللہ تعالیٰ سے آخری ملاقات کرنے کے لیے آپ خانہ کعبہ میں حاضری دیتے ہو..اور مدینہ منورہ..وہاں تمہاری مرضی ہے کہ جاؤ یا نہ جاؤ..''

''لو کیوں نہ جاؤ..وہیں تو جانا ہے۔''

''تو پھر جانا ہے تو پوچھتے کیوں ہو..''

''ایک آخری سوال.. یہ جو سینکڑوں کی تعداد میں مسنون دعائیں وغیرہ مانگی ہوتی ہیں، ان کا کیا ہوگا.. خانہ کعبہ کی پہلی جھلک دیکھتے ہی کیا کیا کچھ پڑھنا ہے.. روضۂ رسولؐ کا سبز گنبد نظر آنے پر جو درود وسلام پیش کرنے ہیں تو وہ کیسے یاد کروں گا.''

''تمہاری نیت ہے ناں حج کی؟'' وہ تنگ آ گئی۔

''وہ تو ہے..''

''تو پھر سب کچھ ہو جائے گا.''

اس طویل مکالمے کے باوجود صورت حال زیادہ واضح نہ ہوئی..

میمونہ کو حج کے دوران ایک گھبرائی ہوئی محترمہ ملیں تو کہنے لگیں ''بہن مجھے تو کچھ پتہ نہیں چل رہا کہ کرنا کیا ہے اور جانا کدھر ہے.. بس جدھر سب لوگ چلتے ہیں میں بھی چلی جاتی ہوں.. اور جو کچھ دوسرے لوگ کرتے ہیں میں بھی کرتی چلی جاتی ہوں.. پتہ نہیں اس طرح حج قبول بھی ہوتا ہے یا نہیں.. جب سے یہاں آئی ہوں افضل اور احسن نامی بھائیوں سے ہی ملاقات رہتی ہے.. جس کسی سے پوچھو وہ کہتا ہے کہ یہ عمل افضل ہے اور یہ عمل احسن ہے.''

ایک بے حد تجربہ کار اور متعدد بار حاجی ہو چکے لاہور کے بزرگ سے جب میں نے یہی سوال کیا کہ محترم آپ ہی کچھ رہنمائی کیجیے.. یہ عقدہ کھولیے کہ آخر حج ہے کیا..

تو انہوں نے فرمایا ''سب سے اول تو یہ کہ نیت کر لو.. اس میں کھوٹ اور جھجک نہ ہو.. پھر منگتے ہو جاؤ.. گداگر ہو جاؤ.. جیسے لبرٹی مارکیٹ میں تمہاری کار کے بند شیشے کھٹکھٹانے والے.. رونی شکلیں بنائے.. شیشے پر ٹک ٹک کرتے اس پر ناک چپکائے تمہیں بیزار کر دینے والے منگتے نہیں ہوتے.. لاکھ کہو کہ بابا معاف کرو.. دفع ہو جاؤ لیکن وہ جان نہیں چھوڑتے مانگتے ہی چلے جاتے ہیں.. تمہیں زچ کر دیتے ہیں.. بدتمیزی بھی کرتے ہیں کچھ لحاظ کچھ ادب نہیں کرتے اور مانگتے چلے جاتے ہیں تو بس یہی حج ہے.. نیت کرو اور ایسے منگتے ہو جاؤ..''

نیت تو ہم نے کر لی تھی بلکہ کچھ زیادہ ہی کر لی تھی اور اس میں کہیں بھی شک کی ایک کونپل بھی نہ تھی..

کھوٹ کہاں سے آتا کہ یہ سکہ تو ابھی ابھی ٹکسال سے کھنکتا ہوا نوا نکور نکلا تھا.. بلکہ ایک دوست کو جب علم ہوا تو انہوں نے کہا کہ اللہ تمہارا حج قبول کرے تو ہم نے عاجزی سے نہیں سینہ پھلا کر کہا کہ بھائی میں رزق حلال صرف کر کے حج پر جا رہا ہوں.. ہزاروں کورے کاغذ سیاہ کرنے والے ایک ادیب کے رزق سے زیادہ حلال رزق اور کس کا ہوگا اور نیت بھی پوری ہے.. اس میں ایک فیصد بھی کھوٹ ہو تو نارِ جہنم میں جلایا جاؤں تو اللہ کیوں نہیں قبول کرے گا.. ویسے بھی اگر اس نے ذاتی طور پر بلاوا بھیجا ہے تو کچھ سوچ سمجھ کر ہی مجھے بھیجا ہے.. یہ تو نہیں کہ خود ہی بلائے اور پھر خود ہی قبول نہ کرے..

اس رزق حلال کے حوالے سے مجھے اباجی کے ایک قریبی دوست یاد آتے ہیں جو اپنے زمانے میں لاہور کے بہت معروف ڈاکٹر تھے اور بے حد متمول تھے۔۔ان دنوں کاروں میں سفر کرتے تھے۔۔بنگلے میں رہتے تھے۔۔آخری عمر میں حج کے لیے جانے لگے تو احباب نے دریافت کیا کہ ڈاکٹر صاحب اس سے پیشتر کیوں خیال نہ آیا۔۔کہنے لگے "بھئی اخراجات کا معاملہ تھا۔۔اب جا کر بندوبست ہوا ہے تو جا رہا ہوں۔" اس پر استفسار کرنے والے متعجب ہوئے کہ جس شخص کا شمار شہر کے امیر ترین لوگوں میں ہوتا ہے، وہ کہہ رہا ہے کہ اخراجات کا معاملہ تھا۔ تو یقیناً جھوٹ کہہ رہا ہے۔۔حج سے واپسی پر ایک قریبی دوست کے اصرار کرنے پر انہوں نے مجبوراً بتایا۔"اگرچہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بہت نوازا ہے۔۔ساری عمر میں نے بھی رزق حلال کمانے کی سعی کی ہے لیکن ڈاکٹروں کا رزق جانے جتنا بھی حلال ہو اس میں مجبوری شامل ہوتی ہے۔ کوئی بھی شخص اپنی خوشی یا خواہش سے ڈاکٹر کے پاس نہیں جاتا ہمیشہ مجبور ہو کر جاتا ہے۔ بے شک وہ ڈاکٹر کو اس کی پیشہ ورانہ خدمات کے صلے میں فیس ادا کرتا ہے لیکن مجبوری کی حالت میں کرتا ہے۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ میں مجبوری کے پیسوں سے حج نہیں کروں گا۔۔میں نے چار بھینسیں خریدیں، اپنی کوٹھی کے پچھواڑے میں باندھیں اور آس پاس رہنے والوں کو اطلاع کر دی کہ اگر وہ خالص دودھ خریدنا چاہتے ہیں تو ہم بیچتے ہیں۔ بھینسوں کی دیکھ بھال اپنے بیٹوں کی مدد سے میں خود کرتا تھا۔۔انہیں نہلاتا تھا۔۔چارہ کاٹ کر آگے رکھتا تھا اور دودھ بھی خود دوہتا تھا۔۔چنانچہ میں نے اس آمدنی سے حج کیا۔"

باقی سب کچھ تو ٹھیک تھا لیکن یہ بھک منگے ہو جانے کی شرط مجھے پریشان کرتی تھی۔۔اس میں شاید میرے اجڈ جاٹ ہونے کا جاہلانہ تکبر تھا۔ گداگر ہو جانا مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔۔

میں نے ایک بار ٹیلی ویژن کے ایک ڈرامے میں ایک فقیر کا کردار ادا کیا تھا۔۔اور میرے کشکول میں ایک راہگیر نے مجھے سچ مچ کا منگتا سمجھ کر ایک سکہ ڈالا تھا اُس کی کھنک نے بھی میری عزت نفس کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔۔اگرچہ یہ ایک ڈرامہ تھا۔۔

یوں بھی اس نے مجھے میری اوقات سے کہیں بڑھ کر نوازا تھا۔۔بے وجہ ممتاز کیا تھا۔۔میری جھولی بھر دی تھی اور اس نے مجھ سے کہیں بہتر۔۔کہیں افضل اور لائق لوگوں سے بڑھ کر مجھے نوازا تھا اور اب مزید مانگنے کیلئے کیا رہ جاتا تھا۔۔اور یہ کیا بات ہے کہ وہ خود بلائے۔۔اور میری عزت نفس کو امتحان میں ڈالے۔۔

تو یہ بھک منگا ہو جانے کی شرط مجھے پسند نہیں آئی تھی۔۔

ایک دوست تو نہیں آشنا کہہ لیجیے جنہیں فلسفے سے تھوڑی بہت رغبت ہے۔ انہیں معلوم ہوا کہ میں حج پر جا رہا ہوں تو پہلے تو انہیں یقین نہ آیا اور جب میں نے انہیں یقین دلا دیا تو نہایت طنز آمیز مسکراہٹ لبوں پر سجا کر بولے "تارڑ صاحب آپ کسے فریب دیتے ہیں۔۔یہ دھوکا ہم نہیں کھائیں گے کہ آپ جیسے روشن خیال اور

وسیع النظر لکھنے والے ایمان لے آئے ہیں اور صدق دل سے حج کے لیے جاتے ہیں.. آپ اگر جاتے ہیں تو صرف اس لیے کہ واپسی پر ایک اور سفرنامہ لکھ سکیں اور لوگوں کے مذہبی جذبات کو بلیک میل کر سکیں.. جیسا کہ حج پر جانے والے دیگر ادیب کرتے ہیں..''

کسی حد تک وہ درست بھی کہتے تھے.. کہ میں ایک پیشہ ور سفرنامہ نگار تھا.. ایک پتھر کو دیکھتا تھا تو پوری کتاب لکھ ڈالتا تھا اور لوگوں کو اپنی تحریر سے سحر زدہ کر کے بلیک میل کرتا تھا..

لیکن اس بار میرا کچھ ارادہ نہ تھا، اس سفر کی روئداد لکھنے کا..

حج کی نیت میں اور شوق میں کہیں بھی.. کبھی بھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ میں واپسی پر اس سفر کی روئداد بھی قلم بند کروں گا..

اس کی کچھ وجوہات تھیں..

بہت عرصہ پہلے جب میں اسلام آباد میں صبح کی نشریات کی میزبانی کیا کرتا تھا ایک اجنبی شخص نے مجھے دوپہر کے کھانے کے لیے مدعو کیا.. عثمانیہ ریستوران کی بالائی منزل پر بیٹھے ہوئے کھانے کے دوران اس نے کہا ''تارڑ صاحب میں ایک فارمیسوٹیکل فرم کے لیے کام کرتا ہوں.. مڈل کلاس شخص ہوں اور میری زندگی شائد مختصر ہو چکی ہے کہ ڈاکٹر یہی کہتے ہیں تو میں نے ایک روز حساب کتاب کیا۔ میں نے جو زندگی گزاری ہے.. اس زندگی میں سب سے زیادہ خوشی مجھے کس نے دی ہے.. تو جواب میں نہ میرے نزدیکی عزیز آئے اور نہ بال بچے.. جواب میں آپ کا نام آیا.. آپ کی تحریروں نے مجھے جو خوشی دی ہے اس کا نام آیا.. تو میں نے بہت سوچا کہ اس خوشی کے لیے جو آپ نے مجھے عطا کی ہے اس کا شکریہ کیسے ادا کروں.. شائد ایسے..'' یہ کہہ کر اس نے جیب میں سے ایک چیک نکال کر میری طرف بڑھایا جس پر اڑتیس ہزار روپے کی رقم درج تھی۔ ''میری خواہش ہے کہ آپ اس رقم سے حج کریں۔''

میں ایک مکمل سناٹے میں چلا گیا.. بہت دیر چپ بیٹھا رہا اور اس چیک کو تکتا رہا جو میری تخلیقی زندگی کا سب سے بڑا انعام تھا.. کسی بھی ادیب کو بھلا اس سے بڑا کامپلی منٹ اور کیا مل سکتا ہے۔ اس کے سامنے تو نوبل پرائز بھی ماند پڑتا تھا..

لاہور واپسی پر میں نے میمونہ سے اس ملاقات اور چیک کا ذکر کیا تو وہ کہنے لگی ''نہیں.. حج صرف اپنی حق حلال کی کمائی سے کرنا جائز ہے.. کسی غیر کے پیسے سے نہیں.. حکومت کے خرچے سے بھی نہیں.. جب تمہاری نیت ہوگی، بال بچوں کے فرائض سے فارغ ہو جاؤ گے تو اپنی کمائی سے چلے جانا۔''

میمونہ نے فتویٰ دے دیا تھا تو میں نے اگلی ملاقات پر وہ چیک واپس کر دیا اور معذرت کے ساتھ واپس کیا اور پھر یونہی دریافت کیا کہ کہیں آپ کی ایک درپردہ تمنا یہ تو نہیں تھی کہ میں حج پر جاؤں اور واپسی پر عادت سے مجبور ہو کر ایک اور سفرنامہ تحریر کروں.. تو ان صاحب نے نہایت متانت سے کہا ''ہاں.. یہ شرط تو ہرگز

نہ تھی لیکن خواہش ضرور تھی لیکن میں اس کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔" گفتگو کا رخ بدل گیا اور میں اس کا پہلی منٹ کے سحر سے باہر آ کر نارمل انداز میں باتیں کرنے لگا۔ "ابھی نہ ارادہ ہے اور نہ خواہش۔ لیکن اگر کبھی میں حج پر گیا تو واپسی پر ہرگز اس سفر کو بیان نہیں کروں گا۔"

وہ صاحب شدید حیرت میں مبتلا ہو گئے "لیکن کیوں۔۔آپ جہاں کہیں بھی جاتے ہیں واپسی پر اس سفر کا احوال لکھتے ہیں تو حج کے سفر سے اجتناب کیوں؟"

"اس لیے کہ۔۔فرض کر لیجیے کہ وہاں پہنچ کر میری کیفیت وہ نہ ہو۔۔جو حج پر جانے والا ہر سفر نامہ نگار بیان کرتا ہے کہ مجھ پر تو یہ قلبی اور روحانی واردات گزری۔۔اور مجھے کچھ بھی نہ ہو۔۔میں جوں کا توں رہوں۔۔جیسا ہوں ویسا ہی رہوں۔۔نہ گناہوں کی پشیمانی میں آنکھوں سے آنسوؤں کے آبشار اتریں۔۔۔نہ کسی روحانی کیف کی سرمستی کی بارش میں بھیگوں۔۔تو پھر کیا کروں۔۔اگر واپسی پر میں یہی کچھ تحریر کر دوں تو علمائے کرام اور مشائخ اور شہر کے لوگ مجھے سولی پر چڑھا دیں۔ انہیں عقیدت اور دینی جذبے کی جس افیون کی عادت ہے، وہ پیش نہ کروں تو وہ مجھے مار ڈالیں۔۔اور اگر ان کے غضب سے ڈر کر یہ بیان کر دوں کہ ہاں مجھ پر بھی وہی گزری ہے جو سب پر گزرتی ہے تو یہ ایک گناہ کا ارتکاب ہو گا۔۔ایک سفید جھوٹ ہو گا۔۔میں جیسا کیسا بھی مسلمان ہوں، کم از کم حج کے سفر نامے میں تو بے جا لفاظی اور اپنے آپ کو اس سحر میں مبتلا کر کے جو کبھی طاری نہیں ہوا۔۔اسے وارد کر کے یہ سفر نامہ تو نہیں لکھ سکتا۔۔جھوٹ نہیں بول سکتا۔ مکہ اور مدینہ کے بارے میں محض خواب و خیال اور خود ساختہ عقیدت میں ڈوب کر تو نہیں لکھ سکتا۔۔"

"آپ اگر گئے تو وہی لکھیے گا جو آپ محسوس کریں گے۔۔"

"اگر میں نے کچھ بھی محسوس نہ کیا تو؟"

اس کا جواب میرے محسن کے پاس بھی نہ تھا۔

لیکن میں نے کچھ نہ کچھ تو محسوس کرنا تھا۔۔وہی جو سب لوگ کرتے ہیں کہ یہ۔۔۔۔میری مجبوری تھی۔۔میں نے زندگی میں بہت کچھ تو نہیں جو کچھ بھی سیکھا ہے نتیجہ یہی برآمد ہوتا ہے کہ نہ دلائل کام آتے ہیں اور نہ آپ کی اپنی ذاتی سچائی۔۔۔عقیدہ ایک ماں کی طرح ہوتا ہے۔۔اور آپ اسے تبدیل نہیں کر سکتے۔۔وہ جیسی بھی ماں ہو۔۔

ڈراؤنی۔۔ بھیانک شکل والی گلے میں کھوپڑیوں کی مالا ڈالے کالی ماتا کے مندر میں آنے والے پجاریوں اور عقیدت مندوں سے بھی آپ بحث نہیں کر سکتے۔۔انہیں قائل نہیں کر سکتے۔۔

آپ دلائل سے کسی بھی مذہب کے پیروکار کو اس کے عقیدے سے اس لیے نہیں ہٹا سکتے کہ وہ آپ کے مذہب کے دلائل ہوتے ہیں۔

آپ جس عقیدے میں پیدا ہوتے ہیں اس کی قید میں ہوتے ہیں۔۔۔اس کے سوا جو کچھ بھی ہوتا ہے، آپ کے نزدیک کفر ہوتا ہے۔

چنانچہ میں بھی اپنے عقیدے کی قید میں تھا..

کمہار نے ابھی ابھی آپ کو چاک سے اُتارا ہے اور ہر شے کچی ہے.. ابھی ابھی ناڑو کٹا ہے اور کانوں کے کچے پردے اذان کی آواز سے تھرانے لگتے ہیں.. اور زندگی کا آغاز ہو جاتا ہے، اور اس کے بعد پوری حیات میں منہ وَل کعبے شریف میرے مولا بلالو مدینے مجھے.. نخنتے بیٹھو.. دوانیوں پر بیٹھو اور ابراہیم نائی کہتا ہے کہ اوپر دیکھو چیل گدھا اُٹھائے لیے جاتی ہے اور آپ فوراً اوپر دیکھتے ہیں اور نیچے کام تمام ہو جاتا ہے.. قرآن پاک پر سر ہلاتے ہوئے.. نمازیں.. روزے.. عیدیں.. جنازے.. اشہد لا الہ اللہ.. لحد میں اتارتے ہوئے.. لاؤڈ سپیکروں پر ملاؤں کا شور.. مرتے ہوئے سورہ یٰسین.. غرض کہ زندگی کا ہر پل عقیدے کی قید میں آئے ہوئے انسان کے کمپیوٹر میں یہ ڈیٹا دن رات فیڈ کرتا چلا جاتا ہے.. اور بالآخر جب انسان ان مقامات کو نظر کے سامنے پاتا ہے جہاں سے اس ڈیٹا نے جنم لیا تھا تو وہ کمپیوٹر کھٹ سے آن ہو جاتا ہے کہ تمہیں اب یہ محسوس کرنا ہے.. یہاں آہ و زاری کرو.. خانہ کعبہ سامنے آیا ہے تو اپنے گناہوں کو یاد کر کے معافیاں مانگو.. روضہ رسولؐ کا گنبد نظر آیا ہے تو عقیدت میں یوں شرابور ہونا ہے..

یہ کمپیوٹر انسان کو حکم دیتا ہے کہ تمہارے محسوسات یہ ہیں.. تم تابع ہو.. اس حکم کی تعمیل کرو.. کیونکہ اس میں کچے پردے پر تھرتھراتی اذان کے بعد اب تک جو ڈیٹا فیڈ کیا گیا ہے اس کا میکانکی ردعمل یہی ہوگا..

اسی کمپیوٹر میں اگر پیدائش کے فوراً بعد بدھ، ہندو، سکھ، عیسائی یا یہودی ڈیٹا فیڈ کر دیا جاتا تو برگد، بنارس، ننکانہ صاحب، بیت اللحم اور بیت المقدس کو پہلی بار نظر کے سامنے پا کر انسان اپنی اپنی قید کے مطابق اپنے کمپیوٹر کے حکم کا تابع ہو جاتا..

کوئی ایک کمپیوٹر کسی دوسرے عقیدے کے مقدس مقام سامنے پا کر آن ہی نہیں ہوتا.. ٹھنڈا پڑا رہتا ہے.. اس انسان کے لیے وہ کوئی بھی عمارت ہو سکتی ہے اسے دیکھا تو جا سکتا ہے لیکن اس کے لیے کچھ محسوس نہیں کیا جا سکتا کہ اسے حکم نہیں ملتا.. تو یہ آپ کا اپنا سراسر غیر جانبدار ردعمل تو ہرگز نہ ہوا.. آپ کو مجبور کر دیا جاتا ہے.. آپ کا کچھ اختیار نہیں..

تو میں اپنے مخصوص عقیدے کی قید میں ہوں، میرے کمپیوٹر میں پچھلے تریسٹھ برس سے جو کچھ فیڈ کر دیا گیا ہے، اس سے فرار نہیں ہو سکتا.. پھر میں کہاں گیا.. ردعمل کا فیصلہ تو کمپیوٹر کے ہاتھ میں چلا گیا.. لیکن میں ہتھیار نہیں ڈالنا چاہتا تھا.. میری شدید تمنا تھی کہ میں اس قید سے نکلوں.. میرا کمپیوٹر سراسر خالی ہو جائے.. سنکھناں ہو جائے.. مجھے اس کی اطاعت نہ کرنی پڑے تب میں نیوٹرل گیئر میں وہاں جاؤں اور پھر وہاں کوئی گیئر لگ جائے خود بخود.. بے شک بیک گیئر لگ جائے اور میں کسی کھائی میں جا گروں یا پہلا گیئر لگ جائے تو میں دھچکے کھاتا آگے چلا جاؤں.. آگے کہاں؟.. کہیں بھی..

تو ایک مجبوری کا سفرنامہ کیا لکھنا..

ایک وجہ اور بھی تھی..

ان مقامات کے لیے عقیدت کے عبادت کی سرشاری اور سرمستی کے.. پچھتاوے اور شرمندگی کے اور محبت کے اظہار کے لیے جو لفظ استعمال کیے جاتے تھے..ان میں یکسانیت بہت تھی تقریباً ہر لکھنے والا انہی مخصوص الفاظ کا سہارا لیتا تھا اور جہاں یکسانیت نہ تھی وہاں فکشن تھی. تخیل کی بلند پروازی تھی..ایک ناول کی مانند کردار گھڑے جاتے تھے اور انہیں اپنے برابر میں بٹھا کر جنگ اُحد کی باتیں کی جاتی تھیں..اللہ میاں سے باقاعدہ ڈائیلاگ کیے جاتے تھے اور فلرٹ کیا جاتا تھا..یہ بھی مجھے منظور نہ تھا. تو عقیدت عبادت، سرشاری اور سرمستی، پچھتاوے اور شرمندگی کے اظہار کے لیے نئے لفظ کہاں سے آئیں گے..اگر یہ سب کچھ محسوس ہوا تو.. اس لیے آغاز میں کچھ خیال نہ تھا. اس لیے میں نے سفرنامے لکھنے کی کوئی منصوبہ بندی نہ کی..کوئی نوٹس تیار نہ کیے..حج کے دوران کسی ایک عمارت، ایک چہرے کا مشاہدہ اس نظر سے نہ کیا کہ بعد میں اسے بیان کرنا ہے..تو نہ لکھنے کی وجوہات کی ایک طویل فہرست پیش کرنے کے بعد اتنے جواز تلاش کرنے کے باوجود میں یہ سفرنامہ کیوں لکھ رہا ہوں. عذر گناہ بےشک گناہ سے بدتر ہے لیکن میں اس کا عذر بھی پیش کروں گا..

آپ بےشک اسے "چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے" کی مد میں ڈال کر میرا عذر قبول نہ کریں لیکن منہ وَل کعبے شریف میں سچ کہتا ہوں..

میں پاکستان سے حج کے بارے میں مختلف قسم کے کتابچے اور پمفلٹ تو ہمراہ لایا تھا لیکن میری توجہ کا مرکز محمد رفیق ڈوگر کی "الامین" کی پہلی جلد تھی..تین جلدوں پر مبنی یہ سیرت رسول میری پسندیدہ کتابوں میں سے ہے. رفیق کو تو اس عمر بھر کی کمائی کے عوض جو اجر ملنا ہے، وہ تو انشاءاللہ ملنا ہی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اس اکھڑ مزاج شخص سے مجھے جو قربت حاصل رہی ہے تو اس کے باعث مجھ پر بھی کرم ہو جائے گا..اس کا مجھے یقین ہے..

جدہ آمد کے دوسرے روز سلجوق نے انٹرنیٹ سے ڈاؤن لوڈ کی ہوئی ڈاکٹر علی شریعتی کی کتاب "حج" کے ایک سو دو صفحات میرے سامنے رکھ دیئے کہ ابا اسے بھی دیکھ لیجیے. میں ایک مدت سے علی شریعتی کی فلسفیانہ تحریروں کا مداح تھا، علامہ اقبال کے کلام سے روشنی پانے والا یہ شخص انقلاب ایران کے پیش رووں میں سے تھا جسے نوجوانی میں ہی شاہ کی خفیہ پولیس ساواک نے ہلاک کر دیا تھا..

علی شریعتی کی یہ کتاب جس کے وجود سے میں ناواقف تھا..ایک اور انقلاب تھا..حج کی جو فلسفیانہ توجیہہ اور اہمیت وہ پیش کرتے ہیں، یکتا اور حیرت انگیز ہے..اس کتاب کے مطالعے نے میرے حج کو ایک ایسا رُخ عطا کیا جو میرے گمان میں بھی نہ تھا..میں تو سیدھی بات ہے گھر سے ہدایات پر اندھا دھند عمل کرنے کے لیے..سوال کیے بغیر سر جھکائے یہ رسوم ادا کرنے کے لیے آیا تھا لیکن "حج" نے میرا نکتہ نظر یکسر بدل دیا کہ ان سب کا تو جواز بھی ہے..اگر میں یہ کتاب پہلے پڑھ لیتا تو اس کا آخری صفحہ الٹنے کے بعد حج کے لیے رختِ سفر

باندھ لیتا.. میں آئندہ دنوں میں اس کتاب کا تذکرہ کرتا رہوں گا.. ویسے تو یہ کتاب اس لائق ہے کہ پوری کی پوری مثال کے طور پر نقل کر دی جائے لیکن شریعتی کے ایک تصور نے مجھ پر گہرا اثر کیا.. وہ کہتے ہیں.. "حج کیا ہے؟ حج دراصل ایک سیاہ فام غلام عورت.. جس کا نام ہاجرہ تھا اسے خراج تحسین پیش کرنے کا نام ہے".. ایک اور مقام پر ان کا بیان ہے کہ.. تمام انسانیت میں سے ایک عورت.. اور تمام عورتوں میں سے ایک سیاہ فام غلام عورت. جس کا نام حاجرہ تھا رہتی دنیا تک لوگ اللہ کے گھر کے ساتھ اس کی قبر کا بھی طواف کرتے رہیں گے کہ ان کا مدفن وہاں ہے..

اگر حضرت ہاجرہ کو حضرت ابراہیمؑ، حضرت سارہ کے نسوانی حسد کے باعث ایک نامہرباں برباد بیاباں میں نہ چھوڑ جاتے تو.. نہ زمزم ہوتا اور نہ کعبہ تعمیر ہوتا.. نہ سعی ہوتی" نہ قربانی اور نہ شیطان.. اور نہ حضرت اسماعیلؑ کی آل میں حضورؐ کا ورود ہوتا اور نہ حج ہوتا. تو حج ہاجرہ ہے..

اور اب وہ عذرِ گناہ.. اگر حج کے سفرنامے کو ایک گناہ کہا جا سکتا ہے تو.. شریعتی اپنی کتاب کے آخر میں لکھتے ہیں "حج محض عرفات میں مکمل نہیں ہوتا.. ادھورا رہتا ہے.. حج تو دراصل تب شروع ہوتا ہے جب آپ اپنے وطن واپس جاتے ہیں اور.. اپنے لوگوں کو حج کے تجربے میں شریک کرتے ہیں.. نہ شریک کریں تو حج ادھورا رہتا ہے.."

تو یہ عذر مجھے شریعتی سے مہیا کیا!

میں نہیں چاہتا کہ میرا حج ادھورا رہے۔ اس سلسلے میں آپ کو اپنے تجربات میں شریک کرنا چاہتا ہوں.. چور چوری سے جاتا ہے.. سفرنامے کی ہیرا پھیری سے نہیں جاتا..

"اب ہم ایسے گُم ہوئے پریم نگر کے شہر.. مکّے پے گیا شور"

حج میں ابھی کچھ روز باقی تھے..

میں رہین جدہ تو تھا لیکن اُس کے خیال سے غافل نہیں تھا..

اُس کے خیال سے جو جدہ سے صرف ایک گھنٹے کی مسافت پر گھر بنائے بیٹھا تھا..

طے ہوا کہ حج سے پیشتر اس سے ایک افتتاحی ملاقات کر لی جائے.. اسے ملنے کی ریہرسل کر لی جائے تا کہ یکدم اسے سامنے پا کر حواس باختہ نہ ہو جائیں.. اس سے ملتے، اس کے سامنے حاضر ہونے کے کچھ آداب سیکھ لیے جائیں.. تھوڑی سی نیٹ پریکٹس ہو جائے..

تو ہم اسی چپ چپ کھڑے ہو ضرور کوئی بات ہے.. پہلی ملاقات ہے یہ پہلی ملاقات ہے.. کو جاتے ہیں..

جدہ تو شیطان کی آنت کی طرح طویل ہوتا چلا جاتا تھا..

شیطان نے تو بہت بعد میں جلوہ دکھانا تھا فی الحال اس نے اس آنت کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ وہ طویل ہوتی چلی جائے.. ختم نہ ہو.. ختم ہو گئی تو ملاقات ہو جائے گی.. اس آنت کے ارد گرد روشنیوں کے انبار تھے..

ہماری کار کے اندر جدہ کے مضافات کی چکا چوند تھی..

اتنی روشنی تھی کہ رات کے اس پہر دن کا گماں ہوتا تھا..

میں ایک ایسے شخص کی مانند تھا جو سو جانا چاہتا تھا لیکن اس کے بیڈ روم کے اندر کسی سٹیڈیم کو بقعۂ نور بنا دینے والی روشنیاں نصب کر دی گئی تھیں اور وہ سو نہ سکتا تھا۔

شب نصف ہو چکی تھی.. اندھیرے اور اجالے کی درمیانی سرحد پر کچھ لمحوں کے لیے قیام کرتی تھی اور سلجوق کی کار ایک صبا رفتار نوخیز چیتے کی مانند قلانچیں بھرتی شاہراہ پر اڑان کرتی چلی جا رہی تھی..

پھر شاہراہ کے عین اوپر منزلوں کے ناموں والا ایک سائن بورڈ قریب آتا گیا.. اس پر جلی حروف میں اگرچہ اور بہت سی منزلوں کے شہروں کے نام بھی درج تھے لیکن مجھے ان کے درمیان صرف "مکّہ مکرمہ" لکھا

دکھائی دیا جس کے اوپر شناخت کے لیے خانہ کعبہ کی ایک سیاہ شبیہ تھی..

یہ روڈ ٹو مکہ تھی..

بھری پُری.. رات کے اس پہر بھی. شاہراہ کے سینے پر ٹریفک شائیں شائیں کرتی ہمارے دائیں بائیں سے گزرتی جاتی تھی..

جب میں نے منزلوں کی نشاندہی کرنے والے نیلے سائن بورڈ پر زندگی میں پہلی بار ''مکہ مکرمہ'' لکھا دیکھا تو اسے پڑھ کر میں ایک چپ سناٹے میں چلا گیا.. نہ بدن میں کسی سنسنی نے جنم لیا نہ تاریخ کے اوراق نے مجھے کسی ہیجان میں مبتلا کیا اور نہ ہی میں اپنی خوش بختی پر نازاں ہوا کہ میں آج کیسے دیار میں جا رہا ہوں.. کس سے ملاقات کرنے.. آشنا ہونے جا رہا ہوں..

شائد اس لیے کہ میں نے اپنے آپ کو نیوٹرل گیئر میں ڈال دیا تھا.. اپنے آپ کو برانگیختہ نہیں کیا تھا.. جوش نہیں دلایا تھا.. نہ اکسایا تھا اور نہ اشتعال دلایا تھا کہ سبحان اللہ میرے یہ نصیب کہ میں آج شہروں کی ماں کی جانب رواں ہوں جس کی جانب پوری حیات میں ہمیشہ میرا مُنہ رہا.. جہاں میرے نبی تولد ہوئے.. جہاں اللہ کا گھر ہے.. ادھر جا تا ہوں.. سبحان اللہ.. نہیں میں نے قطعی طور پر اپنے آپ کو ہپنو ٹائز نہیں کیا.. کمپیوٹر کے ڈیٹا کی سی ان سی کر دی اور نیوٹرل گیئر میں رہا..

ایک آوارہ گرد کے لیے.. چاہے وہ ایشیا میں ہو یا یورپ میں سب سے ہیجان خیز وہ لمحہ ہوتا ہے جب وہ پیدل چلتے.. کسی بس یا کار میں سفر کرتے، یکدم شاہراہ کے کنارے آویزاں کسی سنگِ میل کو دیکھتا ہے اور اس پر ایک ایسے شہر کا نام ابھرا ہوا دیکھتا ہے جسے اس نے تاریخ کی کتابوں میں یا تخیل میں ہی دیکھا ہوتا ہے.. روم.. اتنے کلومیٹر.. پیرس.. برلن.. سٹاک ہوم.. بیروت.. دمشق.. اشبیلیہ.. استنبول.. گلگت.. کاشغر.. تی آن.. اور وہ ایک عجیب جنسی تلذذ کی قربت میں سانس لیتی ہوئی ہیجان خیزی میں ان میں سے کسی ایک نام کو سنگِ میل پر درج دیکھ کر اپنی خوش بختی پر نازاں ہوتا ہے.. اور یہ شہر.... جس کی جانب میں سفر کرتا تھا، کُل خدائی ہر روز پانچ بار اس کی جانب چہرہ کرتی اور جھکتی تھی.. ان میں سے کسی ایک شہر کی جانب کوئی ایک بھی جھکتا نہ تھا تو وہ اُن میں افضل تھا اور اس کے باوجود مجھ پر چنداں اثر نہ ہوا کہ میں نے اپنے آپ کو نیوٹرل گیئر میں ڈال رکھا تھا..

جدہ سے نکلنے والی شاہراہ پر نصف شب کے بعد جب کہ جدہ کی بے رحم روشنیاں پیچھے رہ گئی تھیں اور ایک بے آباد صحرائی وسعت کی تاریکی کار کے اندر آ رہی تھی ایک دوراہا آ گیا..

شاہراہ تقسیم ہوگئی.. سائن بورڈ پر ہدایت کے حرف درج تھے..

مکہ مکرمہ.. سیدھے چلے جائیے..

مدینہ منورہ.. بائیں جانب مڑ جائیے..

البتہ اس مدینہ منورہ کو زندگی میں پہلی بار ایک سائن بورڈ پر لکھا دیکھ کر میرا نیوٹرل گیئر ڈولنے لگا..

ٹوٹنے کو آیا۔۔میرا حلق خشک ہو گیا اور ماتھے پر پسینہ پھوٹنے لگا۔۔کوئی اور گیئر لگ گیا۔۔میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا اور پھر سے نیوٹرل گیئر میں ڈالا۔

اِدھر یا اُدھر؟

بڑا کٹھن سوال تھا کہ اِدھر یا اُدھر۔۔

شہروں کی ماں کے پاس چلیں یا وہ شہر جو منور ہے اُدھر کا رخ کریں۔۔

چونکہ ہم نے گھر سے نکلتے ہوئے فیصلہ کر لیا تھا کہ پہلے اِدھر پھر اُدھر۔۔

بہت بعد میں یہ کھلا کہ نہیں پہلے تو اُدھر۔۔پھر اِدھر۔۔

لیکن یہ تو بہت بعد میں کھلا۔۔

تو فی الحال اِدھر۔۔

مجھے علامہ اسد کی کتاب ''روڈ ٹو مکہ'' یاد آتی چلی جاتی تھی۔۔

اور میں آج روڈ ٹو مکہ پر جا تا تھا۔۔اِدھر کو سفر کرتا مسافر تھا۔۔جو ایک نام کو سائن بورڈ پر دیکھ کر نیوٹرل گیئر کے باوجود ایک چُپ سناٹے میں چلا گیا تھا۔۔لیکن اس چُپ سناٹے میں بھی اِدھر یا اُدھر کی کشتی کے دھاگے اُلجھتے رہے۔۔ان کا کوئی سرا ملتا نہ تھا کہ یہ اتنے اُلجھے ہوئے تھے۔۔یار پہلے اُدھر ہو آتے چپکے سے۔۔پھر اِدھر بھی آ جاتے۔۔اِدھر والے کا جو محبوب ہے، پیارا ہے تو اُس کے در پر اگر پہلے دستک دے آتے تو عاشق نے ناراض تو نہیں ہونا تھا۔

لیکن اُدھر والے کا۔۔سبز گنبد والے کا چونکہ حکم تھا کہ پہلے وہاں جاؤ جو مجھ سے عشق کرتا ہے تو ہم اُس کے فرمان کے تابع اِدھر جا رہے تھے۔۔یوں کچھ تسلی ہوئی۔۔

دائیں جانب صحرا کی وسعتوں میں اس کی بے آباد تنہائی میں کہیں کہیں لینڈ روورز اور مہنگی جیپیں کھڑی تھیں اور ان کے برابر میں خیمے نصب تھے۔۔

یہ اہل جدہ کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔۔رات صحرا میں گزارنا۔۔صحرانشیں اگرچہ ٹیوٹا، بی ایم ڈبلیو اور فراری نشیں ہو چکے تھے لیکن ان کی خصلت نہیں بدلی تھی۔۔میرے ایک قریبی دوست کاروبار کے سلسلے میں رحیم یار خان گئے اور ابوظہبی کے سلطان کے مہمان کے طور پر ان کے وسیع پیلس میں قیام کیا جہاں کے باتھ روم بھی سونے سے مرصع تھے اور نہانے کا ٹب کسی بڑی سیپی کی شکل کا تھا۔۔تو یہ دوست اگلی سویر فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد ٹہلنے کے لیے باہر نکلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ سلطان کے عرب مہمان اِدھر اُدھر ریت کے ٹیلوں پر محوِ خواب ہیں۔۔بعد میں ان سے دریافت کیا گیا کہ یا شیخ یہ کیا ماجرا ہے۔۔دنیا بھر کی آسائش اور راحت ترک کر کے ریت کو کیوں بستر بنایا ہے تو جواب ملا کہ اندر ایئر کنڈیشنر کا شور بہت ہے اور دوسرے یہ کہ جو لطف ریت پر لیٹ کر کھلے

آسمان تلے سونے کا ہے وہ بند کمروں میں کہاں..

''ابو.. آپ چپ بیٹھے ہیں..''

دراصل اس سفر کے دوران میں چپ ہی بیٹھنا چاہتا تھا.. چپ کے گنبد میں دم روک کے اپنے دل کی دھڑکن سننا چاہتا تھا. نبض محسوس کرنا چاہتا تھا کہ شہر مکہ ان پر کیسے اثر انداز ہوتا ہے.. اپنے آپ کو خالی کر کے تاریخ اور تقدس کو رخصت کر کے میں منتظر تھا کہ اس شہر کا پہلا وار کیسے ہوتا ہے..

''ہاں...''

وہ دونوں بھی چپ تھے لیکن زیر لب کچھ بڑبڑا رہے تھے. تھوڑی دیر کے بعد سلجوق پھر بولا ''ابو آپ تلبیہ پڑھیں ناں..''

''تلبیہ؟'' یہ کوئی اجنبی سا لفظ تھا. ناآشنا. پہلے کہاں سنا تھا. ہاں لاہور ایئرپورٹ پر..

''جی ابو.. لبیک اللھم لبیک.. میں حاضر ہوں.. اے اللہ میں حاضر ہوں.. آپ کا کوئی شریک نہیں، میں حاضر ہوں.. بے شک سب تعریف اور نعمت آپ ہی کے لیے ہے اور سارا جہان ہی آپ کا ہے.. آپ کا کوئی شریک نہیں..''

یہ واحد دعا تھی جو میں نے خوب رٹ رکھی تھی لیکن پھر بھی کہیں کہیں اٹک جاتا تھا اور جہاں اٹک جاتا تھا وہاں پہاڑہ بھول جانے والے طالب علم کی مانند تھوڑا سا نوں نوں کر کے سلجوق اور سمیر کی آواز میں آواز ملا کر کام چلا لیتا تھا.. وہ دونوں میری موجودگی سے غافل تھے اور اپنے آپ میں گم لبیک اللھم لبیک کا ورد کیے چلے جا رہے تھے.. بیٹے میرے ہوں اور میرے وجود سے ہی غافل ہو جائیں لیکن جس نے وہ مجھے عطا کیے تھے، وہ دونوں اُس کے لیے مجھ سے غافل ہوتے تھے تو اس میں حسد میں مبتلا ہونے کی کوئی بات نہ تھی..

جدہ سے چلتے ہوئے میں نے سلجوق کو خبردار کیا تھا کہ وہ اپنی عادت کے مطابق مکہ میں داخل ہوتے ہی رننگ کومنٹری نہ شروع کر دے کہ ابا دائیں دیکھو اور اباجی وہ سامنے.. یہ عادت ویسے تو اس نے مجھ سے ہی مستعار لی تھی کہ شمال میں سفر کرتے ہوئے میں مسلسل ان کے کان کھاتا رہتا تھا کہ بیٹا ذرا ناڑنگا پربت دیکھنا.. بیٹا جی اونگھ کیوں رہے ہو، دریائے سندھ کے پار وہ آبشار کیوں نہیں دیکھ رہے.. جدہ میں گھومتے پھرتے اس نے مجھ سے پرانے بدلے لیے تھے اور ڈرائیو کرتے ہوئے ایک لمحے کے لیے بھی چپ نہ ہوتا تھا. قابل دید مقامات کے بارے میں مسلسل معلومات دیتا چلا جاتا تھا.. چنانچہ یہ درخواست ضروری تھی کہ بیٹا جی، چپ!

میں بھی چپ تھا اور آس پاس بھی چپ چاہتا تھا تا کہ میں چپکے سے دبے پاؤں چلتے چور کی مانند رب کے گھر میں داخل ہو جاؤں.. دیکھوں کہ اسے خبر ہوتی ہے یا نہیں.. میری خواہش کے احترام میں کار کا انجن بھی چل تو رہا تھا لیکن دبے پاؤں بے آواز..

اس لمحے رات کا ایک بج رہا تھا جب شاہراہ کے دونوں جانب اندھیرے میں سے چند سیاہ

پہاڑیاں صحرا کی تاریکی میں سے اٹھیں اور واضح ہو گئیں، نظر آنے لگیں اور ان کے درمیان میں شاہراہ کے اختتام پر مکہ کی پہلی روشنیاں ٹمٹمانے لگیں.. میں ان جلتی بجھتی روشنیوں کو جو سیاہ پوش ٹیلوں کے درمیان میں سے نمودار ہو رہی تھیں، آنکھیں جھپکے بغیر دیکھنے لگا کہ ابھی خانہ کعبہ ان میں سے ظاہر ہوگا اور وہ جو کہتے ہیں کہ پہلی جھلک نظر آنے پر جو دعائیں مانگیں آنکھ جھپکے بغیر وہ قبول ہو جاتی ہیں تو کہیں وہ گھڑی گزر نہ جائے..

میں دبے پاؤں چپکے سے ایک چور کی مانند رب کے گھر میں کیوں داخل ہونا چاہتا تھا؟

میں کوئی چور تھا..؟

چور تھا..

چوری کرتے بھن گھر رب دا.. اس لیے دبے پاؤں جاتا تھا.. توبہ توبہ یہ بلھے شاہ بھی کیسے غلط موقعوں پر نازل ہو جاتا تھا.. میں نے اس لمحے واقعی بلھے شاہ کو شدید ناپسند کیا. یہ کوئی موقع تھا. مجھے بقیہ سفر میں اس سے اجتناب کرنا چاہیے تھا ورنہ وہ میرے لیے مضر ثابت ہو سکتا تھا.

گھر رب دا ہے کہاں.. ہم چور تو نہیں ہیں، ڈھانے کے لیے تو نہیں آئے تو نظر آ جا..

"خانہ کعبہ کب دکھائی دے گا ابو جی؟"

"ابا وہ نہ تو یہاں سے دکھائی دے گا، اتنی دور سے اور نہ ہی مکہ کے اندر پہنچ کر نظر آئے گا.. تب دکھائی دے گا جب ہم اس تک پہنچیں گے. ریلیکس کریں والد صاحب."

اب والد صاحب ریلیکس کرنے جوگے رہے ہی نہیں تھے..

کھچاؤ اور تناؤ میں بیٹھے رہے.. دور ٹمٹماتی روشنیوں کو گھورتے ان کے اندر تک آنکھیں لے جا کر کچھ تلاش کرتے رہے.

تے ٹھگ اوس ٹھگاں دے ٹھگ نوں...

کفر کفر.. توبہ توبہ

آپے بائیاں کُنڈیاں تے آپے کھچنا ایں ڈور

ساڈے وَل مکھڑا موڑ..

مکھڑا ان ٹمٹماتی روشنیوں کے اندر تو تھا.. یہ طے تھا کہ وہ وہاں ہے لیکن وہ اس مکھڑے کو موڑ کر یہ نہیں دیکھتا تھا کہ کون آیا ہے..

کون آیا پہن لباس کُڑے..

عرش کُرسی تے بانگاں ملیاں، مکے پے گیا شور..

مکے میں واقعی شور تھا..

اور جب ہم سچ مچ مکے میں داخل ہوتے ہیں تو کیسے کیسے مایوس ہوتے ہیں.. کیسے دل گرفتہ اور شکستہ

ہوتے ہیں کہ یہ مکہ ہے.. بڑی صراحیوں سے مزین ایک چوک کے آگے ایک جدید شہر کی لپک جھپک اور چکاچوند تھی.. اوراس مکے میں شور تھا.. وہی شاپنگ مالز، سپر سٹوراور ریستوران جو جدہ کے آزار تھے.. اور فٹ پاتھوں پر.. شاہراہ کے درمیان میں مزے سے ٹہلتے.. شاپنگ کرتے.. آپس میں چہلیں کرتے.. سیکنڈ ورلڈ کے برگر، کینٹکی فرائڈ چکن اور پیزا کھاتے.. کوک اور پیپسی نوش کرتے آئس کریمیں چاٹتے بے پرواہ لوگ.. صرف ایک فرق تھا کہ ان میں سے کچھ احرام میں ملبوس تھے.. ایک اور بے روح ماڈرن شہر دل کو بجھا دینے والا..

ایسا شہر کہ اس میں داخل ہوتے ہوئے "میں حاضر ہوں.." پکارنے کو بھی جی نہ چاہا کہ یہاں کون ہوگا جو حاضری لگائے گا.. خواہ مخواہ رنجیدہ اور آبدیدہ ہو کر لبیک لبیک کی دُوہائیاں دیتے رہو.. کون سنے گا.. اس شہر میں اس کا مکھڑا کیسے ہو سکتا ہے..

یہ پریم نگر کا شہر تو نہیں تھا..

اب ہم آیسے گم ہوئے پریم نگر کے شہر..

اتنی چمک بھڑک کے چکاچوند شہر میں تو ایک سوئی گم نہ ہو سکتی تھی اتنی روشنی تھی تو ہم کیسے گم ہو سکتے تھے..

حاجی لوگ مکے نوں جاندے، اساں جانا تخت ہزارے..

جت ول یار اُسے تے دل کعبہ، بھویں پھول کتاباں چارے..

ہم بھی اگرچہ تخت ہزارے والے تھے لیکن حاجی لوگ تھے، مکے آ گئے تھے.. ہم نے تو یہ نہیں کہا تھا کہ جدھر یار ہے اسی سمت میں کعبہ ہے.. کہ ہم نے تو منہ ول کعبے شریف کیا تھا اور جس مکے میں وہ کعبہ تھا وہاں شور تھا.. تخت ہزارے میں اتنا شور نہ تھا..

مکہ.. شہروں کا شہر..

شہروں کی ماں..

مکہ..

جس کی جانب نصف جہان.. اربوں لوگوں کی خلقت کا اژدہام.. نہ ان کے چہرے ملتے ہیں نہ شکلیں نہ رنگ.. نہ ناکیں جو سجدے میں جائیں تو کبھی مزید چپٹی ہو جائیں اور کبھی اتنی تیکھی کہ فرش میں شگاف ڈال دیں.. اور مصلے چٹائی یا زمین پر ان کے پسینے جذب ہوں تو ان سے رنگ اور نسل کا کوئی تعین نہ ہو تو ایسی خلقت کا اژدہام روزانہ پانچ بار کم از کم جس کی جانب رُخ کر کے سجدے میں گرتا ہے تو یہ مکہ مجھ پر کچھ اثر نہ کرتا تھا.. معمول کا ماڈرن پُر شور شہر تھا.. درست کہ دنیا کے بُت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا یہاں تھا اور ہے پر کہاں ہے.. اور اسی مکے نے میرے محبوب نبیؐ کو نکال دیا تھا.. ہجرت پر مجبور کر دیا تھا.. وہ تو اسے پھر بھی عزیز رکھتے تھے تو میں کیسے اسے عزیز نہ رکھوں.. کوئی نشانی، عمارت، کوئی اشارہ تو ایسا ملے کہ یہ شہروں کی ماں ہے..

سوائے ٹریفک کے اشاروں کے اور کوئی اشارہ نہ ملا..

سلجوق کسی حد تک اس شہر کا باسی تھا.آتا جاتا رہتا تھا.اس کے لیے یہ معمول تھا.لیکن میں تو معمول سے الگ ہو کر یہاں پہنچا تھا تا کہ غیر معمول کا نظارہ کروں..پہلی بار آیا تھا..

حاجی لوگ پہلی بار مکّے آئے تھے اور مایوس اور دل گرفتہ ہو رہے تھے.سلجوق نے اپنی کار پاکستان ہاؤس کے احاطے میں پارک کی اور ہم پیدل ہو گئے..دور دور تک نہ کوئی مینار تھا اور نہ کسی سیاہ پوش گھر کے آثار.البتہ متوقع حاجی لوگ رات کے ڈھائی بجے بھی سڑکوں پر سرگشت کر رہے تھے..شاپنگ میں مشغول تھے اور ان میں سے کچھ کو میں نے دیکھا کہ ایک تنور کے سامنے قطار بنائے گرم گرم روٹیوں کے حصول کی چاہت میں بے چین ہوئے جاتے تھے.

ایک طویل سرنگ میں داخل ہو گئے..

اس کے اندرون میں جیٹ ہوائی جہازوں میں نصب پنکھوں ایسے جہازی ایئر کنڈیشنر ایک مخوف میکانکی شور میں بلند ہو رہے تھے..سرنگ میں بہت ٹھنڈک تھی اور سرد ہوا تھی..

ہم اس یخ بستہ ہواؤں والی سرنگ سے باہر آئے..باہر آئے تو ایک پُل کے پار..اونچی عمارتوں میں سے ایک بلند قامت کھجور کے درخت کی مانند ایک چکاچوند روشن مینار نمودار ہوا.

''اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا
سوہنے یار دے حُسن دا گرم بازار''

''سلجوق..''

''جی ابا.. یہ خانہ کعبہ کا مینار ہے؟''

اس مینار کی ساخت بہت نئی نویلکی اور ستھری شکل کی تھی.. وہ اس قدر.. رات کے ڈیڑھ بجے بھی نمایاں اور روشنیوں میں ڈوبا ہوا تھا جیسے کسی سٹیج ڈرامے میں ایک اہم کردار پر سپاٹ لائٹ مرکوز کر کے اسے فوکس میں لایا جاتا ہے۔

اس میں نا کوئی کشش نہ تھی۔

نہ تو اس میں دمشق کی جامع امیہ کے مینار ایسی قدامت اور خوش شکلی تھی..

نہ یہ مسجد قرطبہ کے اس مینار کی ہمسری کرتا تھا..

آیا صوفیہ.. نیلی مسجد کے مخروطی آسمان میں گڑھے ہوئے برچھوں ایسے نازک میناروں کا تذکرہ کیا.. جامع مسجد ہرات کے صحن میں سے بلند ہونے والے نیلگوں.. نیلاہٹ میں رنگے ہوئے میناروں کو کیا فراموش کریں.. یہاں تک کہ بادشاہی مسجد لاہور کے مینار جو شان رکھتے تھے..

یہ محض اس لیے ممتاز تھا کہ خانہ کعبہ کے دل سے اٹھتا تھا..

پُل کے پار ہوئے تو یکدم بابِ عبدالعزیز سامنے آ گیا..

انگریزی میں کنگ عبدالعزیز کے دروازے کے سامنے ایک وسیع احاطہ تیز روشنیوں کی زد میں آیا ہوا اور وہاں احرام پوش مختلف حالتوں میں کچھ چلتے پھرتے تھے.. کچھ اونگھتے تھے.. کچھ جمگھٹوں میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے.. زیر زمین پہلے غسل خانوں میں سے خود کار زینوں پر کھڑے.. کچھ نہا دھو کر.. کچھ فارغ ہو کر.. بیشتر وضو کر کے احاطے کی روشنیوں میں ابھر کر زینوں سے پہلا جھجکتا ہوا قدم اٹھا کر فرش پر قدم رکھ کر ہجوم کا ایک حصہ بن جاتے تھے۔ اگرچہ ہجوم کا ایک حصہ بن جاتے تھے لیکن الگ الگ شباہتیں، شکلیں اور قد بت

ان کی پہچان جدا رکھتے تھے.. نغمہ ایک ہی تھا لیکن راگ راگنیاں مختلف تھیں..

سلجوق اور ٹمیسر نے باب عبدالعزیز کے سامنے جو ایک گھڑیال چبوترہ ہے، اس کے نیچے مجھے کھڑا رہنے کی ہدایت کی کہ ابا یہاں سے ہلنا نہیں ورنہ گم ہو جاؤ گے.. جیسے میں بچہ تھا اور وہ میرے بزرگ کہ خبردار جو یہاں سے آگے پیچھے ہوئے تو.. میلے میں گم جاؤ گے.. اور خود وضو کرنے کے لیے خود کار زینوں میں اترنے کے لیے چلے گئے.. میں ظاہر ہے جدہ سے وضو کر کے چلا تھا اور ظاہر ہے وہ ابھی تک قائم تھا.. میں اتنے تردد میں پڑنا بھی نہیں چاہتا تھا کہ اگر کچھ شک ہے تو کون وضو خانوں میں اترے اور اس سارے عمل کو دوہرائے تو وضو ہو گا ہی.. نہ ہو گا تو اللہ معاف کر دے گا.. میں نے پہلی بار باب عبدالعزیز کو اطمینان سے دیکھا..

تو کیا خانہ کعبہ کے اس بلند دروازے کو سامنے پا کر میں کچھ آبدیدہ ہوا اور والہانہ انداز میں اس باب کو اپنی آنکھوں میں سمویا.. اس کی چوکھٹ پر سر رکھنے کو جی چاہا جس نے اندر شنید ہی تھی کہ اللہ کا گھر ہے؟..

نہیں.. بالکل نہیں.. میرے اندر ایک نیم سراسیمگی نے تو اسی لمحے جنم لے لیا تھا جب میں نے شاہراہ پر آویزاں منزلوں کے ناموں میں "مکہ مکرمہ" لکھا دیکھا تھا.. انتظار بھی تھا لیکن دل سے ہوک نہ اٹھی تھی..

میناروں کی مانند باب عبدالعزیز بھی ماڈرن طرز تعمیر کا ایک بلند دروازہ تھا جس میں سے کہیں بھی نور یا تقدس کی کوئی کرن نہ پھوٹتی تھی.. بے شک اس پر زر کثیر خرچ کیا گیا تھا.. روشنیوں کی بہتات تھی، دنیا کے مہنگے ترین پتھروں سے تراشیدہ تھا.. شاندار اور پرشکوہ تھا لیکن اپنے اندر پوشیدہ "خزانے" کا پتہ نہ دیتا تھا..

ایک اور الجھن تھی جو سلجھتی نہ تھی کہ باب شاہ عبدالعزیز اور باب شاہ فہد.. تو جو حرم کے خادم ہوتے ہیں، وہ اپنے آقا کے گھر کے دروازوں کے نام اپنے نام پر تو نہیں رکھتے.. غلام کی کیا مجال کہ مالک کی حویلی کے بڑے پھاٹک کو اپنا نام دے.. کوئی نہ کوئی مصلحت تو ہو گی جو مجھ کند ذہن کے پلّے نہ پڑتی تھی۔

موسم میں بہت خوشگواری تھی..

ایک بار جی تو چاہا کہ گھڑیال چبوترہ چھوڑ کر ذرا اندر جھانک لوں شتابی سے لیکن اس دوران اگر بیٹے واپس آ گئے تو کیا ہو گا.. بہت ڈانٹ پڑے گی.. اس لیے ایک ایسے بچے کی طرح کھڑا رہا جو ٹانی کی طرف ہاتھ تو بڑھانا چاہتا ہے لیکن ڈانٹ سے ڈرتا ہے..

ٹمیسر اور سلجوق لمبی لمبی پلانگیں بھرتے میری جانب آ رہے تھے.. کانوں میں انگلیاں چلاتے.. ہتھیلیاں جھٹکتے وضو سے فارغ ہو کر آ رہے تھے..

"چلو والد صاحب.."

"چلو.."

روشن احاطے کے ستھرے سفید رنگ مرمر کے فرش پر چلتے بلد سے خرید کردہ وہ چپلیں گھسٹتے جو ادھڑتی جاتی تھیں، ہم باب عبدالعزیز کی چوکھٹ پار کر کے ایک عمارت کے اندر جاتے ہیں.. بلند چھتیں ہیں،

ستون اونچے ہو رہے ہیں۔ محرابیں ہیں۔ زمزم بھرے واٹر کولر ہیں، خُدام صفائی میں مصروف ہیں اور لوگ ہیں۔۔رات کے اس پہر بھی خلقِ خدا کی رونق ہے۔۔راہداریوں میں ترک خاندانوں نے ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں۔ شیر خوار بچوں سے لے کر اسی برس کے درمیان کی تمام ورائٹی موجود ہے۔۔سیاہ پوش ایرانیوں کی مجلس الگ ہو رہی ہے۔۔انڈونیشین اور ملائیشین خواتین قرآن پاک پر اتنی جھکی ہوئی ہیں کہ پتہ نہیں پڑھتی کیسے ہیں اور کبھی قرآن کے اوراق چھوتی ان کی چپٹی ناکیں مزید چپٹی ہو رہی ہیں۔۔افریقی مرد قرآن پڑھتے ہوئے کبھی مسکراتے ہیں، کبھی جھومنے لگتے ہیں۔۔اور کیا جانئے کہاں کہاں سے آئی ہوئی مخلوق عبادت میں مگن ہے۔۔

ہم ان کے درمیان میں سے راستہ بناتے عبادت کرنے والوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے۔ جھکی ہوئی خواتین کے احترام میں ذرا پرے پرے ہوتے چلتے گئے۔۔

میں چلتا جا رہا تھا، مگن لوگوں کے پار آنکھیں کم جھپکاتے کہ کہیں وہ سیاہ پوش عمارت میرے بند پپوٹوں پر دستک دے کر لوٹ نہ جائے۔۔جیسے "شکنتلا" کے قلانچیں بھرتے ہرن کی ٹانگیں اس کے بدن سے آگے نکلی جاتی تھیں۔ ایسے میری آنکھیں بھی میرے بدن سے آگے نکلی جاتی تھیں۔

ہم خانہ کعبہ کے اُس حصے میں آ گئے جس کی عمارت قدیم ہے۔۔ترکوں کے زمانے کی ہے۔۔اس کے گل بوٹے آرائش فانوس اللہ کے گھر کو زیب دیتے ہیں کہ ان میں قدامت اور عبادت کی مہک ہے۔۔ مسجد قرطبہ کے ستونوں کی مانند رومی طرز کے پرانے ستون جن میں سے ہر ستون کی تاریخ الگ ہے۔ جھکی ہوئی محرابیں اور ان میں بھی مسجد قرطبہ کی جھلک تھی۔۔تو ان رومی ستونوں کے لشکتے سرخ سفید اور کلیجی رنگ کے پتھروں سے تراشے ہوئے ستونوں کے درمیان میں مجھے خانہ کعبہ تو نہیں۔۔ایک آہستہ رو سفید گردش کا بہاؤ مدھم مدھم سانس لیتا دکھائی دیا۔ رب کا گھر دکھائی نہ دیا۔ رب کے بندے بہتے ہوئے دکھائی دیئے۔۔وہ اپنے روپ رنگ۔ تو میتوں اور خصلتوں میں نمایاں نظر نہ آئے۔۔الگ الگ ذرّوں کی صورت میں نہیں ایک سفید صحرا کی صورت یک جان حرکت کرتے ہوئے دکھائی دیئے۔۔

"یہ کیا ہے؟" پیر رومی نے کہا تھا

"یہ وہ ہے جس کی تمہیں خبر نہیں۔" شمس تبریز نے کہا تھا۔

یہ بھی وہ تھا جس کی مجھے خبر نہ تھی۔۔

مجھے خانہ کعبہ کے سیاہ پوش وجود کی تو خبر تھی لیکن اس کی خبر نہ تھی۔۔اس کے گرد جو ذرے ایک مدھم سُر میں بہتے طواف کرتے ہیں ان کی پہلی جھلک جب آنکھوں میں اترتی ہے۔۔ان کے اندر پتلیوں کے گرد بھی جب یہ سفید بہاؤ طواف کرنے لگتا ہے تو کیا گذرتی ہے اس کی ہرگز خبر نہ تھی۔۔میں دیکھنے کچھ گیا تھا اور نظر کچھ اور آ گیا تھا۔۔

جیسے ایک سیاہ ستارے کے گرد ایک کہکشاں۔۔ان گنت ستاروں کے جھرمٹ اپنا اپنا وجود کھو کر ایک

روشن ہالہ تخلیق کرتے ہیں اور یہ ہالہ بھی دھیرے دھیرے اس کے گرد بہہ رہا ہو..

مجھے کسی ایک شخص نے بھی خانہ کعبہ کے کسی بیان نے.. داستان نے.. اس سفید سحر کے مدھم بہاؤ کے لیے تیار نہیں کیا تھا.. اس منظر میں نیند میں لے جانے والی ایک کیفیت تھی.. اور یہ حقیقت سے ماورا لگتا تھا. میری چُپ اور سناٹے کے گنبد میں یہ ان گنت سفید ذرّے داخل ہوئے اور اپنے مدھم بہاؤ میں یہ چُپ اور سناٹا بہا لے گئے..

بے شک اس سے اگلے لمحے مجھے غلاف کعبہ کا ایک حصہ نظر آ گیا.. میں نے سفید بہاؤ سے جدا ہو کر اس پر اپنی توجہ مرکوز کرنی چاہی لیکن وہ فوراً ہی بھٹک کر پھر سے طواف کرنے والے سفید صحرا میں کھو گئی.. سیاہ غلاف سے ڈھکی مکعب نما عمارت جو مکمل مکعب نہیں ہے.. اونچائی چوڑائی میں کچھ فرق ہے.. انسانیت اس کے گرد گھیرا ڈالے اس کے گلے کا ہار ہو رہی تھی.. سفید موتیے کا ایک ہار جس کے ہر پھول میں جان تھی.. اور ہر پھول اپنی الگ شناخت کھو کر اس ہار میں پرویا بہاؤ میں تھا..

ایک سفید گجرا سیاہ کلائی کے گرد لپٹتا چلا جاتا تھا..

میں خانہ کعبہ پر ایک نظر ڈال کر اس سے غافل ہو گیا کہ اس میں وہ بات نہ تھی جو اس کا گرداب ہونے والے سفید ذرّوں کے تحرک میں تھی.

ذرّوں کا یہ بہاؤ بہتے بہتے طواف کرتے کرتے یوں لگتا تھا جیسے اس سیاہ عمارت میں جذب ہو رہا ہے.. ابھی جذب ہوتا ہے اور ابھی اس میں سے پھوٹ کر بہنے لگتا ہے.. یہ رب کا گھر تھا لیکن اس کے گرد بہتے ذرّے اس گھر سے کہیں اہم ہو رہے تھے.. گھڑی کی سوئیوں کی مخالف سمت میں رواں یہ آہستہ رو نیند میں لے جانے والے سحر کا مدھم سیلاب رب کے گھر کو اہم بنا رہا تھا..

یہ سفید بہاؤ جیسے دھیرے دھیرے خانہ کعبہ کو تعمیر کر رہا تھا.. یہ نہ ہوتا تو پھر وہ کہاں ہوتا..

خانہ کعبہ میرے اندازے سے بہت چھوٹا تھا..

ٹیلی ویژن پر جو دکھائی دیتا تھا تصویروں میں جو نظر آتا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بہت بڑا ہے.. لیکن ان کی نسبت یہ بہت چھوٹا ہے.. ترک ستونوں میں سے نظر آنے والا جو سفید دریا بہتا تھا جس کے قطرے باہم ہو کر ایک گرداب بنے جاتے ہیں ان کے درمیان جو رب کی رہائش گاہ تھی بہت ہی قریب لگ رہی تھی.. بالکل اتنی قریب کہ میں ترک حصے کی سیڑھیوں سے اتر کر صحن میں داخل ہو کر دو چار قدم اس کی جانب چلوں گا تو اس سے ٹکرا جاؤں گا..

اتنے چھوٹے سے گھر میں اتنا بڑا رب کیسے رہتا تھا..

بے شک یہ اس کا گھر ہے پر اس میں وہ رہتا تو نہیں ہے.. رہتا تو وہ کہیں اور ہے.. کہاں رہتا ہے.. ہمیں یہاں بلا کر رہتا وہ کہیں اور ہے.. یہ تو بڑی زیادتی ہے.. اگر شہ رگ کے قریب رہتا ہے تو ہمیں یہاں

بلانے کی کیا ضرورت تھی..

ابھی ہم تُرک حصے میں تھے..

ستونوں کے درمیان جب وہ سفید ذرّوں کا آہستہ خرام بہاؤ نظر آیا تو اسے آنکھوں میں سموتے اور اس پر یقین کرتے زمانے بیت گئے..ابھی تو ہم نے سیڑھیاں اتر کر خانہ کعبہ کے صحن میں پہلا قدم رکھنا تھا..

اور ہاں بے شک ہم زیر لب میں حاضر ہوں..میں حاضر ہوں پکار رہے تھے..بہاؤ کی سفید پری جو ایک سیاہ کوہ قاف کے گرد ہولے ہولے اڑان کرتی تھی اس کے جادو کے اسیر تھے لیکن گانٹھ کے پکے تھے اپنی چپلوں سے ہوشیار تھے، انہیں سینے سے لگائے چلے آتے تھے تا آنکہ سلجوق نے حرم کے کناروں پر آبِ زمزم کے جو بڑے بڑے کولر دھرے تھے، ان کے عقب میں ایک خاص مقام پر انہیں پوشیدہ کر دیا کہ وہ ایک تجربہ کار ملاقاتی تھا، رب کے گھر میں آتا جاتا رہتا تھا اور جانتا تھا کہ اگر ہم وفورِ جذبات سے مغلوب ہو کر انہیں حرم سے باہر اتار آتے تو واپسی کسی اور کی چپل میں جاتے یا ننگے پاؤں جاتے

ہم سے بڑھ کر جذب والے اور اشتیاق والے قلانچیں بھرتے ہمیں پیچھے چھوڑتے طواف میں شامل ہو رہے تھے..

سفید گرداب..متحرک ذرّے..آہستہ رو بہاؤ..جیسے وہ ایک خواب میں چلتے ہوں..نیند میں چلتے تو ہوں پر آگاہ ہوں..یہ ابھی ابھی تو اس طواف میں شامل نہ ہوئے تھے..یہ آج کے ذرّے نہ تھے جو متحرک تھے..بلکہ جب خانہ کعبہ کی پہلی اینٹ رکھی گئی تھی..اور پھر حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے اس کی بنیادیں اٹھائیں، اس کی تعمیر میں مصروف ہوئے..تو انہیں بھی خبر نہ ہوئی..انہیں بھی پتہ نہ چلا کہ زائرین کے ذرّے چپکے سے نظر بچا کے..دبے پاؤں..چوری چوری...اس رب کے گھر کا طواف کرنے میں مگن ہو گئے ہیں..آج بھی وہی زائرین تھے..حضرت ابراہیم کے زمانے کے..وہی لباس تھا اور وہی کیفیت جذب کی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے..تو تب سے لے کر اب تک لحہ موجود تک طواف کرتے وہی چلے آتے ہیں..یہ سب کے سب اپنے آپ میں مگن زمان و مکاں سے ماورا ذرّے تعداد میں کتنے ہوں گے..چند ہزار..تو یہ تبھی سے چلے آتے ہیں..کعبہ کے ہم عمر ہیں..اس کے یار ہیں، اس کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑتے..اور شاید ہر برس ایک مرتبہ یہ لحہ بھر کے لیے رکتے ہوں اور خانہ کعبہ کو سالگرہ مبارک کہتے ہوں اور جواب میں.."تمہیں بھی" کی سرگوشی ہوتی ہو کہ دونوں ایک ہی دن پیدا ہوئے تھے..ان میں سے بیشتر احرام میں ملبوس تھے تو کیا پتہ کس عہد کے لوگ ہیں..یوں سفید پوش نہ ہوتے اپنے زمانے کے پیراہنوں میں ہوتے تو فوراً پہچانے جاتے کہ یہ جن کے اُونی چوغے رسّیوں سے بندھے ہیں..دھاری دار چادریں اوڑھے ہوئے ہیں..دراز گیسوؤں والے..ناف تک آتی داڑھیوں والے..ہمارے زمانوں کے تو نہیں..

کیا پتہ ہزاروں برس سے انہوں نے کسی زمانے کو..کسی نو وارد کو اپنے طواف میں شامل ہونے کی

اجازت ہی نہ دی ہو۔ ان میں بلھے شاہ اور شاہ حسین بھی چلا جاتا تھا.. نانک، بھٹائی اور فرید بھی گردش میں تھے.. غالب بھی پردہ نہ اٹھاتے تھے کہ کہیں اس میں بھی وہ کافرصنم نہ نکلے.. اور اگر سب تھے تو میں بھی تھا۔

اور اس سفید صحرا میں جو خانہ کعبہ کی پہلی اینٹ رکھتے ہی وجود میں آ گیا تھا اگر میں بھی تھا تو سب سفید ذرّوں میں کیسے مجھے پہچانا جا سکتا تھا؟

کہ میں ایک جھجکتا ہوا ذرّہ تھا..

میرے پاؤں میں روانی نہ تھی، لغزش تھی..

کہ میرے اندر شک کی جڑیں بہت گہری تھیں..

دور سے پہچانا جاتا تھا کہ یہ ذرّہ ڈانواں ڈول ہو رہا ہے..

سفید بہاؤ کا ایک حصہ تو ہے لیکن فنا نہیں ہے.. کچھ سوچتا اور شک کرتا طواف کرتا چلا جاتا ہے..

تو اس قدیم بہاؤ میں.. میں کیسے داخل ہوں گا.. اگرچہ میں وہاں تھا لیکن دوبارہ کیسے ان ذرّوں میں ذرّہ ہو کر بہنے لگوں گا..

''آئیں ابو..''

میں پُرشوق تو بہت تھا..

ابھی کچھ لمحے پہلے اگر مجھے ''آئیں ابو'' کہا جاتا تو میں ایک بے وقوف ہرن کی مانند زقندیں بھرتا طواف کے گرداب میں جا شامل ہوتا.. میں اتنا بے چین ہو رہا تھا.. لیکن اس خیال نے مجھے ذرا کل بنا دیا تھا کہ خانہ کعبہ کے ہم عمر زائرین میں سے کوئی ایک مجھے پہچان لے گا اور مجھے شامل نہ ہونے دے گا کہ اچھا تو یہ تم ہو.. تم جو والہانہ انداز میں نہیں جھجک کر چلتے ہو.. شک سے مکمل نجات حاصل کرنے والوں میں سے نہیں ہو.. ہم پہلے ہی تم سے بیزار ہیں، تم دوبارہ نہیں آ سکتے.. چنانچہ ترک ستونوں کو چھوتے محرابوں تلے سے گزرتے جب ہم خانہ کعبہ کے صحن میں اترے.. شاید رات کے تین بجے تھے جب اترے اور میں نے اس گردش میں شامل ہو کر طواف کرنے کا قصد کیا تو سلجوق نے میرا ہاتھ پکڑ کر پھر ڈانٹا ''والد صاحب.. کس دھیان میں ہیں.. طواف یہاں سے شروع نہیں کرتے.. حجر اسود کے سامنے پہنچ کر گنتی شروع ہوتی ہے.. آغاز وہاں سے ہوتا ہے.. آپ کیا کر رہے ہیں؟''

والد صاحب کچھ بھی نہیں کر رہے تھے.. صرف شتابی سے اس بہاؤ میں شامل ہو کر بہنا چاہتے تھے کہ کہیں یہ رک نہ جائے.. ابھی اوپر سے کوئی حکم نازل نہ ہو جائے کہ بس بس.. تو اس سے پیشتر یہ شغل ہو جائے.. گھوم لیا جائے۔

اور والد صاحب کے دل میں دھتکارے جانے کے بہت خدشے تھے.. کہ یہ ہزاروں برسوں سے گردش میں آئے ہوئے جو قدیم لوگ ہیں.. نہ میری نسل کے ہیں، نہ رنگت اور زبان کے تو کیا پتہ وہ مجھے دھکیل

دیں.. جیسے ایک گلیوں میں پھرتے.. ہر راہگیر کے پیچھے دُم ہلاتے پُر اشتیاق کتے کو دُر دُر کہتے ہوئے دھتکارا جاتا ہے.. کہ تو کہاں سے آ گیا ہے..

ان خدشوں کے باوجود والد صاحب ''آئیں ابّو..'' کا اذن پاتے ہی زقندیں بھر رہے ہیں.. صحن حرم میں نوافل ادا کرنے والوں کو ٹاپتے جا رہے ہیں.. جو تلاوت میں محو ہیں، ان کا بھی کچھ لحاظ نہیں کرتے کہ کہیں یہ گاڑی مِس نہ ہو جائے اور پلیٹ فارم پر تنہا نہ رہ جائیں.. سب مسافر منزل تک پہنچ جائیں اور وہ بے آسرا ہاتھ ملتے نہ رہ جائیں.. والد صاحب اتنے مخبوط الحواس اور بے وقوف ہو گئے.. ''شکنتلا'' کے ہرن کی مانند اب ان کی ٹانگیں ان کے بدن سے آگے چلی جاتی ہیں..

حجرِ اسود کہیں خانہ کعبہ کی ایک نکڑ میں نصب تھا.. یہاں بہاؤ کی لہریں پُر جوش ہو جاتی تھیں تو ان کی اٹھان میں وہ کہیں روپوش تھا.. نظر نہ آتا تھا.. البتہ اس کی سمت کا تعین ہو جاتا تھا کہ سنگِ سیاہ کی ایک پٹی اس سیاہ پتھر کے قدموں سے شروع ہو کر صحن میں بچھے سنگ مرمر کی سفیدی میں راستہ بناتی صحن کی آخری حد تک چلی جاتی تھی... اس سیاہ پٹی پر کھڑے ہو کر اگر بائیں جانب نگاہ دوڑائیے تو وہ پتھر سے جا ٹکرائے گی.. اگر درمیان میں بہاؤ کی لہریں حائل نہ ہوں تو! معمولی پتھر تھا.. جسے حضرت عمرؓ نے چومتے ہوئے کہا تھا کہ تیری کوئی حیثیت نہیں، میں تو تجھے اس لیے بوسہ دیتا ہوں کہ میرے پیغمبر نے تجھے چوما تھا.. مجھے اس طواف میں بھی اور حج کے بعد طوافِ زیارہ اور وداع کے دوران بھی شدید کاوش اور خواہش کے باوجود اس پتھر کی قربت حاصل نہ ہو سکی، درمیان میں اتنی خلق خدا حائل رہی کہ میں انہیں دھکیل کر روند کر شاید اس تک پہنچ ہی جاتا لیکن یہ مجھے گوارا نہ تھا کہ میں محض کچھ ثواب کمانے کی خاطر رب کے بندوں کو ضعف پہنچا کر اس تک رسائی حاصل کر دں.. یوں بھی ایک طے شدہ منصوبہ بندی کے تحت ثواب کا حصول میرے شیڈول میں شامل نہ تھا..

تو سمیر اور سلجوق میرے آگے پیچھے دو بلند روئی ستونوں کی مانند ایستادہ اور مستحکم... میرا ہاتھ پکڑے.. میرے کندھوں پر ہاتھ رکھے دھکیلتے ہوئے مجھے اس سیاہ پٹی تک لے گئے جو حجرِ اسود کی سمت کی نشاندہی کرتی تھی اور جہاں سے باقاعدہ طواف کا آغاز کیا جاتا تھا....

''طواف کی نیت کریں ابا جی۔''

''وہ تو میں کر چکا..''

''اپنا داہنا کندھا حجرِ اسود کے بائیں کنارے کے مقابل کریں والد صاحب۔''

اب اضطراب میں دائیں اور بائیں کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔

''لیفٹ.. کھبّا ابا جی.. اور نیت کریں..''

اس دوران پہلے سے طواف میں آئے ہوئے خواتین و حضرات ہمیں دھکیلتے رہے.. پاؤں اکھڑتے

توردی ستون میری ڈھال بن جاتے..

''اے اللہ۔ میں تیرے گھر کا طواف کرنے کا ارادہ کر رہا ہوں..اس کو میرے لیے آسان فرما اور اس کو مجھ سے قبول فرما۔''

''اب دونوں ہاتھ بلند کر کے ہتھیلیوں کا رُخ حجرِ اسود کی جانب کریں اور اللہ اکبر پکار کر چلنا شروع کر دیں۔''

میں نے حسب ہدایت دونوں ہاتھ بلند کر کے ہتھیلیوں کا رُخ اس جانب کیا جہاں حجرِ اسود کے ہونے کی شنید تھی کہ وہ دکھائی نہ دیتا تھا اور پھر ایک سہما ہوا ذرا ڈرا سا ''اللہ اکبر'' گلے میں سے برآمد کیا۔ یہ نہیں کہ اس لمحے صرف میرے دو ہاتھ فضا میں اونچے ہوئے تھے بلکہ آس پاس ہزاروں ہاتھ صحنِ کعبہ میں بے چین کونپلوں کی مانند پھوٹ رہے تھے..ہوا کے تیز چلنے سے جب سرکنڈے حرکت کرتے ہیں ایسے حرکت کرتے تھے..

شنید ہے کہ حجرِ اسود تو محض ایک بہانہ ہے..دراصل یہ اللہ تعالیٰ سے ہاتھ ملانے کے مترادف ہے۔اس کے ساتھ دست پنجہ لیتا ہے اور وہ آپ کے ہاتھ کا منتظر ہوتا ہے..اور میرا جیسا زائر..سامالیکم سر جی، ہم آ گئے ہیں..ہور سناؤ کی حال اے۔اجازت اے جناب عالی؟

میرا وہ خدشہ باطل ثابت ہوا کہ میں گردش میں آتے ہوئے ذرّوں میں شامل نہ ہو سکوں گا.... دھکیلا جاؤں گا..

میں شامل ہو گیا بلکہ کر لیا گیا..دریا کنارے کی ریت کا ایک ذرہ جیسے بہاؤ کی زد میں آ کر اس کا ایک حصہ بن جاتا ہے..بہہ نکلتا ہے..دونوں بیٹوں کے درمیان میں، چلنے لگا، جس طرح ہوا چلتی تھی، خلق خدا چلتی تھی۔طواف کے پہلے چکر کا آغاز ہو گیا..

یاد رہے کہ میں اُسی مکہ کے دل میں حرکت کر رہا تھا جسے میں نے چند روز پیشتر جہاز کی کھڑکی سے ناک چپٹائے بہت نیچے سیاہ پہاڑیوں کے شائبے میں سے پھوٹتی ہلکی روشنیوں کی صورت میں ''دیکھا'' تھا۔ تب بھی رات کا یہی پہر تھا..

میں کیا، پورا حرم جن تیز چکاچوند روشنیوں کی زد میں تھا انہیں بقعۂ نور وغیرہ بیان تو کیا جانا چاہیے لیکن اتنی تیز روشنی مجھے ڈسٹرب کر رہی تھی جیسے کسی ڈرامے کی شوٹنگ ہو رہی ہو اور اداکاروں کے کلوز اپ لیے جا رہے ہوں۔علی شریعتی نے بھی ڈرامے کی مثال دی ہے کہ انہی طواف میں مگن لوگوں کو اداکار ہی کہا تھا جو سینکڑوں مختلف قومیتوں اور زبانوں کے تھے لیکن ان کے ہدایتکار کی زبان ایسی تھی کہ وہ سب اسے سمجھتے تھے اور اس کی ہدایات پر عمل کرتے چلے جاتے تھے..

حجرِ اسود کے برابر میں درِ کعبہ کی سنہری چوکھٹ تھی.. یہ بھی خالص سونے کے نقش و نگار سے دمکتا تھا. اگر میں اس تک پہنچ بھی جاتا تو دستک نہ دے سکتا تھا کہ وہ مجھ سے دو چار ہاتھ بلندی پر تھا..

یہ درِ کعبہ وا تو نہ تھا..

"اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا"

لیکن یہ استحقاق تو صرف اس کو تھا جو اگر یادہ خوار نہ ہوتا تو اسے لوگ ولی سمجھتے.. اگرچہ ہم تو سمجھتے ہیں.. ایک بزرگ کے بارے میں روایت ہے کہ وہ مکہ میں داخل ہونے کو تھے.. اور یہ وہ زمانے تھے جب باہر سے آنے والے مسافروں کو پہاڑیوں میں گھرا بیت اللہ دور سے نظر آنے لگتا تھا، فائیو سٹار ہوٹل، سپر سٹور اور شہزادوں کے محلات نظر نہ آتے تھے.. ان بزرگ نے اللہ کے گھر کو تا دیر دیکھا اور پھر آئے تو حج کی نیت سے تھے.. لوٹ گئے.. کہ اس نے مجھے بلایا نہیں، بات نہیں کی.. تو میں جانے کا نہیں.

ہمت والے تنگ ددو کرنے والے اور کچھ ناتواں مگر جذب کی شدت والے دروازے تک پہنچ گئے تھے. وہ اس کی بلند چوکھٹ کو تھامے دیوارِ کعبہ سے لب لگائے شاید گریہ کرتے تھے، شاید فریاد میں تھے یا دعائیں مانگتے تھے لیکن اس مقام سے الگ ہو جانا ان کے بس میں نہ تھا. لوہے کے ذرّے ایک طاقتور مقناطیس سے چپٹے ہوئے تھے.

یہ درِ کعبہ وا نہ تھا..

میرے لیے تو نہ ہوا البتہ میرے بیٹے سلجوق کے لیے ایک بار کھلا تھا..

وہ ایک حکمران کی معیت میں ایک معمولی ڈپلومیٹ کی حیثیت میں اپنے ملک کے صدر کی تعظیم میں "یس سر" کہتا یہاں تک آیا تھا اور پھر اس حکمران کے لیے.. یہ در کھول دیا گیا تھا.

سلجوق خانہ کعبہ کے اندر داخل ہوا تو اس کی کیفیتِ عجیب تھی جسے وہ بیان کرنے سے قاصر تھا.. اس کا بدن کانپ رہا تھا..

"بیٹے آپ کو کیا محسوس ہوا؟ اندر کیا ہے؟ اندھیرا ہے اُجالا ہے؟ وہ وہاں ہے یا نہیں.. کیا یہ محض طفل تسلیاں ہیں کہ وہ وہاں ہے.. واقعی ہے.. ہے تو کیا ہے.."

تو اس نے کہا تھا "ابا مجھے کچھ پتہ نہیں کہ وہاں کیا ہے. اندر داخل ہوتے ہی ہم سب برابر ہو گئے.. واقعی نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز. صدرِ مملکت.. وزراء.. مشیر. سفیر. سب کے سب کمینے اور لالچی ہو گئے.. وہاں کچھ قدیم برتن تھے جن کے بارے میں روایت ہے کہ حضورؐ کے زمانوں کے ہیں.. اور اندر اندھیرا ہے.. بجلی بھی نہیں ہے.. ایک صندوق ہے.. فرش کیسا ہے چھت کہاں ہے، مجھے معلوم نہیں کہ میں نے دیکھا ہی نہیں کہ اوپر کیا ہے اور نیچے کیا ہے.. تین ستون ہیں جو لکڑی سے تراشیدہ اور بہت قدیم ہیں.. اندر داخل ہوتے ہی سب کمینے اور لالچی ہو گئے، زیادہ سے زیادہ نوافل ادا کرنے کے لیے. سجدے میں پڑے رہنے کے لیے..

زیادہ سے زیادہ اس ہوا میں سانس لینے کی خاطر.. اور سب کے سب تنہا ہو گئے.. دوسروں کے وجود سے لاتعلق اور غافل ہو گئے.. البتہ پڑھنے کی سرگوشیاں تھیں اور سسکیاں اور ہچکیاں تھیں.. میں نے تینوں ستونوں کے برابر میں نفل پڑھے.. میرے لیے سب سے ہیجان خیز وہ لمحہ تھا جب میں نے سوچا کہ نفل ادا کرنے کے لیے اپنے چہرے کا رُخ کدھر کروں اور پھر میرا بدن مزید کانپنے لگا کہ میں تو خانہ خدا کے اندر ہوں جدھر بھی رخ کروں گا وہ ہو گا.. اباجی آپ نے میرے لیے جو کاوشیں کیں.. اور امی نے راتوں کو جاگ جاگ کر جو مجھے پڑھایا تھا.. اور آرکیٹکچر کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد میں نے برسوں تک سول سروس کے امتحان کے لیے جو مشقت کی تھی.. جب میں نے خانہ خدا کے اندر ایک ستون کے سامنے کھڑے ہو کر سر جھکا کر ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' پڑھا.. تو ان سب کا پھل مل گیا.. مجھے اب زندگی سے اور کچھ درکار نہیں ''

یہ تو سلجوق کے سرسری جذبات تھے.. کسی اور مقام پر خانہ کعبہ کے اندرون کی تفصیل جو میں نے نوٹ لے لے کر.. جیسے میں خود بھی اس کے ہمراہ اندر جاتا ہوں ایسے بے مثل کیف میں خمار آلود ہو کر جو تفصیل میں نے اس سے حاصل کی تھی.. وہ آپ تک پہنچانے کی سعی کروں گا..

ویسے خانہ کعبہ جس طور صرف حکمرانوں، آمروں اور شاہوں کے لیے وا ہو جاتا ہے، یہ مجھے ایک عجب سا انصاف لگتا ہے.. یہ کیسا ترازو ہے کہ ایک پلڑے میں ایک ایسا حکمران ہے جو قتل کا مرتکب ہوا ہے.. جس نے خلق خدا کی کھال کھینچ ڈالی ہے.. اس کا پلڑا بھاری ہو جاتا ہے.. اور دوسرے پلڑے میں بے شک وہ پاکیزہ، ستھرے اور برگزیدہ لوگ ہوں جنہوں نے اپنی پوری حیات میں مکر فریب اور دغا کا دامن نہ تھاما ہو.. صرف غلاف کعبہ اور ایک سیاہ کمبل کو آنکھوں سے لگایا ہو.. خلق خدا کو آسانیاں دینے والے.. ان کے دکھ سکھ میں شامل رہے ہوں، ان کے لیے نثار ہوتے رہے ہوں اور تڑپتے ہوں، خانہ خدا کے اندر صرف ایک جھات مارنے کے لیے تو ایسے لوگ در کعبہ کے قریب بھی پھٹک نہیں سکتے.. عجیب انصاف ہے..

خلق خدا جن سے عاجز ہے در کعبہ صرف ان کے لیے وا ہوتا ہے..

ایک میراثی نے چودھری صاحب کے بیٹے کی ولادت کی خوشی میں لڈو بانٹتے ہوئے کسی کی جھولی میں ایک ڈھیر ڈال دیا.. کسی کو ایک لڈو پر ٹرخا دیا اور کسی کو دھتکار دیا کہ یہ تو اللہ پاک کی تقسیم ہے اور پھر سب مزارعوں کو برابر کے لڈو جھولی میں ڈالے کہ یہ تو رسول پاکؐ کی تقسیم کی ہے..

تو در کعبہ کے سلسلے میں بھی اسی قسم کی اللہ پاک کی تقسیم رائج تھی....

چوکھٹ سے چمٹے ہوئے.. لپٹے ہوئے اور لٹکے ہوئے لوگ الگ نہ ہوتے تھے.. لگتا تھا کہ وہ اسی حالت میں پیدا ہوئے تھے.. ہمیشہ سے در کعبہ کا حصہ رہے ہیں.. چاہتے بھی تو اس سے الگ نہ ہو سکتے تھے کہ لوہے کے ایک ذرّے کو یہ اختیار نہیں ہوتا کہ وہ چاہنے سے مقناطیس سے الگ ہو جائے..

میں بھی گرداب میں آیا ہوا ایک ذرّہ تھا..

میرے آس پاس ترک اور ایرانی زائرین کے نہایت تربیت شدہ گروپ مجھ سے کہیں بڑھ کر ایک بحرِ جذب میں ڈوبے ہوئے دعائیں کر رہے تھے... میں بھی جانے کیا کیا پڑھ رہا تھا۔

جو کچھ یاد آتا تھا وہی پڑھتا چلا جا رہا تھا...

جو کوئی یاد آتا تھا اسے یاد کرتا چلا جاتا تھا۔

"اے اللہ، بے شک یہ حرم آپ کا حرم ہے.. اور یہ شہر آپ کا شہر ہے.. اور آپ کا امن واقعی امن ہے اور بندہ آپ کا بندہ ہے.. میں دُور کے شہر سے حاضر ہوا ہوں.. بہت سے گناہوں اور برے اعمال کے ساتھ.. میں آپ سے سوال کرتا ہوں اس شخص کا سا سوال جو بہت مجبور ہے اور آپ کے عذاب سے ڈرنے والا ہے.. اس بات کا سوال کہ آپ مجھے اپنی معافی سے اپنے حرم میں رکھیں..."

یہ حرم آپ کا حرم ہے.. اس میں کوئی شک نہیں..

یہ شہر آپ کا شہر ہے.. بے شک..

بندہ آپ کا بندہ ہے.. کون انکار کر سکتا ہے..

اور میں بھی دور کے شہروں سے.. شہر لاہور سے حاضر ہوا ہوں..

بہت سے گناہوں اور برے اعمال کے ساتھ.. ان کا شمار نہ کریں، نہ مجھے شرمندہ کریں، نہ آپ شرمسار ہوں کہ میں نے کس بندے کو خود ہی بلا بھیجا ہے.. ہم دونوں کی بہتری اسی میں ہے کہ شمار نہ کریں، حساب کتاب نہ کریں۔

رند بخشے گئے قیامت میں
شیخ کہتا رہا.. حساب حساب

تو حساب کتاب نہ کریں..

اپنی معافی سے اپنے حرم میں رکھیں

میں دور کے شہر سے.. شہر لاہور سے آیا تھا۔

لیکن میرے آس پاس طواف کے بہاؤ میں بہتے جتنے بھی قطرے تھے.. اس متحرک سفید صحرا کے جتنے بھی ذرّے تھے وہ مجھ سے بڑھ کر دور سے آئے تھے.. شی آن سے.. کاشغر اور بخارا سے.. خرطوم اور مراکش سے.. داغستان سے اور بالی سے.. امریکہ سے اور یہاں تک کہ آئس لینڈ سے.. ایک ایسی وسعت صحرائی تھی کہ جس کا بیان ممکن نہیں اور سب کے سب مجھ سے کہیں بڑھ کر دور کے شہروں سے آئے تھے..

تو یہاں جتنے بھی ذرّے تھے اور گردش میں تھے وہ دور کے شہروں سے حاضر ہوئے تھے..

اور کیسی نرالی خصلتوں کے ذرّے تھے.. جو صحرا نہیں ہونا چاہتے تھے کہ وہ اُس گھر کے گرد گرداب میں تھے جو صحرا کو نہیں ذرّوں کو نوازتا ہے.. اگر صحرا ہوتے تو ہم سب گل بوٹے ہوتے.. کچھ تھوہر ہوتے.. کچھ

خوشبودار جھاڑیاں ہوتے.. اور بیشتر محض گھاس پھونس ہوتے..

ہم چونکہ ذرے تھے، اس لیے ہماری الگ الگ محض گھاس کی یا خوشبودار جھاڑیوں کی پہچان نہ ہوتی تھی.. بہاؤ میں کون بہتا چلا جا رہا ہے.. ریت کا ایک ذرہ.. ایک بدبودار پودہ یا ایک مہک آور جھاڑی.. اس کی پہچان نہ ہوتی تھی..

بس سفید ذروں کے بہاؤ کی گردش ہی واحد پہچان تھی..

ابھی تو طواف کا آغاز ہوا تھا... پہلے چکر کے چند قدم اٹھائے تھے لیکن بدن پر وارد ایک زمانے ہوئے تھے کہ ہمیشہ سے یہی چلن رہا ہے.. ہمیشہ سے اس گردش میں ایک ذرہ رہا ہوں..

میں ایک ذہنی طور پر پسماندہ بچے کی مانند منہ کھولے.. جس کی باچھوں سے رال بہتی ہو، اس کی مانند پُرشوق طواف کرتا ہوا خانہ کعبہ کے سیاہ پوش گھر کو تکتا چلا جاتا تھا..

میں اس کی آرائش اور سنہری خطاطی سے آگاہ تھا..

کوئی ایک بار میں نے ان کی شباہت تصویروں میں اور ٹیلی ویژن پر دیکھی تھی..

غلاف کعبہ سے میری آشنائی بہت قدیم تھی..

تب سے جب ایک بار اس غلاف کی بُنت اور کڑھائی پاکستانی ہنرمندوں کے سپرد کی گئی تھی..

کاتنے.. بُنے.. اور کھڈی پر تانا پیٹا چڑھا کر دلکش کھیس تخلیق کرنے کا ہنر ہم سے بڑھ کر کون جان سکتا ہے جن کے آباء میں سب سے بڑا جولاہا شاہ حسین تھا..

انی حسین جولاہا

نہ اوہ مومن، نہ اوہ کافر

جو آہا سو آہا..

تو ہم جو دور کے شہروں سے آئے ہیں...

شاہ حسین کے تخت لاہور سے آئے ہیں...

تو جو ہم ہیں.. وہ ہم ہیں..

نہ اوہ مومن.. نہ اوہ کافر

جو ہم ہیں.. وہ ہم ہیں..

تو اس غلاف کعبہ کو کھڈی پر چڑھا کر اس کے سنہری بیل بوٹے اور آیات نکھارنے کو ایک بار ہم جولاہوں کو بھی حکم دیا گیا تھا.. مصر کے اُس قصبے کے ہنرمندوں کو محروم کر کے ہم جولاہوں سے یہ غلاف بنوایا گیا

تھا جو صدیوں سے اُسے بُنتے اور سنگھارتے آئے تھے..

میں خانہ کعبہ کے اس غلاف کو تکتا چلا جا رہا تھا..

بہت بعد میں انکشاف ہوا کہ یہ جائز نہیں..

دورانِ طواف خانہ کعبہ کو نہیں دیکھتے..

کیوں نہیں دیکھتے..

جس کو دیکھنے کے لیے آئے ہیں تو اسی کو کیوں نہیں دیکھتے..

ایک روز میں نے سُمیر کو صحن حرم میں نفل ادا کرتے دیکھا تو وہ اپنی سیاہ آنکھیں سامنے سیاہ غلاف پر رکھے اسے پٹ پٹ دیکھے چلا جا رہا تھا..

''سُمیری،'' میں نے بعد میں اس سے کہا ''سنا ہے کہ طواف کے دوران یا نماز پڑھتے ہوئے براہ راست خانہ کعبہ کو نہیں دیکھتے..''

''کیوں نہیں دیکھتے.. میرا جی چاہتا ہے اسے دیکھتے رہنے کو... میں تو دیکھوں گا ابو چاہے اجازت نہ بھی ہو''

یہ نہیں کہ میں منہ اٹھائے صرف خانہ کعبہ کو ہی اپنی توجہ کا مرکز بنائے چلتا جا رہا تھا بلکہ میرے آگے پیچھے برابر میں جو لوگ... بچے بڑے بوڑھے عورتیں.. لڑکیاں طواف میں مگن تھے۔ میں ان کو بھی ایک متجسد مسکراہٹ کے ساتھ ایسے تکتا تھا جیسے ایک بچہ جب پہلی بار میلے میں آتا ہے تو اس میں شامل بے شمار لوگوں کو دیکھ کر حیرت اور خوشی میں مبتلا ہوتا ہے.. کہ اچھا یہ بھی میلہ دیکھنے آئے ہیں.. ''میں بھی آیا ہوں'' وہ سب کو بتانا چاہتا ہے۔

فرش سخت تھا اور اس پر چلتے ہوئے پاؤں دکھتے تھے.. جیسے بھاری بالیاں پہننے سے کوئی کان دُکھتے ہیں..

ایک مرتبہ میں نے اپنے آگے چلتے سُمیر پر نگاہ کی تو احساس ہوا کہ وہ چل نہیں رہا بلکہ دونوں کہنیاں پیچھے کیے سینہ پھلائے، آگے کیے پریڈ سی کر رہا ہے۔ تب مجھے یاد آیا کہ روانگی سے پیشتر میمونہ بیگم نے جو ہدایات دی تھیں، ان میں سرفہرست یہ تھی کہ طواف کے پہلے تین چکر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر سینہ تانے (اور اس نے اس کا مظاہرہ بھی کیا کہ... یوں) اکڑ کر سر اٹھا کر لگانے ہیں.. کیوں؟ صلح حدیبیہ کے تحت جب رسول اللہؐ اپنی اونٹنی قصویٰ پر سوار عمرے کی نیت سے مکہ آئے تو صحن حرم میں داخل ہو کر صحابہ سے فرمایا ''کفار کے سامنے جو اپنی توانائیوں کا مظاہرہ کرے گا، اللہ اسے اپنی رحمت سے نوازے گا.. رمل کرو تا کہ مشرک مسلمانوں کی قوت اور طاقت دیکھ لیں..'' صحابہ کرام نے ارشاد کے مطابق طواف کے پہلے تین چکر تیز چلتے ہوئے مکمل کیے۔ وہ اپنے سینے پھیلا کر کندھے اونچے کر کے چل رہے تھے، باقی چکر عام رفتار سے مکمل کیے.. کفار نے کہا ''یہ تو ہرنوں کی مانند چلتے ہیں..''

میرے لیے ہرنوں کی مانند چلنا ذرا مشکل تھا.. پھر سوچا کہ تخصیص تو نہیں کی گئی کہ کس عمر کے کیسے ہرن.. عمر رسیدہ اور بھدے بدن کے ہرن بھی تو ہو سکتے ہیں.. چنانچہ میں ہو گیا.. اپنی سست روی کو مہمیز دی، سینہ جہاں تک ہو سکتا تھا پھیلایا اور کندھے اونچے کر کے تیز چلنے لگا..

آس پاس بڑبڑاہٹ تھی، بھنبھناہٹ تھی، شور نہ تھا.. ہزاروں لوگوں کے پسینے کی بو تھی تو سہی لیکن اس میں ناگواری نہیں تھی..

ہزاروں لوگوں کے اجسام کی قربت بھی تھی لیکن گراں نہ گزرتی تھی.. بہاؤ میں بہتے ایک ذرے کو دوسرے ذرّوں کی نزدیکی کیسے گراں گزر سکتی ہے بلکہ وہ شکر گزار ہوتا تھا کہ وہ اسے پہلو بہ پہلو چلنے کی اجازت دے رہے ہیں اور اپنے صحرا کا حصہ بنا رہے ہیں.. دائیں جانب لوگوں کی بھیڑ میں گھرا ہوا مقام ابراہیم کا سنہری شیشے کا شوکیس نظر آ رہا تھا.. اس کے گرد زائرین کا ہجوم بہتا ہوا نکلے جا رہا تھا لیکن ان میں سے کچھ طواف موقوف کر کے اس کے شیشے کو ہاتھ سے مس کرتے، چومتے.. اپنے لباس مفلنے اور چادریں اس سے چھوتے آبدیدہ ہو رہے تھے.. شیشے کے اندر کسی دھات یا پتھر میں ثبت دو بڑے بڑے پاؤں کے نشان ثبت ہیں جو حضرت ابراہیمؑ سے منسوب کیے جاتے ہیں جیسے حسن ابدال میں پنجہ صاحب کا نشان ہے.. یہ بھی روایت ہے کہ یہ وہ مقام ہے جہاں کھڑے ہو کر حضرت ابراہیمؑ نے کعبہ کی تعمیر کی تھی.. خانہ کعبہ سے اتنے فاصلے پر کھڑے ہو کر عمارت کو تعمیر کرنا ممکن نہیں لگتا.. بلکہ ذرا گستاخی کریں تو ناممکن ہے.. جب تک یہ تو رب ہی جانے جس کا گھر انہوں نے تعمیر کیا تھا کہ وہ کہاں کھڑے ہوئے تھے.. بہت بعد میں ایک تاریخی حوالہ سامنے آیا کہ کعبہ کی ایک تعمیر نو کے دوران یہ مقام بدل دیا گیا تھا... ایک بار جب عمارت مخدوش ہو گئی تو اس کی تعمیر نو کا فیصلہ کیا گیا اور شرط یہ ٹھہری کہ اس کی تعمیر میں صرف وہ دولت صرف کی جائے جس کے بارے میں کامل یقین ہو کہ وہ حق حلال کی ہے.. چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ابھی تعمیر کا کچھ حصہ باقی تھا کہ قریش کی وہ دولت ختم ہو گئی جو اس معیار پر پوری اترتی تھی.. تو خانہ کعبہ کا ایک حصہ باقی رہ گیا.. اور یہ حطیم تھا..

یہ بھی روایت ہے کہ رسول اللہؐ چاہتے تھے کہ یہ حصہ خانہ کعبہ کی عمارت میں شامل ہو..

اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان زمانوں میں قریش کا جو آرکیٹیکٹ تھا وہ سمجھتا تھا کہ اس عمارت میں ایک تناسب ہونا چاہیے اور اسے مکعب شکل کا ہونا چاہیے.. چنانچہ اس نے جان بوجھ کر اوریجنل ڈیزائن سے روگردانی کر کے کچھ حصہ عمارت میں شامل نہ کر کے اسے ایک مکعب کی شکل دی.. اور تب سے وہی شکل چلی آتی ہے..

بہر حال یہ طے ہے کہ حطیم ایک زمانے میں یوں حرم کے صحن کا نہیں بلکہ خانہ کعبہ کا ایک حصہ ہوا کرتا تھا، اس لیے یہ اتنا ہی محترم تھا جتنا کہ خانہ کعبہ کا اندرون.. چنانچہ اس کی حدود میں اگر نفل ادا کریں تو گویا خانہ کعبہ کے اندر جا کر ادا کریں اور اس لیے وہاں جگہ پانے کے لیے دھکم پیل ہو رہی تھی..

فی الحال تو اس عمر رسیدہ موٹے ہرن کے لیے یہ ممکن نہ تھا..

''کبھی اچھے وقتوں میں ہم بھی کوشش کر دیکھیں گے۔'' اس ہرن نے حسرت سے سوچا اور چلتا گیا۔

حطیم کے اس کھلے حصے کے عین اوپر خانہ کعبہ کی چھت پر بارش کے پانی کے نکاس کے لیے ایک پرنالہ نصب ہے جسے میزاب رحمت کہا جاتا ہے۔ اگر کبھی مکہ میں باران رحمت کا نزول ہو جائے اور اس کا امکان کم کم ہوتا ہے تو رب کے گھر وندے کی چھت پر جو پانی برستا ہے وہ اسی پرنالے کے منہ سے حطیم پر گرتا ہے لیکن اسے کون گرنے دیتا ہے، آس پاس جو زائرین طواف میں ہوتے ہیں اور منتظر ہوتے ہیں اور وہ اللہ کے گھر پر برسنے والے پانیوں کے نیچے کھڑے ہو کر اس سے اشنان کرتے ہیں۔ چلو بھر بھر پیتے ہیں اور ان کی پیاس نہیں بجھتی۔

استنبول کے ٹوپ کاپی عجائب گھر میں۔ مُہر رسالت۔ رسول اللہ کی کمان۔ خلفائے راشدین کی تلواروں اور لبادہ مبارک کے علاوہ در کعبہ کے قفل جہاں نمائش پر ہیں وہاں سونے اور قیمتی دھاتوں سے ساخت کردہ وہ پرنالے بھی نمائش پر ہیں جو کبھی خانہ کعبہ کی چھت پر برسنے والے پانیوں کو حطیم پر گراتے تھے۔

رات تھی۔ تیز روشنیوں کی چکا چوند میں خانہ کعبہ کے اوپر جو آسمان تھا وہ دکھائی نہ دیتا تھا لیکن جب کبھی نظر آتا تھا تو خالی نظر آتا تھا۔ کہیں بادل کا ایک ٹکڑا بھی نہ تھا۔ اس لیے آج اشنان کرنے کا کوئی چانس نہ تھا۔ آس پاس بڑبڑاہٹ۔ سرگوشیاں۔ ہر ذرہ اپنے آپ میں گم۔ سنگ مرمر پر گھسٹتے ہزاروں ننگے پاؤں کی سرسراہٹ۔

میں ابھی تک اس گردش میں شامل ہو جانے۔ دھتکارے نہ جانے کے چاؤ میں چلتا جا رہا تھا۔ کبھیاں آگے پیچھا کرتا۔ کاندھے ہلاتا۔ پریڈ کرتا چلا جا رہا تھا اور پھر یکدم مجھے خیال آیا اور میں نے اپنے آپ کو بہت لعن طعن کی کہ بھائی تارڑ کیا کر رہے ہو۔ ہونقوں کی مانند ادھر ادھر مشاہدہ کیے چلے جا رہے ہو۔ چپ چپیتے چلے جا رہے ہو اور کچھ نہیں کرنا؟۔ کچھ تو کرو۔ نہ کوئی دعا۔ نہ کوئی فریاد۔ نہ دامن پھیلایا۔ نہ خیرات کے طالب ہوئے۔ نہ کوئی آہ و زاری، کوئی گریہ۔ کیسے گداگر ہو کہ ابھی تک گدڑی میں سے کشکول بھی نہیں نکالا۔ محض میلہ دیکھنے کو تو نہیں آئے۔ کچھ تو کرو۔ چنانچہ میں نے مشاہدہ ترک کیا اور جو کچھ بھی عربی زبان میں یاد تھا۔ پوری کی پوری نماز بھی اور سبحان اللہ اور بسم اللہ۔ اور اللھم لبیک بھی پڑھنے لگا۔ لیکن یہ ذخیرہ محدود تھا۔۔۔ چند قدموں میں ہی ختم ہو گیا۔۔۔ اب کیا کریں۔ پھر یاد آیا کہ گھر سے چلتے ہوئے کچھ احباب نے کچھ عزیزوں نے فرمائشیں کی تھیں۔۔۔ دعاؤں کی التجائیں کی تھیں کہ خانہ کعبہ میں روضہ رسولؐ پر پہنچو تو ہمیں یاد رکھنا۔

یہ ایک عجیب واردات ہے کہ مجھ ایسا شخص بھی اگر حج کی نیت کر لے۔ تو فی الفور ولی اللہ ہو جاتا ہے۔ جونہی خلق خدا تک یہ خبر پہنچتی ہے کہ آپ نے خانہ کعبہ کے لیے رخت سفر باندھ لیا ہے تو آپ بزرگ و برتر اور معتبر ہو جاتے ہیں۔

یہ تو سمجھ میں آتا ہے کہ ان دنوں جب لوگ خشکی کے راستے پیدل چلتے، اگر بیگم کے ہمراہ چلتے تو راستے میں کم از کم دو بچے پیدا کرتے۔ اگر اس طویل سفر کے دوران بچ رہتے تو سرزمین حجاز پر قدم رکھتے ہی بدو

بھائی اسلامی اخوت سے سرشار ہوتے.. یہ نہ جانتے ہوئے کہ مسلم امہ ایک بدن ہے، جس کے ایک فرد کے بدن میں درد ہوتا ہے تو گویا کل امہ درد میں مبتلا ہو جاتی ہے یا کم از کم اسے محسوس کرتی ہے تو یہ نادان بدو بھائی بہت مہربانی کرتے تھے تو ان متوقع حاجیوں کو لوٹ لیا کرتے تھے تاکہ رب کے حضور خالی ہاتھ جائیں اور وہاں سے جھولیاں بھر لیں اور اگر وہ مہربانی کے موڈ میں نہ ہوتے تو وہ اسے اللہ کے گھر تک پہنچنے اور اس سے ملاقات کرنے کے سفر کو مختصر کر کے اسے براہ راست اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچانے کے مقدس فریضہ کو بھی سرانجام دے دیتے۔ یعنی ہلاک کر دیتے۔ اللہ کو پیارا کر دیتے.. اور جب ان میں سے بچ جانے والا کوئی ایک دانہ حج ادا کر کے ثابت واپس اپنے وطن واپس پہنچ جاتا تھا تو اس کی قدر ہوتی تھی اور اسے تقریباً ولی کا درجہ دے دیا جاتا تھا۔

ایسے زمانوں میں حج پر جانے والوں کی منت سماجت کرنا.. کہ میرے لیے دعا کیجیے گا.. طواف کرتے ہوئے بس ایک بار میرا نام لیجیے گا.. یہ تو سمجھ میں آتا ہے... لیکن ان دنوں.. موجودہ صورت حال میں جب کہ وہ لوگ جو ابھی تک حاجی نہیں ہو سکے، اقلیت میں بدل چکے ہیں... یہ جذبے اور نیت کو کوئی عمل دخل ہے.. صرف دولت کو ہے اور وہ بھی نہایت مخدوش دولت کو.. جب کہ پروفیشنل حاجی حضرات نے رجسٹروں پر اندراج کر رکھا ہے کہ اللہ کے فضل سے ہر سال بلاوا آ جاتا ہے اور اتنے حج ہو چکے ہیں اور اس برس پھر سے اس نے بلا لیا ہے.. کیا کریں... بلاوا آ گیا ہے تو جانا ہوگا...

کیا یہ ''بلاوا'' بھی پہلے چیک کر لیتا ہے کہ میں نے کس کے پاس جانا ہے.. اس کے پاس تو نہیں جانا جس کے پلے دھیلا نہ ہو.. کنگلا اور غریب ہو... بے شک عشق رسولؐ میں اور اللہ کے گھر میں حاضر دینے کے لیے مرا جاتا ہو... دن رات دعائیں کرتا ہو اور جب اس کی تمنا پوری نہ ہو تو وہ اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلی دے لے کہ بس بلاوا نہیں آیا...

ویسے اس بلاوے میں بھی کہیں نہ کہیں کوئی بھید ہے... بہت سے لوگ مالی وسائل رکھنے اور خواہش کے باوجود جا نہیں پاتے.. ارادے باندھتے ہیں اور وہ ٹوٹ جاتے ہیں.. عین وقت پر کچھ نہ کچھ ہو جاتا ہے... اور وہ رہ جاتے ہیں.. اور کچھ میرے جیسے جن کی آرزو تو ہوتی ہے لیکن اس میں شدت نہیں ہوتی اور پھر بیٹے کی پوسٹنگ جرمنی کی بجائے جدہ میں ہو جاتی ہے.. زادِ راہ کے لیے بینک میں رقم ناکافی ہوتی ہے اور جس روز یہ سوچتے ہیں کہ چلو پھر کبھی سہی تو بیس منٹ کے بعد ایک فون آ جاتا ہے کہ تارڑ صاحب ہمیں آپ کی ضرورت ہے، کل آ سکتے ہیں.. تارڑ صاحب جا کر آتے ہیں تو جیب میں زادِ راہ بھرا ہوتا ہے.. سبب بنتے چلے جاتے ہیں.. تو اس بلاوے میں کہیں نہ کہیں کوئی بھید تو ہے..

چنانچہ اس کے باوجود کہ تقریباً ہر کوئی حاجی ہو چکا ہے.. ان زمانوں میں بھی خلقِ خدا کسی جانے والے عزیز رشتہ دار کے بارے میں خبر پاتی ہے کہ وہ حج پر جا رہا ہے تو آبدیدہ ہو جاتی ہے، اس کی منتیں کرنے لگتی ہے کہ تارڑ جی.. وہاں میرے لیے ضرور دعا کرنا.. روضۂ رسولؐ پر میرا اسلام کہنا اور میرا نام لے کر کہنا.. جن لوگوں

سے معمولی آشنائی ہے، وہ بھی جذباتی ہو رہے ہیں کہ جناب میری طرف سے کبوتروں کو چوگا ڈال دیجیے گا۔ فون آ رہے ہیں، فرمائشیں آ رہی ہیں اور میں ان کی سادگی پر مسکراتا ہوں کہ کیسے بھولے لوگ ہیں، دعائیں کرنے کے لیے کس کو کہہ رہے ہیں.. مجھ کو!.. میں نے تو آج تک کسی حاجی کو رشک کی نظروں سے نہیں دیکھا تھا... نہ کبھی کوئی فرمائش کرنے کو جی چاہا تھا تو ان کو کیا ہو گیا ہے.. مجھے تو اپنے موبائل یا دوسرے ٹیلی فون کا نمبر بھی یاد نہیں رہتا تو اتنے لوگوں کے نام... جن بچوں کے لیے دعائیں مانگنے کے لیے کے لیے کہہ رہے ہیں، ان کے نام اور جو کچھ مانگ رہے ہیں، وہ کہاں یاد رہے گا. لیکن ہوا یہ کہ وہاں خانہ کعبہ کے گرد چلتے چلتے جیسے میرے سامنے ایک پلازما ٹیلی ویژن کی سکرین نمودار ہو گئی ہے اور اس پر لکھا ہوا آ رہا ہے کہ سروار صاحب نے در ٹیلی فون کیے تھے، ان کے لیے اور ان کی بیگم کے لیے دعا مانگو.. اور یہ دعا مانگو... اب عائشہ کی صحت یابی کے لیے اور اب.. یہ سب کچھ پوری تفصیل سے یاد آتا گیا اور میں ان کی درخواستیں پیش کرتا گیا.. اور جب سب کی سب دعائیں ختم ہو گئیں.. آل اولاد، بہن بھائی، رشتے دار، دوست.. آشنا.. وہ بھی جن کے نام نہیں جانتا تھا صرف چہروں سے واقف تھا. سب کے نام دوہرا دیے۔ ان کے لیے دعائیں مانگ لیں تو پھر اپنے پوسٹ مین، دودھ والے، سبزی فروش، مارکیٹ کے دکانداروں، مالی جو بے شک عیسائی تھا، ان کے لیے بھی خوشحالی اور خوش بختی کی دعائیں کرنے لگا. ایسے ایسے لوگ یاد آئے جو یادداشت کے تہہ خانوں میں کب کے دفن ہو چکے تھے.... ایسے چہروں کے لیے جو راہ چلتے نظر آئے تھے. جو فقیر میری کار کے شیشے بجا کر مجھے متوجہ کرتے تھے اور میں انہیں بھیک نہ دیتا تھا، ناراض ہو جاتا تھا تو وہ بھی یاد آئے.. اور جب کچھ اور باقی نہ رہا تو یقین کیجیے میں نے صدق دل سے کہ رب کے گھر کے گرد گردش میں تھا، منافقت سے کام لینا بھی چاہتا تو نہیں لے سکتا تھا۔ میں نے ان لوگوں کے لیے بھی دعائیں مانگیں جنہوں نے مجھ پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا۔ دشمن تھے، حاسد تھے جنہوں نے میرا رزق روکنے کی بھی سرتوڑ کوشش کی۔ میں نے ان کے لیے اور ان کی آل اولاد کے لیے بھی دعائیں مانگیں.. میں یقیناً وہ نہ تھا، جو لاہور میں تھا، کوئی اور تھا.. کون تھا.. پتہ نہیں کون تھا، میں نہ تھا..

خانہ کعبہ کے گرد طواف کرتے ہوئے آپ تنہا نہیں چلتے.. ہمیشہ کے لیے گم ہو چکے... خاک ہو چکے.. بچھڑے ہوئے بھی آپ کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں..

جو بچھڑ چکے ان سے ملاقات ہو جاتی ہے..

جن کو آپ نے اپنے ہاتھوں سے دفن کیا تھا.. اور مٹی ڈالنے سے پہلے کفن کے بند کھول کر ان کے لاڈلے پیارے چہرے قبلہ رخ کیے تھے.. ان کا منہ وَل کعبے شریف کیا تھا، ان سے ملاقات ہوتی ہے..

بے شک وہ مختلف شہروں اور قبرستانوں میں دفن ہوں، یہاں ان سب سے ایک ہی جگہ ملاقات ہو جاتی ہے..

صرف ان سے جو کبھی یہاں آئے تھے..

یہ میری نانی جان فاطمہ بی بی ہیں۔ ضُعف اور عمر سے جھکی ہوئیں.. اسی کعبے کا طواف کر رہی ہیں.. انہی پتھروں پر چل رہی ہیں.. سر اٹھا کر کعبہ کو اپنی بجھتی ہوئی نیلی آنکھوں سے تکتی جاتی ہیں.. اور ان میں جو آنسو بھرتے ہیں وہ بھی نیلے رنگ کے ہیں۔

اور کہیں ہوک اٹھتی ہے کہ میری امی جان بھی تو انہی پتھروں پر چلتی تھیں اور میں جانتا ہوں کہ ان کے ترشے ہوئے باریک اور نازک لبوں پر کس کا نام تھا.. وہ کس کے لیے دعائیں مانگتی تھیں.. جیسے آج اوّلین آہ دعا کی امی کے لیے تھی... وہ بھی میرے ساتھ ساتھ چلی آ رہی تھیں..

میرے شاندار ابا جی نے اپنی دراز قامتی اور وسیع تن و توش کو بڑھاپے میں جانے کیسے سنبھالا ہوگا.. کیسے یہاں چلے ہوں گے..... مجھے یاد ہے ہم نے انہیں عمرے کے لیے تنہا بھیج دیا تھا اور پھر پچھتاتے تھے کہ سفر کی صعوبتوں کو وہ کیسے سہار سکیں گے.. لاہور ایئرپورٹ کے لاؤنج میں وہ سر جھکائے بہت اداس اور خوفزدہ سے بیٹھے تھے اور ان کے گلے میں سلجوق کی سکول والی پانی کی بوتل تھی جسے وہ سینے سے لگائے تنہا بیٹھے تھے.. پھر انہیں مکہ میں لیبیا سے آنے والا ایک نوجوان سفارت کار مل گیا۔ ان کی شخصیت اور بڑھاپے کی بیچارگی سے اتنا متاثر ہوا کہ سگے بیٹوں سے بڑھ کر ان کی خدمت کی.. دیکھ بھال کی.. خود بھول گیا کہ میں یہاں کس مقصد کے لیے آیا ہوں اور یہی مقصد بنا لیا کہ ان نیلی آنکھوں والے بابا جی کا خیال رکھنا ہے... سہارا دینا ہے.. ابا جی آخری سانسوں تک اس گمنام لیبیا کے نوجوان کو یاد کرتے رہے۔

طواف کرتے ہوئے کبھی نانی جان دکھائی دے جاتیں اور کبھی امی جان میرے ساتھ چلنے لگتیں اور ابا جی تو یہاں بھی یہ خیال رکھ رہے تھے کہ کہیں مستنصر تھک تو نہیں گیا.. اسے دھکے تو نہیں لگ رہے.. اس نے رات کا کھانا نہیں کھایا... اور اس کے آگے پیچھے اس سے قد میں نکلتے ہوئے جو نوجوان ہیں جو اس کا خیال ایسے رکھ رہے ہیں جیسے اگر وہ میرے ہمراہ آتا تو میرا خیال رکھتا.. میرے پوتے ہیں اور اس تیمیر کی شکل تو مجھ سے بہت ملتی ہے.... مجھ پر گیا ہے۔

یہ صرف رب کا گھر نہ تھا.. بچھڑے ہوؤں سے ملاقات کا گھر بھی تھا...

یہیں میمونہ کے والد بھی ہوں گے جنہیں میں پہچان نہ پا رہا تھا۔ وہ تو ان زمانوں میں آئے تھے جب یہ حرم سادہ ہوتا تھا... بھڑکیلا اور چکاچوند والا نہ ہوتا تھا... صحن کعبہ کا فرش سنگ مرمر کا نہ تھا... سنگریزوں کا تھا جو مکے کی آتش دھوپ میں سلگنے لگتے تھے اور ان پر جتنے پاؤں طواف کے لیے اٹھتے تھے چھالوں سے مزین ہو جاتے تھے... ابھی کچھ دنوں کی بات تھی جب صفا و مروہ کی اصل پہاڑیوں کے پتھر موجود تھے اور زائرین دکانوں اور مکانوں کے درمیان سعی کرتے ان تک پہنچتے تھے... وہ لاہور واپس آئے تو چل نہ سکتے تھے، ان کے بیٹے ٹرین کے ڈبے میں سے اٹھا کر انہیں گھر تک لائے..

وہ بھی یہاں تھے چودھری عبدالرحمٰن لیکن میں انہیں پہچان نہیں پا رہا تھا... کہ وہ میری شادی سے

بہت پہلے میمونہ کو چھوڑ گئے تھے..

البتہ میں ان ضعیف موٹے شیشوں کی عینک والی.. ریشمی سفید بالوں والی.. ستھری اور ایک گڑیا سی.. گوری چٹی مائی کو خوب پہچانتا تھا.. یہ میمونہ کی امی تھیں زینت بی بی.. آخری عمر میں بھی ذہنی طور پر اتنی چوکس اور بیدار کہ کرکٹ کی کومنٹری بن کر فیصلے دے رہی ہیں کہ اس بچے نے باہر جاتے ہوئے بال کو خواہ مخواہ چھیڑا ہے تو آؤٹ ہو گیا ہے اور اس کا فون تو ملاؤ میں اس سے بات کرتی ہوں کہ ہندوؤں کے مقابلے میں کیوں آؤٹ ہو گیا ہے نالائق کہیں کا.. ستھری اتنی کہ ہمیں ملنے آئیں گی تو اپنی روٹی کے لیے آٹا خود گوندھ کر ساتھ لے آئیں گی کہ میمونہ مجھے نوکرانیوں کے گوندھے ہوئے آٹے کا اعتبار نہیں، جانے وہ ہاتھ دھوتی ہیں یا نہیں اور بسم اللہ پڑھتی ہیں یا نہیں.. میں جانتا تھا کہ طواف کرتے ہوئے انہوں نے کسی اور کو سہارا تو دیا ہوگا، خود کسی کا سہارا نہیں لیا ہوگا.. کہ وہ خوددار بہت تھیں اور ان میں اکھڑ پن بہت تھی کہ ان کے بیگے دادا جان سکھ تھے جو بچپن میں مسلمان ہو گئے...

یہیں کہیں میری خالائیں بھی طواف میں تھیں..

عجیب سلسلہ تھا..

جو بچھڑ چکے تھے اس دنیا کے میلے میں ان سے ملاقات ہو رہی تھی..

لیکن صرف ان سے جو یہاں حاضر ہوئے تھے..

اور مجھے یہی قلق تھا

مجھے اپنے دادا اور دادی سے ملاقات کی بھی تمنا تھی..

پر وہ یہاں نہیں تھے..

لیکن وہ میرے.. میرے اباجی کے یہاں ہونے کا سبب تھے..

اگر وہ اپنی زمین بیچ بیچ کر اپنے اکلوتے بیٹے کو نہ پڑھاتے.. شریکوں کے طعنے اور پھبتیاں کہ.. یہ چودھری امیر بخش ہے بھوئیں بیچ کر اپنے بیٹے کو پڑھا رہا ہے.. پڑھنا پڑھانا تو ہندو لالوں کا کام ہے.. جاٹوں کو کیا ضرورت ہے تعلیم کی.. کوئی ہتھوڑی ڈالنی ہے، ہل چلانا ہے! کیسا نادان ہے.. سننے کے باوجود.. تو نہ کبھی ابا جی یہاں ہوتے اور نہ میں.. اور نہ ہی میرے دونوں بیٹے..

تو میرے یہاں ہونے کا سبب میرے دادا اور دادی تھے..

اصل حج تو ان کا تھا.. ہم تو محض پرچھائیاں تھے..

میں یقیناً وہ نہ تھا جو لاہور میں تھا.. کوئی اور تھا..

ترک زائرین الڈ سے چلے آ رہے تھے.. کسی حد تک فربہ اور گٹھے ہوئے بدنوں والے.. بے حد منظم اور سنجیدہ.. اپنی خواتین کو گھیرے میں لیے ہوئے.. مجال ہے کوئی اور زائر پاس بھی پھٹک جائے..

ایرانی گروہ جو طواف میں مگن تھے ان کی تنظیم بھی بے مثال تھی.. گروپ لیڈر سر جھکائے ورد زبان فارسی

بلند اور رقت بھری آواز میں دعائیں پڑھتا جا رہا ہے اور بقیہ لوگ چلتے جاتے ہیں اور دوہراتے جاتے ہیں..

سوڈانی، انڈونیشین، ملائیشیا والے.. نائیجیرین.. مراکو والے.. سب کے سب ایک ترتیب سے ایک سلیقے سے رب کعبہ کی قربت میں سر جھکائے گردش میں ہیں.. اور صرف پاکستانی ہیں جو گمشدہ بھیڑیں ہیں..

ان کا کوئی والی وارث نہیں..

اگرچہ یہ اپنے تئیں اسلام کے وارث ہیں.. اپنے آپ کو اسلام کا قلعہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کرتے رہتے ہیں لیکن ان کا کوئی والی وارث نہیں.. یہ ملنگ بابے ہیں جن کا اتحاد اور تنظیم سے کوئی واسطہ نہیں..

میں بھی چونکہ ایک گمشدہ بھیڑ تھا، اس لیے کبھی کسی گروپ کی پیروی کرنے لگتا اور ان کا سربراہ جو کچھ پڑھ رہا ہوتا اسے دوہرانے لگتا اور کبھی کسی اور جانب رجوع کرتا اور ترکی ہیں اللہ اللہ کی ثنا کرنے لگتا..

اور اس دربدری اور گمشدگی میں بھی لطف بہت تھا..

میں اردو، پنجابی یا عربی زبان کی قید میں سے نکل کر کسی اجنبی زبان میں دعائیں دہرانے لگتا تو چند لمحوں میں وہ زبان بھی میری مادری زبان ہو جاتی.. میں کچھ بھی نہ سمجھتے ہوئے سب کچھ سمجھنے لگتا.. یہ لطف تھا..

میرے پسندیدہ شاہ جی.. یعنی اشفاق نقوی نے مجھے بتایا تھا کہ جب وہ جانے کن زمانوں میں طواف کر رہے تھے تو انہوں نے ایک بوکھلائے ہوئے پریشان حال پاکستانی بابا جی کو جو بار بار اپنی دھوتی اڑس رہے تھے حیران تھے اور ان کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ رب کے گھر کے پھیرے لیتا ہوں تو یہاں کیا کرنا ہے اور کیا پڑھنا ہے اور اپنے آس پاس ان لوگوں کو دیکھتے تھے جو اپنی اپنی زبان میں دعاؤں کی فریاد کرتے تھے اور ان کے کچھ پلے نہ پڑتا تھا کہ یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں.. کبھی اس گروہ کے ساتھ چلنے لگتے اور کبھی کسی دوسرے گروپ میں شامل ہو کر ان کی دعاؤں میں شامل ہونے کی کوشش کرتے اور بالآخر جب وہ تنگ آ گئے.. لاچار ہو گئے تو انہوں نے دونوں ہاتھ بلند کر کے خانہ کعبہ سے مخاطب ہو کر نعرہ لگایا.. "توں بلایا اے.. تے میں آ گیاں.."

تم نے بلایا ہے تو میں آ گیا ہوں..

شاہ صاحب کا کہنا ہے کہ اس بابے کی یہ والہانہ پکار ہماری عربی، فارسی، ترکی.. تمام دعاؤں پر حاوی ہو گئی..

چنانچہ مجھ پر بھی وہی وقت آ گیا..

جب میری عربی، فارسی خلاص ہو گئی.. ترکی تمام ہو گئی تو میں بھی گمشدہ پنجابی میں درخواست گزار ہو گیا کہ تم نے بلایا ہے تو میں آ گیا ہوں.. اب جو کرو سو تم کرو..

یا کہہ دو کہ تم نے نہیں بلایا تو ہم اپنی درخواست واپس لے لیتے ہیں۔

لیکن تم کیسے انکار کر سکتے ہو..

آپے پائیاں کُنڈیاں تے آپے کھچناں ایں ڈور..

خود ہی تو ہمیں شکار کیا اور اب دھیرے دھیرے ڈور کو خود ہی کھینچتے ہو کہ دیکھیں کیسی مچھلی شکار کی ہے..

ہُن میں لکھیا سوہنا یار۔ جس دے حُسن دا گرم بزار..
تو سوہنے یار کے حسن کا گرم بازار طواف میں تھا..
ہر ذرّہ اس گرم بازاری سے سلگتا تھا..
ربّا!
میرے حال دا محرم توں!
اے رب اگر تو میرے حال کا محرم ہے..اور تو ہے..
تو تجھے کیا فرق پڑتا ہے کہ میں کس زبان میں تجھ سے مخاطب ہوتا ہوں. تو نے جہاں بھی اپنے پیغامبر بھیجے تو جن لوگوں میں بھیجے ان کی مادری زبان میں بھیجے تو ہم سے غفلت کیوں کی..
پاویں گا دیدار صاحب دا..ہو رہی نیواں ہوئے..
صاحب.
تیرے گھر کے گرد پھیرے لگاتے ہیں صاحب..
صاحب ترا دیدار نہیں پاتا اگرچہ میں نیواں ہوا جاتا ہوں..جتنا جھک سکتا ہوں جھکا جاتا ہوں. تو کیوں دھیان نہیں کرتا.
اور بعض اوقات ذہن بالکل خالی ہو جاتا..ہونٹ خاموش ہو جاتے..نہ کوئی دعا ہوتی اور نہ کوئی خواہش..میں ایک سناٹے میں چلتا جاتا ایک روبوٹ کی مانند. کچھ بھی محسوس کیے بغیر کہاں ہوں، کیوں ہوں اور پھر کسی زائر کا پرشوق دمکتا چہرہ نظر آتا..اس کی اُمڈتی ہوئی آنکھیں مجھے ڈبو دیتیں اور اس کے ہونٹوں پر رواں کوئی دعا مجھے سنائی دیتی تو مجھ میں پھر سے جان پڑ جاتی..میں جان جاتا کہ میں کہاں ہوں اور کیوں ہوں..
میں زندگی میں پہلی بار مکّہ میں تھا..
میں زندگی میں پہلی بار خانہ کعبہ میں تھا..
یہ اجنبی مقام تھے، سراسر بیگانے تھے۔ لیکن ان میں اجنبیت یا بیگانگی تھی نہیں..میں یہاں اتنا ہی نارمل محسوس کر رہا تھا..بے خطر اور بے پرواہ تھا جیسے مال روڈ پر سیر کرتے ہوئے۔ گوالمنڈی میں گھومتے ہوئے..اس کا کیا جواز تھا. صرف یہ تو نہیں کہ میں نے ان مقامات کی تصاویر اور فلمیں بچپن سے لے کر اب تک ایک تسلسل سے دیکھی تھیں تو یہ اجنبی نہ لگتے تھے لیکن تصاویر اور فلمیں تو میں نے لال قلعہ دہلی اور روم کے کلاسیم کی بھی تقریباً اسی تسلسل سے دیکھی تھیں تو پھر دہلی اور روم میں یہ اپنائیت کیوں نہ تھی..کسی حد تک تقدس کا اس میں عمل دخل ضرور تھا لیکن تقدس میں ڈر ضرور ہوتا ہے۔ ایک احتیاط ضرور ہوتی ہے جو یہاں نہ تھی تو پھر کیا تھا. ممکن ہے ہر شخص کے بدن کا کوئی محسوساتی حصہ اپنے وطن اپنے گھر میں بھی بے گھر رہتا ہو..ایک بڑے جہاز کے پہلو میں بندھی ہوئی ایک بادبانی کشتی جو مجبوراً اسی بندرگاہ میں لنگر انداز ہو جاتی ہو جس میں وہ جہاز جا رکتا

ہو لیکن ہر وقت اسے اپنے ایک الگ سے سمندر کی کھوج ہو اور اکثر وہ تلاش بے سود رہتی ہو لیکن کبھی کبھار اسے وہ سمندر مل جائے تو وہ اپنے لنگر بخوشی اس میں اتارتی ہے اور اس سمندر کو گھر کر لیتی ہے.. بدن کا وہ حصہ بھی شائد اسی طور یہاں اس طواف کے گرداب میں شامل ہوا تھا تو پہلی بار اسے گھر مل گیا تھا..

آپ میں جو ہیجان اور اضطراب جنم لیتا ہے وہ بھی خبر کرتا ہے کہ آپ کو کھول کر بدن کے حصے الگ الگ کر کے دوبارہ جوڑا جا رہا ہے.. جیسے ایک مشینری کے تمام پرزے.. کیل کانٹے گراریاں پیچ سب کے سب کھول کر انہیں پھر سے جوڑا جائے تو کہیں نہ کہیں کوئی فرق رہ جاتا ہے.. اس دوبارہ تعمیر سے بعض اوقات خرابی کی صورت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ مشینری جو ایک عرصے سے نہایت بے آواز چلتی آ رہی تھی، اب گھرر گھرر کرنے لگتی ہے اور کئی بار یہ ایک اور مشین ہو جاتی ہے.. اس کے چلنے کا انداز مختلف ہو جاتا ہے.. تو یہاں ایسا ہی ہوا تھا کہ میں کھول کر دوبارہ جوڑا گیا تھا تبھی تو میں وہ نہ تھا جو میں ہوا کرتا تھا..

حطیم کے احاطے کی چار دیواری کے شروع ہوتے ہی بہاؤ خانہ کعبہ سے پرے ہو کر اس کی دیوار کے ساتھ کھیتا جب پھر سے خانہ کعبہ کی عمارت کے پہلو میں بہنے لگتا ہے تو وہاں چاروں کونوں میں سے تیسرا کونہ خدا کے گھر کا سامنے آتا ہے جو رکن یمانی کہلاتا ہے.. اکثر زائرین اللہ اکبر کہتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر اس کی جانب بھی رخ کرتے ہیں..

طواف کی گردش سے جو سمفنی جنم لیتی ہے، اس میں ایک بھنبھناہٹ.. دعاؤں کی سرگوشیاں، التجائیں، آہیں اور ہچکیاں اور اللہ کی ثناء کے سُر تو ہوتے ہیں لیکن اس سمفنی کے پس منظر میں ایک اور ردھم مسلسل کانوں میں اترتی ہے.. ہزاروں قدموں کے فرشِ حرم پر گھسٹنے کی سرسراہٹ.. گردش کی ایک اور سریلی سمفنی سنائی دیتی رہتی ہے.. اور اگر آپ غور کریں تو ہر قدم کے گھسٹنے کی الگ الگ آواز پہچان سکتے ہیں.. اور گھسٹتے قدموں کی یہ مسلسل سرسراہٹ گراں نہیں گزرتی.. جیسے سیاروں کی گردش سے جنم لینے والی کوئی سرگوشی ہو.. جتنے بھی ذرے تھے سیارے تھے جو اپنے محور کے گرد گردش میں تھے اور یہ انہی کی مسلسل سرسراہٹ تھی..

ان تقدیس سے لبریز مقامات پر حاضری کے بارے میں مختلف کلیشے ظہور پذیر ہوتے ہیں اور اگر آپ پر اس کلیشے کے مطابق اثر نہیں ہوتا.. متوقع ردعمل بیان نہیں کیا جاتا تو آپ خارج ہو سکتے ہیں اور ان میں ایک کلیشے یہ بھی ہے کہ مکہ.. خانہ کعبہ ہیبت اور جلال ہیں.. یہاں آ کر انسان ان کی عظمت اور رعب تلے آ کر دھاڑیں مار مار رونے لگتا ہے.. ان کی دہشت میں آ جاتا ہے اور اپنے گناہوں کی معافیاں مانگتا فریاد کرنے لگتا ہے.. لیکن مجھ پر.. بے شک آپ مجھے خارج کریں لیکن میں جھوٹ تو نہیں بول سکتا.. مجھ پر خانہ کعبہ کا یہ اثر ہرگز نہ ہوا، نہ میں ڈرا.. نہ کسی خوف کا شکار ہوا.. نہ میری آنکھوں میں آنسو آئے بلکہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں تو اس کا مہمان ہوں.. بلایا تو صاحب نے تھا تو اس کی مہربانی کا شکرگزار ہوتا ہوں لیکن صاحب بھی تو مجھے داد

دے کہ بلاوے پر میں آ گیا ہوں..

شکریے کا مستحق تو مہمان ہوتا ہے نہ کہ میزبان..اور یہ میزبان مجھے بہت مہربان اور احسان کرنے والا..نرم طبیعت اور معاف کر دینے والا لگا.تو اس سے کیا ڈرنا..بے شک میرے بدن میں ایک ہمہ وقت سنسنی دوڑ رہی تھی۔ایک نئے تجربے میں سے گزرنے کی لرزش ہمکتی تھی لیکن اس میں ہیبت یا جلال کو کچھ عمل دخل نہ تھا.

حطیم اور رکن یمانی کے درمیان میں جو دیوار کعبہ تھی..غلاف کعبہ تو اوپر اٹھا ہوا تھا اور دیوار بڑے بڑے پتھروں کی دیوار جو عیاں تھی، اس کے ساتھ بے شمار مخلوق چمٹی ہوئی تھی۔چہرے اس میں پیوست کیے ہونٹ اس پر ثبت کیے ہاتھ بلند کر کے اسے تھامے ہوئے بے پناہ لوگ کیکڑوں کی طرح اس کے ساتھ چمٹے ہوئے تھے۔نہ اُن میں کوئی جان تھی نہ وہ ذرّہ برابر ہلتے تھے..نہ بولتے تھے کہ ان کے ہونٹوں پر دیوار چپی تھی اور نہ کسی آہ وزاری کا گمان ہوتا تھا کہ ان کی آنکھیں پتھروں پر جمی تھیں..ایسے چسپاں تھے جیسے مقناطیس سے لوہے کے ذرّے چمٹ جاتے ہیں..وہ ایک دائمی آبادی لگتے تھے..جیسے یہ سب کے سب یہیں پیدا ہوئے تھے، یہاں جوان ہو کر یہیں فوت ہوئے تھے اور پھر سے پیدا ہو کر پھر سے چمٹ گئے تھے..

خانہ کعبہ کی دیوار کی اینٹیں جہاں تک ہونٹوں کی پہنچ تھی بوسوں کی نمی سے گیلی دکھائی دے رہی تھیں..جیسے سیلاب کی زد میں آنے والی ایک کچی دیوار میں نمی آنے لگتی ہے..بنیاد سے شروع ہو کر درمیان میں آ چکتی ہے اور اوپر کا حصہ ابھی خشک ہوتا ہے.

کیا ان لوگوں کو گھن نہیں آتی..جہاں ہزاروں لوگوں کے منہ کے پانیوں نے اسے گیلا کر رکھا ہے یہ وہیں پر اپنے ہونٹ کیسے رکھ دیتے ہیں..کیسے اس جراثیموں سے بھری سیلن زدہ دیوار پر اپنے ہونٹ جما دیتے ہیں..کیسے لوگ ہیں..عقیدے میں اندھے ہوئے جاتے ہیں..نہ..یہ میرے لیے نہیں..یہ میرے کرنے کا کام نہیں..طواف ہی کافی ہے۔بے شک خانہ کعبہ کی دیوار ہے لیکن اس کی گیلاہٹ پر ہونٹ رکھ دینے کے لیے جو سرشاری درکار ہے، وہ مجھ میں نہیں اور کیا ہی اچھا ہے کہ مجھ میں نہیں.

یوں بھی یہ سراسر شرک تھا..سیاہ پتھروں سے چنی ہوئی، سفید سیمنٹ سے جڑی ہوئی ایک دیوار کے ساتھ ایک کیڑے کی مانند چمٹ جانا اور اس کی ٹھٹھری ہوئی سطح پر ہونٹ جما دینا شرک نہیں تو اور کیا ہے جب کہ وہ اس کے اندر تو نہیں رہتا..گھر بے شک اس کا ہے لیکن وہ قیام پذیر تو نہیں..اندر نہیں رہتا تو کہاں رہتا ہے..اس کا جواب مل جائے تو سارے بکھیڑے حل ہو جائیں لیکن ابھی تک پتہ نہیں چلا کہ آخر وہ رہتا کہاں ہے..بے شک شہ رگ سے بھی نزدیک ہے لیکن وہاں رہتا تو نہیں..تو پھر کہاں رہتا ہے..

مجھ میں تھکن بالکل نہ تھی..

شائد اس لیے کہ میرے لیے یہ ایک اور ایڈونچر تھا..نامعلوم کو جاننے کی جستجو تھی..میں اس جستجو کی ڈور میں بندھا چلا جا تا تھا کہ دیکھیں آخر میں کیا ہے..یہ ڈور کون کھینچتا ہے.آخر میں کوئی ہے بھی یا نہیں یا واہمہ

ہے کہ کوئی ڈور کھینچتا ہے..

طواف کی گردش میں آئے ہوئے سب کے سب بدن مردوں کے تو نہ تھے۔ عورتوں کے بھی تھے۔ عمر رسیدہ، لاچار، اپنے بھاری بدن گھسیٹتی، بڑھاپے کی ماری ہوئی عورتوں اور.. جوان جہان بھری پُری عورتوں کے بھی تھے.. اور اتنے ہجوم میں، اتنے ٹھنسے ہوئے پیک شدہ اژدہام میں وہ اور آپ یک بدن ہو جاتے ہیں.. آپ کے بدن.. پشت پر بھی اور سینے پر بھی ان بھری پُری نوجوان عورتوں کے جسم ایک مسلسل اور نہایت قربت میں مس ہوتے ہیں، چھوتے ہیں، دبتے ہیں.. ایک عورت چاہے آپ کہیں بھی ہوں کیسی ہی پوتر جگہ پر کیسا ہی پاکیزہ عمل کرنے میں مصروف ہوں، ایک عورت کے بدن کے حصوں کی ایسی جُڑی ہوئی قربت آپ کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتی لیکن.. یہ تو دنیا کے.. حسیات کے اور نفسیات کے فرائڈ کے جنسی اصولوں کے معاملے تھے.. اور وہ دنیا ایسے کٹ کر باہر رہ جاتی تھی اور اس کے ساتھ اس کی تمام تر قدرتی حسیات بھی کہ اس عورت کے بدن کا لمس جو آپ کی پشت سے لگی اپنا بوجھ ڈالتی ہے.. اور اسے آپ محسوس کر رہے ہیں یا اس خاتون کی پشت جو آپ کے آگے چلتی ہوئی رک جاتی ہے اور اس کے وجود کو آپ اپنے وجود کے ساتھ پیوست پاتے ہیں تو وہ عورت.. وہ خاتون یا تو آپ کی ماں ہوتی ہے.. یا بیٹی.. اس کے سوا کچھ نہیں۔ ریت کے ایک ذرے برابر بھی اور کچھ نہیں ہے۔

جیسے آپ ماں سے لپٹ جاتے ہیں.. جیسے بیٹی آپ سے لپٹ جاتی ہے.. تو ریت کے ایک ذرے کے برابر بھی اور کچھ ہوتا ہے؟

یہ ایک حیرت ناک اور اچنبھے میں ڈال کر ایک عجیب سی مسرت سے ہمکنار کرنے والا تجربہ تھا.. انسانی بدن کی خصلت بدل جائے.. وہ تابع ہو جائے۔ اس مقام کی اخلاقیات کا اور دم نہ مارے.. اور کا اور ہو جائے.. یقیناً مجھے پُرزہ پُرزہ کر کے کھول کر دوبارہ ایسے جوڑا گیا تھا کہ بس وہ نہ رہا تھا جو کہ تھا.. کوہ طور پر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ سے کہا تھا کہ.. میں وہ ہوں جو کہ میں ہوں.. اسے یہ بھی تو کہنا چاہیے تھا کہ میری قربت میں آ کر تم وہ نہیں رہو گے جو کہ تم تھے..

دوبارہ جوڑتے ہوئے عورت مجھ میں سے خارج کر دی گئی تھی.. اور وہاں صرف ماں، بیٹی اور بہن رہ گئی تھی.. ان کے سوا ریت کے ایک ذرے کے برابر بھی اور کچھ نہ تھا..

یہ سات پھیرے طواف کے کیسے ثمر آور ہوتے ہیں.. کیسے قبول ہوتے ہیں۔ کونسی دعائیں ہیں جنہیں پڑھنے سے اور کونسی فریادیں ہیں جن کے کرنے سے قبولیت کی سند ملتی ہے.. یہاں کچھ بھی پڑھنا فرض نہیں، واجب نہیں.. کچھ بھی نہ پڑھیں، گونگے ہو کر چلتے رہیں تب بھی طواف قبول ہو جاتا ہے..

رُکن یمانی کے گرد بہتے ہوئے جب کہ بہت سے لوگ ہاتھ بلند کر کے خانہ کعبہ کے اس کونے کو بھی مخاطب کر رہے تھے، ہم بہاؤ میں بہتے تھے کہ یکدم اس بہاؤ کے آگے شائد کوئی رکاوٹ آ گئی.. میرے آگے

چلنے والے لوگ جھجکنے لگے.. اپنے پاؤں کو روکنے لگے.. تھمنے لگے اور اس کا سبب یہ تھا کہ طواف کا پہلا چکر مکمل ہونے کو تھا.. ہم صحنِ کعبہ میں نمایاں اس سیاہ پٹی کی قربت میں تھے جہاں سے ہم نے طواف کا آغاز کیا تھا.. حجرِ اسود کو سلام کیا تھا.. رب سے ہاتھ ملا کر آغاز کیا تھا.. تمام زائرین کی نظریں نیچی ہو کر صحنِ کعبہ کی سفیدی میں نمودار ہونے والی سیاہ پٹی کی متلاشی تھیں کہ وہاں رک کر اس پر کھڑے ہو کر پھر سے "اللہ اکبر" کہہ کر حجرِ اسود کی جانب رخ کر کے اگلا چکر شروع کرنا تھا.. اسی لیے رکاوٹ آ گئی تھی.. لوگ جھجکنے لگے تھے..

میں تنہا ہوتا تو یقیناً ایک شترِ بے مہار کی مانند منہ اٹھائے.. منہ وَل کعبہ شریف کیے دوسرا چکر شروع کر دیتا لیکن سلجوق نے مجھے نکیل ڈال دی کہ ابا.. اب نیچے نگاہ رکھو..

نگاہ تلے وہ سیاہ پٹی آ گئی.. یہ نہیں کہ سراسر واضح اور مکمل دکھائی دی بلکہ ہزاروں گھسٹتے ہوئے قدموں کے درمیان میں سے کہیں کہیں جھانکتی اور پھر اوجھل ہوتی نظر آ گئی اور جب اس پر قدم رکھا تو رُکے.. ہاتھ بلند کر کے اللہ اکبر کہا.. ایک چکر پورا ہو گیا تھا..

کیا ابھی صرف ایک چکر مکمل ہوا ہے..

صرف ایک چکر صدیوں پر کیسے محیط ہو سکتا ہے..

زمانوں پر کیسے حاوی ہو سکتا ہے..

ابھی صرف ایک چکر مکمل ہوا تھا اگرچہ مدتیں بیت گئی تھیں..

ہندوؤں کی شادی کی رسم میں دلہا اور دلہن ایک دوسرے کے ساتھ بندھے مقدس اگنی کے گرد جب کہ اُن پر اُن کے مولوی صاحب طرح طرح کے مشک وکافور چھڑک رہے ہوتے ہیں، پھیرے لگاتے ہیں.. میں آگاہ نہیں کہ ان کے پھیرے کتنے ہوتے ہیں لیکن آج اس آتش کعبہ کے گرد پھیرے لگاتے مجھے احساس ہوا کہ ان دلہا اور دلہن کے بھی احساسات مجھ جیسے ہوتے ہوں گے کہ ابھی ایک پھیرا ہی مکمل ہوا ہے..

طواف بھی تو شادی کی ایک رسم کے مترادف تھا کہ لو بھئی آپ ہمیشہ کے لیے بندھ گئے.. اب وفادار رہنا.. تابعدار رہنا.. روگردانی نہ کرنا.. دیر سے گھر نہ آنا.. صرف ایک مسئلہ تھا کہ یہاں دلہا میاں جن کے ساتھ بندھنا ہے وہ مزے سے اپنے گھر میں بیٹھے ہیں اور دلہن بیچاری ان کی خوشنودی کے لیے پھیرے پہ پھیرے لگا رہی ہے.. مشرقی حیا غالب ہے، کہہ بھی نہیں سکتی کہ باہر آؤ.. مکھ دکھلاؤ.. دیکھوں تو سہی کہ کس کے ساتھ بندھی ہوں..

کچھ دلہنیں لاچار اور معذور تھیں.. چل نہیں سکتی تھیں.. پھیرے لگانے سے قاصر تھیں تو وہ ڈولیوں میں تھیں.. کہار ان کی ڈولیاں اٹھائے طواف کرنے والوں کے ہجوم میں عربی زبان میں.. "ہٹو بچو.. ہٹو بچو" کے نعرے بلند کرتے زور لگاتے سر ہلاتے چلے جاتے تھے..

اور یہ دلہنیں پیدل طواف کرنے والوں سے کہیں بڑھ کر تابعدار اور شائق تھیں.. ان کے لب

دعائیں کرتے.. التجائیں کرتے.. فریاد کرتے تھکتے نہ تھے.. جس گھر میں دلہا میاں بنے پرواہ تھے اس کی دیواروں پر اپنی آنکھیں رکھے ہوئے روتی تھیں اور چونکہ ان کی آنکھیں کعبہ کی دیواروں پر رکھی تھیں، اس لیے ان کے آنسو بھی اسے گیلا کرنے کا سبب بنتے تھے..

ڈولی لے کے آئے کہار..

اور جب یہ کہار آتے تھے تو ہم ان کے لیے راستہ چھوڑ دیتے تھے کہ وہ جاہل اور میرے جیسے جاٹ کہار تھے جو زائرین کا کچھ لحاظ نہ کرتے تھے.. ہجوم میں دندناتے چلتے جاتے تھے اور ان کی اٹھائی ہوئی ڈولیوں کے چوبی کنارے آپ کو زخمی کر سکتے تھے اس لیے ہم ان کے لیے راستہ چھوڑ دیتے تھے..

چلنے پھرنے سے معذور.. اپاہج ایک طویل عمر کے سامنے بے بس ہو چکے.. مائیاں اور بابے.. ویل چیئرز پر بیٹھے.. جنہیں ان کے عزیز دھکیلتے تھے.. جن کے پاؤں طواف میں نہ تھے، آنکھیں اپنے قدم رکھتی چلتی جاتی تھیں.. بیٹے اپنی ماؤں کو سہارا دیتے.. رب کعبہ کے حضور اسے بھولتے صرف اپنی ماؤں کو یاد رکھتے سہارا دیتے.. اور کچھ بیٹیاں اپنے باپوں کو سنبھالتی..

یہ نہیں کہ صرف عزیز رشتے دار ہی ایک دوسرے کو سہارا دیتے سنبھالتے تھے بلکہ ایک لڑکھڑاتے ہوئے گرنے کے قریب ترک بابا جی کو ایک لمبا تڑنگا سوڈانی آگے بڑھ کر ان کا بیٹا ہو جاتا تھا اور انہیں سہارا دے کر چلنے لگتا تھا.. اور بابا جی کی نیلی آنکھوں میں جو آنسو اُمڈتے تھے، وہ اس سیاہ فام بیٹے کو دیکھ کر سیاہ ہونے لگتے تھے..

میرے اس بیان سے آپ ہرگز اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیے گا کہ تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے.. سبھی ایک بھی نہیں ہوتے.. زائرین میں بہت سے ایسے تھے جو نہایت خود غرض اور بدتمیز تھے.. وہ لوگوں کو دھکیلتے.. روندتے انہیں بکھیرتے چلے جاتے تھے.. انہیں کسی سے کچھ غرض نہ تھی کہ خود غرض تھے.. لیکن یہ بہت کم کم تھے..

میں نے متعدد ایسے والدین دیکھے جو اپنے بیمار بچوں کو یہاں لائے تھے تاکہ شفا کی فریاد کی جا سکے..

اور ایسے ماں باپ بھی تھے جو ان بچہ گاڑیوں کو دھکیلتے تھے جن میں ان کے ذہنی طور پر پسماندہ بچے.. منہ کھولے یہ ہرگز نہ جانتے ہوئے کہ وہ کہاں ہیں اور آس پاس کیا ہو رہا ہے.. زور لگاتے ان کی گاڑیاں دھکیلتے دعائیں مانگتے طواف میں تھے..

اور بچہ گاڑیوں میں بیٹھے ہوئے ان فاتر العقل بچوں کے چہروں پر بھی وہی حیرت.. کہ یہ میں کہاں ہو.. اور وہی بے یقینی اور پسماندگی نقش تھی جو میرے چہرے پر تصویر ہو رہی تھی..

میں بھی تو ذہنی طور پر پسماندہ ایک بچہ تھا جسے اس کے بچے دھکیلتے ہوئے طواف کروانے کے لیے لے آئے تھے..

مجھ میں اور ان میں سوائے اس کے اور کوئی فرق نہ تھا کہ وہ بچہ گاڑیوں میں تھے اور میں اپنے پاؤں پر چلتا اپنے بچوں کے ہاتھوں سے دھکیلا جا رہا تھا..

ایک چکر پورا ہو گیا تھا.

جیسے ذکر میں غرق لوگ سر جھٹکتے حالتِ حال میں اللہ ھُواللہ ھُو کا ورد کرتے آس پاس سے غافل ہو جاتے ہیں.. زماں و مکاں سے بے خبر ہو جاتے ہیں ایسے میں بھی ایسا غرق اور بے خبر ہوا ہوں کہ پہلے پھیرے کا ذکر کرتا حالتِ حال میں ایسا آیا کہ ابھی صرف ایک پھیرا مکمل ہوا ہے.. حجرِ اسود کے ملبے سے برآمد ہوتی سیاہ پٹی پر پاؤں آتے ہیں اور ابھی چھ پھیرے باقی ہیں تو جانے کتنے بے شمار سفید کاغذ سیاہ کر دیے ہیں... اگر بقیہ چھ پھیروں میں غرق ہوتا ہوں.. ان کا ذکر کرتا ہوں تو ان کے بیان کے لیے ایک ضخیم کتاب درکار ہوگی. یہیں ایسا غافل ہو گیا تو حج کے تذکرے کا کیا ہوگا..

ابھی تو ملاقات کی کیفیت میں جتلا ہوں. اگر یہیں جتلا اور غافل رہا تو حج پر کیسے جاؤں گا۔ آپ کو اپنے ہمراہ کیسے لے جاؤں گا.. خانہ کعبہ کے گرد گردش کرتے ہزاروں ذرّوں میں سے ایک ذرّہ. طواف کے پہلے پھیرے کو بیان کرنے میں ہی زمانے گزار سکتا ہے.. یہ نہیں کہ وہ ذرّہ قادر الکلام ہے بلکہ وہ جو قادر ہے وہ اس سے کلام کرتا ہے کہ تو بیان کر.. تجھے میں نے ایک قلم دیا ہے.. اور جتنے بھی شجر ہیں اگر وہ قلم بن جائیں اور جتنے بھی سمندر ہیں وہ روشنائی بن جائیں تب بھی تو میری ذات کو بیان نہیں کر سکتا.. اس کے باوجود تو بیان کر.. جیسے تکھ پہ گھونگھٹ ڈالے ایک دلہن کن انکھیوں سے اپنے دلہا کے سراپے کو تکتی ہے اور جو وہ محسوس کرتی ہے تو بھی بیان کر..

میں اب قدرے اختصار سے کام لیتا ہوں..

سیاہ پٹی پر قدم روک کر.. حجرِ اسود کی جانب ہاتھ اٹھا کر ''اللہ اکبر'' پکارتا ہوں اور دوسرا پھیرا شروع ہو جاتا ہے..

آخری.. ساتواں پھیرا مکمل ہونے کو تھا جب میں نے سمیر سے درخواست کی کہ یار کچھ بندوبست ہو سکتا ہے.. ہم دیوارِ کعبہ سے پرے بہت چل چکے کوئی ایسی صورت نکل سکتی ہے.. دیوارِ کعبہ کے قریب ہونے کی کوئی صورت نکل سکتی ہے.. یونہی ہاتھ لگانے کے لیے.. اسے چھونے کو جی چاہتا ہے.. صرف چھونے کو.. چومنے چاٹنے کو نہیں.. یونہی..

''دیکھیں گے والد صاحب'' اس نے میری درخواست پر کچھ دھیان نہ دیا اور مجھے اپنی لامبی بانہوں کے حصار میں لیے دھکیلتا ہوا چلتا رہا.. اور جب ہم اپنے آخری پھیرے میں تھے اور حطیم سے ذرا آگے ہوئے تو سمیر نے میرا ہاتھ جکڑ کر زائرین کے ہجوم میں سے مجھے یوں گھسیٹا جیسے سمندر میں ناکارہ ہو چکی ایک کشتی کو ریت

پرگھسیٹتے ہوئے ساحل تک لے جاتے ہیں.. بہاؤ کی گردش کو چیرتے ہوئے دھکیلتے ہوئے..کبھی اپنی دراز قامتی سے جھکتے ہوئے زائرین کو سوری کہتے ہوئے وہ مجھے گرداب سے نکال کر خانہ کعبہ کی دیوار کی قربت میں لے گیا..

تب اس نے میرا ہاتھ چھوڑا" والد صاحب قائم رہیے گا" کہ یہاں بھی ہجوم کے زور سے پاؤں اکھڑتے تھے اور اپنے دونوں ہاتھ بلند کیے اور سوا چھ فٹ کی قامت کے بعد اس کے ہاتھ بھی تو تین فٹ مزید بلند ہو گئے تو ان ہاتھوں سے اس نے دیوار کے ساتھ چپٹے ہوئے لوگوں کے سروں کے اوپر دیوار کعبہ پر اپنی ہتھیلیاں جما دیں..اور اتنی سختی سے جما دیں کہ مجھے یقین تھا کہ جب وہ انہیں اٹھائے گا تو دیوار پر ان کے نشان ثبت ہو چکے ہوں گے جیسے گرونانک کا پنجہ صاحب ثبت ہے..نانک بھی تو مکہ آئے تھے..دو تین زائرین جن کے اوپر سمیر کے بازوؤں نے ایک خیمہ سا بنا دیا تھا انہوں نے یقیناً کچھ اندھیرا سا محسوس کیا اور اوپر دیکھا کہ روشنی کیوں کم ہو گئی ہے..اور ان میں سے ایک صاحب نے کرم کیا اور دیوار سے الگ ہو کر پیچھے ہو گئے..

"آ جائیں ابا جی"

اور میں جو سمیر کے سہارے کے بغیر ہجوم میں ڈول رہا تھا فوراً اس کے بازوؤں کے نیچے ہو کر دیوار کعبہ کے ساتھ جا لگا۔ ہاتھ بلند کیے اسے تھاما اور پہلے اپنا ماتھا اس کے ساتھ لگایا اور پھر ہونٹ رکھ دیے..میں نے خود رکھے یا دیوار کچھ آگے ہوئی میرے ہونٹوں کو چھونے کے لیے. کچھ تو ہوا کہ میرا تو کچھ ارادہ نہ تھا، اس گیلی سیلی بھیگی دیوار کو چومنے کا..مجھے تو یہ سوچ کر ہی کراہت آتی تھی کہ وہاں اپنے ہونٹ جا رکھوں جہاں مجھ سے پیشتر ہزاروں گیلے آہیں بھرتے ہونٹ رکھے جا چکے ہوں..کوئی ارادہ نہ تھا..

میں نے مُونا سے ایک سوال پوچھا تھا..اور یاد رہے کہ وہ صفائی ستھرائی چھوت چھات کے معاملے میں بالکل براہمن ہے.."تم نے حجر اسود کو چوما تھا اور تم سے پیشتر ہزاروں لوگ اسے چوم چکے تھے اور تم نے وہیں اپنے ہونٹ رکھ دیے تو کچھ کراہت محسوس نہیں کی.."

کہنے لگی.."نہیں.. بالکل بھی نہیں. مجھے تو یوں لگا جیسے ابھی ابھی حضرت ابراہیم اس پتھر سے اترے ہیں اور پہلی بار میں ہی اسے بوسہ دے رہی ہوں.."

تو میری کیفیت بھی یہی ہو گئی..دیوار کعبہ ابھی ابھی تعمیر ہوئی ہے، اسے ابھی تک کسی نے چھوا تک نہیں..اور میں پہلا شخص تھا جس نے اُس پر اپنے لَب رکھے تھے..ابھی تو اس کے پتھروں میں سے نئی تعمیر کی مہک آتی تھی..نہ جھجک نہ کراہت نہ اس کا کوئی خیال..یہ سب کسی اور دنیا کی باتیں تھیں اور یہ دنیا اور تھی اور یہاں کے محسوسات مختلف تھے..یوں جیسے حاضری اب ہوئی ہے..تکمیل ہونٹوں کی مہر ثبت کرنے سے ہوئی ہے..رجسٹر پر حاضری اس مہر کے لگنے سے مکمل ہوئی ہے..البتہ ناک نے بہت عاجز کیا..دیوار سے ماتھا لگاتا تو ہونٹ جدا ہو جاتے..اور جب ماتھے کو دیوار سے لگے کچھ لمحے بیت جاتے تو ہونٹوں کی جانب سے صدا آتی کہ

اب ہماری باری ہے..ناک چپٹی ہوتی تو کیا ہی آسانی ہوتی..ماتھا اور ہونٹ دونوں لگے رہتے..
آنکھیں بھی دیوار کے ساتھ لگی تھیں..

انہیں جب کبھی جھپکتا تو پلکیں دیوار کعبہ کو چھوتیں..دریار پہ دستک دیتیں..کوئی ہے..اندر کوئی ہے..
میں دیکھ نہیں سکتا تھا کہ آنکھیں جو دیوار کے ساتھ لگی تھیں..صرف کان تھے جو سنتے تھے..آہیں
صدائیں، دعائیں، ہچکیاں، التجائیں، سفارشیں، معافیاں..دے دے سخی بابا اللہ بھلا کرے گا..اور دے دے
اللہ تو کون بھلا کرے گا..دے دے اللہ..تو اس لمحے مجھے اس لاہوری بزرگ کا قول یاد آیا کہ حج کیا ہے؟..منگتے
ہو جانا..ڈھیٹ ہو کر پلّو تب تک نہ چھوڑنا جب تک کچھ مل نہ جائے..تو میں بھی منگتا ہو چکا تھا..اسی لمحے ہو گیا تھا
جس لمحے میرے لب دیوار کعبہ سے پیوست ہوئے تھے..یہاں ایک بڑی مصیبت تھی..دینے والا ایک تھا اور
اس کے گرد ہزاروں گداگر تھے جو مانگتے چلے جا رہے تھے..تو ان میں سے ایک کی صدا جانے اُس تک پہنچتی ہے
یا نہیں..اپنے لیے مانگا..سب کے لیے مانگا..طواف کے دوران جتنی دعائیں کی تھیں جن جن کے لیے کی تھیں
انہیں پھر دوہرایا..جو کچھ یاد آ رہا تھا..کوئی ایک شخص..کوئی ایک بوٹا..کوئی پتہ سب کے لیے مانگ رہا تھا..اور اس
گداگری کے دوران..مسلسل مانگتے چلے جانے کے عمل کے دوران بھی کبھی شک کی ایک کونپل پھوٹتی..تو پلکوں
سے دریار پہ دستک دیتا چلا جاتا ہے..اندر سے کوئی جواب آیا؟..اندر تو کچھ بھی نہیں تو کس سے مانگ رہا
ہے..کیوں ہلکان ہو رہا ہے..وقت ضائع کر رہا ہے یہاں سے کچھ نہیں ملنے کا..کوئی اور در تلاش کر..لیکن شک کی
یہ کونپل پھوٹتے ہی بدن سے ایک ہوک سی اُٹھتی یہ پکارتی کہ میں حاضر ہوں..اور وہ کونپل اس ہوک کے گرم
سانسوں کی زد میں آ کر مرجھا جاتی..مر جاتی..

کیا یہ صرف ماحول تھا جو مجھے اپنے رنگ میں رنگتا تھا..خانہ کعبہ ویران پڑا ہوا ہو..سنسان اتنا ہو کہ
آس پاس..دور دور تک کوئی ذی روح نہ ہو..کڑی دھوپ میں تنہا ہو..اور صرف میں ہوں..تو کیا تب بھی وارفتگی
اور جذب کی یہی کیفیت مجھے نڈھال کر دے گی؟..کیا تب بھی میں اس کی دیوار سے چمٹ کر جذبے کی اسی
شدت اور گہرائی میں ڈوبا مانگتا چلا جاؤں گا..اپنے لیے..دوسروں کے لیے فریاد کرتا چلا جاؤں گا..دستک
دیتا چلا جاؤں گا..یہی جی چاہے گا کہ عمر بھر اسی طور اس دیوار کے ساتھ لگا دیوار ہو جاؤں..اس سفر دشتے کا
حتمی جواب تو تبھی مل سکتا ہے جب یہ حقیقت میں بدل جائے..لیکن شاید امکان یہی ہے کہ صرف ایک تنہا
پجاری اپنے دیوتا سے لاپروا ہو جاتا ہے..پجاری نہ رہیں تو دیوتا بھی متروک ہو جاتے ہیں..ماننے والے
نہ ہوں تو خدا تنہا رہ جاتے ہیں..تو یہ کعبہ..رب کا گھر بھی تو پجاریوں نے ہی بنایا تھا..ماننے والوں نے ہی
اس کا مان بڑھایا تھا..تیرے کعبے کو جبینوں سے سجایا کس نے..ان ماننے والوں کے کھرے اور سچے دلوں
کے درمیان اگر مجھ سا سیاہ دل بھی آ جائے تو وہ بھی دھویا جاتا ہے..میرے من کی کالک اتارنے میں طواف
کرتے ہزاروں پجاریوں کی آہیں اور دعائیں شامل تھیں..دیوار کعبہ پر سبھی جبینیں اور ہونٹ تھے..یہ نہ

ہوتے میں تنہا ہوتا تو یہ کالک کب اترنے والی تھی..

دیوارِ گریہ کی وقعت بھی اس سے لپٹ کر رونے والوں کی دیوانگی سے برقرار رہتی تھی..

خانہ کعبہ کی یہ دیوار بھی ایک دیوارِ گریہ تھی..لیکن یہ کیا کہ درجنوں ماننے والے جو اس کے ساتھ کیکڑوں کی مانند چمٹے ہوئے تھے..دیوار کے پتھروں میں اپنی جان بھرتے تھے اور یک جان ہوتے تھے..اپنے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے گریہ کرتے نڈھال ہوتے تھے..ایک بابا جی ٹھوڑی آگے کر کے بار بار اپنی مختصر داڑھی سے اسے چھوتے اور کہتے..معاف کر دے..معاف کر دے..ایک افریقی کے آبنوسی چہرے پر جو آنسو ڈھلکتے تھے وہ بھی سیاہ دکھائی دیتے تھے جیسے اس کے گناہوں کی سیاہی ڈھل رہی ہے اور ایک انڈونیشین لڑکی تھی..جس کی چپٹی ناک دیوار سے لگ کر مزید چپٹی ہو رہی تھی اور اس کے گرد آنسوؤں کے دھارے بہتے تھے..ایک پاکستانی یا شاید ہندوستانی دیوار پر ہاتھ مارتا ایک عجیب ہیجان میں شکایتیں کرتا روتا جاتا تھا..لیکن یہ کیا کہ صرف میں تھا جو گریہ نہیں کر رہا تھا..آبدیدہ تو تھا لیکن شرمندہ تھا کہ میری آنکھوں کی ریت میں سے چشمے کیوں نہیں پھوٹتے..گیلاہٹ تو ہے لیکن اتنی نہیں کہ آنسوؤں کو جنم دے سکے..میرے رخسار سوکھے ہی رہے..ان پر آنسوؤں کی دھاریں تو کیا ایک بھی آنسو اٹک کر نہ بہا..نہ میں نے سعی کی..نہ اپنے آپ کو آمادہ کیا..میں ایک اداکار تو نہ تھا کہ اپنے آپ کو مائل کرتا کہ اس منظر میں گریہ کرنا ہے..اگر میری آنکھیں خشک تھیں تو یہ اس کی منشا تھی،میرا اس میں کچھ عمل دخل نہ تھا..

اس گیلی دیوار پر میں ہونٹ رکھتا تھا..اسے بوسہ دیتا تھا دیر تک اپنے لب رکھتا تھا..پھر ماتھا ٹیک کر مانگنے میں محو ہو جاتا تھا تو پھر بے تابی ہوتی تھی کہ ایک اور بار وہیں لب رکھ دوں..محبوب کے چہرے کو چومتے ہوئے کون سیر ہوتا ہے..کس کی تسلی ہوتی ہے کہ بس کافی ہے..لب ہٹاتے ہی ایک اور بوسے کی طلب ہوتی ہے..

سُمیر کے بازو مجھ پر سایہ کیے ہوئے تھے اور وہ سر کے عین اوپر دیوار سے لپٹا مجھ سے لاتعلق دنیا جہان سے لاتعلق..میرے لیے ایک اجنبی جانے کیا کیا مانگ رہا تھا..کس کس کے لیے مانگ رہا تھا..کیا میرے لیے بھی کچھ مانگ رہا تھا..یہ تو میں جانتا تھا کہ جیسے میری پہلی آہ و دعائی میری امی کے لیے تھی تو وہ بھی اپنی ماں کو ہی فضیلت دے رہا ہو گا..اس کے بعد والد صاحب کی باری جانے کونسے نمبر پر تھی..اگر تھی..میری ماں نے ہمیں میری خوشی اور خوش حالی کی دعائیں کی تھیں..اور میں نے آج ان کی مغفرت اور جنت کے سب سے اونچے محل مناروں میں ایک رانی کی طرح راج کرنے کی دعائیں مانگی تھیں..سُمیر کی ماں نے بھی یقیناً پچھلے برس اپنی آل اولاد کے لیے التجائیں کی ہوں گی اور آج اس کا بیٹا اس کی صحت اور تندرستی اور اس کی چھاؤں کے سدا رہنے کی دعائیں مانگ رہا تھا..عجیب پنگ پانگ کا کھیل تھا..گیند اُدھر سے اِدھر آتا تھا اور پھر اِدھر سے اُدھر چلا جاتا تھا..

کیا سُمیر میرے لیے بھی کچھ مانگ رہا ہے؟

اگر مانگ لے تو اچھا ہے.. کیونکہ امکان یہی تھا کہ یہاں شاید میری صدا کی شنید نہ ہو.. اس کی سُنی جائے گی..

وہ ایک کمر خمیدہ.. لاچار سا جھکا ہوا بوڑھا تھا..

شاید وہ کوئی ایرانی تھا، تُرک بھی ہوسکتا تھا، شامی بھی..

ٹھوکریں کھاتا.. دھکے سہتا کسی نہ کسی طرح دیوار کی قربت میں پہنچ تو گیا تھا لیکن اس کے سامنے.. دیوار کے ساتھ لگے.. کبھی اس سے جدا نہ ہونے والے.. اس سے جُڑے چمٹے ہوئے لوگوں کی ایک دیوار تھی.. یہاں اس کا کوئی بس نہ چلتا تھا.. اور اگر دیوار سے جُڑے ہوئے لوگوں میں سے کوئی ایک الگ ہوتا.. اپنا مقام چھوڑتا.. تو وہ بہت پیارا لگتا خمیدہ کمر بوڑھا جس کی سفید داڑھی زرد تھے روتے نچڑتی تھی وہ جتنی دیر میں مردہ اُبھری ہوئی نیلی رگوں سے بھرے بازو ایک پانی سے باہر مچھلی کی مانند تڑپاتا.. اور اس کی بجھی بجھی آنکھوں میں کیا کیا التجائیں تھیں.. آنکھیں ہاتھ جوڑتی تھیں، منت سماجت کرتی تھیں کہ مجھے اس دیوار کو چھو لینے دو.. میں نے دوبارہ نہیں آنا، مجھے راستہ دے دو.. صرف ایک بار چوم لینے دو.. اور وہ خمیدہ کمر بوڑھا جتنی دیر میں وہاں پہنچتا.. اتنی دیر میں کوئی اور زور آور زائر اس خالی مقام کو بھر دیتا..

میں اس بابا جی کا چہرہ کبھی نہیں بھول سکتا..

میں نے آئندہ دنوں میں.. حج کے دوران.. روضۂ رسولؐ کی جانب سر جھکائے چلتے ہوئے.. کہیں بھی ایسا چہرہ نہ دیکھا..

اس چہرے پر ہر کسی کے لیے.. جو بھی آس پاس تھے.. جو انہیں دھکیلتے تھے.. ان کا کچھ خیال نہ کرتے، کچھ دھیان نہ کرتے تھے اور جو دیوار کے ساتھ لگے دیوار بنے ہٹتے نہ تھے، ان سب کے لیے اس چہرے پر التجائیں تھیں.. درخواستیں اور عرضیاں تھیں.. کہ مجھے پار پہنچا دو.. میں بھی دور کے شہروں سے حاضر ہوا ہوں.. بے شک بوڑھا کمر خمیدہ لاچار ہوں لیکن حاضر ہوا ہوں.. بے شک یہ حرم آپ کا حرم ہے.. یہ شہر آپ کا شہر ہے.. بہت سے گناہوں اور برے اعمال کے ساتھ میں آپ سے سوال کرتا ہوں.. اور سوال کرنے کے لیے مجھے اس دیوار تک پہنچا دو.. کہ میرا سوال اس شخص کا سوال ہے جو بہت مجبور ہے.. میں بہت ہی دور کے شہروں سے آیا ہوں..

میں نے دیوار سے ہٹنا تو نہیں تھا لیکن مجھے اس چہرے نے ہٹا دیا..

مجھے محسوس ہوا کہ جیسے وہ مجھی سے سوال کرتا ہے کہ مجھے اس دیوار تک پہنچا دو..

میں نے دیوار سے ہاتھ نیچے کیے..

ہونٹ الگ کیے..

اپنے آپ کو جدا کیا..

جدا کیا تو میرے پیچھے جو بہت سے منتظر اور سوالی تھے وہ میرے خالی کردہ مقام کی جانب لپکے۔ لیکن میں نے اپنا بایاں ہاتھ بڑھا کر ان جھکے ہوئے دور کے جانے کون سے شہر سے آنے والے سوالی بابا جی کے لیے راہ بنائی اور شمیر نے انہیں سہارا دیا اور میں نے زیر لب مسکرا کر پنجابی میں کہا "آ جاؤ بابیو" میں نے جو جگہ خالی کی تھی، اس میں پُر ہو جانے سے پیشتر ان بابا جی نے جن پُر تشکر نگاہوں سے مجھے دیکھا ہے..

ایسے دیکھا ہے..

جیسے اس ملاح کو دیکھتے ہیں جو سمندری طوفان کے دوران آپ کو یقینی موت سے بچا کر ساحل پر لے جاتا ہے..

جیسے ایک ڈوب جانے والا شخص اپنی جانب بڑھتے ہوئے ہاتھ کو دیکھتا ہے..

ایک برفانی دراڑ میں گرا ہوا منجمد موت کا منتظر ایک کوہ نورد اُس رسّے کو دیکھتا ہے جو اس دراڑ میں اس کے ساتھی اُتارتے ہیں..

ایسے..اُن بابا جی نے مجھے دیکھا..

بلکہ یہ سب مثالیں ناکارہ اور ہیچ ہیں کہ انہوں نے مجھے کسی اور طرح دیکھا جس میں زندگی اور موت کی کوئی حیثیت نہ تھی..

کیا میں نے ان بابا جی کے چہرے اور تاثرات کو بے جا طوالت دیا ہے..نہیں..بلکہ میں نے تو کچھ بیان نہیں کیا..دور کے شہروں سے آنے والے اس خمیدہ کمر بوڑھے نے جیسے مجھے دیکھا..اس دیکھنے کو بیان کرنے کے لیے ایک زندگی درکار تھی..

اور صرف ایک بار انہوں نے مجھے ان پُر تشکر بجھتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور پھر میری خالی کی ہوئی جگہ میں دیوار کعبہ سے جُڑ گئے..اس کی ایک اینٹ ہو گئے..

ساتواں پھیرا مکمل ہوا اور اس سیاہ پٹی پر قدم رکھا جو حجرِ اسود تک چلی جاتی تھی تو ہم نے اُس پتھر کو جسے میں چوم نہ سکا تھا، ہاتھ بلند کر کے الوداع کہا اور بہاؤ سے الگ ہو گئے۔

میری زندگی کا پہلا طواف مکمل ہو گیا تھا..

''کھوٹے سکّے، کھرے سکّے، ابابیلیں اور گندی جرابیں''

حجرِ اسود سے رخصت چاہ کر ہم مقامِ ابراہیم کی قربت میں نفل ادا کرنے کے لیے کھڑے ہو گئے کہ یہی دستور تھا..

عام دنوں میں خانہ کعبہ کے اندرون میں اور صحن میں مردوں اور عورتوں کے حصے الگ الگ ہیں.. یعنی عبادت کرنے کے لیے.. لیکن حج کے دوران کوئی تخصیص باقی نہیں رہتی.. کوئی بھی کہیں بھی نماز کی نیت کر سکتا ہے یا نفل ادا کر سکتا ہے.. چنانچہ طواف کے خاتمے کے بعد جب میں مقامِ ابراہیم کے نزدیک ہو کر نفل ادا کرنے کے لیے کھڑا ہوا تو ایک جی کو خوش کر دینے والا منظر دیکھا.. یہاں عورت بھی مرد کے برابر تھی اور برابر میں عبادت کر رہی تھی.. میرے بائیں جانب دو افریقی نوجوان عورتیں شوخ اور بھڑکیلے رنگوں کے لباسوں میں نفل پڑھ رہی تھیں اور بلند آواز میں پڑھ رہی تھیں اور پڑھنے کے دوران وہ قدرے جھومتی تھیں.. اپنے بدن کو رقص کے انداز میں وجد میں لاتی تھیں کہ ردھم ان کے خون میں تھی.. طواف کے دوران بھی میں نے کچھ افریقی مردوں اور عورتوں کو دیکھا جو جھومتے باقاعدہ رقص کرتے چلتے تھے.. ایک جانب ملائیشیا کی ایک خاتون سراسر سفید لباس میں لپٹی کھڑی تھی.. لگتا تو یہی تھا کہ وہ بھی نفل ادا کر رہی ہے لیکن وہ درمیان میں اپنی زبان میں اللہ تعالیٰ سے باتیں بھی کرتی چلی جا رہی تھیں.. کبھی ہاتھ اٹھا کر خانہ کعبہ سے مخاطب ہو کر کچھ گزارش کرتی تھیں اور کبھی تو باقاعدہ جھگڑنے پر اتر آتی تھیں.. پتہ نہیں اللہ سے انہیں کیا کیا شکایتیں تھیں.. اب موقع ملا تھا تو گن گن کر پوچھ رہی تھی کہ تم نے میرے ساتھ کیوں کیا اور یہ کیوں نہیں کیا.. اُن کے لہجے سے تو یہی لگتا تھا کہ جھگڑ رہی ہیں، ہو سکتا ہے محبت کا اظہار کر رہی ہوں..

میں نے سوچا جس قسم کی عبادت یہ خواتین کر رہی تھیں یعنی جھومتی تقریباً رقص کرتی اور اپنی زبان میں اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگتی اور وہ بھی نوافل کے دوران تو پاکستان میں تو اس قسم کی ''قباحتوں'' کی کوئی گنجائش نہ تھی..

لیکن ایک ہی صف میں خواتین کے برابر نفل ادا کرنے کا تجربہ مجھے بہت خوشگوار لگا.. مکمل ہونے کا احساس ہوا..

جو لوگ احرام میں تھے اور عمرہ ادا کرنے کی نیت سے آئے تھے وہ مقام ابراہیم کے پاس نفل ادا کر کے صفا اور مروہ کی جانب سعی کرنے کی خاطر چلے گئے.. اور ہم صحن کعبہ میں اطمینان سے گھومنے لگے کہ اس میلے میں گھومنے کا بھی عجیب لطف تھا.. درمیان میں طواف جاری تھا اور ارد گرد صحن کا جو حصہ خالی تھا وہاں لوگ بیٹھے تھے.. باتیں کر رہے تھے.. عبادت کر رہے تھے.. تلاوت میں محو تھے.. بچے دوڑتے پھرتے تھے.. مائیں بچوں کو دودھ پلا رہی تھیں اور کچھ لوگ ہجوم سے الگ کسی ستون کی آڑ میں.. کسی کونے میں اپنے آپ میں.. اپنے آپ میں جو رب تھا، اس میں اور سامنے جو اس کا گھر تھا، اس میں غرق بیٹھے تھے.. یہ وہ تھے جو سب سے بے خبر تھے اور خانہ کعبہ میں تنہا تھے..

''والد صاحب تھک تو نہیں گئے؟''

''نہیں یار..''

''میرا خیال ہے کہ تھک گئے ہیں، آرام کرنا چاہتے ہیں؟''

''کہا جو ہے کہ نہیں تھکا.. ایک اور طواف کر کے دکھاؤں؟..''

وہ دونوں مسکرانے لگے..

دراصل ان کو خدشہ تھا کہ یہ جو ابا ہے جو گھنٹی بجنے پر گھر کا گیٹ کھولنے کے لیے جاتا ہے.. واپس آتا ہے تو دھڑام سے صوفے پر گر جاتا ہے کہ تھک گیا ہوں تو یہ ابا جو زقندیں لگاتا پھرتا ہے تو یقیناً کسی بھی لمحے تھکن سے ڈھے جائے گا اور ہمیں مصیبت میں ڈال دے گا یونہی شوخ ہو رہا ہے.. کہتا ہے کہ ایک اور طواف کر کے دکھاؤں..

''والد صاحب آئیں میں آپ کو ایک شاندار مقام پر لے کر چلتا ہوں.. اور وہاں منظر ہے..''

ہم حرم کے ڈھکے ہوئے حصے میں آئے اور وہاں سے سیڑھیاں طے کر کے پہلی منزل پر آئے..

یہاں بھی خانہ کعبہ کو نظر میں رکھ کر طواف جاری تھا.. خوب رونق تھی.. یہاں ایک منزل کی بلندی سے خانہ کعبہ کی ایک مختلف تصویر نظر آتی تھی، اس کے ریشمی سیاہ غلاف پر سنہری دھاگوں سے کاڑھی ہوئی آیات قریب آتی لگتی تھیں کہ درمیان میں زائرین حائل نہ تھے.. نظر کے سامنے کوئی رکاوٹ نہ آتی تھی.. اور جو سفید گردش تھی ہم اس کی سطح سے اوپر تھے اس لیے اس کے بہاؤ کی تصویر بھی جدا دکھائی دیتی تھی..

ہم دوسری منزل پر پہنچ گئے..

اوپر کھلا آسمان تھا..

اور بدن کو بوسے دینے والی ٹھنڈک بھری ہوا کروٹیں بدلتی آتی تھی.. اور واقعی یہ ایک شاندار مقام تھا..

اور یہاں ایک منظر تھا..

یہاں سے.. سنگ مرمر کے شفاف فرش اور گنبدوں سے آگے.. ریلنگ کو تھام کر نیچے تو نظر کیجیے..

رات کے اس پہر.. شائد تین بج رہے تھے.. صحنِ حرم کے درمیان روشنیوں میں ڈھلا ہوا.. سیاہ غلاف میں ڈھکا ہوا خانہ کعبہ ایک خواب لگتا تھا.. غیر مرئی لگتا تھا.. جیسے یہ گھڑی دو پل کے لیے آسمان سے اُترا ہے.. عرشوں کے سفر نے اسے تھکا دیا ہے تو پل دو پل کے لیے سستانے کے لیے براجمان ہو گیا ہے.. اور خلقِ خدا کو خبر ہو گئی ہے اور وہ اس کے گرد ہو گئی ہے.. اسے گھیرے میں لے لیا ہے کہ تمہیں جانے نہ دیں گے.. اور وہ جو گردش کے گھیرے میں آ چکا ہے، منتظر ہے کہ کب ان کا طواف اختتام کو پہنچے اور میں پھر سے کوچ کر جاؤں.. اللہ عرش پر بے گھر ہے.. لیکن خلقِ خدا بھی جانتی ہے کہ طواف ختم ہو گا تو اس کی نیت کوچ کر جانے کی ہے، چنانچہ طواف ختم ہی نہیں ہوتا.. جاری رہتا ہے.. تو وہ کیسے کوچ کر جائے.. کر بھی جائے تو اوپر رب سرزنش کرے گا کہ جن بندوں کے لیے میں ہوں اور جو میرے بندے ہیں انہیں چھوڑ کر کیوں آ گیا.. تو کیسا گھر ہے..

یہاں سے خانہ کعبہ ایک فلم کا سیٹ دکھائی دیتا تھا اور وہ ان تھک مرکھڑے پھیرے باز اداکار دکھائی دیتے تھے..

اس منظر میں ایک سحر تھا.. ایک جادوگری تھی کہ اس پر یقین نہ ٹھہرتا تھا.. نظر ٹھہرتی تھی تو لاچار ہو جاتی تھی، پھر سے اٹھتی نہ تھی..

میں یہاں سے دوسری منزل کی بالکونی سے نیچے رات کے تین بجے کروٹیں بدلتی ٹھنڈک بھری ہوا اپنے رخساروں پر محسوس کرتا اس منظر کو نہ دیکھتا تو ہم دونوں ادھورے رہ جاتے.. میں بھی اور خانہ کعبہ بھی۔

بہتر تو یہی ہے.. بلکہ مسنون بھی یہی ہے کہ انسان صحن حرم میں خانہ کعبہ کے گرد پھیرے لگائے.. آج سے کچھ عرصہ پہلے یہ منزلیں کہاں ہوتی تھیں..

اور اگر وہاں ہجوم زیادہ ہو.. دشواری پیش آتی ہو تو پہلی منزل پر چلا آئے اور وہاں طواف کی رسم ادا کرلے..

اور اگر وہاں بھی مشکل پیش آئے تو ادھر آ جائے کھلے آسمان تلے اور یہاں اس کے گرد گردش میں آ جائے..

اس میں صرف ایک سخت مقام آتا تھا..

نیچے صحن میں آپ خانہ کعبہ کی انتہائی قربت میں پھیرے لگاتے ہیں تو مسافت مختصر ہوتی ہے..

پہلی منزل پر آ کر اگر چکر لگاتے ہیں تو مسافت میں کم از کم یعنی میرا اندازہ ہے چار پانچ گنا اضافہ ہو جاتا ہے..

اور یہ جو دوسری آسمانی منزل تھی، اس کی چھت پر چلنا شروع کریں تو نیچے کے سات پھیروں کے برابر یہاں ایک پھیرا مکمل ہوتا تھا.. چنانچہ یہ کڑی مسافت تھی.. اس میں ایک مدت صرف ہوتی تھی..

نیچے صحن نصف سے زیادہ خالی تھا.. بھرا ہوا نہ تھا.. وہاں آسانی سے طواف کیا جا سکتا تھا.. پہلی منزل پر

بھی اتنے لوگ نہ تھے کہ وہاں دشواری ہوتو پھر.. یہ لوگ دوسری منزل پر آ کر ایک ایسی ریاضت میں کیوں جتے ہوئے تھے جس کی مسافتیں طویل تھیں.. نیچے وہ اتنی مدت میں چھ سات طواف مکمل کر کے یہ فریضہ ادا کر سکتے تھے، ثواب کے حقدار ٹھہر سکتے تھے..

تو پھر وہ یہاں کیوں آئے تھے..

میرا ایک قیاس ہے.. ایک اٹکل پچو سا اندازہ ہے کہ یہ لوگ محض ایک فریضہ ادا کرنے یا ثواب جمع کرنے کی خاطر یہاں نہ آئے تھے..

نیچے جو یہاں کی نسبت نہایت مختصر طواف تھا، رب کے گھر کے گرد پھیرے تھے، اُن سے اِن کی تسلی نہ ہوتی تھی۔ وہ جان بوجھ کر اس حاضری کو طول دینا چاہتے تھے.. ہجوم میں گھر کر دھکے کھاتے.. لوگوں کو دھکیلتے اُس ہجوم کا ایک حصہ ہوتے.. اس کی موجودگی کی بانہوں میں سانس لیتے محض ایک فریضہ پورا نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ کچھ موج میلہ کرنا چاہتے تھے، تنہا ہو کر اطمینان سے.. لطف لیتے.. خانہ کعبہ کے کُل سراپے کو اپنی آنکھوں تلے رکھتے.. اپنی من مرضی سے آزاد ہو کر چلنا چاہتے تھے..

نیچے اتنے ہجوم میں گھرے رب سے باتیں نہیں ہو سکتی تھیں.. راز و نیاز کے لیے تنہائی شرط تھی.. اور وہ یہاں پوری ہوتی تھی..

اس کے سوا اور کوئی جواز نہ تھا۔

ہوا میں ٹھنڈک اور مامتا بھری آسودگی تھی۔

آسمان قریب بھی تھا اور مہربان بھی.. اس سے کوئی شکایت نہ تھی.. جیسا کہ شعراء حضرات واویلا کرتے ہیں.. جیسے کھلے آسمان تلے پھولی ہوئی سرسوں کے کھیت میں ایک ٹھنڈک بھری زرد مہک ہوتی ہے.. ایسی ٹھنڈک اور مہک تھی..

یہاں بھی.. پورے کے پورے خاندان آباد تھے.. اپنی چٹائیوں پر براجمان.. زادِ سفر چکن کے سنیک تھے.. منرل واٹر کی بوتلوں سے پیاس بجھاتے.. جیسے پکنک پر آئے ہوں.. عبادت میں ڈوبے ہوئے.. قرآن کے کاغذوں کو اپنے آنسوؤں سے گیلا کرتے.. دعائیں مانگتے.. اپنی اپنی طلب اور شوق کی کائناتوں میں گم.. اور ان کے سامنے چھت کے سرے پر جو گیلری تھی اس کے گرد چلتے طواف کرتے گزرتے لوگوں سے بے خبر.. طلب اور شوق میں گم.. میں فرش پر یونہی تادیر نہیں بیٹھ سکتا تھا.. مجھے سہارا درکار تھا.. چنانچہ میں ایک گنبد کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا..

سُمیرا اور سلجوق مجھ سے کچھ دُور کانوں کو چھو کر سینے پر ہاتھ باندھ کر مجھ سے غافل ہو گئے..

میرا اور ان کا رشتہ منقطع ہو گیا اور انہوں نے مجھے ترک کر کے کہیں اور رشتہ جوڑ لیا..

اب میں کیا کرتا..

عبادت کرتے کرتے..احترام کرتے کرتے میں تھک چکا تھا.عبادت اور احترام کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔چنانچہ میں عبادت میں نہیں..عبادت کرنے والوں کے چہروں میں گم ہوگیا..

اُن چہروں میں.جن کی تسلی صحن حرم میں ایک مختصر گردش سے نہیں ہوتی تھی..جن کی مسافتیں طویل تھیں..قرآن پڑھتے.نفل ادا کرتے..یا سر جھکائے گریہ کرتے لوگوں سے پرے.گیلری کے ساتھ چلتے طواف کرتے چہروں میں گم ہوگیا..

اُن سے دور ایک گنبد سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا لیکن اُن چہروں پر زوم ان کر کے انہیں فوکس میں لاتا تھا..

جیسے میڈیا کی زبان میں''بگ بگ کلوز'' کہا جاتا ہے..اس میں لاتا تھا..

رب کے گھر کے گرد..بے شک دوسری منزل پر گرداب میں جان بوجھ کر آتے ہوئے ہر چہرے کو گویا ناک سے ناک ملا کر اتنی قربت سے دیکھتا تھا کہ ان کے مین نقش تو عیاں ہوتے تھے، پر ان کے چہروں پر جو شوق اور عشق کے سامان تھے ان کو بھی رُوبہ رُو پاتا تھا..

میں گویا قرۃ العین طاہرہ تھا کہ چہرہ بہ چہرہ رُو بہ رُو تھا.اگرچہ اُس روگردانی کرنے والی..عشق میں کوچہ بہ کوچہ پھرنے والی خاتون کا حوالہ یہاں مناسب تو نہیں..

ایک ناول نگار نے کہا تھا کہ مجھے صرف ایک چہرہ چاہیے جو اپنی سچائی اور محبت میں ڈوبا ہوا ہو تو میں اُس چہرے پر ایک بڑا ناول لکھ سکتا ہوں.

صرف ایک چہرہ چاہیے..

اور یہاں تو ہزاروں چہرے میری نظر کے فوکس میں آتے تھے جو اپنی سچائی اور محبت میں ڈوبے ہوئے.غرق ہو چکے تھے اور ان پر..ہزاروں ناول لکھنے کا سامان موجود تھا..

میں ایک مرتبہ پھر واضح کر دوں کہ میں کہاں ہوں:

خانہ کعبہ کی دوسری منزل پر..رات کے تین بجے اگرچہ رات کو بھی دن کا سماں ہے.موسم خوشگوار ہوسوں ایسا.ٹھنڈک سے چومتا ہوا.ہوا مہربان..آسمان قریب اور وہ بھی مہربان..نیچے صحن کعبہ میں وہی سفید کائناتی گردش کا سحر انگیز تسلسل.. جہاں میں ہوں اگر خانہ کعبہ کے کل سراپے کو نظر میں رکھنا ہے تو عبادت گزاروں سے آگے بڑھ کر حفاظتی جنگلے کے قریب ہو جائیے اور اسے اپنی نظروں میں تصویر کر لیجیے..ایک جادوئی تصویر..جس کا پرنٹ کسی لیبارٹری میں نہیں نکل سکتا.صرف آنکھوں میں سے نکل سکتا ہے..ایک سیاہ پوش مکعب..پردہ پوش..تقریباً تمام کا تمام سفید پوشوں کے نرغے میں آیا ہوا..وہ ساکن ہے اور وہ حرکت کرتے ہیں.لیکن اس کی ساحری جادوگری کا منظر دیکھنے کے لیے اگر آپ حفاظتی جنگلے تک چلے جاتے ہیں تو خارج ہوتے ہیں.

اُن کا حرج کرتے ہیں جو اس منزل پر طواف میں ہیں..
اُن کے راستے میں آتے ہیں..
اُن کا راستہ کھوٹا کرتے ہیں.. جن کی ذات کے کھوٹے سکّے کھرے ہوتے جا رہے ہیں..

اور ایک کھوٹا سکہ کیسے کھرا ہوتا ہے..
اس کے لیے سات پھیروں کی شرط ہے.. طواف درکار ہے..
پہلے چکر کی تکمیل پر کچھ زنگ جو بھرنے کو ہوتا ہے، بھر جاتا ہے..
دوسرے پھیرے میں وہ آلائشیں جو زمانے نے اس سکّے پر جما دی ہیں وہ اُبھرنے لگتی ہیں..
تیسرا پھیرا اختتام کو پہنچتا ہے تو اس سکّے پر زندگی کی جو عبارتیں ہیں، وہ واضح ہونے لگتی ہیں. غور کرنے پر پڑھی جا سکتی ہیں کہ یہ کب ڈھلا تھا، کس ٹکسال میں ڈھلا تھا.. کہ ہر سکّے پر یہ سب کچھ درج کیا جاتا تھا..
چوتھے پھیرے کے دوران اسے پڑھنے کے لیے غور کرنے کی حاجت نہیں ہوتی.. اس کا ایک ایک حرف ابھر کر سامنے آ جاتا ہے.. اسے پڑھتے تو لکھا ہے کہ میں دور کے شہروں سے آیا ہوں، یہ حرم آپ کا حرم ہے، یہ شہر آپ کا شہر ہے اور یہ بندہ آپ کا بندہ ہے..
پانچویں پھیرے میں آپ تھکے ہوئے ہیں لیکن اس تھکاوٹ کو محسوس نہیں کرتے کیونکہ آپ کے کھوٹے سکے کے کھرے ہونے کے امکان نظر آنے لگتے ہیں.. اور وہاں اس دوسری منزل پر بھی حجرِ اسود کی سیدھ میں ایک سیاہ پٹی ہے جس پر کھڑے ہو کر اللہ اکبر پکار کر ہاتھ ہلا کر آپ طواف کا آغاز کرتے ہیں۔ چھٹے چکر کا اختتام ہوتے ہی یہ خوش کن خبر مل جاتی ہے کہ اے سکّے تو جو ابھی کچھ دیر پہلے کھوٹا تھا.. دنیا کے بازاروں میں تو شاید چل ہی جاتا تھا لیکن دین کے بازاروں میں تیری کوئی وقعت نہ تھی. تو کھرا ہوا ہی چاہتا ہے. کُل عبارتیں واضح ہو چکی ہیں.. تو جانتا ہے کہ تجھ پر کیا لکھا ہے.. "اے اللہ جو ساتوں آسمانوں اور ان سب چیزوں کا رب ہے، جو آسمانوں کے نیچے ہیں.. (اور میں بھی تو ان کے نیچے ہوں) اور جو ساتوں زمینوں کا اور ان چیزوں کا رب ہے جو ان کے اوپر ہیں (اور میں اُن میں سے ایک چیز ہوں) ان چیزوں کا رب ہے جنہیں ہواؤں نے اڑایا ہے (میں بھی اڑتا.. پرواز کرتا یہاں آیا ہوں.. اور میں بہت دور کے شہروں سے آیا ہوں)..
اور جب ساتواں پھیرا اختتام کو پہنچتا ہے، طواف مکمل ہو جاتا ہے تو یہ سکہ جو کبھی کھوٹا تھا کھنکنے لگتا ہے.. جیسے ابھی ابھی ٹکسال میں ڈھل کر نکلا ہو.. یہ اب کسی بھی بازار میں چل سکتا ہے..
صرف سکّے کو اب دھیان رکھنا ہے کہ وہ ایسے عمل نہ کرے.. جن کے نتیجے میں وہ پھر سے کھوٹا ہو جائے..
لیکن سکہ کیا کرے.. اگر تو ہمیشہ کے لیے رب کے گھر میں رہائش اختیار کر لے تو شائد کھرا ہی رہے لیکن اس نے تو واپس دنیا کے بازار میں جانا ہے.. کیا کرے رزق کمانا ہے.. معاشرے کے مطابق چلنا ہے تو اس پر ڈھیروں

دھیرے پھر سے زنگ تو آئے گا.. بے شک اس بار اسے قلق ہوتا ہے کہ یہ زنگ کیوں بڑھ رہا ہے. آلائشیں کیوں جم رہی ہیں.. میں کبھی کھرا تھا. اور پھر سے کھوٹا ہو رہا ہوں. میرے ساتھ بھی بعد میں ایسا ہی ہوا تھا..

تو آپ کا جی تو بھی چاہتا تھا کہ ریلنگ کے پاس کھڑے ہو کر اس خوابناک منظر کو تکتے رہیں لیکن وہاں آپ حائل ہوتے ہیں، طواف میں مصروف ان سکّوں کے راستے میں جو کھوٹے سے کھرے ہونے کے مراحل میں چل رہے ہیں. صرف اس لیے آپ ... پیچھے ہٹ جاتے ہیں..

میں پیچھے ہٹا اور پھر سے اس گنبد کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا. اگرچہ یہاں سے خانہ کعبہ تو دکھائی نہیں دیتا تھا لیکن میں ان لوگوں کو دیکھ سکتا تھا جو اس بلندی پر ان کے گرد طواف میں مگن تھے اور ان کے چہروں کو تا دیر دیکھتے رہنے سے ان پر خانہ کعبہ کو بھی دیکھ سکتا تھا..

چنانچہ میں گنبد سے ٹیک لگائے رات کے اس پہر کی ہلکی خنکی میں جب نہ میرے بیٹے میرے وجود سے غافل ہو چکے تھے، ان ہزاروں چہروں کو تکتا جا رہا ہوں جو مجھ سے کچھ دور.. عبادت میں غرق.. جھکے ہوئے.. سجدے میں پڑے ہوئے. قرآن پڑھتے ہوئے لوگوں سے پرے.. چلتے جا رہے ہیں..

تو ان میں سے ہر چہرہ واقعی ایسا تھا.. جس پر نہ گناہ کی پشیمانگی تھی.. اور نہ ثواب کی حرص. سُرور تھا.. وہ سرورِ رفتہ جو باز آیا تھا. ایک پرمسرت.. چلبلا ہٹ تھی.. جیسے ایک بچہ جب زندگی کی پہلی آئس کریم کھاتا ہے تو اس کے چہرے پر ہوتی ہے.. جیسے برسوں کی جدائیوں کے بعد یونہی کسی موڑ پر مڑتے ہوئے محبوب کی شکل سامنے آ جائے جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے.. اور یہاں تو ہولے سے بادِ نسیم بھی چلتی تھی تو واقعی ہر چہرہ ایسا تھا جس پر ایک بڑا ناول لکھا جا سکتا تھا کہ یہ کیسے دھیرے دھیرے کھوٹا ہوا.. پہلے.. جب اس کے کانوں میں اذان پھونکی گئی تو وہ نواں نکور اور بے داغ تھا اور پھر کیسے دھیرے دھیرے زندگی نے.. معاشرے اور معاش کی مجبوریوں نے اور شاید مذہبی تنگ نظری نے اسے کھوٹا کر دیا..

سب سے زیادہ مذہبی تنگ نظری کھرے سکّوں کو کھوٹا ہو جانے پر مجبور کرتی ہے..

چہرے گزرتے جا رہے تھے..

یہ نہیں کہ میں سراسر بیکار اور نکما بیٹھا رہا..

کبھی مجرم سا محسوس کرتا کہ رب کے گھر میں مہمان ہوں اور اس کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتا.. آس پاس جو مخلوق ہے، حرم کی چھت پر کھلے آسمان تلے وہ کیسے ان انمول لمحات کو کیش کروا رہی ہے.. دولتیں سمیٹ رہی ہے اور تم ایک افیونی کی مانند گنبد سے ٹیک لگائے کاہلی سے اونگھ رہے ہو.. بس چہروں کو تکتے چلے جا رہے ہو اور وہ چہرے جس کو تکتے ہیں تم اس کو نہیں تکتے.. تو میں اس احساس جرم کے بوجھ تلے دب کر اٹھتا اور منہ وَل کعبے شریف نفل پڑھنے لگتا..

سنگ مرمر کا فرش جہاں میں ماتھا ٹیکتا تھا، اس میں بھی شب کی خنکی سرایت کر چکی تھی اور میں دیر تک سجدے میں رہتا تا کہ میرے ماتھے میں بھی اس ٹھنڈک کی سرائت ہو..

میں اب بھی جب کبھی خانہ کعبہ کی کوئی فضائی تصویر دیکھتا ہوں یا ٹیلی ویژن پر اس کا ٹاپ شاٹ یا بلندی سے فلم بند کیا ہوا منظر دیکھتا ہوں تو شور مچا دیتا ہوں کہ دیکھو دیکھو یہ چھت پر جو تیسرا گنبد اُبھرا ہوا نظر آتا ہے، میں اس کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا ہوا تھا. اور میرے بچے مجھے چپ کرا دیتے ہیں والد صاحب ہمیں کیا بتاتے ہو.. ہم بھی تو وہیں تھے.. اور جب بھی سلام پھیر کر دیکھتے تھے تو آپ کو بیکار بیٹھا ہوا دیکھتے تھے..

بچوں نے ہمیشہ یہی سمجھا ہے کہ میں ہمیشہ بیکار بیٹھا رہتا ہوں..

گنبد کے گرد ایک دو اینٹ کی اونچائی کا گھیرا تھا اور میں اس پر بیٹھا تھا اور میرے برابر میں.. مجھ سے دو اینٹ نیچے فرش پر پھسکڑا مارے ایک لال گلال گوری ترُکن. قرآن کے ورق آنسوؤں سے گیلے کرتی خاموشی سے سر ہلاتی پڑھتی جاتی تھی.. چونکہ روشنیوں کی چکا چوند تھی اس لیے میں ذرا سا جھک کر.. جھانک کر.. اس کے سامنے کھلے قرآن کو آسانی سے پڑھ سکتا تھا.. چنانچہ میں نے یہ تانک جھانک شروع کر دی. یعنی میں جھاتیاں مار رہا تھا.. اور قرآن پڑھنے کی سعی کر رہا تھا جو ترکن کے سامنے کھلا تھا.. مجھے تب احساس نہیں ہوا تھا لیکن آج اُس منظر کو دوبارہ زندہ کرتا ہوں تو ذرا حیرت میں کھو جاتا ہوں کہ تب ایک عجیب سا اتفاق ہوا تھا.. وہ تُرکن ظاہر ہے آس پاس اور خاص طور پر میری موجودگی سے سراسر غافل تھی لیکن وہ حیرت انگیز طور پر قرآن کا ورق تب الٹتی جب میں اس ورق کی آخری سطر کو پڑھ رہا ہوتا.. نہ کبھی پہلے اور نہ کبھی بعد میں..

اور پھر کچھ دیر تانک جھانک کے بعد میں پھر سے اپنے سامنے سے گزرنے والے.. طواف میں زندگی کرتے چہروں کو اپنے دھیان میں لے آتا..

وہ جو گیان دھیان میں تھے انہیں اپنے دھیان میں رکھ لیتا..

کچھ مدت بعد میں ان چہروں کو پہچاننے لگا.. ان سے آشنا ہونے لگا..

کسی ایک چہرے کا منتظر رہتا کہ بہت دیر ہو چکی جب وہ میری نگاہوں کے فوکس میں آیا تھا.. اسے اب تک اپنا پھیرا مکمل کر کے آ جانا چاہیے تھا.. منتظر رہتا کہ ابھی وہ نمودار ہوگا اور مجھ سے غافل اپنی دھن میں مگن چلتا جائے گا.. ان چہروں میں ایک قزاق بابا بھی تھے..

چھریرے بدن کو ایک فرغل یا لمبے چوغے میں متحرک کرتے تھے.. سر پر ایک مخروطی قزاق ٹوپی.. نہایت سبے دریغ سفید داڑھی.. اگر پہنے ہوئے ہوتے تو یقیناً گھٹنوں تک آتے فل بوٹ پہنے ہوئے ہوتے.. یہاں تو ظاہر ہے ننگے پاؤں.. چوکڑیاں بھرتے ہوئے آتے اور پل بھر میں گزر جاتے..

مجھے طواف کرنے والوں کے ہجوم میں دور سے ان کی قزاقی ٹوپی نظر آ جاتی اور میں انتظار کرتا کہ کب وہ میرے سامنے سے گزرتے ہیں.. چھاتی تانے.. جیسے اب بھی اپنے وطن قازقستان کی وسیع چراگاہوں

میں گھڑ سوار ہیں..نہایت راضی..رضا مند..چوکڑیاں بھرتے پل بھر میں گزر جاتے..اور اتنے خوش وخرم جیسے ابھی ابھی ان کے خیمے میں ایک پوتا پیدا ہوا ہے..

ایک چہرہ اُس خاتون کا تھا جو شاید شامی تھی، شاید تُرک تھی..اُردنی بھی ہو سکتی تھیں۔ وہ ایک بچہ گاڑی دھکیلتی طواف میں چلتی تھیں اور ظاہر ہے اس بچہ گاڑی یا پریم میں ایک بچہ بھی تھا جو انہی کا ہو سکتا تھا..ایک ماں جائے کو ہی یہ اعزاز نصیب ہو سکتا ہے کہ اس کی ماں اسے طواف پر لے آئے..اتنا ترد٭ کرے..پہلے پھیرے کے دوران میں نے دیکھا کہ بچہ ٹھمک رہا ہے..کلکاریاں مارتا اپنی پریم میں اُچھل رہا ہے..قابو میں نہیں آتا اور اس کی ماں دعائیں مانگنے یا رب کے گھر پر نظر رکھنے کی بجائے اس پر نظر رکھ رہی ہے اور اس سے باتیں کر رہی ہے..اس نے جھکنے پر فدا ہوتی پریم پر جھکی لب سکیڑ کر جیسے اسے چوم رہی ہے..جیسے وہ دونوں ایک پارک میں سیر کرنے کے لیے آئے ہوں

یہ پہلے چکر کا منظر تھا..

اور جب ایک مدت کے بعد وہ دونوں پھر نمودار ہوئے تو بچہ قدرے سنجیدہ ہو چکا تھا..کچھ حیران تھا..اچھل کود میں دلچسپی نہ رکھتا تھا..سُست پڑ چکا تھا..اور جب وہ دونوں تیسری بار دکھائی دیئے..میرے سامنے آئے تو بچہ سو چکا تھا اور وہ خاتون پریم دھکیلتی زیرِ لب دعائیں دوہرا رہی تھی..

دو سیاہ پوش افغان میاں بیوی..مرد سیاہ پگڑی میں..تنا ہوا سیدھا ایک بلند شجر کی مانند..اور اس کے برابر میں اس کی بیوی..گوٹے کناری سے مزین ایک سیاہ بڑے گھیرے والے گھاگھرے میں چلتی، کالی چادر میں لپٹی ہوئی..لیکن چہرہ کھلا..آنکھوں میں سُرمے کے انبار..رخساروں پر نقش ونگار..دونوں بلند قامت ایک خاص رفتار سے بڑھتے چلے جا رہے تھے..اور آخری پھیرے تک ان کی رفتار میں کوئی فرق نہ آیا..

ایک پاکستانی بابا اور بابی بھی تھے..

نہایت عمر رسیدہ ہونے کے باوجود نوخیز جوانی کی مست چال میں چلتے تھے..کبھی باباجی اپنی دُھن میں آگے نکل جاتے..اور کبھی بابی اپنے نیم خمیدہ بدن میں ایک جنگل بیلے میں کودتی ہرنی کی پھرتی بھرتی باباجی کو اوورٹیک کر لیتی..وہ دونوں سفید کھدر کے کرتوں اور تہبند میں ملبوس تھے..البتہ باباجی کے سر پر کھدر کی ایک پگڑی بھی تھی..وہ دونوں آخری پھیرے تک تازہ دم یونہی قلانچیں بھرتے رہے..

سب سے دلچسپ چہرہ ایک درمیانی عمر کے خوش شکل زائر کا تھا..

وہ صاحب باقاعدہ ایک شوخ نیلے رنگ کے جوگنگ سوٹ میں ملبوس تھے، خوش شکل بھی اور خوش بدن بھی..اور چھوٹے چھوٹے قدم دھرتے ایک خاص سُر میں جوگ کر رہے تھے، البتہ پاؤں میں ظاہر ہے جوگر نہیں تھے سرخ جرابیں تھیں..میرا قیاس کہتا تھا کہ موصوف مقامی ہیں مکّہ کے باسی ہیں اور ورزش کے شوقین ہیں۔ چنانچہ کسی پارک وغیرہ میں جانے کی بجائے ادھر آ نکلتے ہیں، شوق بھی پورا ہو جاتا ہے اور ثواب کے

اکاؤنٹ میں بھی سات چکر لکھے جاتے ہیں.. ہم خُرما و ہم ثواب وغیرہ..

ایک افریقی جنٹل مین نہایت رنگارنگ لبادے میں نہایت شاہانہ انداز میں اپنی دراز قامتی پر نازاں چلتے تھے..

میں ان چہروں کو بیان کر رہا ہوں جن سے میں آشنا ہو چکا تھا.. اور اکثر اندازہ لگا لیتا تھا کہ ان صاحب کا طواف مکمل ہونے کو ہے اور اب یہ دوبارہ نظر نہیں آئیں گے..

آشنا چہروں میں اجنبی چہرے بھی شامل ہو جاتے تھے..

ایک چینی بابا جی جن کا قد بہت مختصر تھا، طواف کرنے والوں کی بھیڑ میں نظر ہی نہیں آتے تھے لیکن وہ اپنی موجودگی کی پہچان کروانے کے لیے مسلسل اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے رکھتے تھے.. وہ نظر نہ آتے تو ان کے عمر رسیدہ ہاتھ دکھائی دے دیتے.. وہ کبھی ادھر ہجوم میں ڈوبتے تو ادھر نکلتے اور کبھی ادھر ڈوبتے تو ڈوبے ہی رہتے..

انڈونیشیا کی خواتین سراسر سفید پیراہنوں میں ڈھکی ہوئی تھیں.. ان میں کچھ عورتیں.. سفید فام شاید بوسنیا کی تھیں جن کی نیلی آنکھوں میں آئی ہوئی نمی میں مجھے یہاں گنبد سے ٹیک لگائے بیٹھے بھی خانہ کعبہ کی تصویر جھلملاتی نظر آتی تھی۔

ان طواف کرنے والوں کو دیکھتے دیکھتے.. انہیں نظر میں رکھتے، کبھی لونگ شاٹ میں مشاہدہ کرتے اور کبھی کلوز اپ میں جاتے.. ان کی بے پروائی اور وارفتگی کو کسی حد تک حسد سے محسوس کرتے.. اور یہ بھی دیکھتے کہ ان میں سے کسی ایک چہرے پر بھی ثواب کا لالچ یا بخشش کی تمنا ظاہر نہ تھی.. نہ کوئی ڈر تھا اور نہ اس کی کوئی بپت جو نیچے صحن میں گھر بنائے بیٹھا تھا.. وہ سب کے سب اگر گھومتے تھے.. تیز چلتے.. کبھی دوڑتے.. کبھی تھکن سے مغلوب قدم گھسیٹتے تھے تو محبت کے مارے ہوئے بے غرض اپنی خوشی اور من مرضی سے ایسا کرتے تھے.. میں نے ایسے شانت اور مطمئن چہرے کم ہی دیکھے تھے..

اُن کی گردش خانہ کعبہ کو اپنے گرداب میں لاتی تھی.. اسے اپنی جانب آنے پر اپنے آپ میں جذب ہونے پر مجبور کرتی تھی.. انہیں یوں مسلسل تکتے تکتے میں بھی کچھ حالت وارفتگی میں چلا گیا.. اس گردش پر اتنی دیر سے نظریں جمائے ہوئے تھا کہ جیسے میں کسی طلسم کی زد میں آ گیا اور مجھے یوں لگا جیسے ان کی بے غرض محبت اور عزت نفس ایسی تھی کہ خانہ کعبہ ان کے پاس چل کر آ رہا ہے اور دھیرے دھیرے ان کے اندر منتقل ہو رہا ہے..

اسی بڑے حجم میں نہیں بلکہ جتنے طواف کرنے والے تھے، ان سب میں برابر برابر تقسیم یوں ہو رہا ہے کہ ہر ایک کے اندر چھوٹے چھوٹے منی ایچر خانہ کعبہ ان کے بدنوں میں گھر بنا رہے ہیں.. تعمیر ہو رہے ہیں.. ناخن کی پور جتنے.. غلاف سمیت اور غلاف پر کاڑھی ہوئی آیات اسی حساب سے اتنی باریک ہیں کہ بس سنہری لکیریں ہیں..

یہاں تک کہ جو اصل خانہ کعبہ ہے وہ تحلیل ہوتا جا رہا ہے.. اور جونہی یہ امکان میرے حواس پر اترا کہ یہ لوگ یہاں سے جائیں گے تو ایک پور جتنے خانہ کعبہ کے مکعب اپنے بدنوں میں لیے جائیں گے اور ان میں اللہ بھی

ہوگا تو پہلی بار.صرف نمی نہیں اتری.میری آنکھوں نے ساون بھادوں جھڑیوں کو روکنے سے انکار کر دیا.جو ساون خانہ کعبہ کی پہلی جھلک پر..پھراس کے گرد پھیرے لگاتے ہوئے..اس کی دیوار سے لپٹے دیوار ہوتے ہوئے بھی..جو ساون نہ برساتھا، وہ ان چہروں کو دیکھ کر..جن سب کے حصے میں ایک چھوٹا سا گھر اللہ کا آ گیا تھا اور وہ اسے ساتھ لے جا رہے تھے..وہ خانہ کعبہ کے متولی ہو گئے تھے..تو اس امکان کا جو احساس ہوا تو وہ ساون چھلک اٹھا.کہ یہ کیسے نصیب والے ہیں..یہ لے گئے تو میرے حصے میں کیا آئے گا.

مجھ سے دو ایک فٹ نیچے فرش پر پھسکڑا مارے بیٹھی لال گلال گوری ترکن نے قرآن پاک پر جھکا ہوا سر اٹھا کر ایک بار میری جانب نگاہ کی..اور پھر اپنی نگاہ کو قرآن کے حرفوں پر رکھ دیا..وہ حیران نہ ہوئی.کہ یہ وہ علاقے تھے جہاں جھڑیاں لگتی ہی رہتی تھیں..رخساروں پر آبشاریں بہتی ہی رہتی تھیں..حیران تو وہ پہلے ہوئی ہوگی کہ یہ شخص ابھی تک سوکھا کیوں پڑا ہے.ساون کی جھڑی جب آتی ہے تو اپنی من مرضی سے آتی ہے.تو وہ آ گئی..اس ترکن نے کیا محسوس کیا ہوگا کہ یہ بابا جی جواب جا کر روئے ہیں اور اتنا روئے ہیں تو لمبے ہی گنہگار ہیں جو کہ وہ تھے..پر اس جھڑی میں گناہ کا کچھ خیال نہ تھا.رشک تھا کہ وہ خانہ کعبہ کو دل میں لے جائیں گے اور محرومی تھی کہ میرے پلّے کچھ نہ آئے گا..

میرے بیٹے مجھ سے دور جا چکے تھے.کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا کہ ان میں اتنا انہماک ہے کہ وہ مجھ سے غافل ہو جائیں گے..

آسمان مہربان تھا اور اس میں سے خوشی اور خوشگواری کی پھوار گرتی تھی اور اس آسمان پر میں نے سیاہ پرندوں کے ایک غول کو اڑان میں دیکھا..وہ مکہ کی پہاڑیوں کی جانب سے..وہ پہاڑیاں جن پر کہیں کہیں گھروں کی روشنیاں تھیں اور تاریکی کے راج میں تھیں وہاں سے وہ پرندے اڑتے آ رہے تھے..ان کا ایک غول عین میرے سر پر سے گزر کر نیچے اڑان کرتا صحن حرم میں اترا.ان میں سے کچھ پرندے غول سے جدا ہو کر صحن کے پار اٹھ کر تاریکی میں چلے گئے اور بیشتر نے خانہ کعبہ کے گرد ایک یوٹرن لیا..اور اسے تقریباً چھوتے ہوئے بلند ہوئے اور نظروں سے اوجھل ہو گئے..

تھوڑی دیر بعد ایک اور غول نمودار ہوا.

وہ سینکڑوں کی تعداد میں تھے..

ان کے غول کے غول اترتے تھے..بے آواز اور بے شور جیسے بغیر انجن کے سیاہ چھوٹے چھوٹے گلائیڈر ہوں جو ہوا میں جھولتے آ رہے ہوں..ان میں سے کوئی ایک غول یکدم صحن حرم میں ڈائیو لگاتا اور خانہ کعبہ کے گرد ایک نصف دائرہ بنا کر پرواز کرتا بلند ہو جاتا..یہ کبوتر دکھائی نہ دیتے تھے جو مقدس مقامات اور مزاروں کی علامت ہوتے ہیں..یہ کچھ اور تھے اور میں انہیں شناخت کرنے سے قاصر تھا..

میں نے سلجوق کی جانب دھیان کیا جو کسی اور دھیان میں تھا "جوقی.."
وہ تسبیح میں مصروف تھا..
"جُوقی.." میں نے پھر کہا..
اس نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا..
"یہ پرندے کیا ہیں؟" میں نے مدھم آواز میں پوچھا تاکہ تلاوت میں محو وہ تُرکن ڈسٹرب نہ ہو..
"یہ ابابیلیں ہیں ابو"
"ابابیلیں.. یہاں؟"
"ہاں جی.. رات کے اس پہر یہ اکثر خانہ کعبہ کی عمارت کے گرد پرواز کرتی دکھائی دیتی ہیں.. یہاں خانہ کعبہ کے گنبدوں میں بھی ان کے گھونسلے ہیں اور مکہ شہر کے گرد جو سیاہ پہاڑیاں ہیں، وہاں بھی رہتی ہیں."
ان کا ایک اور غول اترا.. حرم کے صحن میں اتر تا رہا اور پھر غلاف کعبہ کو تقریباً چھوتا اوپر اٹھا اور دوسری منزل پر جہاں ہم تھے، ہمارے سروں پر سے خاموشی سے پرواز کرتا چکا چوند روشنیوں کی زد میں سے خارج ہو کر سیاہ آسمان میں سیاہ ہوتا گم ہو گیا..
ابابیلیں..
یہ چودہ سو برس پیشتر بھی تھیں.
"اور ان کی طرف پرندے بھیجے ابابیل اور ان کے اوپر پتھر پھینکے نشان والے.."
آج بھی ہیں..
آج جب کہ میں ہوں.. یہ بھی ہیں.
اُنہی ابابیلوں کی نسل کے تسلسل میں اب بھی ہیں جنہوں نے کنکریاں برسا کر ابرہہ کی سپاہ کو بھوسے کی مانند کر دیا تھا..
ابرہہ خانہ کعبہ کو ڈھانے آیا تھا کہ لوگ یمن میں تعمیر کردہ اس کے شاندار معبد میں حاضری دیں..
ابرہہ کے سپاہی عبدالمطلب کے سو اونٹ پکڑ کر لے گئے.. عبدالمطلب ابرہہ کی لشکر گاہ میں گئے جو مکہ سے چھ میل کے فاصلے پر المغمس کے مقام پر تھی.. ابرہہ نے انہیں بڑی عزت سے پاس بٹھایا.. "آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں.."
"آپ کے آدمی میرے دو سو اونٹ پکڑ لائے ہیں، وہ مجھے واپس کر دیں.."
ابرہہ نے حیرانی سے کہا.. "میں خانہ کعبہ کو مسمار کرنے آیا ہوں، آپ نے اس بارے میں مجھ سے کوئی درخواست نہیں کی.."
تو عبدالمطلب نے کہا "اے بادشاہ! میں نے اپنے مال کے بارے میں درخواست کی ہے.. میں تو

ان اونٹوں کا مالک ہوں.. بیت اللہ کا مالک خدا ہے، وہ خود اس کی حفاظت فرمائے گا۔"

اور کیسے حفاظت کی!

"اصحاب فیل کا انجام دیکھو تمہارے خدا نے ان کی تدبیریں کس طرح ناکام کر دیں۔ ان پر ابابیل پرندوں سے ایسی کنکریوں کی بوچھاڑ برسوائی جن میں سے ایک ایک کنکری نشان زدہ تھی جن کی زد سے ان کا لشکر خشک گھاس کی طرح پامال ہو گیا۔"

وہ چبائے ہوئے بھوسے کی مانند ہو گئے..

ابرہہ کا لشکر چیچک کا شکار ہو گیا.. ابرہہ کا بدن چھالوں سے بھر گیا..

یہ عام الفیل کہلایا.. ہاتھیوں کا سال!

چودہ سو برس سے زائد کا عرصہ گزرا.. جب ہاتھیوں کا سال تھا اور آج انہی ابابیلوں کی نسل ہمارے سر پر سے اڑانیں کرتی مکہ کی پہاڑیوں میں اپنے گھونسلوں کو لوٹتی تھی.. یہ تسلی کرنے آئی تھی کہ کوئی ابرہہ تو نہیں ہے..

یہ وہ لمحہ تھا جب میں نے اس سفر کے دوران تاریخ کی صداقت پر پہلی مہر لگتی دیکھی..

یہ ابابیلیں قرآن کی تصدیق کر رہی تھیں کہ یہ محض ایک قصہ ایک دیومالائی داستان نہیں.. یہ مستند ہے۔ ایک تاریخی حقیقت ہے

ان ابابیلوں کی موجودگی توثیق کرتی ہے.. شک نہ کرو یہ سب کچھ ہوا تھا.. میرے لیے کشف کا ایک لمحہ تھا.. جس نے مجھے ایک نئی راہ دکھائی.. میں قرآن کو ایمان کو پرکھ سکتا تھا.. یہاں مکہ میں.. منیٰ، عرفات اور مزدلفہ میں.. اور خاص طور پر مدینہ اور طائف میں تاریخ کی صداقت پر مہریں لگتی چلی گئیں اور یہ مجھے ایک ناقابل یقین تشفی سے دوچار کرتی تھیں.. حج کے علاوہ تاریخ کی یہ مسلسل تصدیق تھی جس نے اس تجربے کو میرے لیے بے مثال کیا.. اگرچہ کچھ حرج بھی نہیں لیکن ضروری بھی نہیں کہ آپ آنکھیں بند کر کے ایمان لے آئیں.. بے شک کھلی رکھیں بلکہ بہتر ہے کہ کھلی رکھیں تو بھی آپ کے سامنے تاریخ کی توثیق ہوتی چلی جاتی ہے..

وہ سب چہرے جو طواف میں تھے جن سے میری شناسائی ہو گئی تھی بدل گئے تھے.. ان کی جگہ نئے چہروں نے لے لی تھی.. یہ کچھ اور کھوٹے سکے تھے جو اپنے آپ کو کھرا کرنے کے لیے آ چکے تھے..

وقت کا بہاؤ مدھم اور بے آواز تھا، ابابیلوں کی مانند.. گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا اور سویر کی ہلکی سپیدی کچی لسی ایسی.. ہر سو پھیلنے لگی..

حرم سے پرے.. مکہ کے سکائی سکریپر اور حرم پر اترتے شاندار ہوٹل.. جن کی شاندار آمدنی حرم سے بھی بلند تھی.. ان سے پرے جو سیاہ پہاڑیاں تھیں جن میں مڈل کلاس اہل مکہ اور ابابیلیں بسیرا کرتی تھیں.. اور دونوں چودہ سو برس گزرنے کے باوجود جوں کے توں تھے.. اہل مکہ بھی اور ابابیلیں بھی.. سویر کی سپیدی میں

نمایاں ہونے لگے.. ہم جن چکا چوند برقی روشنیوں کے حصار میں تھے وہ ماند پڑنے لگیں اور صبح کا اجالا ایک دھند کی مانند پھیلتا گیا..

یہ بھی کیا دل میں سرایت کر کے اُسے اُجالتا ہوا اُجالا منظر تھا..

یہ منظر کچھ اور منظر تھا..

نہ یہ ہرات کا طلوع آفتاب تھا.. نہ سندھ کے پانیوں پر پھیلتا.. نہ نانگا پربت کی برفوں پر اترتا.. نہ شاہ گوری کے بدن کو روشن کرتا.. اجالا تھا.. یہ کوئی اور ہی اجالا تھا.. رات کے سیاہ لبادے سمٹتے جا رہے تھے اور رب کے گھر پر اجالا اترتا جا رہا تھا..

پہلے تو نظر دور تک نہ جاتی تھی.. جُرکن دوشیزہ تھی اور اس کا قرآن پاک.. کچھ اور لوگ تھے سجدہ ریز اور عبادت میں مگن اور بیرے بیٹھے تھے کسی اور دھیان میں.. لیکن جب روشنی ہوئی تو ایک خلقت نظر آنے لگی.. دعائیں کرتے.. زیرلب خواہشیں دوہراتے.. تمنا اور آرزو کی مانگ کرتے.. جتنے آبنوس میں تھے ان سے بھی بڑھ کر بہا چکے لوگ.. دور دور تک نظر آنے لگے..

اس دوران.. اُجالا پھیلنے سے کہیں پہلے.. تہجد کی اذان بھی مجھ تک آئی.. اور اپنی گردش سہ دسال میں پہلی بار یہ نماز بھی ادا کی اور بخوشی ادا کی..

پھر فجر کا بلاوا آ گیا..

مخلوق خدا جو غیر سرکاری عبادت میں غرق تھی، اسے سرکاری بلاوا آیا تو خوش ہو گئی..

وہ بھی کیا رات تھی.. اور کیا سویر تھی..

یہ زندگی میں پہلی بار آئی تھی.. اور اس نے دُوجی بار کہاں آنا تھا.. یہ زندگی کا پہلا بوسہ تھا جس کا ایکشن ری پلے ممکن نہ تھا.. عشق کی پہلی کسک تھی اور اس کے بعد ایک اور کسک نصیب میں آ بھی جائے تو وہ سیکنڈ ہینڈ ہو گی..

میں نے جس گنبد سے ٹیک لگائے یہ سحر طراز معجزاتی شب کھلی آنکھوں سے اگرچہ کبھی کبھار جھلملاتی آنکھوں سے.. گزاری تھی تو جب میں وہاں سے سویرے کے سفید سحر میں اٹھا ہوں تو اٹھنے سے پیشتر جو کچھ اب تک میں نے دیکھا تھا.. خانہ کعبہ کو دل میں پوشیدہ کرتے، گھر لے جاتے چہرے.. ابابیلیں اور عبادتیں تو ان سب سے ارفع اور اعلیٰ میں نے ایک منظر اور دیکھا..

اُس منظر کو دیکھا تو جو ساون برس چکا تھا، اس کے بادلوں میں پھر سے پانی بھر گیا اور میری آنکھوں سے برسنے لگا..

میں نے اب تک دھیان نہیں کیا تھا.. کرتا تو بھی رات تھی.. دیکھ نہ سکتا تھا..

دوا بنت نیچے بیٹھی ہوئی لال گلابی.. چٹی گوری جُرکن آلتی پالتی مارے نہیں گھٹنے سمیٹے نماز کی حالت میں

بیٹھی بدستور قرآن پڑھ رہی تھی اور وہاں سے اٹھتے ہوئے رخصت ہوتے ہوئے میری نگاہ اس کے پاؤں کی جانب گئی اور ان پاؤں میں سفید جرابیں تھیں. صبح کے اجالے میں.. میں نے نگاہ کی تو دیکھا کہ سفید جرابوں کی ایڑھیوں پر.. مٹی کے ذرّے تھے.. وہ گندی ہو گئی تھیں.. ایڑھیوں پر زیادہ.. اور دکھائی دیتے تلووں پر کہیں کہیں..

یہ ترکن.. جو میری بیٹی عینی کی ہم عمر ہو گی.. اسی کی طرح گوری چٹی لال گلال تھی.. یقیناً پاک اور مصفا ہو کر حرم میں آئی تھی.. اور اس نے یقیناً دھلی ہوئی سفید براق جرابیں پہنی ہوں گی..

اور یہ گندی ہو گئی تھیں..

اللہ کے اس گھر میں چلتے چلتے. صحن کعبہ کے فرش پر چلتے چلتے اس فرش پر مٹی کے جو ذرّے تھے انہیں اپنی سفیدی میں جذب کر کے گندی ہو گئی تھیں.. انہوں نے رب کے گھر کے صحن کی صفائی کی تھی.. اس کی مٹی کو اپنے اندر جذب کر لیا تھا..

میں جو بہت دور کے شہروں سے آیا تھا..

ایڑھیوں پر گندی ہو چکی جرابوں کو رشک سے دیکھتا رہا..

کیسا بے نصیب تھا کہ نہ خانہ خدا کی پہلی جھلک دیکھ کر رویا. طواف کرتے دیوار سے لپٹتے بھی آنکھوں کی نمی باہر نہ آئی.. اور جب ساون کی صورت میں برسی تو کہاں برسی.. چند چہروں کو دیکھ کر.. یا پھر ان گندی جرابوں کو دیکھ کر.. ان کے نصیب کو دیکھ کر میں کیسا بے نصیب تھا..

"خانہ کعبہ کا اندرون"

سلجوق ماشاء اللہ ایسا خوش بخت ہے کہ ایک سفارت کار کی حیثیت سے اُسے مختلف مواقع پر سربراہان مملکت کے ہمراہ خانہ کعبہ اور روضۂ رسولؐ کے اندر جانے اور وہاں کچھ وقت گزارنے اور نوافل ادا کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے.. پہلی بار جب اس نے ان فضاؤں میں سانس لیے تو قابل فہم طور پر اسے اپنی کچھ خبر نہ تھی، آس پاس کیا ہے، کچھ ہوش نہ تھی صرف مقام سے آگاہ تھا کہ میں کہاں ہوں.. بدن کے ساتھ دماغ بھی سن ہو چکا تھا اور کبھی وہ کام کرنے لگتا اور کبھی پھر سناٹے میں چلا جاتا.. تو وہ محسوس تو کرتا رہا لیکن مشاہدے کے لیے جو آنکھ درکار ہے وہ اتنی نم تھی کہ اسے کچھ نظر نہ آیا.. پھر میں نے فرمائش کی کہ بیٹا اگر کبھی دوبارہ ایسا بخت ہو تو ذرا آس پاس کا دھیان کرنا کہ وہاں کیا ہے، ہوا کیسی ہے.. در و دیوار کیسے ہیں، ان کے رنگ کیا ہیں.. اس کے بعد جو حاضریاں اس کے نصیب میں آئیں ان میں اس نے اپنی آنکھیں قدرے کھلی رکھیں.. آس پاس کا دھیان کیا.. دیوار و در کی کیفیت اپنے اندر جذب کی... اور جو کچھ اس نے مجھ سے بیان کیا، اسے تقریباً اسی کے لفظوں میں.. ایک تحریری تسلسل کے ساتھ تو نہیں بلکہ ان حاضریوں کے لمحے اور پل الگ الگ ایک نشیانہ ایمانداری کے ساتھ آپ تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہوں..

خانہ کعبہ کا باب ملتزم فرش حرم سے بلند... اور اسے غلاف کعبہ نہیں ڈھکتا.. قدم آدم سے ایک ہاتھ بلندی پر نصب ہے..

صحن کعبہ میں کھڑے زائرین اپنے ہاتھ بلند کر کے بمشکل اس کی چوکھٹ تھامتے ہیں اور گریہ کرتے ہیں، دعائیں مانگتے ہیں..

یہی تو در کعبہ ہے..

یہاں اس کی چوکھٹ کے قریب پہنچنا اور اسے ہاتھ بلند کر کے تھام لینا کوئی آسان کام نہیں.. اللہ کے گھر کی چوکھٹ تھامنے کے تمنائی اس دنیا میں کچھ کم نہیں..

یہ وہی در ہے کہ آپ لوٹ آئے گر در کعبہ وا نہ ہوا..

اور اگر درِ کعبہ وا ہو جائے تو کون لوٹتا ہے..

تو یہ دَرِ کعبے وا ہوتا ہے..

ایک سیڑھی ہے جسے خادم دھکیلتے ہوئے کعبہ کی جانب لے جا رہے ہیں..

طواف کرنے والوں اور زائرین کو خبردار کرتے ہوئے خادم اس سیڑھی کو دھکیلتے جا رہے ہیں جس کا رُخ خانہ کعبہ کی جانب ہے..

وہ ایک کرین کی مانند ہے.. ایک زرافے کی مانند گردن اٹھائے.. زائرین میں سے راستہ بناتی دور سے نظر آ جاتی ہے..

.. اور یہ حرکت کرتی سیڑھی دلیل ہے اس بات کی کہ آج درِ کعبہ وا ہوگا اور کچھ نصیب والے ہوں گے جو اس کے ذریعے کعبہ کے اندر داخل ہوں گے..

درِ کعبہ کی جانب حرکت کرتی اس علامت کو دیکھ کر زائرین اور طواف کرنے والوں میں ایک ہیجان پیدا ہو جاتا ہے.. وہ تو کعبہ کے گرد طواف کرنے کو ہی زندگی کی سب سے بڑی سعادت جانتے ہیں اور بابِ ملتزم کی چوکھٹ کو تھام لینے کو خوش نصیبی کی معراج جانتے ہیں.. تو وہ کون ہیں جن کے لیے درِ کعبہ وا ہونے کو ہے.. بے شک وہ کعبے کے اندر جانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے لیکن وہ اس سیڑھی کو حرکت کرتے ہوئے تو دیکھ رہے ہیں جس نے ابھی کچھ دیر بعد بابِ ملتزم کے ساتھ جا منسلک ہونا ہے.. تو وہ بھی گویا شدتِ احساس کی سطح پر.. روحانی طور پر اس سیڑھی پر ہیں.. تب وہ سب اللہ اکبر کے نعرے لگانے لگتے ہیں..

جو بے خبر ہوتے ہیں.. طواف میں فنا اور مگن ہوتے ہیں، وہ بھی ان نعروں کو سن کر متوجہ ہو جاتے ہیں کہ کیا ہوا ہے.. اور پھر وہ بھی طواف سے بے خبر ہو کر اس سیڑھی کو آنکھوں میں سموتے اللہ اکبر پکارنے لگتے ہیں..

چنانچہ حرمِ کعبہ میں جتنی بھی آنکھیں ہوتی ہیں، وہ سب کی سب اس سیڑھی کے ساتھ ساتھ حرکت کرتی درِ کعبہ تک اس کا ساتھ دیتی ہیں..

بالآخر وہ سیڑھی بابِ ملتزم کے ساتھ جا لگتی ہے..

جیسے آگ بجھانے والوں کی سیڑھیاں اس عمارت کے ساتھ جا لگتی ہیں جس میں آگ خس و خاشاک کو جلا رہی ہے..

دراصل یہ سیڑھی بھی آگ بجھانے والوں کی ہے..

عشق آتش کو تسلی دینے والی ہے..

وہ جو ملکوں ملکوں بھڑکتی ہے..

فارس کے آتش پرست سلمان کے سینے میں.. حقہ کے ٹھڑے پر بیٹھنے والوں کے تن بدن میں

بھڑکنے والی.. کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے.. وہی آتش..

جب وہ سیڑھی ملتزم کے ساتھ جا لگتی ہے تو ہیجان میں مزید شدت آ جاتی ہے کہ کوئی تو ہے جو اس دروازے میں داخل ہو کر اللہ کے گھر کے اندر جا رہا ہے.. ہم نہ سہی.. پر ہم اس کو تو دیکھیں گے جو اس کے گھر کا مہمان ہونے کو ہے.. آداب کے مطابق پہلے تو سربراہ مملکت یا وزیراعظم سیڑھی پر قدم رکھتے ہیں، پھر ان کے وفد میں شامل کچھ عیار.. کچھ دھوکے باز.. کچھ ظلم کرنے والے مسکین شکلیں بنائے اور آنسو پونچھتے اور ایک دو پاکباز.. وزیر اور سفیر سیڑھی پر قدم رکھتے ہیں.. تب آخر میں کہیں جا کر جونیئر سفارت کاروں کی باری آتی ہے.. کبھی نہیں بھی آتی.. لیکن سلجوق کی باری آ جاتی ہے..

سلجوق کا کہنا ہے کہ اس لمحے بھی خدشہ دامنگیر ہوتا ہے کہ سب اندر چلے جائیں گے اور صرف میں رہ جاؤں گا.. خدشہ نہیں یقین ہوتا ہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں، خانہ کعبہ کے اندر چلا جاؤں گا..

باب ملتزم کو کعبہ کے رکھوالے ایک بڑی نقرئی چابی سے کھولتے ہیں..

یہ چابی فتح مکہ کے دوران عثمان بن طلحہ کے پاس تھی اور اس نے رسول اللہؐ کو یہ چابی دینے سے انکار کر دیا جس پر اس کی ماں نے سرزنش کی کہ محمدؐ فاتح ہے، وہ تم سے یہ چابی زبردستی بھی لے سکتا ہے تو انکار نہ کرو.. اور جب اس نے خانہ کعبہ کی چابی حضورؐ کی خدمت میں پیش کی تو انہوں نے اس کے انکار کے تنفس کو نظرانداز کر دیا اور کہا کہ تمہاری سب آئندہ نسلوں کے لیے خانہ کعبہ کی چابی کی ملکیت برقرار رہے گی..

اسی در سے یا تقریباً اسی مقام سے رسول اللہؐ خانہ کعبہ کے اندر فتح مکہ کے بعد داخل ہوئے تو انہوں نے "حق آیا اور باطل چلا گیا" کی رفاقت کے لیے کس شخص کو پسند کیا.. کسے چنا.. صرف ایک سیاہ فام کو کسی قریش کو نہیں اور کسی انصار کو نہیں.. صرف بلالؓ کو.. کہ تم میرے ساتھ کعبہ کے اندر آؤ گے اور اسے بتوں سے پاک کرو گے..

حضور خانہ کعبہ سے نکل آئے تو بلالؓ پیچھے رہ گئے..

خانہ کعبہ کے اندر ٹھہر گئے..

اور تب عبداللہ بن عمر اندر داخل ہوئے اور پوچھا کہ رسول اللہؐ نے یہاں کس جگہ نماز پڑھی تھی.. حضرت بلالؓ نے نشاندہی کی.. اس کے بعد عبداللہ بن عمر جب بھی بیت اللہ میں داخل ہوتے تھے.. منہ سامنے رکھتے تھے اور دروازہ (باب ملتزم) پشت کی جانب ہوتا، اور خانہ کعبہ کی سامنے کی دیوار کے درمیان صرف تین ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا اور نماز پڑھتے..

اس مقام پر بھی سلجوق نے نفل ادا کیے..

لیکن ابھی تو ہم سیڑھی چڑھ کر باب ملتزم تک پہنچے ہیں اور کعبہ کے رکھوالے نے ایک نقرئی چابی سے درِ کعبہ کھولا ہے..

کعبہ کے اندر داخل ہوتے ہیں..

یعنی قدم آدم سے مزید ایک ہاتھ کی بلندی پر واقع خانہ کعبہ کی دیوار میں نصب باب ملتزم میں سے کعبہ کے اندر داخل ہوتے ہیں..

اندر داخل ہوتے ہیں تو آگے جو فرش ہے، وہ چوکھٹ سے چار پانچ انچ نیچے ہے..

یہ کمرہ.. یہ گھر ایک کیوب ہے.. اس کی چار دیواریں ہیں..

خانہ کعبہ کے اندر مکمل اندھیرا ہے.. بجلی نہیں ہے..

نگہبان ایک ٹیوب لائٹ آن کر کے کمرے کے درمیان میں رکھ دیتا ہے تو اشیاء کی ہیئت کچھ ظاہر ہونے لگتی ہے..

فرش سنگ مرمر کا ہے:

دیواروں کے درمیان تک وہی سنگ مرمر نصب ہے اور دیواروں کا بقیہ نصف حصہ سیاہ غلاف سے ڈھانپا گیا ہے.. چھت بھی اسی غلاف میں سیاہ پوش ہے.. نصف دیواروں اور چھت کو ڈھکنے والا سیاہ غلاف اسی شباہت کا ہے جو خانہ کعبہ کی بیرونی دیواروں کو ڈھکنے والے غلاف کی ہے..

کہہ سکتے ہیں کہ اندرونی دیواریں تقریباً چھ فٹ تک سنگ مرمر کی ہیں اور اس سے اوپر غلاف میں ملفوف ہیں..

باب ملتزم سے داخل ہونے پر.. جب ٹیوب لائٹ آن کی جاتی ہے تو دیواروں سے ٹنگے کچھ قدیم برتن.. چراغ یا فانوس نظر آنے لگتے ہیں..

سنگ مرمر کے کچھ کتبے آویزاں ہیں جو غالباً بادشاہوں کی جانب سے نذر کیے گئے.. کتبے ہیں یا خطاطیاں ہیں..

بالکل سامنے ایک محراب ہے جو اس مقام کی نشاندہی کرتی ہے جہاں رسول اللہ نماز ادا کیا کرتے تھے اور نشاندہی حضرت بلالؓ نے کی تھی..

دائیں جانب دیوار پر ایک 2x4 فٹ سونے کا کتبہ آویزاں ہے اور یہ وہ مقام ہے جو معافی مانگنے کا مقام ہے..

خانہ کعبہ کے اندر اندھیرا ہے اور ٹیوب لائٹ کی روشنی ناکافی ثابت ہوتی ہے..

اندر بہت حبس ہے.. بہت گرمی ہے کہ وہاں کوئی روزن کوئی کھڑکی نہیں.. ہر جانب سے بند ہے.. سوائے باب ملتزم کے..

لوگوں کی موجودگی بھی اس حبس اور گرمی میں اضافہ کا باعث بنتی ہے.. اندر بمشکل چالیس کے قریب لوگ سما سکتے ہیں..

اور جو لوگ بالآخر اندر داخل ہوتے ہیں وہ ایک ہیجان میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ وقت عبادت میں گزرے.. سر جھکانے میں گزرے..

ہر کسی کی ہزاروں خواہشیں ہوتی ہیں کہ اندر پہنچ گئے تو جتنی ہو سکیں خواہشیں پوری کر لی ہے اور جس خواہش پر ہر شخص کا دم نکلتا ہے وہ جہاں رسول اللہؐ نماز پڑھتے تھے اس مقام پر کھڑے ہو کر نفل ادا کرنے کی خواہش ہوتی ہے.. چنانچہ ہر کوئی اُدھر ہجوم کرتا ہے.. اس کے بعد جدھر معافی کا مقام ہے وہاں کھڑے ہو کر معافی کی خواستگاری کی خواہش ہوتی ہے.

باب ملتزم میں سے خانہ کعبہ کے اندر قدم رکھتے ہی شاہ و گدا ایک ہو جاتے ہیں.. ایک سربراہ سلطنت اور ایک معمولی سفارت کار میں کچھ فرق نہیں رہتا.. دونوں اس کی سرکار میں پہنچ کر ایک ہو جاتے ہیں.. وہ ایک دوسرے کی موجودگی سے بھی سراسر غافل ہو جاتے ہیں.

تمام لوگ ایک دوسرے کی موجودگی سے غافل ہو جاتے ہیں..

ہر کوئی اللہ کے گھر کے اندر زیادہ سے زیادہ سانس لینے کی کوشش کرتا ہے..

ہر کوئی اضطراب میں ہوتا ہے..

ہر کسی کو خدشہ ہوتا ہے کہ کہیں وہ رسول اللہ کے جائے نماز پر کھڑا ہونے سے رہ نہ جائے.. معافی مانگنے کے مقام پر معافی کی درخواست پیش کرنے کا موقع کھو نہ دے.

البتہ سب میں ایک کیفیت مشترک ہوتی ہے..

سب لوگ رو رہے ہوتے ہیں..

بلند آواز میں نہیں.. اپنے اندر ہی اندر.. کہ آنسوؤں کے گرنے کی آواز نہیں ہوتی.. فانی انسانیت ابدیت کے ذائقے سے آشنا ہوتی ہے..

سلجوق جب تیسری بار خانہ کعبہ کے اندر گیا تو اسے دوسروں سے مختلف ایک تجربہ ہوا.. اس کا کہنا تھا کہ..

میں چونکہ دو بار پہلے بھی آ چکا تھا اس لیے مجھے اللہ کے گھر کے در و دیوار اور اس کی آرائش سے واقفیت ہو چکی تھی.. میں تیسری مرتبہ آنے والا مہمان تھا جو اس گھر میں اجنبی نہ تھا اور جانتا تھا کہ کونسا مقام کہاں اور کس رُخ پر ہے چنانچہ اندر قدم رکھتے ہی میں نے رسول اللہؐ کے جائے نماز کا رُخ کیا.. پھر مقامِ معافی پر سجدے کیے.. البتہ میری بدنی کیفیت پہلی بار سے مختلف نہ تھی.. خوش بختی کا احساس وہی تھا اور آنسو بھی اتنے ہی گرتے تھے..

پھر میں نے پہلی بار نوٹ کیا کہ یہ جو چوکور نیم اندھیارا بے شمار سانسوں سے حبس زدہ گھر ہے اللہ کا، تو اس کے دائیں جانب ایک دروازہ نظر آتا ہے.. یہ سونے سے بنا ہوا ایک دبیز چوکھٹ والا دروازہ ہے.. اس کے در کھلے ہیں..

اور ان کھلے دروں میں سے مجھے اوپر جاتی سیڑھیاں دکھائی دے رہی ہیں. سب لوگ روتے تھے. نوافل کی ادائیگی میں کھوئے ہوئے تھے اور میری نظریں اس دروازے پر ٹھہری ہوئی تھیں. یہ سیڑھیاں اوپر کہاں جا رہی ہیں، مجھ میں یہ جاننے کی خواہش سر اٹھاتی تھی..

کیا میں چلا جاؤں؟

میں ہمت کر کے اس دروازے تک گیا اور اوپر جاتی سیڑھیوں پر قدم رکھا.. یہاں تک ٹیوب لائٹ کی روشنی نہ آتی تھی، اس لیے تاریکی بہت تھی..

یہ سیڑھیاں چکردار تھیں.. گھومتی ہوئی اوپر جا رہی تھیں..

اور ہاں یہ جو سنہری دروازہ تھا وہ ایسا تھا جیسے ایک لفٹ کا ہوتا ہے.. اس کے پٹ باہر نہیں کھلتے..

میں کہہ نہیں سکتا کہ یہ دروازہ جو دکھائی تو سونے کا دیتا ہے، واقعی سونے سے تراشیدہ تھا.. سٹیل کا بھی ہو سکتا تھا.. کسی سنہری شیشے کا بھی ہو سکتا تھا.. دکھائی سونے کا دیتا تھا.. پرکھا نہیں جا سکتا تھا.

میں اوپر چڑھنے لگا..

دو تین موڑ آئے کہ یہ گھومتی ہوئی سیڑھیاں تھیں..

اندھیرا مزید گہرا ہو رہا تھا.. اور مجھے اب ڈر لگنے لگا کہ میں کیوں ادھر آ گیا..

سیڑھیاں کسی بھی گھر کی اگر مکمل طور پر اندھیرے میں غرق ہوں تو ان پر چڑھتے ہوئے بھی دل دھڑکتا ہے.. چہ جائیکہ اللہ کے گھر کی سیڑھیاں ہوں.. لگتا یہی تھا کہ یہ خانہ کعبہ کی چھت تک جا رہی ہیں.. جس پر کھڑے ہو کر حضرت بلالؓ نے کعبہ میں اولین اذان دی تھی..

جب آخری سیڑھی آئی تو میں نے وہاں دو عربی خادموں کو خاموش کھڑے پایا.. انہوں نے مجھے دیکھا، لیکن کچھ کہا نہیں، بس کھڑے رہے..

میں آگے ہو گیا..

یہ دراصل خانہ کعبہ کی پرچھتی تھی..

نیچے جو گھر تھا اس کی چھت اور خانہ کعبہ کی وہ چھت جس پر مینہ برستا ہے اس کے درمیان والی جگہ تھی..

ایک خلاء تھا..

دو چھتوں کے درمیان ایک وقفہ تھا..

کتنا؟..

بس اتنا کہ ایک انسان وہاں کھڑا ہو سکے..

وہ اللہ کے گھر کی چھت پر کھڑا ہو اور اس کا سر خانہ کعبہ کی چھت سے چھونے کو ہو..

بس اتنی گنجائش تھی..

اور اس خلاء میں کیا تھا؟
کچھ بھی نہیں..
البتہ مٹی کی مہک تھی..
سلجوق نے یہی کہا کہ ابا وہاں اس اندھیرے میں سانس لینے سے مٹی کی مہک اندر جاتی تھی..
وہاں مٹی کہاں سے آئی..
شائد وہاں جھاڑ پونچھ نہیں کی جاتی تھی کیونکہ وہاں کوئی نہیں آتا تھا..
یہ ایک اَن چھوئی تنہائی تھی..
ایک سناٹا تھا.. اس میں تنہا.. یکسر اکیلا میں کھڑا تھا..
میرے قدموں تلے جو فرش تھا، وہ اللہ کے گھر کی پہلی چھت تھی جس کے تلے میرے وفد کے ارکان عبادتوں اور عقیدتوں میں محو اور مصروف تھے اور میرے سر کے اوپر خانہ کعبہ کی وہ چھت تھی جو اس لمحے دھوپ سے روشن تھی..
پھر یکدم میں نروس ہو گیا..
مجھ پر ڈر غالب آ گیا..
کہ میں کہاں آ گیا ہوں..
کوئی نہیں جانتا کہ میں اس سنہری دروازے میں سے داخل ہو کر سیڑھیوں پر گھومتا ہوا یہاں آ چکا ہوں.. کہ ہر کوئی مگن اور محو تھا.. کسی دوسرے کی کچھ خبر نہ تھی.. تو کہیں ایسا نہ ہو کہ کعبے کے چابی بردار واپسی کا اعلان کر دیں اور میرے وفد کے سب ارکان باب ملتزم سے باہر چلے جائیں اور در کعبہ پھر سے مقفل کر دیا جائے..
اگر رب کے گھر کا واحد دروازہ بند ہو گیا تو میں کیا کروں گا..
کسی کو بھی شک نہ ہو گا کہ درجنوں لوگوں میں سے ایک مسخک نوجوان ہم میں موجود نہیں.. تو میں کیا کروں گا.. میرا دم گھٹ جائے گا.. کیا کروں گا..
جان اتنی عزیز ہوتی ہے کہ خانہ کعبہ کے اندر اللہ کے گھر کے اندر بھی جانا نہیں چاہتی ٹھہرنا چاہتی ہے..
ان دو عربی نگہبانوں کے قریب سے گزر کر میں یہ خیال کیے بغیر کہ یہ اللہ کے گھر کی سیڑھیاں ہیں، دھڑ دھڑ نیچے اترنے لگا.. اور میرا دل بھی اسی حساب سے دھڑ دھڑ دھڑکتا تھا کہ کہیں در کعبہ مقفل نہ ہو گیا ہو..
میں نیچے پہنچا تو وفد کے بیشتر ارکان در کعبہ سے باہر جا چکے تھے اور میں ان آخری لوگوں میں سے تھا جنہوں نے باب ملتزم کی چوکھٹ پار کر کے فرش حرم پر اترنے والی سیڑھی پر قدم رکھا..
اور میں نے شکر کیا کہ میں اللہ کے گھر میں قید نہیں ہوا، باہر کھلی فضا میں آ گیا ہوں اور میں نے سرخوشی اور اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا کہ جان بھی کیسی عزیز شے ہوتی ہے.. اللہ کے گھر کے اندر بھی جانا نہیں

چاہتی بکھرنا چاہتی ہے..

میں نے سلجوق کو بہت کریدا، بار بار خانہ کعبہ کے اندرون کے بارے میں سوال کیا۔ وہ بہت تحمل سے جواب دیتا اور پھر یکدم پرجوش ہو جاتا اور اس کا چہرہ دمکنے لگتا۔ یہاں تک کہ اس کی عینک کے شیشے بھی روشن ہونے لگتے.. اور وہ کہتا، بس انو خانہ کعبہ کے اندر جا کر کیا محسوس ہوتا ہے، یہ تو میں جانتا ہوں لیکن اسے بیان نہیں کر سکتا.. اور میں یہ حالت سمجھ سکتا تھا کہ جس تن لاگے سو تن جانے.. تو جان وہی سکتا تھا، پر بیان نہیں کر سکتا تھا..

بے شک تن وہی جانتا ہے جسے لگتی ہے لیکن مجھ تن نہیں لاگی اور اس کے باوجود میں کچھ کچھ جانتا ہوں کہ جس تن لگتی ہے اس پر کیا گزرتی ہے..

آپ ایک عرصہ سفر کے بعد جب اپنے گھر کے اندر قدم رکھتے ہیں تو تن میں جو قرار آ جاتا ہے اور جو خوشی پھوٹتی ہے، بس وہ قرار اور خوشی اگر ایک ذرہ ہوتی ہے تو اس کے گھر کے اندر.. زندگی کی کل مسافت کے بعد پہلی بار اس کے گھر کے اندر قدم رکھتے ہوئے وہ قرار کا صحرا کیسا ہوگا، خوشی کی کائنات کیسی ہوگی..

یہ میں کچھ کچھ جانتا ہوں.

''اب تو باندھا ہے دیر میں احرام''

یہ کہاں کبھی گمان گزرا تھا کہ کبھی اپنے آپ کو کفناؤں گا۔

ایک روز آئے گا ایسا کہ کفن میں خود اپنے آپ کو لپیٹوں گا اور بہ رضا و رغبت لپیٹوں گا اور پھر پُرمسرت بھی ہوں گا جیسے ایک بچہ عید کے روز نئے نکور کپڑے پہن کر اتراتا پھرتا ہے۔

یہ تو کبھی بھی گمان میں نہ آیا تھا۔

الگ الگ کمروں میں اپنے گرد احرام لپیٹے جا رہے تھے اور وہ لپٹتے نہ تھے۔ گر جاتے تھے۔ جو لباس پہلی بار پہنا جائے اس کے الٹے سیدھے کا پتہ نہیں چلتا اور احرام کا تو یوں بھی نہ کوئی الٹا ہوتا اور نہ کوئی سیدھا، اس لیے میں سلجوق اور سمیر کو پکارتا جو ساتھ والے کمرے میں احرام باندھنے میں مشغول رہتے تھے کہ بیٹا یہ نچلا حصہ تو پیٹ پر ٹھہرتا ہی نہیں، کھسک جاتا ہے، کیا کروں؟

اور اُدھر سے ہدایت کی جاتی تھی کہ ابا جی سانس کھینچ کر اسے تہبند کی طرح باندھیں جیسے دادا جان باندھتے تھے اور پھر اس کے اوپر کمر کے گرد منی بیلٹ کس لیں اور پھر سانس نہ لیں کچھ عرصہ۔

بالآخر سفر حج شروع ہونے کو تھا اور ہم اس سفر کے لیے مخصوص لباس پہنتے تو نہیں بلکہ اوڑھتے تھے اور باندھتے تھے۔

ایک تفصیلی غسل اور صفائی ستھرائی کے بعد اب میں احرام کے دو ٹکڑوں سے گتھم گتھا ہو رہا تھا۔ یعنی نہلایا نہیں گیا تھا، خود نہایا تھا اور کفنایا نہیں گیا تھا خود کفن لپیٹ رہا تھا۔ چونکہ اس سے پیشتر کفن پوشی کا کوئی تجربہ نہ تھا اس لیے الجھ رہا تھا۔

یہ محض لباس کی تبدیلی نہ تھی، ذات اور خصلت کی بھی تبدیلی تھی۔

علی شریعتی کہتا ہے کہ دنیاوی لباس ترک کیا ہے تو دنیاوی خصلتیں بھی ترک کر دو۔

بھیڑیے کی خصلت ترک کر دو۔ جو اپنے سے کمتر لوگوں کو دباتا ہے۔ اور دانت کچکچاتا ہے، انہیں کھا جانے کی کوشش کرتا ہے۔

تم میں ایک چوہے کی عیاری اور فریب بھی ہے جو خفیہ رہتا ہے، دھوکا دینے کے لیے دوسروں کی

ملکیت گستر تا رہتا ہے..

بعض اوقات تم ایک لومڑی کی خصلت اختیار کر لیتے ہو. جُل دے جانے والی.. اور تم ایک بھیڑ بھی ہوتے ہو.. سر جھکائے رکھتے ہو ایک غلام کی مانند.

یہ سب کی سب خصلتیں اور عادتیں جو ہر انسان میں کبھی نہ کبھی پائی جاتی ہیں، انہیں تیاگ دینے کا وقت تھا.. ایک جانور سے ایک ''انسان'' کے رُوپ میں پلٹ آنے کا لمحہ تھا..

دراصل ایک ''آدم'' ہو جانے کا..

احرام باندھتے ہوئے انسان کی ایک نئی پیدائش ہوتی ہے.. وہ ایک ''آدم'' کے رُوپ میں آجاتا ہے..

احرام کا سب سے بڑا استعارہ موت ہے.. اُس لمحے جب انسان احرام اپنے گرد لپیٹتا ہے تو گویا اپنے آپ کو موت کے حوالے کر دیتا ہے.. وہ مشاہدہ کرتا ہے اپنے گزشتہ وجود کا.. اپنی لاش کا.. اپنی قبر کو اپنے سامنے پاتا ہے.. اپنے آپ کو اس کے حوالے کرتا ہے اور پھر اسی قبر سے اُٹھتا ہے.. ایک نیا جنم لیتا ہے، آدم ہو جاتا ہے اور حج کے لیے پہلا قدم اٹھاتا ہے..

بدن پیچھے رہ جاتا ہے اور جو ابدی پھونک ہے، روح کی وہ آگے چلی جاتی ہے..

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب احرام باندھتے ہوئے سب لوگ مر جاتے ہیں تو ایک فرد کی حیثیت سے آپ کا وجود باقی نہیں رہتا چنانچہ ''میں'' کی بجائے وہ ''ہم'' ہو جاتے ہیں

آپ جو پہلے تھے وہ مر چکے اور اب جو ہیں کچھ اور ہیں..

احرام باندھتے ہوئے شکوک کے ننھے سنپولیے میرے اندر سرسرانے لگتے ہیں.. یہ نومولود سنپولیے نہیں ہیں، میں نے ایک مدت انہیں شک اور شبہے کا دودھ پلا کر پالا ہے تو یہ کہتے ہیں.. نہیں تارڑ تم بدل نہیں سکتے تم وہی رہو گے جو کہ تھے.. تم اپنی بھیڑ یے کی جون نہیں بدل سکتے

چوہے کی رازداری سے نجات حاصل نہیں کر سکتے..

تمہاری عیاری لومڑی کے روپ میں موجود رہے گی..

اور تم اب بھی ایک بھیڑ ہو.. ہاں ہاں کرتی.. دوسروں کے آگے جھکتی.. عزت نفس کے بغیر.. دنیا کے چارے پر مسلسل منہ مارتی.. تمہارا پیٹ کبھی نہیں بھرتا.. تم حرص کو قبر تک لے جاؤ گے..

لیکن یہ سراسر درست نہ تھا.. مجھے یوں لگا جیسے سنپولیوں میں وہ پہلے والا دم خم نہیں ہے.. احرام کو سامنے پا کر وہ کچھ کم سرسراتے ہیں، مرجھائے جاتے ہیں..

جونہی آپ دنیاوی لباس اُتار کر احرام سے تن ڈھانپتے ہیں آپ پر فوراً کچھ پابندیاں بھی عائد ہو جاتی ہیں.. یہ احرام کے قانون ہیں اور آپ پر لاگو ہیں.. چونکہ یہ ایک نیا جنم ہے، اس لیے آپ کو اپنا

کاروبارِ حیات.. معاشرے میں مقام.. اپنی کلاس.. اپنی قوم، قبیلہ اور شناخت بھلا دیتی ہے.. جیسے کہ آدم تھا.. اور یہ سب کچھ یکسر بھلا دینا کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟

وہ ایسے کہ آپ نے بہت کچھ ترک کر دیا ہے..

مثلاً.. آپ نے آئینہ نہیں دیکھنا تاکہ آپ اپنی شکل نہ دیکھیں اور اپنے "میں" کو فراموش کر دیں.. کہ میری شباہت ایسی ہے، میں بہت خوش شکل ہوں.. میں میں ایک بھیڑ کی مانند..

کسی قسم کی خوشبو استعمال نہیں کی جا سکتی.. تاکہ آپ دوسروں سے ممتاز نہ ہوں۔ اُس خوشبو کے حوالے سے.. تاکہ اس خوشبو سے منسلک جو یادیں ہیں، وہ یاد نہ آئیں..

کسی بھی کفن پوش احرامی ساتھی کو حکم نہیں دینا کہ میرے لیے یہ کرو.. پانی کا گلاس لاؤ.. پکوڑے کھلاؤ.. وضو کا بندوبست کرو.. البیک یا تازاج زیستوران سے روسٹ چکن لا دو اور فرنچ فرائز کے ساتھ ٹمیٹو ساس نہ بھولنا.. ادرک کی چٹنی بھی یاد رکھنا.. چائے لے کر آؤ.. یہ نہیں کرنا کیونکہ آپ سب برابر ہو چکے ہیں.. کوئی چوہدری نہیں، کوئی کمی کمین نہیں..

انسان تو کیا جانوروں اور کیڑوں مکوڑوں کو بھی نقصان نہیں پہنچانا.. نہ ہی پودوں کو اکھاڑنا ہے.. نہ درختوں کو کاٹنا ہے۔ قدرت کے ساتھ امن سے رہنا ہے۔

شکار سے بھی اجتناب کرنا ہے.. رحم کرنے کا رویہ اپنانا ہے..

حقیقی محبت کی جانب قدم اٹھانے کے بعد دنیاوی محبتیں اور رشتے فراموش کر دیئے ہیں..

شادی نہیں کرنی.. اگر ابھی تک نہیں ہوئی تو ابھی نہیں.. اگر ہو چکی ہے تو دوسری ان ایام میں تو نہیں ، نہ ہی کسی ایسی تقریب میں شامل ہونا ہے..

میک اپ کا استعمال.. کسی بھی ایسی شے کا استعمال جو عارضی طور پر آپ کو حسن عطا کرتی ہے، نکھارتی ہے، ممنوع ہے.. یہاں تک کہ آپ بالوں میں کنگھی بھی نہیں کر سکتے تاکہ آپ وہی رہیں جو کہ ہیں..

نہ کسی سے بحث کرنی ہے.. نہ ہی گالی گلوچ پر اترنا ہے اور نہ ہی تکبر کو پاس آنے دینا ہے..

احرام کو سوئی دھاگے سے اپنی پسند کی شکل نہیں دینی.. اَن سلا رکھنا ہے تاکہ آپ کی پہچان کسی طور الگ نہ ہو..

ہتھیاروں کی اجازت نہیں.. اگر بہت ضروری ہو تو احرام میں پوشیدہ ہوں نظر نہ آئیں۔

سائے کی تلاش نہ کرو.. دھوپ سہو..

اپنے سر کو نہیں ڈھکنا..

اور اگر آپ صنف نازک ہیں تو چہرہ نہیں ڈھکنا.. نہ بار سنگھار نہ زیور زیبائش.. بال سنوارنے بھی نہیں اور کاٹنے بھی نہیں..

اور خون نہیں بہنا چاہیے.. اپنے آپ کو بھی زخم لگنے سے بچاؤ..

یہ سب کچھ آپ پر اُس لمحے سے لاگو ہو جاتا ہے جب آپ دو سادہ سفید چادریں بدن کے گرد لپیٹتے ہیں۔

میں نے بچہ لوگ کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے بمشکل سانس اندر کھینچا اور احرام کی چادر کو اپنے والد صاحب کی طرح.. جیسے میں نے ہزاروں بار انہیں تہبند درست کرنے کے لیے اس کے بند کھول کر پھر سے باندھتے اوراڑستے دیکھا تھا، ویسے اس چادر کو پیٹ کے گرد باندھ لیا، پھر سانس روکے ہوئے اس پر پیسوں کا پیٹی خوب کس کر باندھی اور اپنے آپ کو مقفل کر لیا..

احرام کی دوسری چادر کا کوئی مسئلہ نہ تھا، وہ تو ایک کمبل کی مانند لپیٹنی تھی جو میں نے لپیٹ لی..

اس پیچیدہ عمل سے فراغت حاصل کر کے دو نفل پڑھے اور حج کی نیت کی.. اللہ کو خبردار کیا کہ میں آ رہا ہوں.. یہ محض کارروائی تھی کیونکہ وہ تو پہلے سے ہی خبردار تھا، میرا منتظر تھا، بلاوا بھیجنے والا منتظر تو رہتا ہے کہ دیکھیں یہ کمبخت آتا ہے کہ نہیں..

گھر سے نکلتے ہوئے بے خبری میں ایک قدِ آدم آئینے پر نگاہ پڑ گئی.. میں ایک حریص اور پیٹو رومن لگ رہا تھا، ٹوگا باندھے.. نیم سرخ آنکھوں والا ایک نیرو جو بنسری بجانے کا شوقین تھا، روم کے جلنے کی مسرت میں!

احرام میں حرکت کرنے کی عادت نہیں ہو رہی تھی.. کبھی بالائی چادر ڈھلک جاتی اور کبھی نچلا حصہ کھسک کر گرنے کو آ جاتا..

نیا جنم تھا، نیا لباس تھا.. تو مولود کو عادت کیسے ہوتی..

اور ہاں.. اللّھم لبیک..

''مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیٔ خیال''

روڈ ٹو مکہ..

سلجوق کے ولا سے نکل کر، اپنا سامان ڈھوتے.. رات کے دس بجے ہم پاکستان قونصلیٹ کے باہر پہنچے جہاں سات آٹھ کوسٹر گاڑیاں اپنے ٹائروں پہ کھڑی جا رہی تھیں کہ ان میں قونصلیٹ کے عملے کے اراکین اور ان کے عزیز رشتے دار نہایت شد و مد سے داخل ہوتے جاتے تھے اور ہم بھی چونکہ وائس کونسل صاحب کے نزدیکی عزیز تھے، اس لیے ہم بھی کار سے اُترتے ہی کوسٹروں کی جانب لپکنے لگے تھے.. چھتوں پر سامان لوڈ ہو رہا تھا۔ نگرانی کی جا رہی تھی کہ کہیں کوئی بیگ، سوٹ کیس رہ نہ جائے.. اور جنہیں یقین تھا کہ یہ کوسٹر گاڑیاں ہمیں چھوڑ کر نہ جائیں گی، وہ احرام میں لہراتے بل کھاتے.. سب کے سب سفید سفید.. جیسے قونیا کے درویش جدہ میں رقص کر رہے ہوں.. ادھر ادھر گھوم رہے تھے، ان میں سلجوق بھی شامل ہو گیا کیونکہ وہ ہمارے کوسٹر کا گروپ لیڈر تھا اور سامان رکھوانا، فہرست کو چیک کرتے ہوئے حج کے شوقین خواتین و حضرات کو سوار کروانا.. اور پھر ان پر نظر رکھنا کہ وہ ادھر ادھر نہ ہو جائیں.. اس کی ذمہ داری تھی.. اور اس دوران اس نے کچھ ڈانٹ ڈپٹ بھی کی جس کی زد میں اس سے کہیں سینئر سفارت کار اور سفیر بھی آئے، لیکن وہ مسکراتے ہوئے بلکہ لطف اندوز ہوتے اس جونیئر کے احکام بجا لاتے رہے کہ احرام باندھنے کے بعد سب کی سنیارٹی ختم ہو گئی تھی..

روڈ ٹو مکہ..

ہم ایک مرتبہ پھر اس روڈ پر رواں تھے.. آگے پیچھے آٹھ کوسٹر اتنے بے چین اور تیز رفتار جیسے ان میں سوار مسافر نہیں وہ خود حج کرنے کو جا رہے ہوں.. ہمارے کوسٹر کا ڈرائیور کالا خان تھا.. جو نہ تو بہت کالا تھا اور خان بھی واجبی سا تھا لیکن غضب کا ڈرائیور تھا.. ایسا ماہر کہ پل صراط پر سے گزرنے کے لیے بے خطر اس کی خدمات حاصل کی جا سکتی تھیں..

اور یہ تو نہیں کہ روڈ ٹو مکہ پر صرف ہم ہی ہم تھے.. صرف ہمارے کوسٹر تھے.. لگتا تھا کہ پورا جدہ خالی ہو رہا ہے..

پورا سعودی عرب خالی کیا جا رہا ہے..

جیسے آبادیوں۔ شہروں اور قصبوں میں ابھی ابھی اعلان کیا گیا ہے کہ ایٹمی حملہ ہونے میں بس دو چار منٹ ہیں تو جان بچانے کے لیے نکل جاؤ۔ تو ایسے ہی ہر نفس، اپنے گھر اور کاروبار اور عشق ترک کر کے جان بچانے کے لیے نکل کھڑا ہوا ہے۔

ایسا بے پناہ اور گھنا ہجوم تھا روڈ ٹو مکّہ پر۔۔

روڈ دکھائی نہ دیتی تھی۔۔ سب کو مکّہ دکھائی دیتا تھا۔۔

کوسٹر، بسیں، ٹیکسیاں، پرائیویٹ کاریں۔۔ کاروان۔۔ ٹرک۔۔ ٹریلر۔۔ جیپیں۔۔۔ بے تاب اور بے چین اس خوف میں مبتلا کہ کہیں ہم پیچھے نہ رہ جائیں۔۔ اور اس حشر اور اژدہام میں کالا خان یوں نکلتا تھا جیسے مکھن سے بال نکلتا ہو۔۔ ایک ایسی روح کی مانند جو دیواروں کو پار کر جاتی ہے۔

روڈ ٹو مکّہ میں رکاوٹیں بھی تھیں۔۔

متعدد مقامات پر پولیس چیک پوسٹیں راستے میں حائل ہوتی تھیں۔۔

ہم رُکتے۔۔ باہر جلتی بجھتی پولیس کاروں کی فلیش لائٹس کچھ نیلی کچھ پیلی اور ان کی دہشت۔۔ کوئی ایک سعودی پولیس مین عام طور پر نہایت نوخیز اور کچی عمر کا نوجوان کوسٹر میں داخل ہو کر نیم تاریکی میں دبکے ہوئے احرام پوشوں پر ایک سرسری نظر ڈالتا۔ پھر کالا خان سے مخاطب ہو کر کوئی سوال کرتا تو وہ پہلے تو شُستہ عربی میں اس سے گپ لگاتا اور پھر ایک کھل جا سم سم یعنی ''پاکستانی قونصلیٹ'' کہتا اور ہمیں رہا کر دیا جاتا۔

ان چیک پوسٹوں سے گزرتے ہوئے ہمارے دل رکتے تھے۔۔ اگرچہ رُکتے تھے لیکن اُن کی دھک دھک کی دھمک پورے کوسٹر میں سنائی دینے لگتی تھی۔۔ اس لیے کہ ہم میں سے بیشتر یہاں ''وزیٹر ویزا'' پر آئے تھے ''حج ویزا'' پر نہیں۔۔۔ بے شک اس ملاقاتی ویزا پر حج کر لینے پر کوئی پابندی نہیں تھی لیکن سعودی عرب میں قوانین بدلتے دیر نہیں لگتی۔ کوئی ایک حکم کسی شاہانہ قصر سے کسی بھی لمحے جاری ہو کر ہمیں روک سکتا تھا کہ جدّہ واپس جاؤ۔۔ احرام اتار کر چکن بخاری کھاؤ۔۔ سوئمنگ پول میں ڈبکیاں لگا کر انڈین فلموں کے گانے دیکھو۔۔ ایشوریہ رائے کی ناف کے بارے میں رائے قائم کرو۔ مزے کرو اور حج کو بھول جاؤ۔۔

ویسے ایک اعتراف بے جا نہ ہوگا۔۔

اور یہ آنکھوں دیکھا حال ہے کہ سعودی پولیس بظاہر بہت بدتمیز اور سختی کرنے والی تھی لیکن وہ سوال جواب کرنے کے بعد۔۔ یہ بھی ثابت ہو جانے کے باوجود کہ جو لوگ پک اپس میں اور ٹیکسیوں میں احرام باندھے بیٹھے ہیں، وہ غیر قانونی ہیں، ان کے پاس کچھ کاغذات نہیں ہیں۔۔ وہ انہیں بھی روکتی تھی۔۔ ڈراتی دھمکاتی تھی لیکن پھر۔۔ جانے دیتی تھی۔۔

صرف اس لیے کہ جو حج کی نیت سے آئے ہیں۔ حاضری دینے کے لیے آئے ہیں۔۔ انہیں اس سعادت سے محروم کر دینے سے گناہ ہوگا۔۔

روڈ ٹو مکہ..

اور پھر یکدم ہم اس روڈ سے منہ موڑ کر.. منقطع ہو کر.. مکہ سے روگردانی کرتے ہوئے ایک اور شاہراہ پر مڑ گئے جس نے ہمیں منیٰ تک لے جانا تھا..

بس یہی موڑ تھا جو میری سمجھ میں نہیں آتا تھا. کہ اگر ہم حج پر آئے ہیں تو مکہ کیوں نہیں جاتے..

حاجی لوگ مکّے نوں جاندے..

مکہ سے منہ موڑ کر کہیں اور چلے جانا. کیسا حج ہے. لیکن یہی حج تھا..

مکہ سے منہ موڑ لینا ہی حج تھا.

"اور تم جو حج کے لیے آئے ہو..

اپنی حیات کے خشک صحراؤں سے..

تمہارے لیے ایک چشمہ گنگنا رہا ہے..

بہت غور سے اپنے دل کی دھڑکن سنو..

تم اس چشمے کی گنگناہٹ سن لو گے.."

صرف مکہ تک جانے کا فیصلہ کر لینا حج کی روح نہیں ہے.. نہ ہی کعبہ اور قبلہ تمہاری منزل ہے.. یہ محض تمہاری غلط فہمی تھی. حضرت ابراہیم تمہیں سکھاتے ہیں کہ حج کعبہ میں نہیں.. حج کا آغاز تبھی ہوتا ہے جس لمحے تم کعبہ چھوڑ دیتے ہو.. کہ یہ کعبہ ایک نشانِ منزل ہے.. منزل نہیں..

کعبہ کو چھوڑ دو اور میں اسے چھوڑ کر تمہارے ساتھ چلنے لگوں گا. تم سے قریب ایسا آؤں گا کہ تم اپنی شہ رگ دھڑکتی محسوس کرو گے..

تو اگر وہ خود کہتا ہے کہ میرا گھر چھوڑ دو.. اور میں تمہارے قریب آ جاؤں گا. تو تم کیسے انکار کر سکتے ہو..

اس لیے ہمارے کوسٹر نے حکم کی تعمیل کی.. مکہ سے.. خانہ کعبہ سے منہ موڑ کر منیٰ کا رخ کیا..

''دھوپ کے شہر میں پچیس لاکھ سونے کے پجاری''

منیٰ...

جو دو چار روز کا شہر ہے.

برس کے بقیہ دنوں میں صحرا ہوتا ہے... بے آباد اور ویران ہوتا ہے..

اور جب آباد ہوتا ہے تو مکہ اور مدینہ بھی اس کی جانب حسرت کی نگاہ کرتے ہیں..

رات کے اس پہر منیٰ میں داخل ہوتے ہوئے ایک معجزہ ہو گیا یعنی مجھے اپنی بیگم بہت یاد آئی کہ اس کا نام بھی منیٰ ہے. میمونہ ہے.. کیونکہ منیٰ کو مونا بھی کہتے ہیں...

ہم منیٰ گئی رات پہنچے تھے لیکن یہاں بھی چکا چوند اتنی تھی کہ لگتا تھا کہ بھری دوپہر میں پہنچے ہیں..

منیٰ خیمہ بستی..

لاکھوں کی تعداد میں سفید سفید خیمے.. درمیان میں سیدھی ایک، دوسرے کو کاٹتی سڑکیں اور ان کے کناروں پر کوئی ایک بھی اینٹ روڑے کی پکی عمارت نہیں. سفید کپڑے کے مخروطی خیمے.. لاکھوں کی تعداد میں..

میرے کوہ نوردی کے مختصر خیمے ایسے نہیں بلکہ وسیع بلند چھتوں والے ایئر کنڈیشنڈ خیمے جن میں قالین بچھے تھے.. قالین کا کونہ اٹھا کر دیکھو تو نیچے صحرا کی ریت.. اور قالینوں پر فوم کے گدے.. کچھ صاف ستھرے کچھ زیادہ نہ صاف ستھرے.. جن پر دس بارہ اللہ کے مہمانوں کی گنجائش تھی جسے کھینچ تان کر یعنی گنجائش کر، دو گئے لوگ بھی پہلو بہ پہلو گزر اوقات کر سکتے تھے..

منیٰ کی خیمہ بستی کے لاکھوں سفید خیمے اس عارضی شہر کے آسمان میں یوں نوکیلے اُبھرتے تھے جیسے بیافو یا ہسپر گلیشیئر کی ابدی برفوں کے تکونے اہرام اُبھرتے ہیں..

میرا بہت جی چاہا کہ اب تو ایک سگریٹ سلگا لوں. لیکن اگر خوشبو لگانے کی مناہی تھی تو بُو پھیلانے کی اجازت کیسے ہو سکتی تھی، اس لیے میں نے ضبط کیا. سلجوق اپنے گھر سے دو رضائیاں اُٹھا لایا تھا جنہیں ان زمانوں میں کمفرٹر کہا جاتا ہے اور ہم نے ان کو کچھ بچھایا اور کچھ اوڑھا اور آسودہ ہو گئے..

ابھی پوری طرح آسودہ نہیں ہوئے تھے کہ مجھے احساس ہوا کہ ہم یہاں آسودہ اور آرام دہ ہو کر

استراحت فرمانے نہیں آئے، حج کرنے آئے ہیں تو اب کچھ نہ کچھ تو کریں لیکن کیا کریں چنانچہ میں نے یہ سوال سلجوق سے کیا جو نفل ادا کرنے کے لیے پر تول رہا تھا۔

''والد صاحب آپ تھک گئے ہوں گے.. فجر کی نماز میں ابھی کچھ وقت باقی ہے۔ تب تک سو جائیں۔''

مجھے نیند نہیں آتی تھی..

باہر منیٰ کی بستی بھرتی جا رہی تھی.. مسافر اُتر رہے تھے اور جن بسوں اور ویگنوں سے اُتر رہے تھے، اور وہ ہزاروں کی تعداد میں تھیں تو ان کے ہزاروں انجن بریکیں لگاتے گھر رگھر رشور مچاتے تھے.. اور اتنی قربت میں کہ محسوس ہوتا کہ ابھی کوئی نہ کوئی بس اس خیمے میں چلی آئے گی..

نیند اس لیے بھی نہیں آتی تھی کہ آس پاس جتنے بھی مہمان تھے، ان میں سے کچھ تو فوراً نیند میں اتر کر بے خبر خراٹے لے رہے تھے لیکن بیشتر دعائیں کر رہے تھے.. قرآن پاک کھول کر اس پر جھک گئے تھے.. تسبیح کر رہے تھے.. یہ وہ لوگ تھے جو خیمے میں اتنی بے تابی سے داخل ہوئے تھے جیسے گاڑی چھوٹنے کے ڈر سے مسافر سٹیشن کے اندر داخل ہوتے ہیں.. ایسے اضطراب میں تھے جیسے وقت کا پیمانہ متعین کر دیا گیا ہے.. ریت گرنے لگی ہے، اور ہر ذرّے کے ساتھ وقت گزرنے لگا ہے اور وقت محدود ہے اور انہیں اس محدودیت میں بہت کچھ کرنا ہے..

لیکن مجھے تو کچھ بھی نہیں کرنا تھا، بس سونا تھا۔

چنانچہ میں سو گیا۔

منیٰ ایک روشن شہر ہے..

دھوپ کا شہر ہے..

سورج اور لاکھوں سفید خیمے مقابلے پر اتر آتے ہیں کہ دیکھیں کس میں کرنیں زیادہ روشن ہیں.. اور پھر دھوپ کا سفید راج.. ہر چٹان.. ہر احرام ہر شے پر حاوی ہو جاتا ہے۔

منیٰ تو کیلے برف رنگے لاکھوں احراموں کا شہر ہے..

ایک بے انت خیمہ بستی ہے سیاہ پہاڑوں کے چٹیل دامن میں.. نشیب و فراز میں.. یہاں تک چٹانوں کے کناروں پر اور ان ڈھلوانوں پر بھی جہاں ریت کا ایک ذرّہ نہیں ٹھہر سکتا جانے خیمے کیسے ٹھہرے ہوتے ہیں.. لیکن یہ خیمے جو منیٰ کی باقاعدہ سرکاری بستی کے فٹ پاتھوں.. کونوں کھدروں.. اور آس پاس کی چٹانوں سے چپٹے ہوتے ہیں قدرے بے قاعدہ ہوتے ہیں.. یہ غیر قانونی تارکین وطن کی مانند ہوتے ہیں جن کے پاس نہ یہاں آنے کا پاسپورٹ ہوتا ہے اور نہ کوئی اجازت نامہ یہ چھپ چھپا کے آتے ہیں اور شامل ہو جاتے ہیں.. اکثر پورے خاندانوں کے ہمراہ عشق کے مارے ہوتے ہیں اور قانون بھی ان پر ایک نظر کرتا ہے

اور پھر دوسری نظر نہیں کرتا.. درگزر کرتا ہے۔

سیاہ پہاڑوں کے چٹیل دامن میں ایک خیمہ بستی اس دامن کو بھرتی ہوئی.. جہاں واقعی تل دھرنے کی جگہ نہیں ہے، جہاں کہیں کوئی ایک تل دھرا جاسکتا تھا وہاں ایک سفید پوش حاجی دھرا ہے..

دنیا بھر میں اپنی نوعیت کا یہ واحد شہر ہے جو سارا سال بھائیں بھائیں کرتا رہتا ہے.. اجاڑ کھنڈر شہر ہے.. ایک ایسے شہر کی مانند جو کسی لق ودق صحرا کی ویرانیوں میں سونا دریافت ہونے پر یکدم سونے کے حصول کے لالچ میں وہاں ہجوم کرنے والوں کی آمد سے.. ان کی موجودگی سے وجود میں آتا ہے.. اور پھر سونے کی کانوں میں سے جب آخری ڈلی آخری ذرّہ برآمد ہو جاتا ہے اور وہ کانیں بیکار ہو جاتی ہیں تو ان کے ساتھ ہی وہ بھرا پُرا شہر بھی بنجر ہو جاتا ہے.. ایک بھی نفس باقی نہیں رہتا، سب کُوچ کر جاتے ہیں اور اس کے گلی کوچوں میں کانٹے دار جھاڑیاں سنسناتی شور مچاتی ہواؤں میں اُچھلتی ہیں.. کھڑکیاں اور دروازے تیز ہوا کے دباؤ سے کھلتے اور بند ہوتے چلے جاتے ہیں.. کواڑ سر پٹختے چلے جاتے ہیں..

منیٰ بھی سال بھر ایسا ہی ویران اور بنجر شہر ہوتا ہے..

اور پھر آٹھ اور نو ذوالحج کے آس پاس ہر رنگ اور ہر قومیت کے لوگ غول کے غول.. سفید پوش افواج کی مانند یلغار کرتے اس شہر میں اترتے ہیں.. سفید چیونٹیوں کی مانند رینگتے ہوئے اس ویرانے میں داخل ہوتے ہیں اور اسے بھر دیتے ہیں.. اور یوں یہ دیکھتے دیکھتے آباد ہو جاتا ہے جیسے دنیا کا کوئی اور شہر کبھی آباد نہیں ہوتا..

دنیا کے کس شہر میں سینکڑوں مختلف قومیتوں کے لوگ کسی ایک وقت میں عارضی طور پر کہاں آباد ہوتے ہیں.. کہیں نہیں.. صرف منیٰ میں..

اور یہ لوگ بھی بے غرض نہیں آتے.. ''سونے'' کے لالچ میں یہاں آتے ہیں..

اپنی ڈلی حاصل کرنے کے لیے آتے ہیں..

اس ''سونے'' کی چمک نے پیدائش کے فوراً بعد کان میں اترتی آواز کے ساتھ ہی اپنی چھب دکھلا دی تھی.. اُن کی مُندی ہوئی ابھی ابھی ماں کی کوکھ میں سے باہر آئی ہوئی مُندی ہوئی کچی آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا..

پیدائش کے ساتھ ہی ایک ٹکسال نے سکے ڈھالنے شروع کر دیئے تھے، خالص پانسے کے سونے کے..

ایک سکے پر اللہ کے واحد ہونے کی شہادت کندہ تھی..

ایک اور پر اس کے رسول محمدؐ کا اقرار درج تھا..

کسی پر نماز کی پانچ مہریں ثبت تھیں اور کسی پر روزے کا ضبط کندہ تھا..

اور کہیں زکوٰۃ کی ادائیگی کی ہدایت ابھری ہوئی تھی..

اور ایک سکہ ایسا ڈھلتا تھا جس پر حج کی مہر فرض تھی..

یہ جو لاکھوں مسافر تھے اور دور کے شہروں سے آئے تھے تو اسی سونے کی مہر کو حاصل کرنے کے لالچ میں منیٰ تک آ گئے تھے..

اور یہیں سونے کی وہ کان تھی جو پچھلے چودہ سو برس سے سنہری ڈلیاں وجود میں لاتی رہی تھی.. خشک اور خالی ہونے کا نام نہ لیتی تھی.. بنجر نہ ہوتی تھی..

اسی لیے منیٰ ہر برس ان ایام میں آباد ہو جاتا تھا..

بقیہ برس وہ بنیادیں باقی رہ جاتی تھیں جن پر کبھی لاکھوں خیموں کی عمارتیں ایستادہ ہوا کرتی تھیں.. یا پھر اس کے ویران گلی کوچوں میں صحرا کی تیز ہوائیں پلاسٹک کے بیگ، کاغذ، خالی ڈبے، بوتلیں اور زائرین کے پھینکے ہوئے بوسیدہ پیراہن اڑاتی پھرتی شور کرتی تھیں۔

اور جب یہ آباد ہوتا تھا تو ویرانے میں بہار آ جاتی تھی.. ہولے سے بادِ نسیم چلتی تھی اور اس میں بھی جو بھی بیمار آ جاتا تھا اسے بے وجہ قرار آ جاتا تھا..

نہ صرف یہ کہ لاکھوں خیمے زندگی کی حرارت اور عبادتوں کی سرگرمی شوق سے بھر جاتے تھے بلکہ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں آس پاس کی پہاڑیوں اور چٹانوں کے کناروں پر.. پلوں کے نیچے.. گلیوں میں.. فٹ پاتھوں پر.. یہاں تک کہ جہاں غسل خانے ہیں، ان کے برآمدوں میں اور خیموں کے درمیان جو راہداریاں ہیں وہاں بھی لوگ کھلے آسمان تلے یوں آباد ہو جاتے تھے جیسے وہ ہمیشہ سے ہی اسی بودوباش کے عادی ہوں وہ اتنے سکون اور آسودگی اور قرار سے وہاں آباد ہو جاتے تھے..

چھ ہزار سے زائد چھوٹے بڑے ریستوران جن میں البیک اور تازاج نمایاں ہوتے ہیں.. ٹھیلوں.. کھوکھوں.. فٹ پاتھوں پر..... ہر قسم اور ہر نوعیت کی خوراک ظاہر ہونے لگتی ہے..

پچیس لاکھ کے قریب ''سونے'' کے بیوپاری اگر شہرِ منیٰ اترے ہوں اور ہوں بھی مختلف قومیتوں اور براعظموں کے تو ان کی زبان کے ذائقے اور پسند ناپسند بھی تو مختلف ہوگی.. تو وہاں ہر زبان کے ذائقے کا سامان بک جاتا ہے..

''عرب نیوز'' کے مطابق ہر روز پچاس لاکھ ڈبل روٹیاں منیٰ کے تندوروں میں سے نکلتی ہیں.. یعنی ایک روز کی خوراک کے لیے فی حاجی یا حجن دو روٹیاں کچھ زیادہ نہیں..

اسی منیٰ میں تین شیطان بھی پائے جاتے ہیں..

پچیس لاکھ افراد کے لیے صرف تین شیطان بھی کچھ زیادہ نہیں..

یہ شیطان زائرین کی مانند صرف دو تین روز کے لیے یہاں آباد نہیں ہوتے بلکہ ہزاروں برسوں سے پیامبروں کے باپ ابراہیم کے زمانے سے یہاں مستقل طور پر آباد ہیں.. گھر بنائے بیٹھے ہیں اور اگر وہ یہ

دعویٰ کریں کہ منیٰ ان کا شہر ہے تو وہ سچ کہتے ہیں.. اور اگر وہ یہ کہیں کہ منیٰ صرف ان کی خاطر آباد ہوتا ہے تو بھی ہم انہیں جھٹلا نہیں سکتے..

یہ شیطان بہت طاقتور ہیں.. ہزاروں برسوں سے صرف تین شیطان کروڑوں لوگوں کا مقابلہ کرتے آئے ہیں اور ابھی تک زیر نہیں ہو سکے.. جوں کے توں کھڑے ہیں.. ان کی استقامت میں کچھ شبہ نہیں..

لیکن اس برس بھی مقابلہ ہونا ہے..

ابھی ان کے گرد اور دور تک آباد جو سفید پوش حضرات ہیں، اپنی عبادات میں مگن ہیں.. رب کے بھیجے ہوئے حرفوں پر جھکے اور دعاؤں میں غرق ہیں..

ابھی تو وہ آئے ہیں.. پہلا دن ہے.. اور ابھی وہ شیطان کے روبرو ہونے کا حوصلہ نہیں رکھتے.. کیسے رکھیں کہ ان کے اندر اس کا ڈیرہ ہے.. وہ اسے بے دخل کرنے کے ابھی قابل نہیں ہیں.. اسی لیے وہ ابھی اُدھر کا رخ نہیں کرتے جدھر وہ براجمان ہیں، ان سے نظریں چراتے ابھی اپنے اپنے خیموں میں منہ چھپائے عبادتوں میں مگن ہیں اور اپنے لیے طاقت طلب کرتے ہیں تاکہ وہ کسی روز ان کا سامنا کر سکیں..

منیٰ میں اذان کی آواز سنائی نہیں دیتی..

یا ہو سکتا ہے مجھے سنائی نہ دی ہو..

جانے وہاں اذان دی بھی جاتی ہے یا نہیں..

یا لاکھوں لوگوں کے صرف سانس لینے سے اتنا شور اٹھتا تھا کہ وہ اس میں دب جاتی تھی..

اگر بہ فرضِ محال اذان نہیں بھی دی جاتی تھی تو اس سے کچھ فرق نہ پڑتا تھا.. کیونکہ پچیس لاکھ سوتے کے پجاریوں کے بدن میں زندگی میں پہلی بار ایک ایسا الارم کلاک فٹ ہو جاتا تھا جیسے دل ناتواں کو متحرک رکھنے کے لیے ایک پیس میکر سرجن حضرات دل میں فٹ کر دیتے ہیں.. تو وہ ایسا کلاک زندگی میں پہلی بار بدن میں ٹانکا جاتا ہے کہ جونہی کسی بھی نماز کا وقت ہوتا ہے تو وہ دہائی سی دینے لگتا ہے کہ اٹھو اٹھو.. غافل ہو تو غفلت سے باہر آ جاؤ.. اپاہج ہو تو چلنے لگو.. گونگے ہو تو بولنے لگو.. شور مچ جاتا ہے.. گھنٹیاں بجنے لگتی ہیں.. پازیبیں کھنکنے لگتی ہیں اور ہر شریان اور ہر رگ میں کوئی بڑے غلام علی خان یا روشن آرا بیگم الاپنے لگتی ہے کہ جاگو جاگو موہن پیارے..

تو موہن پیارا کیسے نہ جاگے.. اتنے شور شرابے اور سُریلے الاپوں میں موہن کی کیا مجال کہ وہ سوتا رہ جائے..

اور جب آپ سوتے سے بیدار ہوتے ہیں.. اس اندر کے گھڑیال کی ٹن ٹن سے تو یقین جانئے آپ بیزاری سے بیدار نہیں ہوتے.. بے شک آپ کے حصے میں صرف دو تین گھنٹوں کی نیند آئی ہو آپ ایک سیاہ ہرن کی مانند چوکڑیاں بھرتے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں.. نہ کوئی جمائی لیتے ہیں نہ کوئی غنودگی طاری ہوتی ہے.. یہ وہ عالم شوق کا ہوتا ہے جو دیکھا نہ جائے.. لیکن یہ دیکھا جائے کہ وہ بُت ہے یا خدا ہے.. یہ دیکھا جائے.. کسی بُت کے لیے اتنی آسانی سے بیدار ہونا کم از کم میرے لیے ممکن نہیں چاہے وہ بُت کتنا ہی خوبصورت ہو..

منیٰ کے یک... لاکھوں میں ایک.. خیمے میں فجر کے وقت میں اسی کیفیت میں مبتلا بیدار ہوا..

بیدار ہوتا ہوں تو آس پاس کیا دیکھتا ہوں.. غنودگی کافور ہو چکی ہے اور میں کیا دیکھتا ہوں کہ بیشتر اہل خیمہ رت جگے کی کیفیت میں ہیں.. وہ جاگتے رہے ہیں اور میں سوتا رہا ہوں.. وہ تو پوری شب جھکتے رہے ہیں.. عبادت میں مگن.. تلاوت کرتے، دعائیں مانگتے رہے ہیں اور میں غافل سوتا رہا ہوں..

انہوں نے نہ جانے کیسی کیسی منزلیں طے کر لی تھیں.. کہاں جا پہنچے تھے.. اور میں سوتا رہا تھا.. اونٹوں والے پنوں کو لے جا چکے تھے اور بے خبر سسی سوتی رہی تھی اور شہر بھنبھور لٹ چکا تھا..

ایک شدید احساس جرم نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا.. کہ میں سوتا رہا تھا..

لیکن شہر منیٰ میں اور شہر بھنبھور میں ایک فرق تھا..

سسی بے خبر بے شک غفلت میں رہے.. سوتی رہے.. لیکن یہ شہر ایسا تھا کہ لٹتا نہ تھا..

اس کی کانوں میں سے ڈلیاں برآمد ہوتی رہتی تھیں..

میرے اقرار کرنے میں کوئی حرج نہیں..

بے شک اس اقرار سے اُس ماتھے پر جس پر محراب کا سیاہ نشان ہے، اُس پر تیوڑی کے بل پڑ جائیں اور ریش مبارک پر خشونت سے ہاتھ پھیرا جائے تب بھی اقرار کرتا ہوں.. ان کے سامنے نہیں جنہوں نے رب کعبہ کی اجارہ داری کا بہروپ بھر رکھا ہے بلکہ منیٰ کے شہر میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نے زندگی بھر مسلسل پنج نمازیں کبھی ادا نہیں کی تھیں..

شاید اس لیے کہ پانچ برس کی کچی عمر میں میری پیٹھ پر مولوی صاحب کے جو بید برسے تھے.. نماز کی ادائیگی کے دوران جو زیر زبر کی غلطی ہوتی تھی اس پر نماز جاری رکھنے کے حکم کے ساتھ جو بید برسے تھے اور میں بھی اوندھا ہو کر گرتا تھا اور پھر کھڑا ہو جاتا تھا اور روتا تھا اور تب بھی نماز پڑھتا جاتا تھا تو شاید اس لیے..

یا شاید یہ ایک بہانہ تھا..

کچھ بھی تھا.. میں نے پوری حیات میں باقاعدگی سے پانچ نمازیں کبھی نہ پڑھی تھیں.. لیکن یہاں.. بلکہ پہلے طواف کے بعد میں خود بخود ”باقاعدہ“ ہو گیا تھا.. اور میں یہ بھی اقرار کرتا ہوں کہ چونکہ مجھے اتنی ڈھیر ساری نمازوں کی ادائیگی کی عادت ہی نہ تھی اس لیے میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ میری کمر میں جھک جھک کر ”کب“ نکل آیا ہے.. ایک اونٹ کی طرح میری کمر پر ایک کوہان اُبھر آیا ہے۔

''منیٰ کے غسل خانے اور ''آہا آہا.. ہُو ہُو.. سبحان اللہ''

فجر کے آثار خیمے کے دروازے سے اندر آتے آتے واضح ہو رہے تھے..

باہر سویر ہو رہی تھی اور منیٰ کے خیمہ شہر کے درمیان جو سینکڑوں گلی کوچے تھے ان میں ہزاروں متوقع حاجی حضرات ناشتے کی تلاش میں سرگرداں تھے.. آپ بے شک اپنی پوتر نالیں عرش کو چھو آئیں.. مست ملنگ ہو جائیں.. کچھ بھی ہو جائیں آپ صبح سویرے ایک ناشتے، ایک کپ چائے اور اس کے بعد ایک غسل خانے کی ضرورت سے ماورا نہیں ہو سکتے.. یہ سہولتیں مہیا نہ ہوں.. آپ بے سہولت ہو جائیں تو نہ عبادت یاد رہتی ہے اور نہ یاد الٰہی ستاتی ہے.. ہمارے خیمے کے برابر میں جو راہگذر تھی وہاں دو تین مقامات پر ناشتے کے بندوبست بھاپ اڑاتے نظر آئے اور درجنوں زائرین ہاتھ اٹھا اٹھا کر دکانداروں کو یوں متوجہ کر رہے تھے جیسے دعائیں مانگ رہے ہوں. میں نے ایک بنگالی ریستوران سے کافی ریال صرف کر کے جو کچھ خریدا وہ کچھ بھی ہو سکتا تھا لیکن ناشتہ نہیں ہو سکتا تھا. شائد وہ انڈے تھے آملیٹ ہوتے ہوتے.. یا میدہ تھا یا بھوسہ تھا.. اور اس کے ہمراہ گتے کے گلاس میں جو نیم جوشاندہ سا تھا وہ چائے تھی یا نہیں تھی یا کچھ اور تھا..

''سونے'' کی ایک ڈلی حاصل کرنے کے لیے.. ایک دیسے سکے کے حصول کے لیے آنے والے کے لیے جس پر ''حج'' کی مہر ثبت ہو، شکایت کرنا جائز نہیں، اس لیے میں بھی شکایت نہیں کرتا..

البتہ جب میں غسل خانوں کی جانب گیا، مناسب تفتیش کے بعد کہ وہاں رش کتنا ہے.. کتنی دیر میں باری آتی ہے.. کتنی دیر میں پانی آتا ہے تو وہاں شکایتوں کے دفتر کھلے تھے..

پچیس لاکھ زائرین کو سنبھال لینا کوئی معمولی بات نہیں جب کہ ان کے سینکڑوں مزاج ہوں، سینکڑوں ذائقے اور خصلتیں ہوں.. ایک دوسرے سے جدا آب و ہوا اور خوراک کے عادی ہوں.. بے شک ایک امت ہوں لیکن ان کا جغرافیہ اور طبیعت تو جدا جدا تھی.. ایک ہی قومیت اور زبان کے پچیس لاکھ افراد کا بندوبست کرنے کے لیے ایک واضح پالیسی اختیار کی جا سکتی ہے لیکن ان بھانت بھانت کے لوگوں، بولیوں اور مزاجوں کا کیا کیا جائے ان سب کو سنبھالنا واقعی ناممکن لگتا ہے..

بہت ساری بڑبڑاہٹوں، شکایتوں اور الم ناک واقعات کے باوجود سعودی حکومت کے انتظامات کی توصیف نہ کرنا زیادتی ہوگی.. اگرچہ وہ کسی پر احسان نہیں کرتے، یہ ان کی روزی روزگار بھی ہے۔ وہ قطعی طور پر مسلمانان عالم کے حضور اپنی خدمت محض ثواب کمانے کی خاطر پیش نہیں کرتے.. ثواب کے علاوہ بھی وہ بہت کچھ کماتے ہیں اور ایک زمانے میں ان کی دال روٹی بلکہ کھجور دودھ حج کی آمدنی سے ہی چلتے تھے اور اب اگر وہ مرغ پلاؤ کھاتے ہیں.. لاکھوں کی گھڑیاں باندھتے ہیں اور ان پر وقت کبھی نہیں دیکھتے.. اپنی شکلوں سے زیادہ خوبصورت کاروں میں گھومتے ہیں.. ایسے ولاز میں رہتے ہیں جن میں وہ جچتے نہیں تو اب بھی حج کے دوران انہیں جو آمدنی ہوتی ہے، وہ اس سے غفلت نہیں برت سکتے.. اسی لیے سعودی ایئر لائن حج کے دنوں میں ملاقاتی ویزا پر آنے والوں کے لیے کرائے ڈیڑھ گنا کر دیتی ہے اور کسی بھی پاسپورٹ پر ٹھپہ لگانے کے لیے حرم کے خدام کی خدمت میں پونے چار ہزار روپے کی پوٹلی پیش کرنی پڑتی ہے.. تو یہ محض ثواب کا ہی نہیں مناسب کمائی کا کام بھی ہے..

اور انہیں یعنی عربوں کو کمائی کے اس کام کا تجربہ پچھلے دو ہزار برس سے بھی زائد کا ہے.. جب سے حضرت ابراہیم نے کعبہ کی پہلی اینٹ رکھی تھی تب سے ہے۔ چنانچہ وہ ایکسپرٹ ہو چکے ہیں..

فتح مکہ کے بعد بھی تنازعہ کھڑا ہوا تھا کہ حج کے موقع پر حاجیوں کو پانی کون پلائے گا.. کھانا کس کے ذمے ہوگا.. دیگر انتظامات کس کے سپرد ہوں گے.. خانہ کعبہ کی چابی کس کے پاس ہوگی کہ یہی سرداری تھی اور یہی روزگار..

اگرچہ موجودہ حکمران حجازی نہیں.. نجدی ہیں اور ان دونوں کی رقابت ایک مدت سے چلی آرہی ہے.. اور اس دیرینہ رقابت کے شواہد ہمیں آج بھی ملتے ہیں.. ایک تاریخ دان کا تجزیہ ہے کہ تاریخ کو مٹا دینے اور اس کا نام و نشان نہ چھوڑنے اور آثار ڈھا دینے کا عمل اسی دیرینہ رقابت کا شاخسانہ ہے.. کہ یہ نجد کی نہیں.. حجاز کی تاریخ ہے.. اور اسے شرک کا نام دے کر نابود کیا جارہا ہے.. محض حضورؐ کو برداشت کیا جاتا ہے کہ اس کے سوا چارہ نہیں۔ اگرچہ ان کی ذات سے وابستہ حوالے ایک ایک کر مٹائے جارہے ہیں.. سوائے ان کے مرقد کے.. شنید تو یہی ہے کہ اسے بھی جنت البقیع کے مزاروں کی مانند ڈھا دینے کا سوچا گیا تھا لیکن اس میں بغاوت کے خدشات تھے اس لیے اجتناب کیا گیا.. یہاں تک کہ گھر کے بعد حضورؐ کا دوسرا مسکن جبل نور جس کی کھوہ حرا میں پہلی وحی نازل ہوئی تھی، اسے بھی ناپسندیدہ قرار دے کر اسے ایک ڈسٹ بن میں بدل دیا جاتا ہے..

لیکن میں تو بھٹک گیا ہوں..

کیسا مسلمان ہوں کہ حج پر آیا ہوں اور اس کے باوجود صراط مستقیم سے بھٹک کر جانے کدھر سے کہاں نکل گیا ہوں.. کہنا میں صرف یہ چاہتا تھا کہ حج کے دوران سعودی حکومت کے انتظامات کی داد نہ دینا زیادتی ہوگی.. گھر میں چار مہمان آجائیں تو بھگدڑ مچ جاتی ہے تو پچیس لاکھ مہمانوں کو سنبھالنا جن میں ہزاروں

مہمان بہت ہی بدتمیز اور بے ہودہ بھی ہوتے ہیں، انہیں برداشت کرنا ایک کارنامے سے کم نہیں اور صرف ایک برس نہیں ہر برس ایسے انتظامات کرنا قابل ستائش ہے..

بس یہ ہے کہ شاید اُن کا دھیان اس جانب نہیں گیا کہ منیٰ میں ہزاروں لوگوں کے حصے میں صرف ایک غسل خانہ آتا ہے.. اگر دو چار آ جاتے تو فراغت میں آسانیاں پیدا ہو سکتی تھیں.. تو صرف اس جانب ان کا دھیان نہیں گیا..

منیٰ میں تعمیر کردہ محدود غسل خانوں کے گرد دباؤ میں آئے ہوئے جو ہجوم ہوتے ہوں، ان میں سے ہر شخص کی نفسیات پر فرائڈ ایک کتاب لکھ سکتا تھا..

ہمارے مکتب کی قربت میں جو چند غسل خانے اور پانی کے دس بارہ نل تھے وہاں جو حالتیں غیر ہوتی تھیں دھکم پیل ہوتی تھی اور "ایمرجنسی" ڈکلیئر ہوتی تھی اور اس کے بارہ بجتے تھے، ان کا تذکرہ قدرے دلچسپ ہے.. یوں بھی منیٰ کے غسل خانوں کے بیان کے بغیر حج کی سائیکی سمجھ میں نہیں آ سکتی..

الگ سے نہانے.. صرف پیشاب کرنے یا فارغ ہونے کے لیے جدا جدا بندوبست نہ تھا.. ایک ہی غسل خانے میں یہ سب انتظامات کر دیئے گئے تھے.. چنانچہ جو کوئی نصیب والا اندر جانے میں کامیاب ہو جاتا تھا تو باہر آنے کا نام نہ لیتا تھا.. وہ کوشش کرتا تھا کہ یہ تینوں عمل خوش اسلوبی سے سرانجام پا جاویں.. دروازے کے باہر ایک قطار لگی ہوئی ہے، بے چین اور بے اختیار ہوتے حضرات کی اور جو صاحب اندر گئے ہیں وہ وہیں مستقل اقامت اختیار کر چکے ہیں.. وہاں آباد ہو چکے ہیں.. آپ بے شک دستک دیں.. نعرے لگائیں.. فریادیں کریں.. اللہ رسول کے واسطے دیں وہ باہر نہیں آئیں گے.. اور کیوں آئیں شاید انہیں دو روز بعد یہ سنہری موقع ملا ہے تو وہ آئیں گے تو اچھی طرح نہا دھو کر آئیں گے.. احرام جھٹک کر.. فارغ ہو کر.. فرحت آمیز ہو کر ہی آئیں گے.. اس انتظار کے دوران حاجی حضرات کیسے اور کیونکر فراغت کے دباؤ اور پانی کے بہاؤ کو برداشت کرتے ہیں، اس گتھی کو صرف آئن سٹائن ہی سلجھا سکتا تھا..

وضو کے لیے بھی چند ایک نل رواں ہیں.. اور نماز کے اوقات میں وہاں بھی روزِ محشر کی کیفیت برپا ہوتی ہے کہ کہیں قضا نہ ہو جائے.. کسی کا پاؤں دُھل رہا ہے تو اس کے عین اوپر کوئی صاحب کلیاں کرتے پچکاریاں چلا رہے ہیں.. کوئی چلو بھر پانی کا خواہش مند ہے کہ کہنیوں تک اسے بہا لے جاؤں.. اور کسی نے نصف وضو کیا ہے تو پیچھے دھکیلا گیا ہے.. اور وہ اس سوچ میں ہے کہ وضو مکمل کرنے کے لیے یلغار کروں یا نہ کروں.. کروں تو نماز قضا ہو جائے گی..

اس دوران کچھ حضرات ایسے بھی ہوتے ہیں جو ٹونٹیوں کے سامنے تھڑے پر بیٹھے نہایت اطمینان سے.. نہایت تفصیل کے ساتھ.. جزیات کو ملحوظ خاطر رکھتے آس پاس کے ہجوم سے لاتعلق ایسے وضو کرتے چلے جاتے ہیں جیسے زندگی میں پہلی اور آخری بار کر رہے ہوں... اور اپنے محلے کی مسجد میں تنہا وضو کر رہے

ہوں. اُٹھنے کا نام نہیں لیتے ..

اسی کشمکشِ وضو کے دوران مجھے یاد ہے کہ میں بھی لوگوں کی بغلوں میں سے ہاتھ نکالتا پانی تک پہنچتا. کبھی ایک چلو بھرتا اور کبھی کسی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر منہ پر چھینٹے مارتا تھا کہ برابر میں بہت دیر سے بیٹھے ہوئے تفصیلی وضو کرتے ایک پاکستانی مولانا نے نہایت خشمگیں چہرہ بنا کر نہایت ناگواری سے مجھے مخاطب کیا ''تارڑ صاحب.. آپ کے احرام پر کچھ چھینٹے پڑ گئے ہیں.. آپ کا وضو نہیں ہوا..''

میں نے بھنا کر کہا ''مولوی جی.. کیا میں نے تم سے پوچھا ہے کہ میرا وضو ہوا ہے یا نہیں؟''

اس پر وہ مزید خفا ہو گئے اور بولے ''میرا دینی فرض تھا کہ آپ کو بتا دیتا کہ آپ کا وضو نہیں ہوا تو نماز بھی قبول نہیں ہوگی.. میں نے تو آپ کی بھلائی کی بات کی ہے..''

یہ تو تھا غسل خانوں کے برابر میں جو چند نل رواں تھے جن پر ہجوم ٹوٹ پڑتا تھا، اس کا بیان تو یہاں سے پھر واپس چلتے ہیں غسل خانوں کی جانب.. جہاں اگرچہ ایک شدید دباؤ والی مگر پُرلطف صورتِ حال جنم لے رہی ہے..

ایک صاحب کی بے چینی عروج پر ہے. حالت اضطراب میں ہیں.. بار بار ناف کے زیریں حصے پر ہاتھ جما کر اپنے آپ کو بے اختیار ہونے سے بچا رہے ہیں. اور ان کے آگے ابھی تین چار متاثرین انہی کی حالت زار میں ہیں تو وہ صاحب اپنے آگے کھڑے امیدوار کی کمر پر ہلکے ہلکے کچوکے دیتے ہیں کہ بابا جلدی کرو.. اور وہ بابا جلدی کیسے کریں، ان کے آگے بھی تو دو تین اضطراب کے پیکر پہلو بدلتے ہیں.. تو ان بابا صاحب کو شاید گدگدیاں ہوتی تھیں تو جونہی ان کے پیچھے منتظر حاجی بابا ان کی کمر میں کچوکے دیتے تو وہ ذرا جھک سے جاتے تھے.. قدرے لہک سے جاتے تھے.. بالآخر انہوں نے پلٹ کر کہا ''آپ کا کیا خیال ہے، میں یہاں رقص کرنے کے لیے آیا ہوں جو یوں گدگداتے چلے جا رہے ہیں..''

ایک اور صاحب بھی ''ایمرجنسی'' میں مبتلا ہیں اور خوش قسمتی سے ان کے اور لبِ بام کے بیچ صرف ایک حاجت مند کھڑے ہیں اور وہ غسل خانے کے تادیر بند آہنی دروازے پر ہاتھ رکھے آس لگائے کھڑے ہیں.. یہ صاحب جو دوسرے نمبر پر ہیں اور ان کے پیچھے کھڑے ہیں، کچھ زیادہ ہی ایمرجنسی میں مبتلا ہیں تو اُن سے منت کرتے ہیں کہ بھائی مجھے پہلے اندر جانے دو.. مت پوچھو کہ کیا حال ہے میرا تیرے پیچھے.. ان کی ٹھوڑی کو چھوتے ہوئے ایک عجیب سی لجاجت آمیز آواز نکالتے ہیں.. کہ آ.. ہو ہو.. ڈن شان.. الحمدللہ.. کہ دونوں کی زبانیں الگ الگ ہیں.. کہہ رہے ہیں کہ بھائی جان.. ہم ایک اُمت ہیں.. ایک بدن ہیں اور بدن کے جس حصے میں درد ہوتا ہے تو پوری امت کے بدن میں درد ہوتا ہے.. تو یہ درد سہا نہیں جا رہا.. آپ مہربانی کرو.. اپنی باری مجھے دے دو، میں سخت مصیبت میں ہوں.. یہ مصیبت یہیں کہیں خارج نہ ہو جائے.. مجھے پہلے جانے دو،

آپ کی مہربانی!

اور وہ صاحب جو غسل خانے کے آہنی دروازے پر ہاتھ رکھے اس کے کھلنے کے منتظر ہیں، ان کا ہاتھ ٹھوڑی سے ہٹا کر کہتے ہیں، اور اپنی زبان میں کہتے ہیں "آ ہا آ ہا.. ہو ہو.. سبحان اللہ"

یعنی میں جو اتنی دیر سے کھڑا منتظر ہوں اور اپنے آپ کو روکے ہوئے ہوں.. اپنی باری تمہیں دے دوں.. گھاس چر گئے ہو کیا.. میں امت کے لیے اتنی بڑی قربانی نہیں دے سکتا..

ایک اور حاجت مند.. اور اس واقعے کے چشم دید گواہ یوسف شاہ صاحب ہیں جو ہمارے ہم سفر تھے.. برما میں پاکستان کے سفیر تھے اور پٹھان ہونے کے ناطے بُو باس سے عاری نہایت زندہ دل اور ہنس مکھ تھے.. ان کا پسندیدہ موضوع بھی منیٰ کے غسل خانے تھے

بقول ان کے ایک صاحب اپنی ناف کے زیریں حصے کو دونوں ہاتھوں سے کنٹرول کرتے ہوئے قطار میں اپنے سے آگے کھڑے حضرت سے درخواست کرتے ہیں کہ للہ.. کرم کیجیے، مجھے پہلے جانے دیجیے کہ روانی آب ہوا ہی چاہتی ہے..

اور وہ صاحب پلٹ کر کہتے ہیں برآپ کے ہاں تو ہوا ہی چاہتی ہے.. ہمارے ہاں اس کا آغاز ہو چکا ہے.. اور قطرہ قطرہ دریا ہے شروع ہوا جا رہا ہے..

میں نے ان مختصر غسل خانوں کی جانب بڑھتے ہوئے ایسے شائقین کو بھی دیکھا اور لاچار اور بے بس دیکھا اور یہی طے پایا کہ تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے..

اور کیا کیا ایک ہوئے..

یوسف شاہ اگرچہ دیرینہ سفارت کار ہیں، ایک عزت مآب سفیر ہیں پھر بھی قطار میں کھڑے پہلو بدلتے ہیں اور کوئی پشتو گیت گنگناتے ہیں تاکہ دھیان بٹا رہے اور ایمرجنسی کی نوبت نہ آئے..

مہدی صاحب.. کینیڈا میں ہائی کمشنر رہ چکے ہیں اور ان دنوں یو این او کے سیکرٹری جنرل کے آس پاس کسی بلند عہدے پر متمکن ہیں وہ اپنی ریڑھ کی ہڈی کو سنبھالنے کی خاطر گلے میں ایک طوق سا پہنے ہوئے ہیں.. پاؤں میں بھی کوئی عارضہ ہے اور نہایت تحمل سے دھوپ میں اور قطار میں کھڑے ہیں.. منتظر ہیں کہ کب بلاوا آتا ہے..

فیڈرل سیکرٹری برائے اطلاعات و نشریات انور محمود ہیں جو عینک سنبھالتے ایک کموڈ اٹھائے چلے آرہے ہیں اور نہایت پریشان ہیں کیونکہ نہیں جانتے کہ ایک کموڈ کیسے اٹھایا جاتا ہے.. میں دریافت کرتا ہوں کہ جناب آپ تو ان دنوں پورے پاکستان کے میڈیا کے زار ہیں تو یہاں زار و قطار کیوں ہیں.. تو ان کی بیگم کہتی ہیں "بھائی میرے گھٹنوں میں تکلیف ہے، غسل خانوں میں انڈین سسٹم ہے، انور صاحب بے چارے

میرے لیے کموڈ اٹھائے چلے آ رہے ہیں۔"

میں نے محض مردانہ غسل خانوں کی حالتِ زار اور حالتِ قطار بیان کی ہے.. زنانہ غسل خانوں کے سامنے ان سے بڑھ کر جمِ غفیر تھا کہ خواتین کے مسائل اور بھی ہوتے ہیں..

منیٰ میں یہ واحد شکایت تھی..

اگرچہ ہم نے کچھ تجربے اور کچھ اِدھر اُدھر تاک جھانک کر کے جان لیا تھا کہ اگر ہم نزدیکی پاکستان ہاؤس کے پہریدار سے نظر بچائے وہاں کے غسل خانوں تک پہنچ جائیں تو فراغت نسبتاً آسانی سے ہو سکتی تھی..

"تُوں سُتّوں چادر تان کے.. تیں عمل نہ کیتے جان گئے.. منیٰ کے دن اور منیٰ کی راتیں"

منیٰ کے کوچہ و بازار دیکھتے دیکھتے خالی ڈبوں.. جوس کے کارٹنوں.. پلاسٹک کے تھیلوں منرل واٹر کی بوتلوں سے یوں اٹ جاتے تھے کہ آپ سڑک پر نہیں اس وسیع کاٹھ کباڑ میں چلتے تھے.. اور پاؤں بچی کھچی خوراک اور جوس سے آلودہ ہو جاتے تھے پھر دیکھتے دیکھتے بل ڈوزر نما صفائی کی مشینیں نمودار ہوتی تھیں اور اگلے لمحے یہ کوچہ و بازار پھر سے صاف ستھرے ہو جاتے تھے.. اگر فی زائر جوس کے دو ڈبے، منرل واٹر کی ایک بوتل اور دو شاپنگ بیگ حساب کیے جائیں تو روزانہ ایک کروڑ کاٹھ کباڑ سڑکوں پر پھینکا جاتا تھا اور اسے سمیٹنا اتنا آسان نہ تھا۔

منیٰ کے قیام کے دوران یہ احساس کم ہی ہوتا تھا کہ آپ کسی مقدس فریضے کی تکمیل کی خاطر یہاں قیام کر رہے ہیں۔ لگتا ہے کہ بس نمازیں پڑھنے اور تفریح کے لیے یہاں آئے ہیں.. پکنک منا رہے ہیں..

سرِ شام مکتب کے باہر تھڑوں پر محفلیں جم جاتی تھیں..

منیٰ میں دو زندگیاں تھیں۔

ایک خیمے کے اندر.. جہاں کچھ لوگ سوتے رہتے تھے.. جیسے سونے کے لیے آئے ہوں..

کچھ گپیں لگاتے رہتے تھے جیسے بس یہی کرنے کو آئے ہوں..

اور کچھ ہمہ وقت عبادت میں مصروف رہتے تھے جیسے عبادت کے لیے ہی آئے ہوں..

میں ان تینوں زندگیوں کا مرکب تھا۔ یہاں گدّوں پر نماز پڑھتے وقت عجیب مزاحیہ سی صورت حال پیدا ہو جاتی تھی.. کہ آپ ہاتھ باندھے ان پر کھڑے ہیں اور ڈولتے ہوئے اپنا بیلنس قائم رکھنے میں مشغول ہیں.. سجدے میں جا کر اٹھتے ہیں تو اٹھا نہیں جاتا کہ گھٹنے فوم میں دھنسے اٹھنے سے انکاری ہو جاتے ہیں، بمشکل لڑکھڑا کر کھڑے ہوتے ہیں تو پھر ڈولنے لگتے ہیں.. اس ڈانواں ڈول صورتِ حال کا حل میں نے یہ نکالا کہ سامنے والے خیمے میں جہاں اُردنی امریکی قیام پذیر تھے، نماز کے وقت وہاں چلا جاتا.. ان کے پاس خاصی

گنجائش بھی تھی اور فرش پر قالین بھی بچھا تھا. نماز کے اختتام پر ان کے وفد کا ایک باریش نوجوان امریکی لہجے میں اسلام کے بارے میں لیکچر دیتا جو دل کو خوش کر دیتا..

امریکیوں سے یاد آیا کہ ہمارے مکتب کی قربت میں.. کہ غسل خانوں کو ہم اُدھر سے ہو کر جاتے تھے.. امریکی مسلمان گوروں کا بھی ایک کیمپ تھا جنہیں یہاں تک لانے والی سیاحتی تنظیم کا بینر اُن کے خیموں پر آویزاں تھا اور اس پر جلی حروف میں "پیراڈائز ٹورز" لکھا ہوا تھا.. یہ ایک مخصوص امریکی رویہ تھا کہ ہماری تنظیم کے ذریعے حج کیجیے اور سیدھے جنت سدھاریئے.. ان امریکیوں کے لیے نہایت پر تکلف انتظامات کیے گئے تھے اور وہ باقاعدہ فرائی انڈوں اور ٹوسٹ مکھن کا ناشتہ تناول کرتے تھے اور لنچ کے لیے بُوفے کی میزیں سج جاتی تھیں.. میں نے ان گوروں میں سے کسی ایک کو بھی غسل خانوں کے گرد منڈلاتے نہیں دیکھا تھا جس کا مطلب یہی تھا کہ ان کا الگ سے کہیں اور بندوبست تھا. ان میں سے ایک نہایت فربہ امریکی خاتون شلوار قمیض میں ملبوس دوپٹہ اوڑھے ہاتھ میں تسبیح تھامے ہمہ وقت لبیک لبیک پکارتی پھرتی تھی.. انہیں ایک شکایت تھی کہ ہر کوئی مجھ سے پوچھتا ہے کہ کیا تم مسلمان ہو.. اگر مسلمان نہ ہوتی تو یہاں کیسے ہوتی..

اور ہاں منیٰ کے پہلے پھیکے ناشتے اور بدذائقہ بازاری لنچ کے بعد ہم قدرے ہوشیار ہو گئے.. اور تحقیق کرنے پر کھلا کہ فلاں مکتب میں بنگالی بھائی دال چاول لگائے بیٹھے ہیں اور فلاں جگہ ہندوستانیوں کا ڈیرہ ہے اور ان کے ہمراہ کوئی لکھنوی باورچی ہے جو پلاؤ بہت عمدہ پکاتے ہیں.. پاکستان ہاؤس کا کھانا بھی مناسب تھا.. اور جب عیاشی کو جی چاہتا تھا تو "البیک" کی جانب ہرکارہ بھیجتے تھے اور وہ چکن نگٹس لے آتا تھا.. اور اس دوران اتنے چکن نگٹس کھائے کہ پاکستان واپسی پر جب کسی ریستوران میں چکن کی ان ڈلیوں کو چکھتے تو فوراً منیٰ پہنچ جاتے اور نفل ادا کرنے کو جی چاہنے لگتا..

تو منیٰ میں دو زندگیاں تھیں..

ایک خیمے کے اندر..

اور دوسری خیمے کے باہر سر شام تھڑوں پر سجتی تھی..

یہاں بازار میں چلتے پھرتے انواع و اقسام کے حاجیوں سے ملاقات رہتی. معلومات اور مسنون دعاؤں کا تبادلہ ہوتا.. اُردنی امریکی لطیفے سناتے لیکن ایسے لطیفے جو ایمان کو متزلزل نہ کرتے ہوں.. خوراک اور غسل خانوں پر بحث ہوتی.. یہیں پر میاں وحید سے ملاقات ہوگئی جو نہایت زندہ دل اور روح افزا قسم کے بزرگ تھے اور اپنی سفید ریش کو سنوارتے سگریٹ پہ سگریٹ پھونکے چلے جا رہے تھے..

"میاں صاحب.. یہ حج کے دوران سگریٹ پینا جائز ہے.؟"

"پتہ نہیں.."

"میرا تو خیال ہے جائز نہیں.. اگر خوشبو لگانے کی بھی ممانعت ہے تو اس کی بُو پھیلانے کی بھی

ممانعت ہو گی۔"

"بالکل ہو گی۔"

"تو پھر آپ کیوں پی رہے ہیں؟۔"

"مجھے سگریٹ کی لت ہے۔" وہ ایک طویل کش لگا کر مسکراتے ہوئے کہنے لگے۔ اور وہ نہ صرف اپنی بیگم بلکہ کل بال بچوں، پوتے پوتیوں سمیت حج کے لیے آئے تھے۔

"حج پر آنے سے پیشتر میں توبہ تائب ہوا۔ جتنے سگریٹ جیب میں تھے، انہیں مسل کر کوڑے کے ڈھیر میں پھینک دیا اور یہاں چلا آیا۔ ابھی صرف پہلا دن تھا کہ میری بیگم نے کہا۔ میاں صاحب آپ نماز پڑھتے ہوئے سجدے بھی آگے پیچھے کر جاتے ہیں۔ اور جب بلند آواز میں دعائیں مانگتے ہیں تو ان میں بھی ربط کی خاصی کمی ہوتی ہے تو ذرا احتیاط کیا کریں، حج کا معاملہ ہے۔ تو میں نے کہا۔ نیک بخت معاملات اپنے بس میں نہیں، بدن میں نکوٹین کی کمی کوہ بائی دیتی ہے۔ کچھ کا کچھ پڑھ جاتا ہوں۔ آمین کہتا ہوں تو فوراً سگریٹ نظروں کے سامنے دھواں دینے لگتے ہیں۔ سجدے میں جاتا ہوں تو ناک تمباکو سونگھتی ہے۔ میں کیا کروں، مجبور ہوں۔ اس پر بیگم نے اپنا ذاتی بیگ کھولا اور اس میں سے میرے برانڈ کے سگریٹ نکال کر میرے سامنے رکھ دیے اور کہنے لگی۔ میاں صاحب میں جانتی تھی کہ آپ ان کے بغیر حج نہیں کر پائیں گے۔ سجدے آگے پیچھے کرنے اور بے ربط دعائیں مانگنے سے جو گناہ ہوتا ہے وہ یقیناً کش لگانے سے نہیں ہوتا۔ بسم اللہ کیجیے۔ چنانچہ تارڑ صاحب اب اللہ کے فضل سے عبادت میں بھی شدت اور یکسوئی آ گئی ہے۔ اس کے علاوہ ڈھیرے ڈھیرے بصارت میں جو کمی آ رہی تھی اس کا مداوا بھی ہو گیا ہے۔ منیٰ دکھائی دینے لگا ہے۔ آپ سگریٹ پیتے ہیں؟"

"پیتا تھا۔"

"اب کیوں نہیں پی رہے؟"

"ممانعت ہے۔"

"حالت کیسی ہے؟"

"جیسی میری حالت اب ہے، کبھی ایسی تو نہ تھی۔ مت پوچھیے میرا کیا حال ہے تیرے پیچھے۔"

"کش لگا لیں۔ اللہ معاف کرنے والا ہے۔"

"معاف کر دے گا۔" میں نے مسکرا کر میاں صاحب کو دیکھا۔

"اتنا کچھ معاف کر دیتا ہے۔ یہ تو دو چار کش ہیں۔"

میں نے میاں صاحب کے عنایت کردہ سگریٹ سے جو پہلا کش لگایا تو بدن کی ایسی بحالی ہوئی ہے، ایسی تسکین ہوئی ہے کہ باقاعدہ نماز کے علاوہ تہجد پڑھنے کو بھی جی چاہنے لگا۔ ویسے تو میں نے منیٰ کے گلی کوچوں میں ہزاروں حاجیوں کو برسرِعام سونے لگاتے دیکھا تھا اور دل ہی دل میں انہیں سخت لعن طعن کی تھی کہ

ان کا حج قبول ہوتے کا نہیں لیکن اس پہلے کش کے بعد میں نے میاں صاحب کی یہ توجیہہ دل و جان سے قبول کرلی کہ وہ اتنا کچھ معاف کر دیتا ہے تو دو چار کش اور سہی.. ایک خطا اور سہی.. اور یہ خطا بھی اللہ میاں اُس میاں وحید کے کھاتے میں ڈال دیجئو.. مجھے ورغلانے والے وہی تھے اور میرا حج تو قبول کر لیجیو..

مکتب کے باہر سر شام اس تھڑے پر بیٹھے ہوئے.. اور بیٹوں سے نظریں بچا کر کش لگاتے ہوئے کچھ اور تجربات بھی ہوئے.. انسانی نفسیات اور ردعمل کے کئی پہلو سامنے آئے..

ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے دو پاکستانی بے فکرے اور بے پرواجیسے گوالمنڈی میں گھوم رہے ہوں..

کوئی بوڑھا افریقی.. کمر خمیدہ.. جس کی سفید داڑھی کے چند بال اس کی آبنوسی ٹھوڑی پر نمایاں ہوتے تھے.. اپنی دُھن میں جانے کیا پڑھتا کیا ورد کرتا آس پاس سے لاتعلق چلتا جا رہا ہے..

ایک افریقی خاندان سر پر چٹائیاں اٹھائے فٹ پاتھ کے کسی ایسے گوشے کی تلاش میں تھا جہاں وہ رات گزار سکے..

خوراک کے کھوکھوں اور ریستورانوں میں کام کرنے والے باورچی اور ملازم جو ہر برس یہاں کاروبار کے لیے دکانیں سجاتے تھے اور انہیں حج سے کوئی غرض نہ تھی.. یہ ایک میلہ تھا جس میں وہ روزی کمانے کی خاطر آئے تھے.. اور میرا گمان تھا کہ وہ برس ہا برس سے منیٰ میں آ رہے تھے لیکن شاید انہوں نے ابھی تک باقاعدہ حج نہیں کیا تھا کہ تجھ سے بھی دل فریب ہیں غم روزگار کے.

یہاں بھی.. اپنے خیمے سے باہر.. منیٰ کی شام میں.. ایک تھڑے پر براجمان میرے سامنے.. خانہ کعبہ کی دوسری منزل کی چھت پر اس رات گنبد سے ٹیک لگائے ہوئے میرے سامنے سے طواف میں محو جو لوگ گزرتے تھے تو ان میں سے ہر ایک کی لگن اور چہرے کی کیفیت ایسی تھی جسے مدتوں بیان کیا جا سکتا تھا.. ایسے یہاں بھی.. منیٰ کی شام میں.. تھڑے پر بیٹھے ہوئے میرے سامنے.. ایسے ہزاروں افراد گزرتے تھے جنہیں بیان کرنے کے لیے.. کہ یہاں محض عقیدت اور لگن نہ تھی ایک بے پروا پکنک پر آئے ہوئے لوگوں کی کیفیت بھی تھی تو اسے بیان کرنے کے لیے بھی اک عمر درکار ہے..

اس تھڑے پر بیٹھے ہوئے.. کئی روز کے بعد پہلا کش بدن میں بھرنے کے بعد یادداشت میں جو سب سے انوکھی اور پیاری تصویر باقی ہے، میں چاہتا ہوں کہ آپ کو بھی اس میں شریک کروں..

ہمارے برابر میں دو پاکستانی بابے.. جو سفید ریش تھے.. بچپن کے یار لگتے تھے اور چٹے ان پڑھ بھی لگتے تھے، حیرت سے اپنے سامنے سے گزرنے والے زائرین کو.. دعائیں مانگتے.. بلند آواز میں آیات قرآنی کا ورد کرتے دیکھ کر کہتے ہیں ''یار محمد دین..''

ان میں سے ایک نے یار محمد دین کو جو کچھ کہا، وہ پنجابی میں کہا ''یار محمد دین.. اسی وی جے پڑھے

لئے ہوندے تے وخت نوں پھڑے ہوندے۔'' یعنی'' یار محمد دین.. اگر ہم بھی پڑھے لکھے ہوتے تو اسی طرح مصیبت میں مبتلا ہوتے..''

نقل کفر والی بات ہے.. جو سنا وہ رپورٹ کر رہا ہوں..

ویسے مجھے یقین کامل ہے کہ دعائیں کرنے والے اور آیات پڑھنے والوں کی نسبت ان اَن پڑھوں کی قبولیت کا زیادہ امکان تھا..

وہ آنکھیں بند کر کے.. نہ جانتے.. نہ سمجھتے ہوئے.. یہاں ایک ایسی خالی سلیٹ کے ساتھ چلے آئے تھے، جس پر کچھ نہ لکھا تھا..

ایک ایسی ہی سلیٹ پر ''اقرا'' لکھا گیا تھا..

تو جو پڑھے لکھے نہیں ہوتے صرف انہیں ہی ''اقراء'' کی آواز آتی تھی..

استنبول سے خشکی کے راستے پر سفر کرتے جو ترک ابھی ابھی منیٰ پہنچے ہیں اور وہ چھ روز کی مسافت کے بعد یہاں پہنچے ہیں تو وہ منیٰ کی گلیوں میں ان کے سامنے جو بھی شخص آتا ہے.. افریقی.. یورپی یا ایشیائی اس سے گلے مل رہے ہیں.. آبدیدہ ہوئے جاتے ہیں کہ شکر ہے ہم بروقت پہنچ گئے ہیں..

پاکستان ہاؤس سے آگے دائیں جانب ایک مکتب کے باہر ایک باریش.. خوش شکلی کی انتہا کو چھوتے ہوئے ایک صاحب.. میرے قریب آتے ہیں اور نہایت گرمجوشی سے گلے ملتے ہیں اور کہتے ہیں.. تارڑ صاحب.. آپ بھی یہاں..!

''کیا مطلب کہ میں بھی یہاں..'' میں ان کی گرم جوش گرفت سے الگ ہو کر ناگواری سے کہتا ہوں..

اور جب الگ ہوتا ہوں اور ان کی شباہت پر غور کرتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ یہ مولانا جنید جمشید ہیں جو نادیہ حسن کے سنگ پاکستانیوں میں پاپ سنگنگ کی خشت اول ہیں.. ایک پامیر ہیں.. جنہوں نے روح کو چھونے والے درجنوں گیت گائے.. ''اور دل دل پاکستان.. گایا.. اور اب ایک باریش صورت میں منیٰ کی سٹیج پر پچیس لاکھ لوگوں میں سے ایک.. اس سٹیج پر پرفارم کر رہے ہیں..

ویسے میں شروع سے ہی جنید جمشید کی حیا اور شرافت کا شاہد رہا ہوں.. ہزاروں قربان ہوتی دوشیزاؤں کے ہجوم میں مسلسل گھرے رہنے کے باوجود اس کی نظر میں کبھی میں نے ہوس نہ دیکھی.. وہ ہمیشہ اپنی بے مثال مقبولیت سے شرمندہ اور حیادار رہا.. شاید ... در جوانی توبہ کردن شیوۂ پیغمبری.. اسی کے بارے میں کہا گیا تھا..

ہم لوگ تو اپنی عامیانہ اور جعلی شہرت کو ہضم نہیں کر سکتے اور یہ کیسا شخص تھا جو ایک زمانے کی پسندیدگی پر حاوی.. ملکوں ملکوں جانا پہچانا.. سب دنیا ترک کر کے داڑھی بڑھائے.. سر جھکائے اپنے آپ کو پچیس لاکھ لوگوں میں گم کیے.. بے شناخت کیے یہاں چلا آیا تھا.. اور کیسا مطمئن تھا جیسے کچھ بھی نہیں کھویا.. سب کچھ پا لیا ہے..

منیٰ کے دن..

اور منیٰ کی راتیں..

بس اس ہوس میں..اس انتظار میں گزرتے کہ کب یہاں سے کوچ کریں.بسوئے عرفات جائیں..اور کب وہاں شاہان شاہ کا دستخط کردہ فرمان جاری ہو کہ..تارڑ حاجی ہو گیا..

ابھی تو منیٰ..

منیٰ منیٰ..

یامُو نامُونا..جو کہ میری بیگم بھی ہیں..

"ہزار قافلۂ آرزو... میں دُور کے شہروں سے آیا ہوں"

ایک نیم صحرائی وسعت میں ہر سو دھول اٹھ رہی تھی..

دھول کا ایک غبار تھا جو تیز دھوپ کو مدھم کرتا تھا..

ہوائیں سنسناتی ہوئی صحراؤں کی ریت کی پرتیں پلٹتی تھیں.. اِن کے ذرّے ایک دمکتی چادر کی صورت بُن کر سورج کے سامنے تان رہی تھیں..

اور ریت کے اس غبار میں ہزاروں لوگ پا پیادہ.. تیز تیز چلتے.. اپنے احرام سنبھالتے کہ وہ فضا میں سفید پھریروں کی مانند یوں پھڑ پھڑاتے تھے جیسے ہزاروں پرچم ہوں کسی سپاہ کے.. ہزاروں سفید کبوتر ہوں جو اُن کے سروں کے اوپر انہی کی رفتار سے پنکھ کھولتے ان پر سایہ کرتے ہوں..

کبھی وہ کسی بلند ریتلے ٹیلے کی اوٹ میں سے برآمد ہو کر دکھائی دینے لگتے.. اپنے بال بچوں سمیت.. عورتیں اپنے مردوں کی صحرائی چال کا ساتھ دے رہی تھیں اور بچے ریت میں سے اپنے ننھے پاؤں نکالتے مسرت سے دمکتے چلتے جاتے تھے..

ہزاروں قافلے تھے..

صحرا کی وسعت میں ریت کے ذرّوں کی دمکتی چادر میں سفید پیراہن لہراتے چلتے جا رہے تھے..

فروری کے مہینے میں ایک گرم دن میں تپتی ریت کو خاطر میں نہ لاتے شاہوں کی مانند چلتے جا رہے تھے..

پورے خاندان تھے.. قبیلے تھے.. گروہ تھے.. لیکن کہیں کہیں کوئی تنہا بھی تھا.. اور وہ تنہا سردار لگتا تھا اس تمکنت سے صحرا میں چلتا تھا..

اور وہ سب کے سب یک رُخے تھے.. ایک ہی سمت میں چہرے تابناک کیے چلتے جا رہے تھے..

کدھر جا رہے تھے؟

سوئے عرفات جا رہے تھے.. جدھر ہزاروں بسوں، ویگنوں، ٹرکوں، ٹریلروں اور کوسٹروں میں سوار کل خدائی جا رہی تھی..

ہم جو اپنے کوسٹر میں سوار تھے.. ہم رینگتے تھے اور وہ جو آس پاس کے صحرا کے غبار میں چلتے تھے، وہ

ہم سے آگے نکلے جاتے تھے.. یہ نہیں کہ وہ کسی مجبوری کے باعث یہ سفر پاپیادہ کر رہے تھے بلکہ انہوں نے سواری قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا.. ہماری طرح اپاہج تو نہیں تھے کہ ایک کوسٹر کی عافیت میں ایئر کنڈیشنڈ سہولت میں فالج زدہ لاچار بیٹھے رہتے.. ان کے ہاتھ پاؤں ثابت تھے، ان میں زندگی کی لہر تھی.. جس اللہ نے انہیں یہ پاؤں دیئے تھے تو وہ اس کے دربار میں حاضری دینے کے لیے اسی کے پاؤں چلتے تھے.. کُل اقوام کے لوگ تھے.. ان میں جو سوڈانی تھا، اس کی بلند قامت آبنوسی شباہت ایسی تھی جیسے مائیکل انجلو کا تراشیدہ کوئی مجسمہ جس میں جان پڑ گئی ہو اور وہ صحرا کی سفیدی میں ایک دہکتے سیاہ سورج کی مانند طلوع ہوتا تھا اور اس کا احرام ایک شاہانہ لبادے کی مانند حرکت کرتا تھا.. عرب بھی تھے.. جو اپنے خاندانوں کے ہمراہ اپنے گھر یعنی صحرا میں اپنائیت سے چلتے تھے.. یمنی اور مصری بھی تھے.. اور ترک تھے جن کے چہرے سورج کی تمازت سے سرخ ہوتے تھے اور ایرانی تھے جن کی آنکھوں میں سورج اترے ہوئے تھے.. رہ نوردِ شوق کے جتنے مسافر تھے، پر تمکنت اور بے تھکن تھے..

اور ہم اپاہج.. اپنے کوسٹر میں بیٹھے صحرا کے غبار میں سے برآمد ہوتے ان ہزاروں قافلوں کو حیرت سے تکتے تھے..

کالے خان ایک ایسا عرفات دیدہ آزمودہ ڈرائیور تھا جو خوب جانتا تھا کہ ٹریفک کے اس ہجوم میں.. جہاں پہلو بہ پہلو بسوں اور ویگنوں کی کئی قطاریں یا تو ساکن تھیں اور یا چیونٹیوں کی طرح رینگ رہی تھیں تو وہ خوب جانتا تھا کہ کون سے لمحے اپنی قطار میں سے نکل کر اس قطار میں جا شامل ہونا ہے جس نے اگلے لمحے رواں ہو جانا ہے..

صحراؤں میں سے برآمد ہونے والے کچھ قافلے تو عرفات کے لیے کسی مختصر راستے پر چلتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو جاتے اور بے شمار لوگ، یکدم غبار میں سے نمودار ہو کر ٹریفک کے اس اژدہام کے برابر میں.. شاہراہ کے کناروں پر جو ریتلے علاقے تھے، ان میں چلنے لگتے ہمارے ساتھ ساتھ..

فضا میں ریت کے ذرات کی جو سنہری چادر تنی ہوئی تھی، وہ کچھ تو ہواؤں نے اٹھائی تھی اور کچھ اُن اَن گنت قدموں نے اڑائی تھی جو رہ نوردانِ شوق کے تھے.. اور یہ جو عرفات ہے یہ کیسا سامری ہے کہ ہر ایک.. پچیس لاکھ لوگوں میں سے ہر ایک.. اس کے سحر میں گرفتار ہے اور اس کی جانب ایسے بڑھتا ہے جیسے وہاں نہ پہنچا تو مر جائے گا.. پہنچ گیا تو حیات کا سانس نصیب میں آئے گا.. یہ لوگ ایسی بے چینی اور پرمسرت پاگل پن سے بڑھتے تھے جیسے انہیں خبردار کر دیا گیا ہے کہ آج تم نے ظہر اور عصر کی نمازیں ملا کر وہاں نہ پڑھیں.. وقت مقررہ پر وہاں نہ پہنچے تو صرف تم نہیں تمہاری آل اولاد بھی ملیامیٹ ہو جائے گی.. وہ اتنی دیوانگی سے بڑھتے چلے جاتے تھے اور ان کے سروں پر انہی کے احرام تیز ہوائیں بلند کر کے انہیں سفید کبوتروں کی پرواز دیتی تھیں..

مُونا نے.. مَیں نے نہیں... میری مُونا نے حج کو بیان کرتے ہوئے جب کہ میں حج کی بجھارت کو بوجھ

نہ پاتا تھا، کہا تھا۔ منیٰ کے بعد آپ عرفات کو جاتے ہو!
"کیوں جاتے ہو؟" میں نے پوچھا تھا
اور اس نے کہا تھا "دعائیں مانگنے.."
اور میں نے متعجب ہو کر کہا تھا "صرف دعائیں مانگنے کے لیے اتنا تردد کرتے ہیں۔ منیٰ اور مکہ میں مانگی جانے والی دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔"
"عرفات میں زیادہ ہوتی ہیں کیونکہ اس روز اللہ وہیں ہوتا ہے.. جو مانگنا ہے براہ راست اُس سے مخاطب ہو کر چہرہ بہ چہرہ رُو بہ رُو مانگ لو۔"
یہ ایک اور بجھارت تھی۔ شکوک پھر سے سر اُٹھانے لگے.. یہ کیا کہ اللہ ایک روز.. آج کے روز اپنے گھر کو ترک کر کے عرفات کو کوچ کر جاتا ہے.. وہاں خیمہ زن ہو کر کھلی کچہری لگاتا ہے.. دعاؤں کی عرضیوں پر قبول ہے، قبول ہے کے احکام جاری کر کے دستخط کر دیتا ہے اور پھر اپنے گھر کو لوٹ جاتا ہے.. یہ بجھارت مجھ سے تو نہ بوجھی جاتی تھی..
منیٰ سے نکلنا۔ عرفات کی جانب کوچ کرنا۔ ایک قیامت ہے..
یوں بھی شنید ہے کہ قیامت اسی میدان عرفات میں برپا ہو گی..
لیکن منیٰ سے یکدم جب بیس پچیس لاکھ لوگ.. پیاسے اور ترسے ہوئے لوگ.. جب منیٰ کی بستی سے منہ موڑ لیتے ہیں.. بے وفا ہو جاتے ہیں اور عرفات کو محبوب ٹھہرا کر اس کی جانب کوچ کرنے لگتے ہیں تو یہ سماں حشر کا سماں ہوتا ہے.. ہر شخص کا دل یا تو رُکتا چلا جاتا ہے یا خطرناک حد تک دھڑکتا چلا جاتا ہے کہ اب جانے میں اپنی بس تلاش کر سکتا ہوں یا نہیں.. مجھے میری کوچ کا ڈرائیور کالے خان دیکھتا ہے یا نہیں.. میں سوار ہو سکتا ہوں یا نہیں.. کہیں پیچھے نہ رہ جاؤں.. منیٰ کے اجڑے ہوئے شہر میں تنہا نہ رہ جاؤں.. میں بابا فرید کی مانند کوکتا نہ رہ جاؤں کہ کوک فریدا کوک.. پچیس لاکھ لوگوں میں ہر شخص کی یہی کیفیت ہوتی ہے.. ہر دل سے یہی ہُوک اُٹھتی ہے، یہی کوک سنائی دیتی ہے کہ میں دور کے شہر سے آیا ہوں، کہیں مجھے پیچھے نہ چھوڑ جانا..
اگرچہ ہم کالے خان کی کوچ میں خوشگوار موسموں میں سانس لیتے.. باہر کے نظارے کر رہے تھے.. لیکن یہ کوچ ایک وہیل چیئر تھی جس میں ہم بیٹھے تھے اور باہر جو ایک نیم صحرائی تیز ہواؤں کی زد میں آئی ہوئی لینڈ سکیپ تھی، اس میں پیدل چلتے سفید پوشوں کو حسرت سے تکتے تھے.. ہم چل نہ سکتے تھے اور وہ چل رہے تھے.. میں اگر حج کی بجھارت بوجھ سکتا.. مجھے اختیار ہوتا تو کبھی اس وہیل چیئر میں نہ بیٹھتا.. ان زائرین میں سے ایک ہوتا جو شدید گرمی اور صحرا کی ہواؤں کی لپیٹ میں کھلی ریتلی فضاؤں میں.. ریت کے ذرّوں کی چمکتی چادر اوڑھے.. اپنی آنکھوں میں ان ذرّوں کی رڑک محسوس کرتے.. اپنے احرام کو پھڑ پھڑانے سے بچاتے ایک ہاتھ سے اسے سنبھالتے۔ عرفات کی جانب چلے جاتے تھے..

اور اگر ان میں نہ ہو سکتا.. تو..

ہمارے کوسٹر کے آگے جو ایک بس بھری تھی اور اس کی چھت پر جو احرام والے تھے.. سیاہ، سفید، بھورے اور زرد چہروں والے تھے اور اپنے آپ کو اڑتی ریت سے بچانے کے لیے اپنے احراموں کے پلو چہروں پر ڈالے سفر کرتے تھے.. گرمی سہتے تھے، پسینے میں شرابور تھے.. یقیناً برے حالوں میں تھے.. پیاسے بھی ہوں گے اور ان کے پاس ہماری طرح منرل واٹر کی ٹھنڈی بوتلیں بھی نہ تھیں تو میری خواہش بہت شدید ہوئی کہ مجھے اُن میں ہونا چاہیے تھا.. بے شک وہ صعوبت سہتے تھے، نڈھال ہو رہے تھے لیکن کھلی فضا میں تھے اور پچیس لاکھ لوگوں کی روانی میں شامل تھے.. جب کہ میں اپنی بند وہیل چیئر میں مکمل طور پر بہرا ہوا بیٹھا تھا جیسے کوسٹر کے انجن کے سوا اور کوئی آواز نہ ہو..

اور باہر آوازیں تھی.. ایک گونج تھی جو صحراؤں پر محیط ہوتی فلک پر دستک دیتی چلی جاتی تھی کہ نیچے آ جاؤ، ہم حاضر ہیں، تو تم کیوں حاضر نہیں ہو..

لیکن میں ایک کیپسول میں بند تھا، یہ گونج مجھ تک نہ پہنچتی تھی..

میں حاضر ہوں.. میں حاضر ہوں کی لاکھوں صدائیں مجھ تک نہ پہنچتی تھی.. میں اپنے کیپسول میں قید باہر کے منظر کی صرف تصویریں دیکھ سکتا تھا، وہ تصویریں جو صدائیں بلند کرتی تھیں، انہیں سن نہیں سکتا تھا..

مجھے منیٰ سے عرفات تک حج ہائیکنگ کرنی چاہیے تھی..

شاہراہ پر کھڑے ہو کر انگوٹھا دکھا کر لفٹ کی بھیک مانگنی چاہیے تھی..

ایک مدت تک میں نے یورپ اور ایشیاء میں یہی کسب کیا تھا اور اس کسب میں کمال کیا تھا تو آج جب اس کسب کے ذریعے میں اللہ کے دربار تک پہنچ سکتا تھا، میں نے اگر یہ نہ کیا تو کتنا برا کیا..

کوئی نہ کوئی تو مجھ پر ترس کھا کر مجھے بٹھا لیتا..

اور میں اُن میں سے ایک ہوتا جو ہماری کوسٹر کے آگے جو بس بھری ہوئی تھی اس کی چھت پر سوار جو احرام والے تھے، ان میں سے ایک ہوتا..

اُن میں سے نہ ہوتا تو..

آس پاس صحراؤں میں سے امڈتے ہوئے جو قافلے تھے.. جو خاندان تھے.. جو گروہ تھے ان کا ساتھی ہوتا. تنہا بھی ہو سکتا تھا.. اس سوڈانی کی مانند جو ریت کے ایک ٹیلے سے اپنی بلند قامتی اور آبنوسی شباہت کے ساتھ سفید احرام سنبھالتا سوئے عرفات جاتا تھا..

لیکن میں تو ایک محفوظ اور آرام دہ حج کر رہا تھا.. اپنے کوکون میں بند.. جیسے بالشوئی تھیٹر میں ایک تماشائی کانوں میں روئی ٹھونس کر چائیکوسکی کی موسیقی نہ سنے اور سٹیج پر "سوان لیک" کا جو آپرا ہو، اس کے راج ہنسوں کو ایک سکوت میں تکتا رہے..

باہر کی آوازیں مجھ پر بند تھیں..

اور میں نے باہر صحراؤں کی دھول اور سورج کی تمازت میں آیا ہوا ایک گہرے عشق میں مبتلا ایک جوڑا دیکھا..

سب قافلوں سے الگ تھلگ..

وہ اپنا عشق نہ بھلاتے تھے.. بانہوں میں بانہیں ڈالے.. ایک مشترکہ عشق خاص کے جنوں میں مبتلا ریت کے ٹیلوں پر چلتے جاتے تھے اور پھر وہ دونوں ایک غبار میں گم ہو گئے..

شاہراہ کے کناروں پر ایک نیلے حروف کا سائن بورڈ بلند ہو کر ہماری کوسٹر کے قریب ہوا اور اُس پر درج تھا کہ اب عرفات اتنے کلومیٹر کی دوری پر ہے..

انسانی تاریخ ایک مسلسل چل چلاؤ.. ایک مسلسل ہجرت سے تعبیر ہے.. کبھی آل اسرائیل اُس سرزمین کے لیے گھر چھوڑتے ہیں جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے.. کبھی آریائی اپنی بلند چراگاہوں سے اتر کر قدیم تہذیبوں کو ملیامیٹ کر کے اپنا راج قائم کرتے ہیں..

کبھی غربت اور بیروزگاری کی شدت سے بوکھلائے ہوئے لوگ.. بے فلاور میں سوار ہو کر سرخ ہندیوں کی سرزمین پر پہنچ کر اسے اپنا لیتے ہیں..

اور کبھی.. لوگ اپنے گھر بخوشی چھوڑتے ہیں.. آباؤ اجداد کی ہڈیاں چھوڑ کر ایک نئی سرزمین.. ایک وعدہ کی گئی سرزمین پر اپنی بہو بیٹیوں کو رسوا کر کے جبر کرتے پہنچتے ہیں..

لیکن اصل ہجرت تو ایک ہی تھی..

جب میرے باباؐ نے اپنے مکہ کو ترک کیا.. تاکہ ہم سب آئندہ اپنے اپنے گھروں کو.. آئندہ صدیوں میں.. اپنے دور کے شہروں کو ترک کریں.. اور وہ اپنے یار غار کے ہمراہ.. اُس اونٹنی قصویٰ پر سوئے یثرب جاتے ہیں جسے وہ اصرار کر کے اپنے یار سے خریدتے ہیں..

تو آج.. پچیس لاکھ افراد اپنے گھر.. اپنے وطن اور رنگ ترک کر کے ہجرت کرتے تھے.. عرفات کو جاتے تھے..

بالآخر ایک اور سائن بورڈ نظر کے سامنے ہویدا ہوا.. اب آپ عرفات کی حدود میں داخل ہو رہے ہیں..

اور عرفات کی حدود میں داخل ہوتے ہیں تو منہ میں گھنگھنیاں ڈال کر مہر بلب گونگے ہو کر نہیں بیٹھے رہتے.. آپ کو کچھ نہ کچھ تو کہنا ہوتا ہے.. کوئی نہ کوئی تو دعا مانگنی ہوتی ہے کہ آپ رب کی سلطنت میں داخل ہو رہے ہیں..

''تارڑ صاحب..'' ایران سے آئی ہوئی.. پاکستانی سفیر کی.. سوس سکولوں میں تعلیم یافتہ روشن دماغ بیگم اپنے لپٹے لپٹائے سراپے میں شاید رو رہی ہیں، مجھ سے مخاطب ہوتی ہیں ''ہم عرفات میں داخل ہو رہے ہیں.. آپ دعا پڑھ دیجیے.. پلیز..''

''میں؟؟''

سب لوگ گردنیں موڑ کر مجھے دیکھنے لگتے ہیں کہ جلدی کرو عرفات میں داخل ہو چکے ہیں.. دعا پڑھو.. اور وہ بالکل سکول کے بچوں کی مانند معصومیت سے مجھے دیکھ رہے ہیں، مجھے ہمت نہیں پڑتی.. میں اس لائق کیسے ہو سکتا ہوں.. میری اوقات کچھ نہیں.. پتہ نہیں میری آواز نکلتی ہے یا نہیں. اگر نکلتی ہے تو جو پڑھوں گا اس میں تاثیر تو نہیں ہوگی... پتہ نہیں دل سے نکلتی ہے یا نہیں.. میں ایک سخت گیر والد کی حیثیت سے سمیر کو حکم دیتا ہوں کہ بیٹے تم پڑھ دو..

اور وہ فرمانبردار بچہ جیسے اسی آس میں تھا.. دعاؤں کا کتابچہ کھولتا ہے، کچھ دیر چپ سا رہتا ہے اور پھر بلند آواز میں عرفات میں داخلے کی مخصوص دعا پڑھنے لگتا ہے:

''اے اللہ میں آپ ہی کی طرف متوجہ ہوا ہوں۔''

سب لوگ متوجہ ہیں..

''اے اللہ میں آپ ہی کی طرف متوجہ ہوا ہوں اور آپ ہی پر بھروسہ کرتا ہوں اور میں نے آپ ہی ہی کو راضی کرنے کا ارادہ کیا ہے، آپ میرے گناہ معاف فرمائیں.. اور میرا حج مبرور بنائیں اور مجھ پر رحم فرمائیں اور عرفات میں میری حاجت پوری فرمائیں، بے شک آپ ہر چیز پر قادر ہیں۔''

ہمارے کوسٹر میں مکمل سکوت تھا.. دم بخود کے ہر مسافر عرفات کی سر جھکائے یہ دعا سن رہا تھا بلکہ دوہراتا چلا جاتا تھا.. سمیر اس دعا کو بالکل سپاٹ انداز میں جیسے ایک سرکاری بیان سناتے نہیں رک رک کر پڑھتا چلا جا رہا تھا، بغیر کسی زیر و بم کے بغیر کسی بناوٹ کے.. ایک ہی لے میں.. شاید یہی وجہ تھی کہ یہ ایک براہ راست درخواست سنائی دے رہی تھی.. ایک التجا تھی.. کہ مجھے جو کچھ درکار ہے، اس کی فہرست سنا رہا ہوں اور جب وہ.. ''اور عرفات میں میری حاجت پوری فرمائیں'' پر پہنچا تو بیگم یوسف شاہ نے ایک لمبی سسکی بھری اور ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے..

''اے اللہ.. میرا اس حج کا چلنا اپنی رضامندی حاصل کرنے کے قریب تر کر دیجیے اور اپنی ناراضگی دور کرنے کا بڑا ذریعہ بنا دیجیے.. اے اللہ میں آپ ہی کی طرف چلا اور آپ ہی پر میں نے اعتماد کیا اور آپ کی رضامندی کا میں نے ارادہ کیا۔ پس آپ مجھے ان لوگوں میں سے کر دیجیے جن کے ذریعے آپ فخر فرمائیں گے، ان لوگوں کے سامنے جو مجھ سے بہتر اور افضل ہیں۔''

کوسٹر کے باہر اڑتی ریت کے غبار میں کئی خاندان اس خدشے کی بنا پر کہ کہیں وہ بچھڑ نہ جائیں ایک دوسرے کے ہاتھ تھامے چلے جا رہے تھے..

میری سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ اس سادہ براہ راست دعا میں اتنی تاثیر کہاں سے آ گئی کہ ہر مسافر

لب بستہ.. خاموشی سے آنسو پونچھتا چلا جاتا تھا.. اور جب ٹمیسر نے کہا کہ.. مجھے ان لوگوں میں سے کر دیجیے جن کے ذریعے آپ فخر فرمائیں گے، ان کے سامنے جو مجھ سے بہتر اور افضل ہیں.. تو میں نے جانا کہ یہ تو صرف میرے لیے کہا گیا ہے اور میری آنکھوں میں بھی نمی جھلملانے لگی کہ میں تو جانتا تھا کہ کل دنیا مجھ سے بہتر اور افضل ہے اور اس کے باوجود اس نے مجھے اپنے لوگوں میں سے کر دیا.. کیسے کیسے مقامات پر اور کیسے بہتر اور افضل لوگوں میں افضل کر دیا..

نمی کی چادر کے پار کوسٹر سے باہر ریت کی چادر تھی جس میں کیسے کیسے مجھ ایسے افضل ہو رہے تھے..

"اے اللہ میں آپ سے معافی اور عافیت دوامی کا دنیا اور آخرت میں سوال کرتا ہوں اور درود نازل ہو اللہ کا اُس کی سب سے بہتر مخلوق حضرت محمدؐ اور ان کی آل و اصحاب پر.."

ٹمیسر چپ ہوا تو تا دیر کوئی بولا نہیں..

کوسٹر کے انجن کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی جیسے ہم خلاء میں بے آواز چلے جا رہے ہوں اور تب ہم نے پہلی بار ریت کے ٹیلوں پر سے اُترتے لاکھوں افراد، قافلوں، خاندانوں اور تنہا مسافروں میں سے بگولوں کی مانند اٹھتی "لبیک اللھم لبیک" کی گونج سنی جو مسلسل تھی اور بے پناہ تھی.. تیز ہوا اور ریت کے جھکڑوں کے باوجود یہ گونج اس قدر تھی کہ عرفات سے اٹھ کر افلاک کو جاتی تھی اور دستک دیتی تھی کہ اگر تو ابھی تک وہیں براجمان ہے تو نیچے آ، ہم تو حاضر ہو گئے ہیں

پہلے ہم باتیں کر رہے تھے.. کوسٹر میں بند باہر کے منظر کو دیکھ رہے تھے اور ہمیں احساس نہ ہوا کہ یہ جو ہزاروں لاکھوں لوگ.. صحراؤں میں سے برآمد ہوتے پکارتے.. بسوں کی چھتوں پر اور شاہراہوں کے کناروں پر پیدل چلتے بار بار منہ کھولتے ہیں تو کیا کہتے ہیں.. بے شک یہ صدائیں کبھی کبھار سنائی دے جاتی تھیں لیکن ہمیں واقعی اندازہ ہی نہ ہوا کہ یہ اتنی مسلسل ہیں، اتنی بلند آہنگ ہیں کہ ان کی گونج عرشوں کے در وا کرتی ہے..

"لبیک اللھم لبیک" کی صدائیں ایئر کنڈیشنڈ کوسٹر کی بند کھڑکیوں پر بنا دستک دیے، جیسے کھلے دروازوں میں سے مئی کے مہینوں میں املتاس کی زرد مہک بے دھڑک آتی ہے.. دھریک اور کیکر کے پھولوں کی نشہ آور خوشبو گاؤں کے کچے صحنوں میں چلی آتی ہے.. ایسے یہ صدائیں بے جھجک اندر آنے لگیں اور ایک سنہری دُھند کی مانند کوسٹر میں پھیلتی اس میں جو مسافر سوار تھے جو دور کے شہروں سے آئے تھے، ان کے احراموں اور چہروں پر سنہری ذرّوں کی مانند تہہ در تہہ جمتی گئیں.... اور ہم سب جو عرفات میں اپنی حاجت پوری کرنے آئے تھے..

ٹمیسر کی دعا کے بعد ابھی تک چپ بیٹھے تھے اور کبھی کبھار ہی لبیک پکارتے تھے، اب ہم سب کی آوازیں بھی اس گونج میں شامل ہو گئیں... گویا ہم کوسٹر میں بند نہ تھے.. ہمارے احرام ہمارے بدن کے ساتھ لپٹے ہوئے نہ تھے.. وہ تیز ہوا میں پھڑپھڑاتے تھے اور ہماری آنکھوں میں بھی ریت کے ذرّے کروٹیں لیتے تھے اور گرمی

ہمارے بدنوں کو نچوڑتی تھی اور گرم ریت ہمارے تلووں کو جلاتی تھی.. جیسے ہم بھی ان قافلوں میں شامل ہو گئے تھے..اُن کے ہمراہ پکارتے پیدل چلتے تھے.. اگرچہ لبیک لبیک کی یہ اجتماعی صدائیں بے حد پُراثر اور بدن کے مساموں اور لُوں لُوں میں سرایت کر کے اندرون تک اُتر کر دل کے آس پاس پکارتی تھیں.. حاوی ہوتی جاتی تھیں لیکن ان مسلسل لاکھوں صداؤں میں ایک دہشت کا عنصر بھی تھا.. ایک خوف، ایک ڈر بھی تھا.. لاکھوں آوازوں کی گونج کانوں میں اترتی تھی تو بدن کانپنے لگتا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے.. یہ کیا ہے جو میں نہیں جانتا تھا جس کی مجھے خبر نہ تھی.. اور یہ جو کچھ بھی ہے اسے جان لینے کے بعد میرے ساتھ کیا ہوگا.. جیسے پہلا بوسہ.. جیسے اولین عشق.. جیسے فیری میڈو کی برفوں میں سے نمودار ہونے والا سٹرابیری کا پہلا سفید پھول.. جیسے پہلے بچے کی کچی مٹھی کھولتے ہوئے اس کی ہتھیلی کی ابھی ابھی نمودار ہوتی قسمت کی لکیریں.. جیسے اکلوتی بیٹی کی رخصتی اور اس کی جدائی میں نیند میں بھی بھیگتی آنکھیں.. بدن کانپنے لگتا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے.. یہ کیا ہے جو میں نہیں جانتا تھا جس کی مجھے خبر نہ تھی..

عرفات کی تاحد نظر صحرائی سٹیج پر لاکھوں اداکاروں کا جمگھٹا تھا..

لیکن یہ کیسے اداکار آ گئے.. جو ایک ہی لباس میں آ گئے ہیں.. اور ایک ہی ڈائیلاگ کو دوہراتے چلے جا رہے ہیں.. لبیک اللھم لبیک پر ہی اٹک گئے ہیں.. کیسے کُند ذہن اداکار ہیں کہ انہیں یاد ہی نہیں کہ ان کے کردار الگ الگ ہیں.. مکالمے جدا جدا ہیں.. رنگ مختلف ہیں، زبانیں ایک دوسرے کے ساتھ کچھ میل نہیں کھاتیں.. اپنے کرداروں سے نکل گئے ہیں اور ایک ہی کردار ہو گئے ہیں.. اپنی زبانیں بھول گئے ہیں اور ایک ہی زبان میں ایک ہی ڈائیلاگ کو مسلسل دوہراتے چلے جا رہے ہیں.. اور ہدایت کار بھی منظر کو کٹ نہیں کرتا.. انہیں روکتا نہیں کہ ڈرامے کا ستیاناس ہو رہا ہے.. تمہاری سوئی ایک ہی ڈائیلاگ پر کیوں اٹک گئی ہے.. کچھ اور بھی بولو.. کچھ اور کہو.. جو تمہارے کردار سے مطابقت رکھتا ہو.. تم تو ڈرامے کو فلاپ کروا کے رہو گے..

لیکن ہدایت کار "کٹ" نہیں کہتا..

کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ سب اداکار.. ہدایت کار سے بھی ماورا ہو چکے ہیں..

وہ اگر "کٹ" کہہ بھی دے تو وہ رُکنے والے نہیں..

اداکار.. ہدایت کار میں ایسے مدغم ہو چکے ہیں کہ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کون ہے جو اداکاری کر رہا ہے اور کون ہے جو ہدایت کاری کر رہا ہے..

اگر وہ دونوں ایک ہیں.. "انا الحق".. ہیں تو وہ خود کیسے اپنے آپ کو روک سکتے ہیں.. کیسے اس سین کو "کٹ" کر سکتے ہیں..

ایک اور عجب بات تھی..

لاکھوں لوگ ایک ہی پکار پر.. ایک ہی مکالمے پر اٹکے ہوئے ہیں پھر بھی ان کی ادائیگی میں یکسانیت

نہیں ہے.. لہجے میں یک رنگی نہیں ہے.. ایک ہی ڈھنگ نہیں ہے.. لبیک کی ہر صدا الگ الگ ہے.. یہ ایک صدا گویا ان کی.. اداکاروں کی کل حیات کی لغت میں جتنے بھی لفظ درج ہیں، ان سب کی نمائندگی کر رہی ہے.. ان سب کے لہجوں میں بلند ہو رہی ہے..

کوسٹر کے باہر ریت کے ٹیلوں کے عقب سے اور نشیبوں میں سے اٹھتے ہوئے جن کے احرام تیز صحرائی ہواؤں میں پھڑ پھڑاتے تھے وہ سب کے سب وارث شاہ کے شعروں کی تفسیر تھے.. اساں ذات صفات تے بھیس کیہا..... نہ ان کی کوئی ذات تھی، نہ کوئی صفت تھی اور نہ ہی کوئی بھیس تھا.. اور نہ کوئی دیس تھا.. اور وہ جس بے تابی.. اشتیاق اور بے صبری سے ٹیلوں پر سے اترتے.. صحرا کی ریت میں سے پاؤں نکالتے.. چلتے جاتے تھے.. تو انہیں دیکھ کر مجھے یہ محسوس ہوا کہ یہ صرف حج کرنے کے لیے تو نہیں آئے..

یہ محض اللہ کے روبرو ہونے نہیں آئے..

انہیں کوئی اور نوید بھی مل چکی تھی..

کہ وہاں کوئی اور بھی ہے.. اللہ کے سوا..

جیسے اہلِ یروشلم اس پہاڑی کی جانب اشتیاق اور بے صبری سے چلتے تھے جہاں ابن مریم نے وعظ کرنا تھا..

جیسے آلِ اسرائیل کوہ سینا کو تکتے تھے کہ موسیٰ وہاں گئے ہیں تو واپس آنے کا نام ہی نہیں لیتے.. جانے کس سے ملاقات ہو گئی ہے..

اور جیسے ایک بلندی پر حضرت ابراہیم چاند ستاروں اور سورج کے طلوع و غروب کو پرکھتے ہیں اور ان کے حواری منتظر رہتے ہیں..

یا پھر یہ سب کے سب بیمار ہیں.. لاچار ہیں.. اپاہج ہیں اور گھسٹتے ہوئے ابن مریم سے دوا لینے جاتے ہیں..

تو وہ یونہی بے چین اور بے صبر نہیں ہو رہے تھے.. ریت کے غبار میں کھوئے جلوا دینے والے قافلے..

کوئی نہ کوئی تو سبب تھا..

سبب یہی تھا کہ انہیں نوید مل چکی تھی..

کہ وہاں اللہ کے سوا کوئی اور بھی ہوگا..

قصویٰ کا سوار آئے گا اور جبلِ رحمت کی چوٹی پر کھڑا ہو کر ان سے مخاطب ہوگا..

''اے لوگو! میری بات سنو..''

اور یہ سب اس لیے بے صبرے اور بے چین تھے کہ اس کی بات سننے کو جا رہے تھے..

''اگلے سال اور اس کے بعد پھر کبھی..

شاید پھر تمہاری ملاقات نہ ہو سکے۔"

تو ان لوگوں میں جو بے صبری تھی، اس لیے تھی کہ وہ آخری ملاقات کو جاتے تھے..
محض اللہ سے ملاقات کی خاطر تو اتنی بے صبری نہیں ہو سکتی تھی..
یہ تو کوئی اور معاملہ تھا..

اور جب یہ بھولی ہوئی خبر دل میں اتری کہ بابا بھی اسی راستے پر قصویٰ اونٹنی پر سوار.. ساتھیوں کو ہدایت کرتے کہ تم شوق میں اور ہیجان میں اپنے جانوروں کو تیز کرنے کے لیے انہیں نہ ستاؤ.. اسی راستے پر عرفات گئے تھے اور آخری بار گئے تھے تو دل کا معاملہ واقعی کوئی اور ہو گیا..

اگر قصویٰ کے سُم اسی راستے پر پڑتے تھے جسے کوسٹر کے ٹائر روندتے تھے تو کہیں گستاخی سرزد ہو رہی تھی..

میں اپنے بیٹوں کی جانب ایک مجرمانہ سی نظر کرتا تھا کہ وہ مجھ سے غافل ہو چکے تھے.. میں ایک آزر تھا.. ٹیلی ویژن پر اور تحریروں میں بُت تراشتا تھا.. انہیں پوجتا تھا اور وہ میرے گھر میں پیدا ہوئے اور روشِ ابراہیم کے مسافر ہو گئے..

لبیک... اللھم لبیک..
ہم اپنی منزل تک پہنچنے والے تھے..

تب دائیں ہاتھ پر خلقتوں.. ہجوموں اور قافلوں کے لاکھوں سفید پھڑپھڑاتے پیراہنوں سے پرے.. میدان عرفات میں ابھرتی نمایاں ہوتی ایک سفید پوش پہاڑی دکھائی دینے لگی..

اس کی سفیدی.. اس صحرا میں برف تو نہیں ہو سکتی تھی..

اتنی سفیدی.. تو برف گرنے کے بعد.. فوراً بعد.. ہی آنکھوں کو چندھیاتی ہے کہ تب ہر گُل بوٹا.. ہر پتھر.. ہر ڈھلوان اور ہر نشیب.. ہر اونچ نیچ برف سے ڈھکے جاتے ہیں تب ایسی سفیدی نظر میں سفید ہوتی ہے..

اور یہ جو بظاہر برف گری ہوئی تھی، میدان عرفات میں ابھرتی نمایاں ہوتی پہاڑی پر.. اگر برف ہوتی تو ساکت ہوتی.. اور یہ آہستگی سے حرکت کرتی نظر آتی تھی.. جیسے چائے میں دودھ رڑ کنے کے بعد اس میں پھونک مارنے سے اس کی سطح پر آئی ہوئی مکھن کی سفیدی ذرا تھرتھرائے.. دودھ نظر نہ آئے..

"کمانڈر.." میں نے سلجوق کو پکارا اور یہ خطاب یوسف شاہ نے کوسٹر کا انچارج مقرر ہونے پر سلجوق کو تفویض کیا تھا "یہ کونسی پہاڑی ہے؟"

"یہ جبل رحمت ہے ابا جی.."

"لیکن اس صحرا میں اس مختصر سی پہاڑی پر برف تو نہیں گرتی ناں.." میں نے جان بوجھ کر بیسلا بن کر

جوتی کو چھیڑا ''تو پھر یہ اتنی سفید کیوں ہے؟''

''ابا میں نے آپ سے کہا تھا کہ دور کی نظر کی عینک ساتھ لے کر آئیں'' جوتی چھیڑ چھاڑ کے موڈ میں نہیں تھا، سیریس ہو گیا۔ خفا ہو گیا۔۔اور وہ کبھی کبھار مجھ سے خفا ہو جایا کرتا تھا۔۔اور مجھے اس کی خفگی راحت دیتی تھی کہ میرا بیٹا مجھے ڈانٹ رہا ہے۔۔''یہ خلق خدا ہے ابا۔ جبل رحمت پر ہے اور اس کے سفید احرام اسے ڈھانپے ہوئے ہیں۔۔برف نہیں ہے۔''

صحیح کہ یہ برف نہیں تھی۔ جبل رحمت ڈھکا ہوا تھا۔ جہاں سے آخری بار خطاب ہوا تھا۔۔ ہر شے اِس جہان کی اور اُس جہان کی مکمل ہو گئی تھی۔۔ جبل رحمت کے نظر میں آتے ہی لبیک اللھم لبیک کی صدائیں مزید پُر فریاد ہو گئیں جیسے اب اللہ نہیں جبل مخاطب تھا۔۔ اس جبل نے لوگوں کی توجہ ہٹا دی تھی۔۔ پہلے جو سفیدی ذرّوں میں دکھائی دیتی تھی اب وہ ہر سراپے احرام دکھائی دینے لگے۔۔ ہجوم گھنا ہوتا جا رہا تھا۔

بالآخر سب کچھ تھم گیا۔۔

کوسٹر۔ بسیں۔۔کاریں۔ ٹریلر۔ ٹرک۔۔ ویگنیں اور چند موٹر سائیکل بھی۔۔سب تھم گئے البتہ جو خلقت پیدل چلتی تھی وہ ٹریفک کے ان تھمے ہوئے جزیروں میں سے بہتی رواں رہی۔۔

عرفات آ گیا تھا۔۔

''کئی حاجی بن بن آئے جی...
ساڈے سجناں دی ڈاچی بادامی رنگ دی''

سورج کا شہر...

کہ یہاں معمول سے زیادہ روشنی ہوتی ہے.. تیز دھوپ اور پچیس لاکھ چہروں کی تمازت بھی تو اسے روشن کرتی ہے..

ہم سے بہت پہلے بھی لاکھوں لوگ آ چکے تھے اور ہمارے بعد بھی لاکھوں لوگ آتے چلے جا رہے تھے..

عرفات میں وقوف تھا.. یہاں شب بسری نہیں تھی..

غروب سے پیشتر ہمیں یہ شہر چھوڑ دینا تھا اور منیٰ کے راستے میں پڑنے والے مزدلفہ میں رات گزارنی تھی.. خیموں میں نہیں.. کھلے آسمان تلے.. جہاں کہیں جگہ ملے فٹ پاتھوں پر.. پہاڑیوں پر.. شاہراہوں پر.. چٹانوں کے نیچے جہاں بھی جگہ ملے رات گزارنی تھی.. کیوں؟.. اس کا جواب تب ملے گا جب ہم مزدلفہ پہنچیں گے کہ ابھی ہم عرفات میں اترے تھے.. اترے تھے تو بس ہم ویسے تھے جیسے کہ وطن سے چلے تھے اور جب یہاں سے روانہ ہونا تھا تو ہم نے حاجی ہو کر روانہ ہونا تھا

ہمارے کوسٹر کے مسافر اپنی آمد کا اعلان کرتے لبیک لبیک کی دہائی دیتے نیچے اترے اور کچھ فاصلے پر واقع ان قناتوں اور بڑے بڑے خیموں کا رخ کر لیا جہاں انہوں نے کچھ چھینٹے اپنے تھکے ہوئے گرمی کے مارے چہروں پر چھڑک کر تازہ دم ہونا تھا اور پھر عبادت میں جت جانا تھا.. نفل ادا کرنے تھے اور دعائیں کرنی تھیں.. لیکن ہم پانچ ان میں شامل نہ تھے..

ہمارا آرڈر آف دی ڈے ہمیں حکم دیتا تھا کہ چلو چلو مسجد نمرہ کی جانب چلو.. اور یہ آرڈر بھی میمونہ نے ہی جاری کیا تھا کہ عرفات پہنچ کر براہ راست خیموں میں نہ چلے جانا.. فوراً مسجد نمرہ کی جانب چل پڑنا تاکہ تم وہاں خطبہ حج سن سکو.. ظہر اور عصر کی نمازیں ملا کر پڑھ سکو کہ حج کی سند اسی مسجد سے عطا کی جاتی ہے..

چنانچہ ہم پانچوں.. سلجوق.. سمیر.. جو ناز.. اور باریش شرارتی آنکھوں والا انتظامی جو سلجوق کے

ہم پیشہ سفارت کار تھے، کوسٹر سے اترے اور اس لاکھوں کے ہجوم کا حصہ ہو گئے جو مسجد نمرہ کی جانب رینگ رہا تھا۔ ٹھوکریں کھاتا۔۔ دھکیلا جاتا۔۔ دھکے کھاتا۔۔ اور نہ یہاں سے مسجد نمرہ نظر آتی تھی اور نہ ہی اس جانب جاتی شاہراہ۔۔ بس سروں کی ایک فصل نظر آ رہی تھی جو ابھرتی ڈوبتی حرکت میں تھی اور پسینے میں شرابور تھی کہ دھوپ کچھ لحاظ نہ کرتی تھی۔۔

خالی بوتلوں، ڈبوں۔۔ شاپر بیگوں اور طرح طرح کے کچلے ہوتے جوس بھرے پیکٹوں پر پاؤں رکھتے۔۔ مجال ہے جو سڑک کا ایک چپہ بھی خالی نظر آتا ہو۔۔ خالی ہوتا بھی تو کہاں نظر آتا کہ احرام شدہ خلق خدا ٹین میں پیک سارڈین مچھلیوں کی مانند جڑی ہوئی حرکت کر رہی تھی، چلتے تو کٹ ہی جائے گا سفر آہستہ آہستہ۔۔ لیکن اتنا آہستہ بھی نہیں کہ شام کو پہنچیں۔ پہنچیں تو نماز کے وقت پہنچیں۔۔ ابھی اسی آرزو میں پر اشتیاق چلے جا رہے تھے۔۔

خطبہ حج البتہ شروع ہو چکا تھا۔۔

پہلے میں یہ سمجھا کہ شاہراہ کے گرد ایستادہ کھمبوں پر جو ہزاروں سپیکر آویزاں ہیں اور بعض زائرین کے کانوں کے ساتھ چسپاں جو بالشت بھر کے ریڈیو ہیں، ان میں سے قرأت کی آواز آ رہی ہے جو ایک گنگناہٹ کی مانند سنائی دے رہی ہے، اور سروں کی فصل پر لہلہاتی گونجتی ہے۔ پھر سلجوق نے مطلع کیا کہ ابا یہ خطبہ حج ہے، سمجھ نہ بھی آئے تو سننے کی کوشش کرو۔۔

میں قدرے ہراساں ہو گیا۔ ''حج کا خطبہ شروع ہو گیا ہے یعنی نماز ہو چکی ہے۔''

''نہیں ابا۔'' سلجوق نے میری جہالت پر مایوسی سے سر ہلایا۔۔ اور ظاہر ہے کھڑے ہو کر مجھ سے مخاطب ہو کر نہیں بلکہ چلتے چلتے مجھے دھکوں سے بچاتے اپنے حاضر ہوں، میں حاضر ہوں میں توقف کرتے ہوئے مسجد نمرہ کے کسی مینار کو سروں کی فصل سے پرے تلاش کرتے ہوئے کہا۔ ''خطبہ پہلے ہوتا ہے۔ نماز بعد میں ہوتی ہے۔''

یہ ممکن نہیں لگ رہا تھا کہ ہم خطبے کے اختتام تک مسجد کے اندر تو کیا مسجد کے آس پاس بھی پہنچ سکیں۔ چنانچہ میں صرف اتنی خواہش کر رہا تھا کہ ہم از کم اتنے قریب تو ہو جائیں کہ مسجد نمرہ میں دیے جانے والے جاری خطبہ حج کو ریڈیو پر نہیں براہ راست اس کے کسی مینار پر نصب لاؤڈ سپیکر سے ہی سن سکیں۔

مسجد نمرہ تک کا یہ آہستہ آہستہ ٹھوکروں اور دھکوں اور ریل پیل اور حج کی خواہش کے بن میں پیک شدہ سفر، صعوبت اور اذیت اور تھکاوٹ سے عاری تھا۔ اس میں ایک عجیب سرمستی اور عجیب ایڈونچر کا کیف اور لذت تھی۔۔ ہم عمر بھر ایسے سفر میں رہ سکتے تھے۔۔

اور کیف سے بڑھ کر گرمی تھی۔۔ اور گرمی سے بڑھ کر حبس تھا کہ لاکھوں پھیپھڑے جو سانس اپنے اندر کھینچتے تھے، تو اس سے فلک اور زمین کے درمیان جتنی ہوا تھی، کم پڑتی جاتی تھی۔۔

اور اس کے باوجود یہ ایک عجیب انوکھا لاڈلا سفر تھا۔۔

گرمی اور حبس کو کم کرنے کی خاطر شاہراہ کے دونوں جانب باریک پھوار والے خودکار فوارے بلکہ پھوارے آویزاں تھے جو زائرین کی پژمردہ بلکتے ہوئے چہروں پر رم جھم رم جھم پڑتے پھوار بھگوتے تھے اور تھوڑی سی نمی عطا کر کے بہت سی راحت عنایت کر کے اس آہستہ رو سفر کو خوشگوار بنانے میں معاون ثابت ہوتے تھے.. یہ پھوار اتنی باریک تھی.. جیسے آپ پہاڑوں کی دھند میں سے گزرتے ہیں تو رخساروں پر نمی کا شائبہ ہوتا ہے.. اتنی باریک تھی اور اگلے ہی لمحے سورج کی تپش اسے چاٹ لیتی..

سلجوق اور سمیر حسب خصلت میرے آگے اور پیچھے رومی ستونوں کی مانند مجھے محفوظ کرتے چل رہے تھے..

اس سفر میں یکسانیت نہ تھی کہ عقیدت کے مارے حج کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کی خاطر دعائیں کرتے لبیک لبیک پکارتے چلے جاؤ بلکہ اس میں کچھ لطف بھرے لمحے بھی آتے تھے..

دائیں بائیں جہازی سائز کے درجنوں ٹریلر کھڑے تھے جن میں لسی کے ڈبے، جوس کے کارٹن اور پانی کی بوتلوں کے ذخیرے تھے جو زائرین پر نچھاور کیے جا رہے تھے..

اور زائرین.. یعنی اکثر زائرین مسجد نمرہ کو فراموش کرتے.. جبل رحمت کی جانب بھی نگاہ نہ کرتے، آسمان سے اترتے اس من و سلویٰ کے لیے دھکم پیل کر رہے تھے.. انہیں ہوا میں اچکتے تھے اور نچھاور کرنے پر تعینات عملہ کی توجہ حاصل کرنے کے لیے ہاتھ ہلاتے اپنی اپنی زبانوں میں نعرے لگاتے تھے.. مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے.. جس کے ہاتھ میں جو آتا تھا مفت آتا تھا، اس لیے برا کیا تھا..

درست کہ یہ بڑی فیاضیاں تھیں.. بڑی کرم نوازیاں تھیں لیکن حج کے دوران عزت نفس کو مجروح کر دینے والا اس سے بڑا کھیل میں نے کہیں اور نہ دیکھا تھا.. بے شک وہ جو اس مال غنیمت کو اچکتے تھے اور ہاتھ ہلا ہلا کر فریاد کرتے اس کے طالب ہوتے تھے، انہیں احساس نہ ہوتا تھا لیکن میں مجروح ہوتا تھا..

دریا دل سعودی حکمرانوں کی جانب سے.. مخیر حضرات کے جذبۂ ثواب کی طرف سے.. زائرین کے لیے سراسر مفت عیاشیاں مہیا کی جا رہی تھیں.. بے شک یہ سہولتیں درکار تھیں لیکن لوگوں کو گداگروں کی مانند ایک جوس کے ڈبے یا لبن یعنی لسی کے ایک کارٹن کے لیے ہاتھ پھیلانے اور انہیں ہوا میں پالتو جانوروں کی طرح دبوچ لینے کی سعی میں مصروف رکھنا.. اگر زیادتی نہیں تو مناسب بھی نہ تھا.. انہیں زائرین کو عطا کرنے کے مناسب طریقے بھی تو ہو سکتے تھے.. اور ہر ڈبے.. خوراک یا جوس کے کارٹن پر جلی حروف میں درج تھا کہ یہ عطایہ تحفہ خادمین حرمین شریفین کی جانب سے ہے..

میرے مشاہدے میں یہ بھی آ گیا کہ ان ڈبوں اور کارٹنوں کی برسات سے کچھ زائرین نے ماتھے پر زخم وصول کیے.. اور ان میں سے بیشتر کہ وہ معصوم تھے، پالتو جانوروں کی مانند اچھل اچھل کر، منہ کھولے نہایت فرمانبرداری اور تشکر سے اپنی جانب پھینکے ہوئے ڈبے دبوچتے ہیں.. نظامانی جیسا کہ میں عرض کر چکا

ہوں ایک سیاہ ریش، شریر شگفتی آنکھوں اور مجتے ہوئے بے رنگ دانتوں والا سندھ کی صوفی روایت میں رنگا ہوا ڈپلومیٹ ہے۔ اور وہ اس آسمان سے اترتے من وسلویٰ کو دبوچ لینے میں بے حد ماہر تھا کہ یہ اس کا تیسرا حج تھا۔ اور وہ اپنے لیے نہیں بلکہ اپنے ڈپلومیٹ کولیگ کے اباجی کے لیے یہ ڈبے کیچ کرتا تھا۔ ایسے کہ سلپ میں جانٹی رہوڈز بھی کیا کیچ کرتا ہوگا اور پھر دانتوں کی نمائش کرتا اپنی سیاہ ریش سہلاتا شرارت بھری آنکھوں سے مجھے دیکھتا ایک ڈبہ مجھے پیش کرتا تھا "انکل لیجئے۔" یعنی لسی نوش فرمائیں۔۔

اور میں اسے نہایت رغبت سے نوش کر جاتا کہ ایک تو یہ لسی سلجوق کا ایک دوست مجھے پیش کر رہا ہے اور اس کے علاوہ میں سعودی حکمرانوں کی دریادلی کو کیسے ٹھکرا سکتا تھا۔ تو میں اس لسی کو عدم کی مانند لہرا کے تو نہیں البتہ گھبرا کے پی جاتا تھا۔

یہ تو میں صراط مستقیم سے لمحہ بھر کے لیے لسی کے ایک نکارتن کے لیے بھٹک گیا تو اب ہم دوبارہ گامزن ہوتے ہیں مسجد نمرہ کی جانب۔ لاکھوں سارڈین مچھلیوں میں پانچ اور پیک شدہ مچھلیوں کی طرح۔ جڑے ہوئے پسینے میں بھیگے ہوئے۔ چلتے تو کیا تھے۔ دھکے کھاتے رکتے پھر سے رواں ہوتے ایک ایسی کار کی مانند جس کا پٹرول ختم ہونے کو ہو ویسے ہچکیاں بھرتے رکتے۔ پھر سے سٹارٹ ہو جاتے۔ چلتے تھے۔ اس شاہراہ کے ہجوم کے گھنے پن کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ ان کے سروں کے اوپر فٹ بال کا ایک میچ آسانی سے منعقد کیا جا سکتا تھا۔ اور مجال ہے کسی کھلاڑی کے پاؤں تلے کوئی ایسا خلا آ جائے جس میں وہ گر جائے اور نہ ہی لڑھکتے۔ سروں پر لڑھکتے ہوئے فٹ بال کو کوئی ایسی جگہ میسر آنی ممکن تھی جس میں وہ گر کر اوجھل ہو جائے۔ اتنے لوگ تھے اور اتنی گھناوٹ تھی۔۔

ہم اس مقام پر پہنچ گئے جہاں شاہراہ سے بچھڑ کر ایک ہجوم جبل رحمت کی جانب رواں تھا اور وہ اس کے دامن میں پہنچ کر رکتا کہاں تھا۔ ٹھاٹھیں مارتا ہوا اس کی ڈھلوان پر بلند ہوتا جاتا تھا۔ اور اس جبل کو اپنے احراموں میں برفپوش سفیدی میں بدلتا تھا۔

یہاں اس مقام پر میں جھجکا۔

کعبہ میرے پیچھے ہے تو کیسا میرے آگے۔

کدھر کو جانا ہے۔۔

کون زیادہ عزیز ہے۔۔

میں چاہتا بھی تو انحراف نہیں کر سکتا تھا۔ میں لاکھوں کے دباؤ کی زد میں تھا مسجد نمرہ کی جانب بڑھتے ہجوم میں بے اختیار تھا۔ اس لیے اپنے آپ کو تسلی دے دی کہ مسجد نمرہ کی جانب ہی سفر کرتے ہیں اور وہاں نماز ادا کر کے واپسی پر جبل رحمت کی کوہ نوردی کا قصد کریں گے۔ پہلے یہ خطبہ سن لیں جو آج کا کام ہے اور پھر آخری خطبہ سن لیں گے جو چودہ سو برس پہلے کا ہے۔۔

بہت سے زائرین کانوں سے ریڈیو چپکائے جیسے کرکٹ میچ کی کومنٹری سن رہے ہوں، ہمارے آس پاس خطبۂ حج سن رہے تھے.. پتہ نہیں آج کس نے زیرو پر آؤٹ ہو جانا تھا اور کس نصیب والے نے سنچری سکور کرنی تھی..

سروں کی فصل کے اوپر ایک مینار نمودار ہوا.. ڈبکیاں کھاتا.. کبھی دکھائی دے جاتا اور کبھی ہجوم میں اوجھل ہو جاتا.. اور پھر حج کا خطبہ مجھے براہ راست سنائی دینے لگا..

اور پھر یوں اٹک اٹک کر.. رکتے رکتے.. دھکے کھاتے.. ڈولتے سنبھلتے چلتے میں نے محسوس کیا کہ مزید رکاوٹ آنے لگی ہے.. اس ٹھوکریں کھاتے بہاؤ کے سامنے بھی کچھ رکاوٹ آنے لگی ہے.. چلتے جانے میں اجتناب آ رہا ہے.. لوگ رکتے جا رہے ہیں.. اور یکدم سب رک گئے دور صفیں بنانے لگے.. قطار میں کھڑے ہونے لگے ہیں..

ہم پانچوں کہیں بھی نہ تھے..

نہ تین میں نہ تیرہ میں..

کسی بھی صف میں کوئی جگہ نہ تھی..

اور ہم ابھی تک مسجد نمرہ کے آس پاس پہنچنے کی آس میں تھے اور یہ صفیں چیرتے چلے جاتے.. جب کہ بیشتر لوگ رک چکے تھے، ہم ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے نہایت بدتمیزی سے اپنا راستہ بناتے آگے چلے جا رہے تھے کہ شاید مسجد نمرہ تک پہنچ جائیں..

نہیں پہنچے..

اور اس کے ساتھ ہی اللہ اکبر، اللہ اکبر کی صدائیں گونج اٹھیں..

اب ہمارے اندر بھی ایمرجنسی ڈیکلئر ہو گئی کہ کھڑے ہو جاؤ، کھڑے ہو جاؤ۔ کہیں تو کھڑے ہو جاؤ، یہ نماز مس ہو گئی تو سمجھو حج مس ہو گیا، کہیں کوئی جگہ ہوتی تو کھڑے ہوتے۔ ہجوم تھمتا تھمتا بالکل تھم گیا.. سیسہ پلائی دیوار ہو گیا اور کسی صف میں اتنی بھی گنجائش نہ تھی کہ ہم کسمسا کر اس میں فٹ ہو جاتے.. کہیں تھوڑی سی جگہ نظر آتی تو آگے کوئی زیلر ہوتا جس کے ساتھ ماتھا ٹکرا کر اگر سجدہ جائز ہوتا تو ہم تامل نہ کرتے.. کہیں رکتے تو اپنے کوصفوں کے درمیان کھڑا پاتے اور پیچھے کھڑے حضرات نہ صرف کمر میں کچوکے دیتے بلکہ اپنی اپنی زبان میں مناسب سرزنش کرتے کہ بے وقوف کہاں آن کھڑے ہوئے ہو، ہم سجدہ تمہارے کندھوں پر کریں گے، چلتے پھرتے نظر آؤ..

ہم چلتے پھرتے کیسے نظر آتے، ہجوم رک چکا تھا.. سفید دریا منجمد ہو چکا تھا اور اس میں چلنے پھرنے کی گنجائش کہاں تھی..

اسی بھگدڑ میں یکدم جب لاکھوں لوگوں کے ہاتھ کانوں تک گئے تو ہم جہاں تھے وہیں ساکت ہو

گئے، پتہ نہیں کہاں تھے.. اور نیت باندھ لی. سجدے جانے کہاں کہاں ہوتے رہے، کبھی کسی چپلوں کے ڈھیر پر.. اور کبھی کسی حاجی بابا کی کمر پر.. اور کبھی ذرا اسکرتے کہ چپلوں پر ماتھا نہ ٹیکیں تو جوس کے خالی ڈبوں پر جبیں جا لگتی.. اور جبیں کے دباؤ سے ایک بار جوس کے ایک ڈبے میں سے جوس کی پچکاری چہرے کو بھگو گئی. لیکن اس کے باوجود ہم مسکرائے بھی جا رہے تھے اور موجودہ حالت سے لطف اندوز ہوتے پڑھتے بھی جا رہے تھے. کمال کی طمانیت بھی تھی کہ ابھی سلام پھیریں گے تو حاجی ہو جائیں گے اور کیسا لطف تھا کہ کبھی ہنسی بھی آتی تھی اور آنکھوں میں نمی بھی آتی تھی.. :

عرفات کے میدان میں پچیس لاکھ افراد کے صرف سانس سنائی دیتے تھے یا کھڑے ہونے اور سجدے میں جانے کے موقع پر ایک سرسراہٹ جیسے ہوا چلی اور پھر تھم گئی.

سلام پھیرتے ہی میں نے مسکرا کر سلجوق سے پوچھا "کیوں بھئی ہم حاجی ہو گئے؟ تو اس نے کہا "آہو ابا.. گلے ملو."

یوں ہم حاجی ہو گئے..

اب حاجی ہو جانے پر، اس فرض کی تکمیل پر جس کے لیے گھر سے نکلے تھے ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ نس نس سے روحانی بالیدگی کے کوئی جھرنے ترل رل کرتے پورے وجود کو بھگوتے پھوٹنے لگتے.. حیرت کی کسی ان چھوئی وادی میں اترنے کا احساس ہوتا. کوئی آبشار سرشاری کا روح کے تالاب پر جمی کائی پر گر کر، اسے دھکیل کر شفاف پانیوں کو ظاہر کر دیتا اور مجھے نوا نکور کر دیتا. کم از کم کوئی ایک تو ایسا چشمہ پھوٹتا جس کے گرد میں ریت کی منڈیر بنا کر اسے "زم زم" کہتا لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا.. میں جوں کا توں رہا. اپنے آپ کو "حاجی صاحب" کہہ کر جوش دلانے کی سعی کی پر من کی کالک دھلی ہی نہ تھی تو تبدیلی کا احساس کیسے ہوتا. میں نے میمونہ سے یہی سوال کیا تھا کہ عرفات پہنچ کر آپ ظہر اور عصر کی نمازیں ملا کر پڑھتے ہو تو اس کے بعد فوری طور پر خود بخود حاجی ہو جاتے ہو. کوئی تحریری امتحان نہیں ہوتا. زبانی انٹرویو نہیں ہوتا. نمبر نہیں لگتے.. پاس فیل کی فہرست تیار نہیں ہوتی. سلام پھیرتے ہو تو حاجی ہو جاتے ہو.. تو اس نے کہا تھا.. ہاں حاجی ہو جاتے ہو..

ہم حاجی ہو تو گئے تھے لیکن اتنی آسانی سے کہ لطف نہ آیا.. اور پکی بات ہے یقین بھی نہ آیا..

البتہ بیٹوں کے چہروں پر جو مسرت پھوٹتی تھی وہ کبھی نہ دیکھی تھی.. سلجوق نے جب زندگی میں پہلی بار آئس کریم کھائی تھی تو تب بھی اس کے چہرے پر ایسی ہی معصوم خوشی تھی.. اور سمیر جو ہر نئی شے کو پانے پر کوئی تحفہ وصول کرنے پر.. بے شک اس کا کمرہ اسی قسم کے بے شمار تحفوں سے بھرا پڑا تھا، ایک بچے کی طرح کھلکھلاتا اور کلکاریاں مارتا تھا.. وہ اس نئے تحفے کے حصول پر بے پناہ مسرت میں بھیگا ہوا ایک شترمرغ کی مانند ہجوم پر نظریں دوڑاتا کہتا تھا "ابا.. سارے حاجی ہو گئے."

اور ہاں میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ ہم مسجد نمرہ کی چار دیواری کی قربت میں پہنچ گئے تھے اور اس

کے مینار دیکھ سکتے تھے اور خطبہ حج کو براہ راست سن سکتے تھے..

اب واپسی تھی.

اسی شاہراہ عرفات پر اپنے عارضی خیموں کی جانب واپسی تھی. جیسے کوہ پیمائی میں چڑھائی کی نسبت بیس کیمپ میں لگے ہوئے اپنے خیموں تک اترائی زیادہ خطرناک اور صعوبت سے بھری ہوتی ہے ایسے ہی یہ واپسی بھی مشکلوں سے اٹی تھی.. کہ ہر کوئی جلد از جلد اپنے عارضی خیموں کو لوٹ کر اللہ سے باتیں کرنا چاہتا تو دعائیں کرنا چاہتا تھا.

ایک اور مشکل برسات کی تھی. کناروں پر ایستادہ پانی کی پھوار چھڑکتے فوارے پھوار برساتے تھے تو اس کے ہمراہ سعودی حکومت اور کئی خیر کے طالب حاجیوں کی جانب سے جوس لسی اور مشروبات کے ڈبے اور دوپہر کے کھانے کے ڈبے بھی سروں پر برستے تھے.

کوئی ایک نامعلوم شخص.. نہ پتہ معلوم.. نہ قومیت کا کچھ علم.. وہ کسی تجارتی ادارے کے ٹریلر کے قریب پہنچتا ہے جہاں جوس اور خوراک وغیرہ فروخت ہو رہے ہیں اور پوچھتا ہے کہ پورے ٹریلر میں جو مشروبات ہیں، خوراک کے جتنے ڈبے ہیں تو ان کی کل قیمت کیا ہے.. وہ یہ قیمت ادا کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میری جانب سے یہ سب کچھ حاجیوں پر نچھاور کر دو.. اور چلا جاتا ہے..

ہر جانب.. جوس، لسی، امریکی مشروبات، پھل فروٹ، سینڈوچ.. روسٹ مرغوں اور چاولوں کا من و سلویٰ اتر رہا تھا لیکن اسے لوٹنے کے لیے جو ہمت درکار تھی. عزت نفس کو جو ایک لمحے کے لیے ترک کرنا پڑتا تھا وہ ہم میں مفقود تھی..

لیکن کچھ اور بھی میزبان تھے..

ایسے میزبان جن کے بارے میں مجھے یقین ہوا کہ روز حشر اللہ تعالیٰ ان کا میزبان ہوگا. یہ ایسے میزبان تھے جن کی حیثیت نہ تھی.. ان کے پاس ثروت نہ تھی، اوقات نہ تھی. عمر بھر روزانہ ایک ایک سکہ بچاتے اب کہیں حج پر آنے کے قابل ہوئے تھے.

ان میزبانوں کے چہروں پر منت سماجت تھی.. عاجزی تھی.. درخواست تھی. صورتیں مسکین تھیں اور وہ التجائیں کرتے تھے، اپنے قریب سے گزرنے والے حاجیوں سے کہ ہمارے مہمان بن جاؤ. ہمیں یہ شرف میزبانی کا بخش دو کہ ہم دور کے شہروں سے آئے ہیں، ہمارے دامن میں جو کچھ ہے اسے قبول کر لو.. ہم فریاد کرتے ہیں کہ کچھ تو قبول کر لو..

اور اگر کوئی قبول کرنے کے لیے رک جاتا تھا ان کے دل رک جاتے تھے کہ ہماری یہ خوش بختی کہ میدان عرفات کا یہ عارضی باشندہ ہمارے لیے رک گیا ہے.. کچھ نہ کچھ تو قبول کرے گا..

ان میں سے ایک موٹا ترک میزبان تھا. سنہری مونچھوں اور دہکتے رخساروں والا جو ایک دیدہ زیب

نقش ونگار سے مزین طشتری میں جُوس اور دیگر مشروبات سجائے ایک مسکین ویٹر کی مانند ہر گزرنے والے کے آگے وہ طشتری کرتا اور منت کرتا.. اگرچہ اس یار کی زبان ترکی تھی.. اور میں ترکی نہ دانم اور اس کے باوجود اس کی لجاجت، اور محبت کی ترکی تمام نہ ہوتی تھی.. حرف حرف دل میں اترتی تھی، اثر کرتی تھی، سمجھ میں آتی تھی کہ برادر مجھ پر کرم کرو.. میرے مہمان بن جاؤ.. جُوس کا ایک ڈبہ ہی اٹھالو.. پیاس بجھالو.. لسّی کا یہ کارٹن میں نے تمہارے لیے ہی تو سجا رکھا ہے..

میں نے اس میزبان اور یار مہربان کی طشتری میں سے ایک مشروب اٹھایا تو اس نے جھک کر میرا شکریہ ادا کیا.. وقت کی گنجائش نہ تھی ورنہ وہ میرے گالوں کے بوسے لیتا..

ایک افریقی میزبان مشروبات پیش نہیں کر رہا تھا بلکہ زبردستی ہاتھوں میں تھماتا جاتا تھا اور اپنے سفید دانتوں کی نمائش کرتا چلا جاتا تھا..

ایک اور.. سر راہ کھڑا.. میزبان.. اگرچہ اس ترک کی مانند میزبانی کی استطاعت نہ رکھتا تھا.. قدرے غریب تھا.. مہمانوں کو بھری ہوئی طشتریاں پیش کرنے سے قاصر تھا لیکن اس کے جذبۂ میزبانی میں اتنی شدت تھی کہ وہ اپنی دونوں ہتھیلیوں پر کیلے رکھے ہر ایک سے التجا کر رہا تھا.. کہ بھائی یہ قبول کر لو.. ایک کیلا کھالو..

اگرچہ کیلا میرا سب سے ناپسندیدہ پھل ہے.. ہمیشہ مجبوری کی حالت میں نگلا ہے، کبھی خواہش سے نہیں کھایا لیکن اس کی التجا میں اتنی دردمندی تھی کہ وہ ہر کسی پیش کر رہا ہوتا تو میں قبول کر لیتا..

میں نے اس کی ہتھیلی سے ایک کیلا اٹھایا تو اس نے مجھے پہچان لیا کہ وہ ایک پاکستانی تھا.. میں آگے بڑھنے کو تھا کہ اس نے مجھے روک لیا.. ''آپ تو تارڑ صاحب ہیں.. آپ دو کیلے کھائیں..''

اور میں نے وہ دو کیلے کیسی رغبت سے کھائے، یہ میرا دل جانتا ہے.. آپ نہیں جان سکتے.. اگر کبھی دوبارہ حج کی توفیق ہوئی.. اس کا ایکشن ری پلے ہوا.. بلاوا پھر سے آ گیا تو میری تمنا ہے کہ میں ایک ایسا ہی میزبان بنوں گا.. یہ میزبان خوراک اور مشروبات برساتے ٹریلروں.. بادشاہوں کی جانب سے عنایت کردہ ڈبوں پر فوقیت رکھتے تھے.. کہ شاہ تو ہر ڈبے پر اپنا نام لکھتے تھے اور یہ بے نام ہو کر میزبانی کرتے تھے، اگرچہ ان کی حیثیت کچھ نہ تھی..

ہم ذرا تشویش میں مبتلا ہو گئے کہ جلد از جلد خیموں تک پہنچیں.. وہاں اپنے ساتھیوں کو تلاش کریں کہ جانے ہزاروں میں سے کس ایک خیمے میں پوشیدہ ہیں.. لیکن جبلِ رحمت نے راستہ روک لیا..

وہ عین شاہراہِ عرفات کے درمیان میں تو نہ تھا.. بائیں ہاتھ پر کچھ فاصلے پر ابھرتا تھا.. اس کے باوجود اس نے راستہ روک لیا..

برف پوش.. سفید رداؤں میں لپٹا.. دامن سے چوٹی تک سفید چیونٹیاں اس پر رینگتی تھیں، ان سے

ع

ذرا بائیں ہاتھ پر نظر آیا..

یہاں سے گزرتے ہوئے ارادہ تو یہی کیا تھا کہ مسجد نمرہ کی قربت میں نماز پڑھ کر.. حاجی ہو کر اس کے دامن تک جائیں گے۔ ایک اور سفید چیونٹی سو جائیں گے لیکن بدن تھکاوٹ سے دو چار جھپکنے لگا.. جبل رحمت کے دامن تک پہنچنے اور واپس آنے کے لیے بہت وقت درکار تھا.. اور وقت نہ تھا۔ ہمیں اپنے خیموں تک پہنچنا تھا.. دعائیں کرنی تھیں اور غروب سے پیشتر عرفات چھوڑ دینا تھا۔ اگر تھکاوٹ نہ بھی ہوتی بدن لرزاں و بے شک ہوتا تو بھی واپسی تک غروب ہو سکتا تھا..

رحمت کی اس پہاڑی کے پتھروں سے میرے بابا کے لبادے چھوئے تھے.. اور میں ان پتھروں کو بھی چھو نہیں سکتا تھا..

''آپ نے وادی نمرہ میں اپنے قیام کے لیے اونٹ کے بالوں کا بنا ہوا خیمہ نصب کرنے کا حکم دیا اور منیٰ سے چل کر عرفات میں قیام کیا.. اور اس خیمے میں اترے.. جب دوپہر ڈھل گئی۔ دھوپ کم ہو چکی تو آپ نے اپنی اونٹنی قصویٰ لانے کا حکم دیا اور قصویٰ پر سوار ہو کر میدان عرفات میں تشریف لے گئے..''

اور آج بھی دوپہر ڈھل چکی تھی۔

دھوپ کم ہو چکی تھی..

یہی وقت تھا جب بابا قصویٰ پر سوار ہوئے تھے..

اور مجھے ایک عجیب سا خیال آیا.. بے شک لاکھوں کا ہجوم ہے.. میں تنہا نہیں ہوں لیکن کیا بعید کہ جہاں میں چلتا ہوں یہاں قصویٰ کی کچھ مینگنیاں گری ہوں جن پر میں چلتا ہوں تو میں احتیاط کرنے لگا.. مبادا میرا پاؤں ان پر آ جائے.. وہ اگرچہ یہاں نہیں تھیں لیکن شاید بھی تھیں۔

''اے لوگو میری بات غور سے سنو..

اگلے برس اور اس کے بعد پھر کبھی۔

شاید میری تمہاری ملاقات نہ ہو سکے..

کیا میں نے تم تک اپنا پیغام پہنچا دیا؟''

جو حاضر تھے انہوں نے کہا ''ہاں آپ نے پہنچا دیا۔''

بابا نے فرمایا ''اے اللہ گواہ رہنا۔''

اور تین بار دوہرایا ''میں پڑوسی کے بارے میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں..''

''اے لوگو سنو..
جو حاضر ہے میری بات غیر حاضر تک پہنچا دے.. بہت سے غیر حاضر..
سننے والوں سے زیادہ یادداشت رکھتے ہیں.''

آخری خطبے کے بعد آپؐ نے اپنے چہیتے بلالؓ کو سب پر فوقیت دی اور انہیں اذان دینے کا حکم دیا..
نماز کے بعد آپ اپنی اونٹنی قصویٰ پر سوار ہو گئے..
اور یہ قصویٰ..
جب کہ میں جبل رحمت کی جانب تکتا، اس کے دامن تک نہ پہنچ پانے کے دکھ میں جلتا تھا یہ قصویٰ اونٹنی کیسے کیسے ناز و ادا سے میرے سامنے ہی تو اٹھکیلیاں کرتی نخرے کرتی چلتی جاتی تھی
اور نخرے کیوں نہ کرتی.. سوار بھی تو دیکھو کیسا پایا تھا..
جس قصویٰ کی پیشگیوں پر قدم دھرتے میں چودہ سو برس بعد بھی گناہ کا سوجب ٹھہرتا تھا تو وہ نخرے کیوں نہ کرے..
قصویٰ جیسے میرے سامنے چھن چھن کرتی گزرتی تھی

چھن چھن کردی گلی وچوں لنگدی
سادڑھے بھاں دی ڈاچی بادامی رنگ دی:

قصویٰ کسی اور رنگ کی ہو ہی نہیں سکتی تھی.. بادامی رنگ کی تھی اور ان گنت جہانوں اور زمانوں میں سے چھن چھن کرتی گزرتی تھی.. اور اس پر سوار جو تھا، وہ ان جہانوں اور زمانوں اور مجھ ذرّے کا بھی سجن تھا..

میری ڈاچی دے گل وچ ٹلیاں..
وے میں پیر مناون چلی آں..

یہ اسی ڈاچی قصویٰ کا قصہ ہے، جس پر سجن سوار تھے اور اس کے گلے میں جو گھنٹیاں ہیں وہ ہزاروں برسوں سے بجتی مترنم چلی آ رہی ہیں.. نہ ان کی آواز میں اور نہ ان کے ترنم میں ذرہ برابر فرق آیا ہے.. جو بھی انہیں سنتا ہے.. اربوں لوگوں کے جتنے بھی کان تھے اور لمحہ موجود میں ہیں، ان سب میں یہ ٹلیاں کھنکتی ہیں. محض اس لیے کہ جس ڈاچی کے گلے میں یہ ٹلیاں ہیں اس پر سجن سوار ہے.

ڈاچی والیا موڑ مہار وے...

خلقت منتیں کر رہی ہے کہ اپنی مہار موڑ دو تو تمہارا مکھ دکھائی دے.. اور وہ سوار ایسا ہے کہ ہر ایک کے لیے.. اپنی مہار موڑ دیتا ہے.. رُک جاتا اور کہتا ہے "مجھ میں اور تم میں کوئی فرق نہیں.. سوائے اس کے کہ مجھ پر وحی اترتی ہے"

اور اسی لیے وہ محبوب ہے کہ وہ ہم جیسا ہے..

اور جب قصوئی کے سوار نے یہ کہا کہ جو حاضر ہے، میری بات غیر حاضر تک پہنچا دے اور بہت سے غیر حاضر سننے والوں سے زیادہ یادداشت رکھتے تھے..

تو وہ غیر حاضر میں تھا.. جو اب حاضر ہوا تھا

اگرچہ مجھ میں اتنی سکت تو نہیں کہ ان کا پیغام آگے پہنچا سکوں.. لیکن اتنا تو کر سکتا ہوں کہ ان کی ڈاچی کے گلے میں جو ٹلیاں ہیں، ان کا ترنم بیان کرنے کی سعی کروں.. بے شک یہ عشق کا وہ بھاری پتھر ہے جو کب مجھ ناتواں سے اٹھتا ہے.. لیکن میں اس پتھر کو ایک لمحے کے لیے چھو تو سکتا ہوں.. پھر بے شک ساری عمر میں اس ایک لمحے کے چھونے کو سوچتا رہوں.. اسے لفظوں میں بیان کرنے کی سعی لاحاصل کرتا رہوں..

میں نے سلجوق سے ایک وعدہ لیا تھا کہ وہ حج کے بعد مجھے ایک بار یہاں جبل رحمت کے قدموں تک ضرور لے کر آئے گا.. تب یہ لاکھوں افراد یہاں نہ ہوں گے.. صرف ایک ڈاچی ہوگی چھن چھن کرتی.. اور میں اس کے پیچھے پیچھے چلوں گا اور اس کی مینگنیاں بھی میرے لیے مزاروں، خانقاہوں اور قبروں سے کہیں زیادہ پیاری اور مقدس ہوں گی کہ میں قبروں پر تو شاید قدم رکھ سکتا ہوں.. اُن پر نہیں!

''دیکھ ناں میںڈے اولن سائیاں تیرا نام ستاری دا..
میں لاچار فقیر.. تجھے پکارتا ہوں''

جہاں ہمارا کوسٹر آن رکا تھا اور ہم پانچ بقیہ ساتھیوں سے انحراف کر کے مسجدِ نمرہ کی جانب بہہ گئے تھے وہاں سے کچھ دور شادی بیاہ کے موقعوں پر ایستادہ کی جانے والی قناتوں ایسے خیموں کا ایک سلسلہ تھا..اس سلسلے کے بیچ دھول آلود راستے تھے..ان راستوں پر کہیں چھاؤں تھی اور کہیں تیز دھوپ.. چھاؤں وہاں تھی جہاں دھریک اور نیم کے پستہ قامت شجر سایہ کرتے تھے..میں ایک تھکا ہوا، پژمردہ اور مایوس سا حاجی تھا کہ اتنی آسانی سے حج کیسے ہو گیا..اپنے آپ کو کوستا تھا کہ اللہ سے غافل ہوئے جاتے ہو، بادامی ڈاچی کی مدھر چھن چھن کے سحر میں گرفتار ہو گئے ہو..تم نے تو عرفات کے میدان میں اللہ سے باتیں کرنی ہیں..کانوں میں وہ چھن چھن گونجتی رہی تو تمہاری باتوں کے جواب میں کچھ آ گیا تو اسے کیسے سن پاؤ گے..

قنات میں پہنچ کر میں نے کمر سیدھی کرنے کی غرض سے آرام کرنا چاہا اور فرش پر بچھی دھاری دار دری پر لیٹ گیا..

گرمی یہاں بھی تھی..

فروری میں یہ حال تھا تو جون، جولائی میں آنے والوں کا کیا حشر ہوتا ہو گا..اور چیونٹیاں اور مکوڑے بھی بہت تھے..وہ میری استراحت کی حالت میں بے سدھ پڑے بدن پر نہایت ڈھٹائی سے سیر و تفریح کرنے کے لیے یوں چڑھتے تھے جیسے میں ایک بے جان کے ٹو ہوں جسے سر کرنے کا وہ ارادہ رکھتے ہوں..میں نے اپنے گال پر رینگتے بڑھی ہوئی داڑھی کے سفید کھردرے بالوں میں راستہ تلاش کرتے ایک بدتمیز مکوڑے کو یکسر ہلاک کرنے کی خاطر ہاتھ اٹھایا..تو فوراً یاد آ گیا کہ نہیں.. بالکل نہیں..حج کے ایام میں کسی جاندار کو نہیں مارنا..ایک مکوڑے کو بھی نہیں بے شک وہ بدتمیز ہو..چنانچہ میں نے ہاتھ روک لیا کہ جاؤ اے دھک مکوڑے آج تمہاری بادشاہت ہے..تم ہمارے رخساروں اور بدن پر راج کرو..ہم نے وعدہ کر رکھا ہے اس لیے تم محفوظ ہو..

اور شکر ہے کہ فوراً یاد آ گیا کیونکہ اس قسم کی وعدہ خلافی ہو جائے تو پاداش میں ''دَم'' دینا پڑتا ہے،

یک بکرا قربان کرنا پڑتا ہے تو یہ سودا مہنگا ہے.. گھوڑے کو جانے ہی دیا جائے تو بہتر ہے..

اس دوران کیا دیکھتا ہوں کہ خیمے میں جتنی بھی مخلوق جمع ہے سوائے چھوٹے بچوں کے وہ سب کی سب.. کیا مرد کیا عورتیں.. بوڑھے جوان سب کے سب.. کل مخلوق خیمے کی یا تو سجدے پہ سجدے کیے جا رہی ہے.. اور یا کونوں کھدروں میں الگ ہو کر سسکیاں بھرتی.. روتی دھوتی ہاتھ اٹھائے دھڑا دھڑ دعائیں مانگ رہی ہے اور سب ایک دوسرے سے لاتعلق.. اپنے اپنے کام میں مشغول..

اب ان کو کیا ہوا ہے؟ حج تو ہو گیا ہے تو اب ذرا ریلیکس کریں اتنی عبادت صحت کے لیے مضر ہوتی ہے.. تو اس نے مجھے پھر اپنی شریک حیات جو شادی کے اولین برسوں میں تو وہاں جان لگتی تھی اور اب عزیز از جان لگتی تھی اس کا سب سے قیمتی مشورہ یاد آیا کہ عرفات میں دعائیں مانگتے ہیں کیسے مانگتے ہیں.. اس نے ایک استانی کی مانند مجھ کند ذہن طالب علم کو سمجھانے کی خاطر عملی مظاہرہ کیا.. اپنے دوپٹے کو دونوں بازوؤں پر پھیلا کر یک فقیرنی کی طرح اٹھایا کہ ایسے.. جھولی پھیلاتی ہے.. بھیک مانگنی ہے کہ وہاں اللہ تعالیٰ موجود ہوگا..

سچی بات ہے میرا کوئی موڈ نہیں تھا مزید دعائیں مانگنے کا.. میں دعائیں مانگ مانگ کر عاجز آ چکا تھا اور بیناؤ بھی سن سن کر عاجز آ چکا تھا.. ایک بور کر دینے والے تواتر کے ساتھ ایک روبوٹ کی مانند.. کعبے کی دیوار سے لپٹ کر طواف کے دوران.. نمازوں اور نفلوں کے بعد.. چلتے پھرتے.. شاید سوتے میں بھی وہی دو چار درجن دعائیں دہرائے دہرائے چلا جاتا تھا.. اپنے بچوں کے.. نام لے کر.. ان کی خوشی، خوشحالی اور صحت کی دعائیں.. اپنی بہو اور داماد کے لیے.. بہنوں، بھائیوں اور ان کے بچوں کے لیے.. ماں باپ کے لیے.. ان کے بھائی بہنوں کے لیے.. جو جا چکے تھے ان کے لیے.. دوستوں کے لیے.. اور دشمنوں کے لیے بھی اور اگر کچھ اور نہ سوجھتا تو اپنے لیے بھی..

تو اب یہاں کونسی دعائیں مانگنی ہیں..

کوئی باقی رہ گئی ہو تو مانگوں..

کوئی نئی دعا سوجھتی ہی نہیں تھی..

لیکن پورے خیمے میں میں فرد واحد تھا جو مزے سے استراحت فرما رہا تھا اور بقیہ پبلک آہ و زاری میں مصروف تھی.. کوئی اتنی بلند آواز سے مانگ رہا تھا جیسے اسے اللہ کی سماعت کے بارے میں شبہ ہو اور کوئی گڑگڑیاں کرتا تھا اور کسی کے صرف ہونٹ پیاسی تتلیوں کی طرح پھڑ پھڑاتے تھے۔ چنانچہ میں بھی مجبوراً اٹھ کھڑا ہوا اور خیمے سے باہر آ گیا..

اب جو خیمے سے باہر آیا ہوں تو باہر دنیا ہی بدلی ہوئی ہے.. بلکہ شاید دنیا کا اختتام ہو چکا ہے.. صور پھونکا جا چکا ہے اور کل خدائی.. گورے کالے.. نیلے پیلے کل جہان کے.. سب جہانوں اور زمانوں کے لوگ اپنے اپنے کفن پہنے.. قبروں میں سے صاف ستھرے جوں کے توں نکل کر.. اپنے خیموں سے نکل کر.. میدانوں اور گلی کوچوں اور شاہراہوں پر.. ساکت کھڑی بسوں، کوسٹروں اور ویگنوں کے آس پاس.. کچھ سائے میں.. بیشتر

دھوپ میں.. حج کی اجتماعی کاوش کے بعد سب کے سب تنہا ہو چکے ہیں اور ہاتھ اٹھائے منگتے ہو رہے ہیں کوئی آبدیدہ ہے تو کسی کے اشکوں کی آبشاریں اس کے پاؤں کے آگے جو خشک مٹی ہے، اسے گیلا کرتی ہیں.. ان لاکھوں کفن پوشوں میں سے کوئی ایک ایسا نہ تھا جو میری طرح بیکار پھرتا ہو.. یا کسی شجر تلے اس کی چھاؤں سے لطف اندوز ہو رہا ہو.. سینڈوچ کھا رہا ہو لسی پی رہا ہو.. کسی سے بات کر رہا ہو کہ وہاں کوئی بات کرنے والا بچا ہی نہ تھا..

گھر سے چلتے ہوئے یہ منظر بھی کہاں میرے گمان میں تھا..

حج کی بھیڑ.. افراتفری.. ہجوم.. بے پناہ خلقت تو گمان میں تھی لیکن.. لیکن ہر ایک نے یکسر تنہا بھی ہو جانا ہے، یہ میرے گمان میں نہ تھا.. بالکل تنہا تو نہیں.. ایک موجودگی اور تھی جس کے سامنے ہر فرد نے تنہا ہونا تھا..

میں کسی ایک فرشتے کی مانند.. ایک ڈرامہ نگار کی حیثیت میں نہایت ٹھنڈے دل سے.. جذبات سے عاری ہو کر اس وسیع تنہائی کے منظر کو پرکھا.. اتنی بڑی سٹیج پر لاکھوں لوگ ایک ہی کردار میں ایک ہی لباس میں.. کوئی یہاں کوئی وہاں.. کوئی کسی خیمے کی اوٹ میں.. کوئی کسی درخت سے ٹیک لگائے.. کوئی دھوپ میں جھڑا ہوا.. اپنے علاوہ ہر وجود سے بے خبر.. بلکہ اپنے آپ سے بھی بے خبر.. اپنی تنہائی میں اور علیحدگی میں ہاتھ پھیلائے.. جھولی پھیلائے.. اپنی ہی باتیں جانے کس سے کیے چلا جا رہا ہے..

اس میں مجھے کوئی شک نہیں کہ اگر میں ایک مسخرے کا لباس پہن کر.. اچھلتا کودتا مزاحیہ حرکتیں کرتا گیت گاتا ڈھول بجاتا ان کے بیچ میں سے گزرتا تو بھی کوئی توجہ نہ کرتا.. وہ اتنے مگن اور آس پاس سے بے خبر تھے.. ان کی اس یکسوئی اور تنہائی کے گیان دھیان میں.. میں نے بہت مجرم محسوس کیا..

جیسے ایک بے خود رقص کرتی محفل میں.. صرف ایک شخص ساکت کھڑا ہو.. ایسے میں نے اپنے آپ کو بے وقوف اور مجرم محسوس کیا..

خیموں کے درمیان جو دھول آلود راستے ہیں.. مسجد نمرہ کی جانب جاتی جو شاہراہ ہے.. جبل رحمت کے گرد جو بیابان ہیں.. عمارتوں کے درمیان.. ٹیلوں پر.. کاٹھ کباڑ کے ڈھیروں پر.. پتھروں کی اوٹ میں.. جہاں کہیں بھی کھلی جگہ ہے سر پر تھوڑا سا آسمان ہے.. ہاتھ اٹھانے کی گنجائش ہے وہاں بے خود لوگ ہیں..

وہ جو خوانچے لگائے بیٹھے تھے.. ریڑھیوں پر خوراک سجائے بیٹھے تھے.. چھتریاں اور رومال فروخت کرتے تھے.. جہازی سائز کے ٹرکوں میں اپنا مال بیچنے کے لیے آئے تھے.. وہ بھی اپنے کاروبار ترک کر کے بے خودی کے اس میلے میں شامل تھے.. یوں بھی جو خریدار تھے، وہ اب طلب گار ہو چکے تھے..

اور کل عرفات میں ویسی ہی خاموشی تھی جیسی ظہر اور عصر کی نماز کی ادائیگی کے دوران چھا گئی تھی.. البتہ ایک فرق کے ساتھ کہ تب.. سجدے میں جاتے تھے یہی لاکھوں لوگ.. اٹھتے تھے.. بیٹھتے تھے.. تو ایک وسیع دل میں خوف بھر دینے والی سرسراہٹ جنم لیتی تھی.. اس کے سوا ہزاروں لاؤڈ سپیکروں پر مسجد نمرہ کے امام کی آواز گونجتی تھی.. لیکن اب کوئی سرسراہٹ نہ تھی کہ سب کھڑے تھے.. نہ سجدے میں جاتے تھے نہ اٹھتے تھے اور نہ

بیٹھے تھے اور لاؤڈ سپیکر بھی چپ تھے۔ تب خیموں کے درمیان میں جو راستہ تھا اس پر چلتے ہوئے میں نے دیکھا.. اور جو میں نے دیکھا اُسے میں آپ کو دکھاتا ہوں..

خیموں کے درمیان میں جہاں کچھ سایہ دار شجر دھریک یا نیم کی قسم کے تھے وہاں ایک درخت کے تنے سے لپٹا ہوا اپنے ناتواں بازوؤں سے اس تنے سے چمٹا ہوا ایک لاہوری حاجی بابا ہے اور یوں چمٹا ہوا ہے کہ الگ ہونے کا نام نہیں لیتا اور بھوں بھوں کرتا.. روتا چلا جاتا ہے۔ اس کی سفید داڑھی میں اس کے آنسوؤں کی مسلسل دھاریں جذب ہوتی چلی جا رہی ہیں.. ہر بار جب آنکھیں جھپکتا ہے تو ان میں سے آبشاریں گرنے لگتی ہیں.. وہ ایک ایسا بچہ ہے جو سکول جانے سے خوفزدہ ہے اور روتا جاتا ہے کہ اماں میں نے سکول نہیں جاتا.. اپنے دادا کی ٹانگوں سے لپٹا ہوا ہے۔ فریاد کرتا ہے کہ اماں میں نے سکول نہیں جانا..

اور اس کی اماں کون ہے..

ایک نہیں تین ہیں..

اس کے گرد اس کے تین اُسی عمر کے تین بابے یار ہیں اور اسے دلاسے دیتے ہیں.. اور کیسے دلاسے دیتے ہیں..

"اوئے.. ڈرتا کیوں ہے.. وہ تو ہمارا یار ہے.. دلدار ہے.. ہمت تو کر وہ کچھ نہیں کہے گا.. کیے گا کیوں اس نے خود ہی تمہیں بلایا ہے.. نہ خوب کھااس سے.. مانگ لے جو کچھ مانگنا ہے، دھتکارے گا نہیں.. وئے وہ تو مومن کا دوست ہے.. نہیں ڈر یار.. وہ تو ہمارا جگر ہے"

اور وہ لاہوری بابا کانپتا ہے.. اس کا پورا بدن ایک ناتواں گھاس کے تنکے کی مانند آندھی کی زد میں آیا کانپتا ہے اور اس دھریک کے تنے کے ساتھ مزید لپٹا جاتا ہے اور اس کی چھال کو اپنے آنسوؤں سے گیلا کرتا چلا جاتا ہے..

ایک اور ساتھی اسے ڈھارس دیتا ہے "اوئے دھریک کے اس تنے کو چھوڑ یار اپنے چھمانہ مار اسے مار جس نے تمہیں بلایا ہے۔ تو خود سے تو نہیں آیا ناں.. اس نے بلایا ہے تو آیا ہے ناں۔ تو پھر کیوں ڈرتا ہے.. یار وہ تمہیں کچھ نہیں کہے گا.."

اور لاہوری بابا جی ہیں کہ اُن پر ان ڈھارسوں، ان دلاسوں کا کچھ اثر نہیں ہوتا اور دھریک سے لپٹے.. تنے سے اپنی گرفت ڈھیلی نہ کرتے بھوں بھوں روئے چلے جا رہے ہیں.. مجھے ایک بے خود اور جذب میں آئے ہوئے شخص کا تماشا تو نہیں دیکھنا چاہیے تھا.. اگر میں اس کی بے خودی کو سمجھ نہیں سکتا تھا تو مجھے وہاں کھڑے ہونے کا کیا حق تھا محض ایک تماشائی کے طور پر..

لیکن یہ دنیا بھی تو ایک کھیل تماشا ہے..

تو اس میں کیا حرج تھا کہ میں بھی ایک تماشائی ہو جاتا..

"بابے کو ہوا کیا ہے؟" میں نے اس کے تین یاروں میں سے ایک کو پوچھا۔
"ڈر گیا ہے" اس نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "کہتا ہے اس نے مجھے نہیں بخشنا۔ میں بہت کالا ہوں۔ اس نے مجھے سفید نہیں کرنا۔ کالک بہت ہے۔ تو اس دھریک کے تنے کے ساتھ چمٹ مارے کانپتا رہا ہے۔ روتا جاتا ہے اور کہتا ہے میں کیسے دعا مانگ سکتا ہوں۔ میں دعا نہیں مانگ سکتا۔"
میں نے ایک سانس لیا اور جب اگلے سانس میں میں نے یہ جواز سنا تو ایک شاطر اور الگ ہو کر صرف مشاہدہ کرنے والے ادیب اور ڈرامہ نگار کے وجود کو خالی کر گیا۔ میں نے خود نہیں اس جواز نے مجھے فیض کیا کہ میں بہت کالا ہوں اور اس لاہوری بابے کے وجود میں ڈھل گیا اور اسی کے بدن کی مانند میرا بدن بھی کانپنے لگا۔ میں بھی ڈر گیا۔
اس نیم خواندہ لاہوری بابے کی قسمت میں۔ جو شاید اندرون شہر کسی تھڑے پر بیٹھ کر اپنے انہی یاروں کے ساتھ شطرنج کھیلتا تھا۔ باہر کی دنیا سے تو گیا شہر کے دروازوں کے باہر جو لاہور تھا، اس سے بھی شناسا نہ تھا۔ اس کے نصیب میں معراج کی جو منزلیں تھیں۔ ان میں سے کوئی ایک منزل بھی میرے ایسے جہاں گرد کے نصیب میں نہ آ سکتی تھی۔
مجھے کچھ معلوم نہیں۔ کہ میں تو آگے بڑھ گیا تھا کہ اس لاہوری بابے نے دھریک کے اس تنے کو یاروں کے دم دلاسے سے چھوڑا یا نہیں۔ اگر چھوڑا تو کوئی دعا مانگی یا نہیں۔ لیکن وہ بابا جی درخت کے تنے کو چھوڑیں یا نہ چھوڑیں۔ ان کے خوف اور ڈر نے یقیناً اللہ تعالیٰ کو بھی آبدیدہ کر دیا ہوگا اور وہ دعائیں مانگیں یا نہ مانگیں ان کی بخشش کے راستے میں ایک ذرے کی بھی اٹک نہ ہوگی۔ اس کا مجھے کامل یقین ہے۔

خیموں کے درمیان جو راستے ہوتے ہیں۔ وہاں بھی لوگ تھے۔ کچھ سائے میں، کچھ دھوپ میں اور وہ بھی اپنی اپنی دھن میں مگن تھے۔ مجال ہے کسی نے دیکھا کہ قریب سے کون گزرتا ہے۔
میں یوں گزرتے ہوئے۔ ایک پٹھان اماں جی کے قریب ہوا۔ ان کی نیلی آنکھوں سے جو آنسو گرتے تھے اور جھریوں سے بھرے سفید چہرے پر گرتے تھے تو یوں لگتا تھا جیسے یہ جھریاں منڈل ہونے کو ہیں۔ وہ دونوں ہاتھوں پر دوپٹہ پھیلائے ننگے سر بلند آواز میں پشتو میں جانے رب سے کیسے کیسے دکھڑے بیان کر رہی تھیں۔
مجھے سمیر نے اطلاع کی تھی کہ ان خیموں کا جہاں اختتام ہوتا ہے وہاں ایک چھوٹا سا خالی قطعہ ہے جہاں سے جبل رحمت نظر آ رہا ہے تو وہاں چلے جایئے ابا۔ کیونکہ میں جو منظر کا مارا ہوا تھا، چاہتا تھا کہ کوئی ایسی جگہ ہو جہاں سے جبل رحمت دکھائی دے تو میں اسے دھیان میں لا کر اس کی جانب رُخ کر کے کچھ کہوں۔ کچھ اگر بیان کرنے کو رہ گیا ہے تو کروں۔
وہاں بھی ایک غیر ہموار۔ خیموں سے پرے۔ چند مکانوں کے برابر میں جو کھلی جگہ تھی وہاں بھی لوگ

تھے.. جتنے لوگ کھڑے تھے، بُت بنے کھڑے تھے اور ان کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں سے پانی پھوٹتے تھے.. جیسے وہ حضرت عیسٰی کے ایسے مجسمے ہوں جن کی پتھریلی ہتھیلیوں میں سے خون خود بخود بہنے لگے.. جیسے حضرت مریم کے کسی معجزاتی مجسمے کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جائیں.. سب مجسمے الگ الگ.. دنیا جہان ہر شے سے غافل.. ایک دوسرے سے غافل.... اس مختصر میدان کے ایک کونے میں ایک ٹیلے پر دھریک کا ایک ابھی قد نکالتا ہوا درخت تھا.. کہیں اور تنہائی نہ تھی.. یہاں تھی.. اور یہاں سے کچے میدان کی اونچ نیچ پر ایستادہ وہ سفید پوش بت نظر آتے تھے اور ذرا آگے ایک دیوار تھی اور اس سے پرے درختوں کی سبز گھناوٹ تھی۔ پھر چند عمارتیں تھیں اور ان سے پرے.. بہت پرے.. جبل رحمت کی بلندی میدان عرفات میں سے ابھر کر سب کے دلوں پر راج کرتی تھی..

کیسے دعا میں مانگوں.. کونسا روپ کونسا ڈھنگ اختیار کروں.. جیسے کچھ لوگ دیوار کی اینٹوں پر ماتھا رکھے سر جھکائے ہوئے تھے.. کبھی نے ہاتھ بلند نہیں کیے ہوئے تھے.. کچھ پشیمان کھڑے بچے کی مانند ہاتھ نکالے سر جھکائے رو رہے تھے.. کچھ اپنے اوپر جو آسمان تھا اسے تکتے تھے تو آنسو ان کے چہروں پر نہ گرتے تھے۔ آنکھوں کے کونوں سے بہہ کر کانوں کی لویں بھگوتے گردن پر بہتے تھے.. کچھ کہیں بھی نہ تکتے تھے.. جیسے نرزادا کر تو یوں کہ وہ تمہارے سامنے ہے.. چنانچہ یہ جو کہیں بھی نہ تکتے تھے اس کی موجودگی کو محسوس کر چکے تھے اور جو سامنے تھا، اس کی خدمت میں حاضر تھے.. پہلے تو یہی خیال آیا کہ اس لاہوری بابے کی مانند میں بھی دھریک کے اس تنے کو جپھا ماروں اور آہ و زاری شروع کر دوں.. لیکن میں تو ڈرا ہوا نہ تھا.. مجھ میں کوئی خوف نہ تھا صرف ایک لرزش تھی.. بہ فرض محال میں تنے سے لپٹ بھی جاتا تو بھی میں وہاں تو نہیں پہنچ سکتا تھا جہاں وہ لاہوری بابا پہنچ چکا تھا.. اس لیے دھریک کی چھدری چھاؤں میں کھڑا ہوا اور میمونہ کی ہدایت کو یاد کرتے ہوئے احرام کے بالائی حصے کو اپنے دونوں ہاتھوں پر ایک دوپٹے کی مانند پھیلایا.. اس کی جھولی بنائی اور پھیلا لی.. ایک فقیر کی وضع اختیار کی.. ایک منگتے کا روپ دھارا.. چہرے کو کسی بناوٹ کی حاجت نہ تھی کہ وہ تو خود بخود فقیر ہوا جاتا تھا.. کر بھلا.. کر بھلا.. کی عاجزی اپنائی.. اپنائی کیا وہ بھی خود بخود اُتری اور دعائیں مانگنے لگا..

دور ہلکی دھوپ میں کہیں کہیں چھاؤں بھی تھی کہ میدان عرفات کے آسمان پر کہیں کہیں بادل تھے اور جبل رحمت سفید ہوا جاتا تھا..

"افضل اور اعلیٰ تو یہی ہے کہ قبلہ رُخ ہو کر مغرب تک وقوف کرے اور ہاتھ اُٹھا کر دعائیں کرتا رہے.. اگر پورے وقت میں کھڑا نہ ہو سکے تو جس قدر کھڑا ہو سکتا ہے، کھڑا رہے اور پھر بیٹھ جائے.. پھر جب قوت ہو تو کھڑا ہو جائے.. پورے وقت میں خشوع و خضوع اور گریہ زاری کے ساتھ ذکر اللہ کرتا جائے.. یہ وقت مقبولیت دعا کا خاص وقت ہے، جو ہمیشہ نہیں رہتا۔"

کسی میں بھی قوت کی کمی نہ ہوئی تھی.. سب کھڑے تھے..

جس وقت نے ہمیشہ نہیں رہنا اس کے ایک ایک پل پر آنسو گرتے تھے.

دعائیں پہلے تو وہی مانگیں جو مانگتا چلا آیا تھا اور مانگ مانگ کر عاجز آ چکا تھا اور پھر پتہ نہیں کہاں سے.. کدھر سے.. سوچ کے کسی ماخذ سے نہیں.. کسی دریافت شدہ منبے سے نہیں.. نت نئی اور انوکھی دعائیں لبوں پر رواں ہو گئیں.. کہ کوئی ایسا در کھل گیا تھا جس کا پہلے وجود نہ تھا.. ایک دیوار تھی اندھی اور اگلے پل میں یہ دروازہ نمودار ہو کر دا ہو جاتا ہے اور اس میں سے یہ انہونی اور آج تک نہ مانگی گئی دعاؤں کا ایک ریلا آتا ہے اور میرے ہونٹوں سے بہنے لگتا ہے..

اس دھریک کی چھدری چھاؤں تلے سفید جھولی پھیلائے میں جو بھی طلب کرتا تھا، جو بھی خواہش کرتا تھا اس کے ساتھ ہی طلب اور خواہش کی خشک کھیتی کو سیراب کرنے کے لیے پانیوں کا ایک ریلا آ جاتا تھا.. جیسے کھیتیاں ایک مدت سے سوکھی پڑی ہوں.. بوٹے مرجھا کر خشک زمین پر آخری سانس لیتے ہوں اور خوشوں میں پوشیدہ نرم گندم کے کچے دانے سوکھ کر مردہ ہونے کو ہوں اور ان کے درمیان میں ایک نہر بہتی ہو، پر کسان کا اس کے پانیوں پر کوئی حق نہ ہو اور پھر یکدم جو ڈاکا لگا تھا، وہ اٹھ جائے.. نہر میں شگاف ہو جائے اور نُوٹے جی اٹھیں.. دانوں کے سوکھے میں پانی جذب ہو کر زندگی بھر دیں اور کھیتی ہری ہو جائے..

یوں ہر وہ کھیتی جو سوکھ چکی تھی.. ہری ہو رہی تھی.

''قیام گاہ تک پہنچ کر اللہ کے رسولؐ نے قبلہ کی طرف رُخ کیا اور غروب آفتاب تک دعائیں مانگتے رہے.. آپؐ کے دونوں ہاتھ سینے سے اوپر اٹھے ہوئے تھے اور آپؐ اپنے اللہ سے ایک ''مسکین مانگنے والے'' کی مانند دعا کر رہے تھے...

اے اللہ تو میری بات سنتا ہے
اور میرے قیام کو دیکھ رہا ہے
اور میرے پوشیدہ اور ظاہر کو جانتا ہے
میری کوئی بات تجھ سے مخفی نہیں...
میں لاچار فقیر
پناہ کا طالب فریادی..
خوفزدہ ہراساں
اور اپنے گناہوں کا اقرار

اور اعتراف کرنے والا ہوں
میں تجھ سے ایک مسکین کی مانند سوال کرتا ہوں
اور ایک گنہگار، کمزور اور ضعیف کی طرح
تیری طرف دست سوال دراز کرتا ہوں
اور میں ایک خوفزدہ ستم رسیدہ کی مانند تجھے پکارتا ہوں
جس کی گردن تیرے سامنے خم ہے
اور آنسو رواں ہیں
اور کمزور جسم تیرے سامنے لرزاں ہے
اور ناک خاک آلود ہے
اے اللہ مجھے دعا کی قبولیت سے محروم نہ کر
اور شقی نہ بنانا
اور مجھ پر مہربان اور رحم کرنے والا ہو جا
اے ان سب سے بہتر جن سے مانگا جاتا ہے
اور ان سب سے افضل جو عطا کرتے ہیں

اگر وہ.. میرے بابا.. لا چار فقیر.. تو پھر میں کیا؟
پناہ کے طالب فریادی، خوفزدہ ہراساں، ایک مسکین کی مانند وہ یہاں اسی عرفات میں دست سوال دراز کرتے تھے، ایک گنہگار اور ضعیف کی طرح تو میں کیسے پناہ کا طالب فریادی ہو جاؤں؟
میں کتنا خوفزدہ ستم رسیدہ ہو کر اسے پکار سکتا تھا؟
میری گردن کہاں تک خم ہو سکتی تھی؟
ان کے آنسوؤں کی روانی سے بڑھ کر روانی کیسے ممکن ہے؟
کتنی لرزش ہو سکتی ہے میرے بدن میں..
اگر بابا ایسے ہو گئے تھے تو پھر ان کی قصوی کے پیچھے پیچھے چلنے والا.. لا چار فقیر.. اس کی مینگنیاں سمیٹنے والا.. کتنا فقیر ہو جائے..
میں تو محض ایک بہروپیا تھا.. بیگم کے کہنے پر جھولی پھیلائے فقیر بنا کھڑا تھا.. اور اس یقین کے ساتھ کھڑا تھا کہ بابا نے لا چار فقیر ہو کر.. ایک مسکین کی مانند.. خوفزدہ اور ہراساں ہو کر ستم رسیدہ کانپتے بدن کے ساتھ جو دست سوال دراز کیا تھا، اپنے لیے تو نہ کیا تھا.. ہمارے لیے کیا تھا.. کہ وہ کہاں کے گنہگار.. اور کیسے

اقرار کہ یہ گناہ ہمارے تھے اور ان کا اقرار ہمارا تھا جو پہنچایا گیا تھا.... وہ جو محبوب تھے اپنے عاشق کے سامنے دست سوال دراز کرتے تھے تو اپنے لیے نہ کرتے تھے ہمارے لیے کرتے تھے:: کہ ہم تو سر جھکائے قصووں کے پیچھے پیچھے چلے آتے تھے.. اس کی اوٹ میں ایسے چہرے چھپائے چلے آتے تھے جو دکھانے کے قابل نہ تھے اور اس یقین میں چلتے تھے کہ آگے آگے وہ جو بادامی رنگ کی ڈاچی پر سوار جن ہے، وہ سفارش کرے گا تو ہم اپنے چہرے دکھا سکیں گے.. کہ ہم تو یونہی جھولی پھیلائے فقیر کا روپ بھرے کھڑے تھے..

یہاں اس دھریک کی چھاؤں میں جبل رحمت کی سفیدی پر نظر رکھتے.. کہ وہاں بھی خلقت تھی اُس کے دامن میں جہاں اونٹ کے سیاہ بالوں سے بنا ہوا ایک خیمہ نصب تھا اور جہاں ڈاچی رُکی تھی.. اور وہاں بھی ان پتھروں پر.. جن پر قدم رکھتا ڈاچی سوار اس جبل کی چوٹی پر پہنچا تھا اپنا آخری خطاب کرنے.. تو جبل رحمت کی سفیدی پر نظر رکھتے توجہ بھٹکتی نہ تھی.. جیسے نماز میں بھٹک جاتی ہے.. یہاں اپنے آپ کو لعن طعن کرنے کی ضرورت در پیش نہ ہوتی تھی کہ رب کے حضور کھڑے ہو کر اور کیا سوچ رہے ہو.. انہماک کے لیے کچھ سعی نہ کرنی پڑتی تھی کہ توجہ بھٹکتی ہی نہ تھی.. کوئی اور خیال آتا ہی نہ تھا.. یہ بھی ایک عجیب سحر تھا..

اگرچہ اس کھلی جگہ میں جو کوئی بھی کھڑا تھا دوسروں سے، اپنے آپ سے غافل تھا.. جدا اور تنہا تھا.. مجھ سے بھی غافل تھا لیکن اس کے باوجود اس ہوس نے میرے بدن میں گھر کیا کہ کوئی ایسا کونہ کھدرا تلاش کروں جہاں میں سچ مچ تنہا ہو جاؤں، آس پاس کوئی نہ ہو.. کچھ باتیں صرف تنہائی میں کی جا سکتی ہیں.. میری آنکھیں جو یوں بھی سرخی میں ڈوبی رہتی تھیں اور اب لال گلال ہو رہی تھیں جیسے خون میں تر ہوں تو انہیں کوئی نہ دیکھے.. ایک مجھ ایسا عمر کا مارا ہوا شخص روتا ہوا کیسا مزاحیہ لگتا ہے تو مجھے کوئی نہ دیکھے، کوئی ایسا گوشہ ہو بے شک وہاں سے جبل رحمت دکھائی نہ دے کہ وہ پہلی منزل میں نے طے کر لی تھی.. میں اس کھلی جگہ سے لوٹ گیا..

دھریک کی چھاؤں کو خالی کر گیا.. اگرچہ اس کے تنے کے آس پاس کچھ نمی چھوڑ گیا اور یکسر تنہائی کی تلاش میں خیموں کے درمیان جو راستہ تھا، اس کی جانب لوٹ گیا.. خیموں کے درمیان چلنے لگا..

راستے میں وہی پٹھان اماں جی بدستور اُسی کیفیت میں اُسی حالت میں کھڑی ہیں، اوڑھنی سینے سے بلند کر کے نیلی آنکھوں کے آنسو خشک ابھی تک ہونے کا نام نہ لیتے تھے.. پشتو میں سوال کرتی، اقرار کرتی.. اپنی تمناؤں اور آرزوؤں کی فہرست پیش کر رہی تھی.. ان کے قریب سے گزرتا ہوا ان کی مکمل سپردگی اور انہماک کی کیفیت اور وجدان سے متاثر ہو کر جانے میں نے کیوں گزرتے گزرتے اردو میں کہا "اماں جی جو مانگنا ہے مانگ لو.. تجیؒ نے کہا تھا کہ یہ دعاؤں کی قبولیت کا لمحہ ہے."

ان پٹھان اماں جی نے دعائیں اور فریادیں یکدم منقطع کر دیں.. سینے سے بلند ہاتھوں پر اوڑھنی پھیلائے انہوں نے مجھے.. میری سرخ آنکھوں کو دیکھا اور میرے گرد ہو گئیں.. پشتو میں جانے کیا کیا مجھ سے کہنے لگیں.. درخواستیں کرنے لگیں، التجائیں کرنے لگیں اور مجھے بدقسمتی سے اپنے ہی وطن کی ایک زبان پشتو

سے اگرچہ کچھ قربت نہ تھی لیکن یہ کیا کہ میں جان گیا۔ سمجھ گیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں۔ مجھ سے کیا مانگ رہی ہیں جیسے میری پنجابی اور ان کی پشتو کو ڈاچی والے نے ایک ہی زبان میں ڈھال دیا ہوا اور وہ کہہ رہی تھیں "اے سرخ آنکھوں والے شخص تم میری سفارش کردو۔ میں جو کچھ مانگ رہی ہوں، اس کی حمایت کر دو۔ تم میرا ساتھ دو اور اس سے کہو کہ یہ مائی جو کچھ مانگتی ہے اسے دے دو۔" اور وہ پٹھان مائی جیسے مجھے الفت سے دیکھتی تھی، اس لمحے میری ماں کا روپ اختیار کر گئی۔۔

میری ماں بھی حج پر آئی تھی۔

ظاہر ہے اس میدانِ عرفات میں انہوں نے بھی دعائیں مانگی تھیں۔۔

اور جیسے جب بھی میرے لب کھلتے تھے اول حرفِ دعا میرے بچوں کے لیے ان لبوں پر آتے تھے تو میری امی کے تادمِ مرگ پیلے اور نازک ہونٹوں پر بھی یہاں جو دعا آئی تھی اس میں میرا نام ہوتا ہوگا۔ میری خوشی اور خوشحالی کی دعا جاری ہوتی ہوگی جس کی برکت سے میں آج ہرا بھرا تھا، جانا پہچانا تھا۔ شاید اسی مقام پر جہاں یہ پٹھان اماں جی جھولی پھیلائے کھڑی ہیں، یہیں میری اماں جی نے بھی دامن پھیلایا ہو۔۔

تو میں اپنی ماں کی درخواست کیسے رد کر سکتا تھا۔ ان کے برابر میں کھڑا ہو گیا اور ہاتھ اٹھا دیئے۔۔ وہ جو کچھ بھی مانگتی رہیں۔ طلب کرتی رہیں۔ فریاد کرتی آنسو بہاتی رہیں، میں "آمین آمین" کہتا رہا۔

میں اس میدان سے دھریک کے درخت سے اور جبلِ رحمت کے نظارے سے جدا اس لیے ہوا تھا کہ کہیں میں تنہا ہو جاؤں۔ ان بے حساب نیر بہاتے لوگوں سے الگ ہو کر تنہا ہو کر دیکھوں تو سہی کہ تب کیا گزرتی ہے۔۔

اور مجھے ایک کونہ مل گیا۔۔

یہاں کوئی اور نہ تھا۔۔

کوئی اور مجھے دیکھتا نہ تھا۔۔

اب جھولی پھیلانے کی عادت ہو گئی تھی۔ چنانچہ میں نے اپنے احرام کو سینے سے بلند ہاتھوں پر پھیلا لیا۔۔

میرے سامنے جبلِ رحمت نہ تھا۔ ایک شکستہ دیوار تھی۔ مٹی کے ڈھیر تھے۔۔ ایک چاردیواری تھی اور اس چاردیواری میں اینٹیں اکھڑ جانے سے ایک چھوٹا سا شگاف ظاہر ہوتا تھا۔ اور اس شگاف میں ایک تصویر تھی جو کبھی دکھائی دے جاتی تھی اور کبھی پوشیدہ ہو جاتی۔۔ اس شگاف میں سے مجھے ایک گورے چٹے رنگ کی صورت کے رخسار اور آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔۔ وہ پتہ نہیں کیسے میری طرح ایک تنہائی کی تلاش میں یہ دیوار پھلانگ کر اندر چلی گئی تھی۔۔ اور واقعی تنہا ہو گئی تھی۔۔ سب سے چھپ کر جانے کونسے اقرار کر رہی تھی اور کیا مانگ رہی تھی۔ کبھی وہ ذرا سی جھکتی۔ گردن خم کرتی تو شگاف خالی ہو جاتا اور جب وہ سیدھی ہوتی تو مجھے اس کے رخسار عرفات کی تپتی ہوئی دھوپ میں تپتے سرخ نظر آتے اور ان پر بہتے دھارے دکھائی دے جاتے۔۔

پتہ نہیں کیوں یہاں وہ یکسوئی حاصل نہیں ہو رہی تھی.. میں کوشش کرتا تھا لیکن محو نہیں ہو رہا تھا.. وہاں اُس کھلی جگہ میں دھریک کے سائے میں جونہی میں نے دامن پھیلایا تھا تو اجنبی، اٹوکھی اور کچھ نہ سمجھ میں آنے والی دعائیں نہ صرف ہونٹوں سے بلکہ کُل وجود میں سے بہنے لگی تھیں. خون میں گردش کرتیں، رگوں شریانوں میں گھلتیں لبوں پر آتی گئی تھیں.. یہاں وہ معاملہ نہیں تھا. شاید مجھے دھریک کا وہ سایہ چھوڑنا نہیں چاہیے تھا وہاں ڈور ہل گئی تھی، اس سے کٹ کر یہاں آن کھڑا ہوں تو دوبارہ جڑ نہیں رہی تھی.. میں وہاں ''ی'' تک پہنچ رہا تھا اور یہاں ''الف'' سے شروع کرتا تھا. پھر بھی اٹک جاتا تھا. اگر حرف ''الف'' ہی رواں ہو جاتا تو کافی تھا کہ اکو الف ہی درکار ہوتا ہے. پھر ''ب'' کی کوئی خبر نہیں رہتی چنانچہ میں نے کیا یہ کہ پہلے رومین کی دعائیں پھر سے ٹیپ ریکارڈر پر چلا دیں اور پھر مجھے نماز کے علاوہ جو کچھ عربی میں آتا تھا وہ پڑھنے لگا.. یہ ذخیرہ بھی ختم ہو گیا تو پھر بھی اُم کلثوم کے نغمے میرے اندر گونجنے لگتے، صرف اس لیے کہ زبان تو عربی تھی بے شک اس کے اندر کہیں نہ کہیں عاشقانہ اور فاسقانہ اجزا بھی شامل ہوں گے.. اور پھر کبھی لفظ اور معانی کی پہچان سے پرے مصری قرأت کا انداز بدن کے گنبدِ بے در میں ایک پرندے کی مانند پھڑپھڑانے لگتا.. آس پاس کوئی بھی نہ تھا جسے دیکھ کر میں متاثر ہوتا اور اپنے اوپر رقت طاری کرتا سوائے چار دیواری کے شگاف کے اندر نظر آتے رخساروں کے جن پر بہتی دھاریں سورج کے شہر عرفات کی کرنوں سے منور ہو کر میری نیم وا آنکھوں کو چندھیاتی تھیں.

کچھ دیر یونہی کٹا ہوا کھڑا رہا.. میں نے کچھ بھی کہنا ترک کر دیا.. اپنے آپ کو ہر دعا.. ہر خواہش سے خالی کر دیا کہ اگر اس نے مجھے بھرنا ہے تو بھر دے.. دلوں کے حال جانتا ہے تو منت سماجت زبانی ضروری ہے کیا. بھر دے.. جھوٹی بھر دے..

کچھ دیر بعد.. شاید دھوپ کی تمازت نے اثر کیا. شاید میری نظروں سے اوجھل عرفات کے طول و عرض میں سفید پوشوں کی گمن کیفیت تھی جس نے مجھے اپنے آپ میں شامل کر لیا.. ان کے آنسو تھے جنہوں نے مجھے بھگو کر جوڑ دیا. ایسے کہ میرا وجود پگھلنے لگا.. میں خاموش کھڑا رہا.. لیکن ایک گہرے ارتکاز میں گم.. پگھلتا رہا.. اور جب سب کچھ پگھل گیا تو ایک سانچے میں ڈھلنے لگا.. اپنا ناک نقشہ.. شکل شباہت کھو بیٹھا.. پگھل جو گیا تھا.. اور سانچے میں ڈھل کر جب ظاہر ہوا ہوں تو یہ میں نہ تھا.. کوئی اور تھا.. ایک اور بُت کی صورت میں ظاہر ہونے لگا.. میں اس بُت کے مہاندرے کو پہچان نہیں سکتا تھا کہ میں اسے پہلی دیکھ رہا تھا.. اس بُت کی عادت اور خصلت مجھ سے یکسر جدا تھی..

اس کے اندر کوئی شک شبہ نہ تھا.. بے یقینی کا ایک ذرہ نہ تھا.. اگر ایک ذرہ بھی شک کا ہوتا تو یہ سانچے میں نہ ڈھلتا.. شک کے اس ایک ذرے کی وجہ سے ریزہ ریزہ ہو جاتا..

اس بُت کی پتھریلی آنکھوں میں سے جیسے سنگلاخ چٹانوں میں سے جھرنے پھوٹتے ہیں ایسے بے وجہ

اور بے سبب آنسو پھوٹنے لگے.. وہی آنسو جو بی بی مریم کے مجسمے کی پتھریلی آنکھوں سے کبھی کبھار پھوٹتے ہیں..

یہ آنسو نہ تو شرمندگی کے تھے.. نہ گناہوں پر ندامت کے لیے نہ کسی ثواب کی خاطر.. اور نہ قبر کے عذاب سے ڈر کر.. یا دوزخ سے نجات کی سفارش کے طور پر.. آنکھوں سے بہتے تھے محض تشکر اور تھینک یو ویری مچ کے گیلے سندیسے تھے.. اور ان کے ساتھ ہی بُت کی پتھر زبان میں بھی جان پڑ گئی اور میں باتیں کرنے لگا.. ایک دیوانے کی مانند کبھی کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بلند آواز میں.. اور کبھی ایک راز دار سرگوشی میں ہولے ہولے اور کبھی میں چُپ ہو جاتا اور بُت کے اندر جو چپ تھی وہ ٹوٹ جاتی اور باتیں وہاں ہونے لگتیں..

"اے اللہ بے شک آپ میری جگہ دیکھ رہے ہیں.. اور میری بات سن رہے ہیں.."

سن رہے ہیں ناں؟.. بے شک اس لمحے پچیس لاکھ لوگ آپ کو اپنی اپنی بات سنا رہے ہیں لیکن آپ تو قادر ہیں، ہم سب کی الگ الگ باتیں سننے پر.. ایسے کہ ہر کوئی یہی سمجھتا ہے اور یہی حقیقت ہے کہ بس وہ صرف میری سن رہا ہے..

"اور آپ میرا ظاہر اور باطن سب جانتے ہیں اور میرے وجود میں سے آپ پر کوئی چیز پوشیدہ نہیں.."

اسی لیے تو میں اس الگ تھلگ تنہائی میں آیا ہوں کہ کوئی اور نہ سن لے..

میرا ظاہر اور باطن ایک نہیں ہے.. تھوڑی سی کوشش کبھی کبھار کرتا ہوں کہ ایک رہنے پر نہیں رہتا.. انہیں ایک رکھنا تھا تو دنیاوی مصلحتوں سے تم نے مجھے کیوں زنجیر کیا.. اولاد اور بیوی کا ڈر رہتا ہے.. معاشرے کا خوف ہوتا ہے.. خشونت بھری نظروں والے.. لمبی داڑھیوں اور ماتھے پر محرابوں والے بھی مجھے اتنا ڈراتے ہیں.. آپ سے الگ کر دیتے ہیں.. آپ کے دائرے سے خارج کر دیتے ہیں.. آپ تو ان کی بات نہیں مانتے ناں.. میں یہ بھی اقرار کرتا ہوں کہ میں ایک بہانہ ساز ہوں.. دوش میرا بھی ہے.. بہت سی قباحتوں کو چھوڑ سکتا ہوں، پر بہانے بناتا ہوں اور نہیں چھوڑتا.. صرف رحیم اور کریم کی تسبیح کرتا رہتا ہوں.. آپ کی باقی جو صفات ہیں ان سے جان بوجھ کر چشم پوشی کرتا ہوں کہ پھر مجھے احکام کا تابع ہونا پڑے گا.. ابونواس کو قاضی القضات نے کہا تھا ناں کہ اے ابونواس تجھ ایسا شاعر تو کبھی نہ ہوگا پر تجھ میں قباحتیں اتنی ہیں کہ کبھی بخشا نہ جائے گا اور ابونواس بھی میری طرح کا بہانہ ساز تھا، کہنے لگا.. اے قاضی تیری بخشش کے بارے میں تو کچھ شبہ ہو سکتا ہے، پر میری بخشش میں کچھ شبہ نہیں کہ وہ تو روز حشر میرا منتظر ہوگا کہ ابونواس آئے تو میں مکمل ہوں.. اُس جیسے بدترین.. شیطان کے راستے پر چلنے والے.. قباحتوں سے بھرے شخص کو جب بخشوں گا تب خلق خدا پکارے گی

سکہ میں واقعی رحیم اور کریم ہوں اور تب میں مکمل ہوں گا..

میں ابونواس جتنی قباحتیں تو اپنے اندر نہیں رکھتا لیکن بہانہ ساز اسی طرح کا ہوں..

''اور میں سختی میں مبتلا ہوں، محتاج ہوں، فریادی ہوں، پناہ کا طلب گار ہوں۔ گناہوں کا اقرار کرتا ہوں۔''

تو سب سے بڑا مصور ہے.. جانتا ہے کہ کون سا رنگ کہاں لگانا ہے.. کس کے سالو کو سرخ رنگنا ہے.. کسے سادے اور سُوسے پیراہن پہنانے ہیں اور کس کے اعمال کی چادر سیاہ لڑانی ہے.. ہم جو سفید احراموں میں ہیں، اب تو نے ان کو کس رنگ میں رنگنا ہے؟.. ہم تو چڑیوں کا ایک چنبہ ہیں، صرف آج کے دن یہاں ہیں، شام سے پہلے پہلے اڑ جانا ہے اور پھر سے اپنی دنیا میں چلے جانا ہے تو آج کونسے رنگ میں رنگ کر واپس بھیجے گا.. بے شک فقیروں کی لوئی سیاہ ہو تو اس پر کوئی دھبہ نہیں لگتا لیکن ہم تو سفید چادریں اوڑھ کر آئے ہیں.. واپس جائیں گے تو ان پر دھبے تو لگیں گے.. کچھ خود لگائیں گے، کچھ لوگ لگائیں گے تو گزارش اتنی ہے کہ اسے مکمل طور پر سیاہ نہ کر دینا، کہ تو سب سے بڑا مصور ہے اور خوب جانتا ہے کہ کونسا رنگ کہاں لگانا ہے..

اور تو سب سے بڑا تخلیق کار ہے..

اور میں تیری پیروی میں ہی کچھ نہ کچھ تخلیق کرنے کا سزاوار ہوں.. یہ جو تجھ سے عرفات میں ملاقات ہے، اسے تخلیق کر رہا ہوں کہ تیرا تراشیدہ بندہ اس عمل سے تیرے قریب ہو جانے کی سعی کرتا ہے.. تجھ جیسا نہیں ہو سکتا پر اس زعم میں مبتلا ضرور ہوتا ہے کہ بے شک ایک چھوٹے سے پیمانے پر ہی سہی میں بھی تو تخلیق کر سکتا ہوں تو اس تکبر کو معاف فرما.. تو اگر تخلیق کرنے والا نہ ہوتا، مجھے تخلیق نہ کرتا تو میں بھی تخلیق نہ کرتا..

اور جو تخلیق کرنے والے ہوتے ہیں تو آپ کے ٹھیکیدار آپ کے نام پر اُن کی گردنوں میں نافرمانی اور کُفر کے طوق ڈال دیتے ہیں اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ.. میتوں کافر کافر آکھدے توں آہو آہو آکھ.. بس یہی لوگ ہیں جو ہمیں سختی میں مبتلا کرتے ہیں، تیرے نام کا پھندا ہمارے گلے میں ڈال کر گلیوں میں گھسیٹتے ہیں.. وہی پھندا جو حلاج کے گلے میں ڈالا گیا تھا.. اور اس پھندے کے نشان میرے گلے پر بھی ہیں..

''میں آپ سے سوال کرتا ہوں ایک مسکین کی طرح... آپ کے سامنے گڑگڑاتا ہوں ایک گنہگار ذلیل کی طرح... اور میں آپ کو پکارتا ہوں جیسا کہ خوفزدہ مصیبت زدہ پکارتا ہے اور جیسا کہ وہ شخص پکارتا ہے جس کی آپ کے سامنے گردن جھک گئی ہے اور جس کے آنسو جاری ہو گئے ہیں۔''

وہ ایک نہیں.. لاکھوں ہیں جن کی گردنیں آپ کے سامنے جھک گئی ہیں اور جن کے آنسو جاری ہو گئے ہیں اور میں اس جھکے ہوئے آبدیدہ صحرا کا ایک ذرہ ہوں اور اس کے باوجود تو اپنے سنگھاسن سے اتر کر صرف ایک ذرے کی دلجوئی کی خاطر.. میرے سامنے آ بیٹھا ہے اور کان لگائے کبھی مسکراتا ہے، کبھی میری سادہ لوحی اور بہانہ سازی پر ہنستا ہے اور کبھی تو قہار اور جبار ہو جاتا ہے.. مجھے قہر اور جبر کی نظروں سے گھورتا ہے کہ میں تجھے معاف کرنے والا نہیں.. بہانے بناتا ہے.. لیکن جو بھی تیری ادا ہو قہر کی ہو یا مہر کی ہو تو صرف میری صرف میری ہی بات سن رہا ہے..

پر کیسے سن رہا ہے..

کیوں سن رہا ہے..

کیسے اپنا گھر کھلا چھوڑ کے.. بے پروا کیے بغیر کہ اس دنیا میں معبودیت کے اور بھی دعویدار ہیں تو کہیں ان میں سے کوئی ایک اس گھر پر قابض نہ ہو جائے، یہ پروا کیے بغیر کیسے میدان عرفات میں کھلی کچہری لگانے آ گیا ہے..

اور تو موجود ہے..

مقابل ہے..

سامنے آ براجمان ہوا ہے..

پچیس لاکھ لوگوں کی عرضیاں وصول کرتا ہے.. ان پر اپنے احکام صادر کر کے قبولیت کی مہریں لگاتا ہے..

ہر ذرے کی فریاد الگ الگ سنتا ہے اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کی خوفزدہ مصیبت زدہ پکار سنتا ہے..

کیسے؟

میں نے اس سفر کے دوران کہیں بھی.. یہاں تک کہ خانہ کعبہ کے گرد طواف کرتے ہوئے بھی.. اور بعد میں زندگی بھر اللہ کی موجودگی کو براہ راست.. آمنے سامنے.. جیسے وہ ایک خیال نہ ہو، ایک ٹھوس وجود ہو.. ایسے کہیں محسوس نہ کیا جیسے حشر کے اس روز جب چار دیواری کے اس شگاف میں نظر آتے سرخ گلال سیب رنگ رخساروں پر بہتے آنسوؤں کو تکتے ہوئے میں نے محسوس کیا..

تو کیا اللہ صرف ایک روز کے لیے اپنے گھر کی آسائش ترک کر کے اس تپتے ہوئے سورج کے شہر میں اپنی مرضی سے چلا آتا ہے یا پچاس لاکھ سینے سے بلند ہوتے ہاتھ مصیبت زدہ اور آفت میں مبتلا محتاج اور فقیر اسے مجبور کر دیتے ہیں کہ ہماری فریاد سننے کے لیے گھر سے نکل.. ہمارے پاس آ..

فرض کیجیے کہ میں اس میدان عرفات میں تنہا ہوتا.. یہ ایک ویران صحرا ہوتا جس میں ایک جھولی پھیلائے ایک تنہا فقیر صدائیں دے رہا ہوتا تو کیا تب بھی وہ اتنا تردد کرتا.. اپنا گھر چھوڑ کر آ جاتا؟

''پریم صراحی عرشوں اتری...''

اور پھر میں نے اپنے اوپر ایک معجزہ طاری کر لیا..

ایک معجزہ تخلیق کر لیا

یہ بے شک ایک گمان تھا.. ایک شبہ تھا.. یونہی اتفاق تھا.. لیکن میں نے اسے اپنے آپ پر طاری ہو جانے دیا..

میں بیان کرتا ہوں.. ذرا دھیان کیجئے گا..

میدان عرفات میں ایک ایسی چار دیواری کے سامنے تنہا گریہ کرتے جب کہ اس کے ایک شگاف میں سے مجھے آنسوؤں سے تر کبھی رخسار نظر آ جاتے تھے اور کبھی لبوں کی ایک نازکی دکھائی پڑتی تھی جو دعاؤں میں تھرتھراتی تھی.. ایک عجب ''سانحہ'' ہوا..

میں بیان کرتا ہوں.. دھیان کیجئے گا..

میری آنکھوں کی سرخی یہ تو اعلان کرتی تھی کہ ان میں سے آنسوؤں کے جھرنے بہت بہہ چکے ہیں اور میں ان کے پار جو بھی دیکھتا تھا، نمی کی ایک باریک پھوار کے پار دھندلاتا ہوا نم آلود دیکھتا تھا.. تو کوئی ایک لمحہ ایسا آیا جب میری آنکھوں پر نمی کی جو ایک جھلی تھی.. ایک پردہ تھا اس پر عرفات کے آسمان پر کسی بادل کی اوٹ میں سے جھانکنے والی سورج کی ایک شعاع.. صرف ایک تنہا اکلوتی کرن اس نم جھلی پر نازل ہوئی.. اور پردے کو شفق رنگ کر دیا.. میری آنکھوں میں ایک انہونی سرخی میں رنگی نمی کی چادر جھلملاتی تھی.. اس کی سرخی میں سے رنگ رنگ کے انار چھوٹتے تھے.. نمی کے ہر ذرے میں سے آتش بازی چھوٹتی تھی.. وہ کوئی ایک ایسا خاص زاویہ ہوگا جس زاویے پر وہ ایک شعاع اتری اور سامنے میری سرخ آنکھوں کی جو تنی تھی.. ایک جھلی ایک چادر نمی کی تھی اور وہ اس پر نازل ہوئی.. اور میں نے واقعی اپنا سانس روک لیا.. کہ کہیں یہ زاویہ بدل نہ جائے.. میں نے اس لمحے شاید اپنے آپ کو قائل کر کے اپنے آپ کو فریب دے کر اس یقین میں مبتلا کیا کہ سورج کی وہ ایک شعاع جس نے نمی کی اس جھلی پر اتر کر اسے تھرتھراتی خون رنگ سرخی میں بدل دیا تھا تو یہ محض اتفاق نہ تھا.. ایک اشارہ تھا..

S

اور میں خوب جانتا تھا.. اس میں کچھ شبہ نہ تھا کہ یہ شعاع صرف میری آنکھوں کے آگے جو نم جھلملی تھی، بس اسی پر اتری تھی..

ایک اشارہ تھا کہ آنکھیں جھپکنے سے پیشتر.. اس سے پیشتر کہ یہ جھلملاتی سرخ نم چادر آنکھ جھپکنے سے تحلیل ہو جائے اور اس نے ہو جانا تھا.. جو کچھ مانگنا ہے مانگ لو.. اس لیے میں نے آنکھیں نہ جھپکیں.. کہیں آج تک میرے تجربے میں نہ آنے والی یہ سرخ جھلملاہٹ.. نہ یہ خون رنگ تھی.. نہ اس میں شفق کی سرخی تھی.. نہ حیا کی سرخی تھی اور نہ کل کائنات میں جتنے بھی گل ہیں اور سرخ ہیں، ان کی سرخی تھی... کہ مصور نے یہ جو رنگ لگایا تھا، اس سے پیشتر اس نے اور کہیں نہیں لگایا تھا..

ایک آنکھ کے جھپکنے کے دوران کیا کچھ مانگا جا سکتا ہے..

یہ چند لمحوں کا کھیل تھا..

اس کے باوجود یہ لمحہ اتنا طویل ہو گیا کہ میں مانگ مانگ کر عاجز آ گیا، اس کا شکر ادا کرتے کرتے بور ہو گیا اور جب مانگنے کو کچھ بھی نہ رہا تب جا کر میں نے.. یا اس نے جس نے وہ شعاع بھیجی تھی، آنکھیں جھپکائیں اور وہ سرخی میں نہائی ان ہوئی نم چادر تحلیل ہو گئی..

اور تب میں نے دیکھا.. کہ چاردیواری کے شگاف میں سے جو رخسار نظر آتے تھے اور ان کے اوپر جو آنکھیں کبھی نظر آ جاتی تھیں اور اب نظر آ رہی تھیں وہ بھی اسی سرخی میں نہائی نظر آتی تھیں.. بے شک یہ معجزہ میرے ذہن نے تخلیق کیا ہو گا لیکن مجھ سے رخصت ہو کر وہ شعاع ان پر اتر چکی تھی اور سرخی کی وہ جھلی شگاف میں تصویر ہوتی آنکھوں میں جھلملا رہی تھی..

”مزدلفہ میں بھٹکتے ہوئے آہو.. جو سُوئے حرم نہیں جانا چاہتے تھے“

سورج جونہی عرفات پر غروب ہوتا ہے.. اُن ریتلے ٹیلوں اور صحرائی وسعتوں میں روپوش ہوتا ہے جہاں سے احرام پوشوں کے قافلے در قافلے اترے تھے.. تو اسی لمحے پچیس لاکھ دیوانوں کی مانند وہی احرام پوش اس شہر کو چھوڑ جانے کا قصد کرتے ہیں..

ایک اور حشر برپا ہو جاتا ہے..

ابھی جو شہر.. شہر آرزو تھا جس میں وقوف کے بغیر ان کی حیات کا سب سے اہم فریضہ ادا نہیں ہو سکتا تھا۔ سورج غروب ہوتے ہی لوگ اس سے بدکنے لگتے ہیں.. اس سے دور ہو جانا چاہتے ہیں ہر قیمت پر.. جلد از جلد نکل جانا چاہتے ہیں..

میں نے زندگی بھر یک مشت پچیس لاکھ ایسے بے وفا اتنے بے مروت لوگ نہ دیکھے تھے..

جس بستی کو آج بسایا تھا، اپنی آنکھیں اس کی راہوں میں بچھائی تھیں، وہی آنکھیں اب انہوں نے اپنے ماتھے پر رکھ لی تھی.. اُن کی جانب دیکھنے کے روادار نہ تھے.. اس مٹی کا بھی کچھ لحاظ نہ کرتے تھے جس میں ابھی تک اُن کے آنسوؤں کی نمی موجود تھی... وہ اس بستی سے کوچ کر جانا چاہتے تھے..

یہاں تک کہ جبل رحمت بھی ان کے پاؤں نہیں روکتا تھا!

لیکن یہی منشاء تھی، یہی حکم تھا. سورج کے اس شہر کو سورج غروب ہوتے ہی ترک کر دینا تھا.. چھوڑ دینا تھا..

ہم اپنے کوسٹر کے باہر کھڑے ہجرت کے اس عظیم منظر کو دیکھتے تھے.. کوسٹر کے گرد جو ہزاروں سواریاں تھیں، وہ اپنے مقام سے حرکت کرتیں تو ہم بھی حرکت کر سکتے تھے.. اور وہ ساکت کھڑی تھیں، اس لیے باہر کھڑے منتظر تھے..

یوسف شاہ اور سمیرا ایک بس کی چھت پر کھڑے شفق کے رنگوں میں نہائے ہوئے یوں کہ ان کے

سفید احرام بھی ہلکے گلابی ہو رہے تھے.. غروب کا منظر دیکھ رہے تھے اور مبہوت کھڑے تھے..

میں اس لیے نیچے کھڑا انہیں حسد سے دیکھتا تھا کہ بس کی آہنی سیڑھی کو تھام کر اس پر پاؤں جمانا اور پھر چھت تک پہنچنا میرے بے ڈول وجود کے بس میں نہ تھا..

''آ جائیں ابا جی..'' سمیر نے ایک مرتبہ پھر پکارا ''یہاں سے پورا عرفات نظر آ رہا ہے.. بہت زبردست....''

''تارڑ صاحب ہمت کریں جی..'' یوسف نے پھر دعوت دی ''میں اوپر چڑھ سکتا ہوں تو آپ بھی آ سکتے ہیں.. آ جائیے.. اوپر آ کر دیکھیں تو سہی کہ یہاں سے کیسے کیسے نظارے دکھائی دے رہے ہیں..''

تارڑ صاحب ہمیشہ سے نظاروں کے ڈسے ہوئے.. منظر کے گناہ کا ارتکاب کرنے کے لیے ہر دم تیار ایک مرتبہ پھر ہامی بھر لیتے ہیں.. کمر کستے ہیں.. احرام کستے ہیں اور بس کے پچھلے حصے پر آویزاں سیڑھی پر قدم ذرا مشکل سے رکھتے ہیں.. ڈولتے ہیں.. دوسرا قدم دوسری سیڑھی تک لے جانا چاہتے ہیں اور نہیں لے جا سکتے کہ ان کے بے سروپا اور بھاری بدن میں کچھ توازن نہیں.. پھر اپنے قدموں پر ایک پچھل پیری کی مانند پچھلے پیروں پر اُتر آتے ہیں کہ خوش رہو اہلِ چمن ہم سے تو یہ سفر نہیں ہوتا..

ہمارے کوسٹر کے آس پاس جو ہزاروں بسیں، ویگنیں وغیرہ ابھی تک ایک ساکت تصویر تھیں، ان میں جان پڑنے لگی اور وہ حرکت میں آنے لگیں..

ان پچیس لاکھ لوگوں میں جو بے وفا اور بے مروّت ہو چکے تھے، یہ نہیں کہ ہم باوفا تھے اور مروّت والے تھے.. ہم بھی انہی کی مانند عرفات میں پل بھر نہ ٹھہرنا چاہتے تھے..

''اب کہاں جائیں گے حاجی صاحب..'' اپنے کوسٹر کے حرکت میں آتے ہی میں نے سلجوق سے دریافت کیا..

''مزدلفہ.. والد صاحب''

''اور وہاں ہم کہاں ٹھہریں گے؟'' اگرچہ میں جانتا تھا کہ یہ کھلے آسمان والی ایک رات ہے جو آ رہی ہے..

''کسی فٹ پاتھ پر.. کسی میدان میں.. سڑک پر.. جہاں جگہ ملی..''

''لیکن کیوں؟''

اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ کیوں..

''اللہ کے رسولؐ نے سورج کے غروب ہو جانے کا انتظار کیا.. جب سورج کی زردی ختم ہوئی تو آپ اونٹنی پر سوار ہو گئے.. اسامہ بن زید کو اپنے پیچھے بٹھا لیا اور مزدلفہ کی طرف چل دیے.. ہر طرف انسان ہی

انسان تھے اور وہ سب بھی اللہ کے رسولؐ کے ساتھ ہی روانہ ہوئے تھے. بعض کی سواریاں دوڑنے لگیں تو آپ نے منادی کروائی. ''اے لوگو سواریاں دوڑانا نیکی نہیں ہے..''

اللہ کے رسولؐ نے اپنی اونٹنی کی نکیل اس زور سے کھینچی ہوئی تھی کہ اس کا سر کجاوے کو چھونے لگا تھا ''اے لوگو اطمینان سے چلو، آہستگی اختیار کرو.. تیز رفتاری ٹھیک نہیں..''

لیکن کالے خان اطمینان سے نہیں چل رہا تھا.. آہستگی اختیار نہیں کر رہا تھا.. اپنی سواری دوڑا رہا تھا.. شاہراہ سے الگ ہو کر کسی اور راستے پر اپنی اونٹنی دوڑانے لگتا.. کبھی کسی ٹیلے کی اوٹ میں سے ہو کر بقیہ سواریوں کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل جاتا تا کہ ہم کم از کم ایک دو لاکھ زائرین کو پیچھے چھوڑ کر جلد از جلد مزدلفہ پہنچ جائیں اور شب بسری کے لیے کسی آرام دہ فٹ پاتھ یا شاہراہ کا کوئی کنارا انتخاب کر سکیں.

بہت سارے ''کیوں'' اور ''کیسے'' ذہن میں تھے..

.. کہ وہاں کھلے آسمان تلے کسی پہاڑی کی اوٹ میں یا ہزاروں لوگوں کے پہلو بہ پہلو رات کیسے بسر ہوگی.. غسل خانے کہاں ہوں گے.. پانی کہاں سے پئیں گے.. کھائیں گے کیا.. اور جان بوجھ کر اپنی رضامندی سے ہی یہ دربدری اور بے سروسامانی کیوں.. ان سب ''کیوں'' اور ''کیسے'' کے جواب تو مزدلفہ پہنچنے پر ہی ملیں گے.. یا نہیں ملیں گے.. دیکھیں وہاں کوئی جواب ملتا ہے یا ایک چپ ملتی ہے.

ایسا تو نہیں ہوا کہ ہم جو عرفات سے آئے تھے تو وہاں سے آتے آتے ہمیں رات ہو چکی تھی اور شب کی سیاہی میں دور سے ہمیں ایک شہر مزدلفہ کی روشنیاں دکھائی دیتی ہیں اور ہم جان لیتے ہیں کہ منزل دور نیست.. نہیں ایسا نہیں ہوا.. ٹریفک کے الجھاؤ میں پھنسے ہوئے.. رینگتے.. رُکتے.. تا دیر رُک کر پھر حرکت کرتے.. ہم پتہ نہیں کب عرفات سے جدا ہوئے اور کب مزدلفہ میں داخل ہو گئے.. نہ کوئی سرحد عبور کی اور نہ کہیں داخل ہوئے.. کالے خان سے دریافت کیا کہ اے مرد سیاہ مزدلفہ کب آئے گا تو اس نے جواب دیا.. آ چکا..

شب بھی کالے خان ہو چکی تھی.. سیاہ ہو چکی تھی..

لیکن اس شب دیجور کو لاکھوں سٹریٹ لیمپ اور سپاٹ لائٹس دن کرتے تھے اور ان میں مزدلفہ کہیں تھا جس کی شاہراہوں اور راستوں اور فلائی اوورز اور طویل پلوں پر ہزار ہا بسیں کوچیں، کوسٹر، کاریں، ٹریلر دیوانے ہو رہے تھے.. انہیں پارکنگ کے لیے جگہ نہ ملتی تھی.. فل لائٹس کے ساتھ ایک ایسے شہر میں بھٹکتے تھے.. دھاگے سے بندھی ایک بھڑ کی مانند گھمن گھیریاں کھاتے تھے.. ایمزن کے گھنے جنگلوں پر اُڑتے ایک ایسے جہاز کی مانند جس کا پٹرول ختم ہونے کو ہے اور اسے لینڈ کرنے کے لیے جگہ نہ مل رہی ہو.. ایک ایسے شہر

میں..اور یہ کیسے ایک شہر ہو سکتا ہے کہ جس میں کوئی گھر نہ تھا..کوئی چھت کوئی آرام گاہ نہ تھی..کچھ بھی نہ تھا سوائے آسمان کے..اور یہ ناہنجار اور ظالم فلک ایسا تھا کہ اپنے تلے کہیں ٹھہرنے نہ دیتا تھا..حاجی باباز کی سواریاں یوں بے قابو ہوئی پھرتی گھومتی تھیں جیسے ان سب کی بریکیں فیل ہو گئی ہوں..

یوں بھی رُکتے تھے تو کوئی رُکنے نہ دیتا تھا..

فلائی اوورز کے آس پاس جو میدان ہوا کرتے تھے وہاں ہجوم ہی ہجوم تھے..کہیں کوئی جگہ ایک سر کو چھپانے کی بھی نہ تھی..دائیں بائیں مڑنے بھی نہ دیتے تھے..ان ذیلی راستوں کی ناکہ بندی کرتے والے پولیس کے سپاہی جو خود بھی دیوانے ہو چکے تھے، کسی بھی سواری کو رُکنے نہ دیتے تھے..مڑنے نہ دیتے تھے..کوسٹر کی باڈی پر ڈنڈے برساتے تھے کہ چلتے جاؤ..مت رکو..مت بریک لگاؤ..اور میرے دل کو بھی بریکیں لگنے لگیں..تشویش سے رُکنے لگا کہ یااللہ مزدلفہ میں ہم یہ شب کہاں بسر کریں گے..اگر کہیں رُکنے دیں گے تو بسر کریں گے ورنہ کہاں جائیں گے..اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مزدلفہ جائیں گے اور مزدلفہ پہنچ کر بھی چین نہ پائیں گے تو کدھر جائیں گے..

ہم بار بار اُنہی راستوں اور شاہراہوں پر سے گزرتے تھے اور گھوم گھام کر پھر واپس آ جاتے تھے..
کہیں اس دیوانگی میں مزدلفہ کی حدود سے ہی نہ نکل جائیں اور نکلنا بھی نہیں ہے کسی صورت..شب یہیں کہیں بسر کرنی ہے ہر صورت..اور ان پہریداروں اور بسوں اور کوسٹروں پر ڈنڈے برساتے ناتواں سے سپاہیوں کا بھی کچھ دوش نہ تھا..کہ اگر ہر سواری اپنی من مرضی سے رُک جاتی تو ٹریفک کا یہ سیلاب عرفات تک رک جاتا اور لاکھوں لوگ وہیں رات بسر کرنے پر مجبور ہو جاتے..چنانچہ ان ناتواں سپاہیوں کا کچھ دوش نہ تھا جو ڈنڈے برساتے دوہرے ہوتے ہانپتے نڈھال ہو چکے تھے..

کوسٹر میں سوار مسافر..ہمارے ساتھی جو ابھی تک عرفات کے سورج سے تمتمائے ہوئے تھے اور ان سب کی آنکھوں میں گریہ کے آثار ابھی تک سرخی میں تھے..اور ایک دوسرے سے الگ الگ تھے..یوں مخمور تھے، اس گمان میں تھے کہ آج میں نے ہی وہ مئے لاالہ ناب پی ہے جو گراں بھی نہیں تھی وہ سب ہوش میں آ گئے..جب ہر مقام پر..ہر موڑ پر نہ رکنے دیا گیا نہ مڑنے کی اجازت ملی تو ان میں بشمول میرے تشویش کی ایک لہر دوڑ گئی..حاجی باباز فکرمند ہو گئے..

سلجوق ان سب باباز کی نسبت زیادہ فکرمند تھا کیونکہ وہ اس کوسٹر کا انچارج تھا..

''کیوں بھئی کمانڈر..'' یوسف شاہ کے سپید چہرے پر بھی فکرمندی کی سیاہی پھیلی تھی ''تم تو پچھلے برس بھی حج کر چکے ہو تو یہ کوسٹر کہیں رُکے گا نہیں تو ہم مزدلفہ میں رات کیسے گزاریں گے؟''

''سر..'' سلجوق مودب ہوا ''کچھ نہ کچھ ہو جائے گا.''

''کیسے ہو جائے گا کمانڈر؟''

"مگر.. کچھ نہ کچھ ہمیشہ ہو جاتا ہے.." اس نے یوسف شاہ کو تسلی دی اور پھر نہایت تحمل سے ڈرائیور سے گویا ہوا "یار کالے خان کچھ تو کرو. تم تو پورے پندرہ حج بھگتا چکے ہو۔"

"سر آج تو پوزیشن ڈینجرس لگتی ہے.." یہاں تک کہ کالے خان بھی نروس ہو چکا تھا۔ "میں تو پورا علاقہ جانتا ہوں سر.. میں گھومتا گھماتا پھرتا ہوں لیکن مزدلفہ کی حدود میں سے نہیں نکلتا. آپ کو نہیں پتہ کہ ہزاروں ویگنیں اور بسیں مزدلفہ سے نکل کر منیٰ کی حدود میں چلی جا رہی ہیں.. اور پھر توبہ تائب ہو کر واپس آ رہی ہیں..."

: لاکھوں ہیڈ لائٹس جن میں ہمارے کوسٹر کی بھی دو ہیڈ لائٹس شامل تھیں.. سر پھری دیوانگی میں گھومتی تھیں جیسے ایک سرکس میں کرتب دکھا رہی ہوں..

جب ہم تقریباً دو گھنٹے تک.. انہی شاہراہوں اور راستوں پہ بار بار گھومتے.. گھماتے، چکر لگاتے.. کہیں جگہ نہ پاتے.. پہریداروں کے ڈنڈے سہتے.. کہیں نہ رکتے.. بے بسی سے گھومتے رہے تب.. کالے خان نے ایک کرتب دکھایا..

اس نے اپنی آستین میں ترپ کا ایک پتہ جو چھپا رکھا تھا.. پھینکا..

ہم سے آگے ایک اور ہم جیسی مجبور اور لاچار بس تھی جو رکنے کی کوشش میں تھی اور پہریدار اس پر ڈنڈے برسا رہے تھے.. اسے پھر سے متحرک ہونے پر مجبور کر رہے تھے اور اس بس کے پیچھے پیچھے ہم جو چپکے سے چلے آتے تھے، ہمیں وہ پہریدار نہ دیکھتے تھے تو کالے خان نے یکدم کوسٹر کو ایک جھٹکے دار بریک سے ساکت کر دیا اور اس یکلخت جھٹکے کی زد میں آ کر ہمارے سر اگلی نشستوں سے ٹکرا کر ابھی معمول کی حالت میں آنے کو تھے جب کالے خان نے یکلخت بریک سے پاؤں اٹھا کر مڑ کر ہمیں کہا "صاحب.. آپ سپیڈ پکڑو.. اترو اور غائب ہو جاؤ.. اگر شرطہ جو ابھی ادھر ڈنڈا برسانے میں مصروف ہے، ادھر آتا ہے تو کہو کہ ہم کیا کریں، ہمارا ڈرائیور ہمیں چھوڑ کر بھاگ گیا ہے.. سپیڈ پکڑو" یہ کہہ کر کالے خان ایک کالے ہرن یعنی بلیک بک کی طرح جست لگا کر ڈرائیور کی نشست سے الگ ہوا باہر چھلانگ لگائی اور قلانچیں بھرتا غائب ہو گیا..

. ہماری سمجھ میں نہ آیا کہ ہم نے کیا کرنا ہے.. دبکے بیٹھے رہے.. سپیڈ نہ دکھائی اور اس دوران دو تین نوخیز سپاہی اگلی بس کو زدوکوب کر کے اسے چلے جانے پر مجبور کرنے کے بعد.. نہایت غصیلی خصلت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمارے ساکت شدہ کوسٹر کی طرف لپکتے ہوئے آئے.. ہمیں تو نہیں کہ ہم تو ابھی تک اندر دبکے بیٹھے تھے البتہ کوسٹر کی باڈی کو ڈنڈوں سے خوب پیٹا اور جب مارکٹائی کے باوجود یہ کوسٹر ٹس سے مس نہ ہوا تو انہوں نے اندر جھانکا.. اس نیت سے کہ ڈرائیور کی گوشمالی کریں گے، اسے زدوکوب کر کے سبق سکھا دیں گے.. لیکن اندر جھانکتے ہیں تو ڈرائیور کی نشست بھائیں بھائیں کر رہی ہے اور وہاں کوئی نہیں جسے سبق سکھایا جا سکے..

ذرا پریشان سے ہو جاتے ہیں..

اس دوران ایک عربی دان مسافر اپنے حلق میں سے جتنی بھی عربی تھی، اسے خارج کرتے ہوئے نہایت ہی مسکین لہجے میں عرض کرتے ہیں "یا حبیبی.. آپ مدد فرمائیں، ہمارے کوسٹر کا ڈرائیور ہمیں بے یار و مددگار چھوڑ کر کمبخت فرار ہو گیا ہے.. ہم کیا کریں.. پردیسی ہیں، حاجی ہیں، آپ ہی مدد کریں۔"

لیکن ان نوخیز سپاہیوں پر اس فریاد کا کچھ اثر نہیں ہوتا کہ وہ ایسی ہزاروں فریادیں سن سن کر ڈھیٹ ہو چکے ہیں اور سنی ان سنی کرتے ہوئے ڈرائیور کی خالی نشست کے آگے جو ڈیش بورڈ ہے، اس پر ہاتھ مارتے ہوئے چابی تلاش کرتے ہیں تا کہ اسے سٹارٹ کر کے راستے سے ہٹا سکیں.. لیکن چابی تو کالے خان کی شلوار کے نیفے میں اڑسی جا چکی تھی کیسے ملتی.. ابھی وہ چابی کی تلاش میں ڈیش بورڈ کو ٹٹولتے تھے جب اوپر تلے تین چار بسیں ہمارے آگے رکنے لگیں اور وہ پہریدار ہراساں ہو کر انہیں کوستے ہوئے کوسٹر سے اتر کر ان کی جانب لپکے..

وہ کہاں تک.. کس کس کو روک سکتے تھے.. لیکن روکتے رہے۔

ہم نے موقع غنیمت جانا اور اپنے بیگ اور چٹائیاں بغل میں دابے کوسٹر سے چھلانگیں مارتے اترے اور شاہراہ کے کنارے پر جو آہنی حفاظتی جنگلا تھا، اس کے پار جو ذرا سا مختصر سا ریتلا قطعہ تھا، اس پر قابض ہو گئے..

"عرش سے ادھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

اور وہ بھی مزدلفہ میں"

جہاں ہم قابض ہوئے ہیں اُس کا حدود اربعہ ملاحظہ کیجیے کہ شاہراہ کے کنارے ایک آہنی جنگلہ ہے.. اُس کے پیچھے کوئی چار پانچ فٹ چوڑا اور دس بارہ فٹ لمبائی کا ایک جزیرہ سا ہے جس کے پہلو میں سے ایک پستہ قد پہاڑی اُٹھتی ہے اور اُس پر سایہ کرتی ہے.. یہ کوئی ایسا مقام نہ تھا جہاں پندرہ بیس نومولود حاجی اور حاجنیں اطمینان سے رات بسر کر سکیں.. بے شک جڑ کے بیٹھ جائیں تب بھی پہلو بدلنے کی گنجائش کم تھی.. اگر لیٹنے کی کوشش کریں تو پاؤں جنگلے سے باہر سڑک پر آرام کرتے تھے، بہر حال یہ بھی غنیمت تھا بلکہ بے مثل خوش بختی تھی.. یہ جو ٹیلا نما پہاڑی سایہ فگن تھی اُس میں سے کچھ جھاڑیاں لٹکتی تھیں.. چینی ساخت کی دو چار چٹائیوں سے اُس جزیرے کو ڈھک دیا گیا اور ان پر بیٹھ کر ہم نے اپنا قبضہ مکمل کر لیا.. اب ہمیں یہاں سے کوئی بے دخل نہیں کر سکتا تھا.. اور یاد رہے کہ ابھی تک صرف ہمارا کوسٹر تھا جو ڈرائیور کے مفرور ہو جانے کے باعث ساکت کھڑا تھا اور نہ دیگر سواریاں رُکنے کی جسارت نہ کر پاتی تھیں..

ایک نہایت اطمینان بخش اور خوش باش آسودگی ہم سب کے تھکے ہوئے بدنوں میں اُتری کہ بھلے ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کر یہ شب گزر رہے گی لیکن گزر رہے گی تو مزدلفہ کے کھلے آسمان تلے.. بے شک ہمارے سامنے شاہراہ پر شائیں شائیں بھائیں بھائیں شور مچاتی سواریاں چیختی چلاتی کہ ہمیں رُکنے دو فل لائٹس ہمارے چہروں پر ڈالتی مسلسل گزرتی جاتی تھیں اور شاید ریتلی زمین میں سنگریزوں کی چبھن تھی اور ٹیلے میں جانے کیا کیا حشرات رینگتے تھے جن میں بچھو بھی ہو سکتے تھے لیکن کسے پروا تھی، ہم اپنے بیگ گود میں رکھے چٹائیوں پر بیٹھے نظارے کر رہے تھے..

ہمارے ساتھیوں میں ایک سندھی ڈاکٹر صاحب تھے جو قونصلیٹ کے کسی اہلکار کے دور پار کے عزیز تھے اور اپنی معمر والدہ اور بیگم کے ہمراہ حج پر آئے تھے.. کسی سے کچھ بات نہ کرتے تھے سب سے پرے پرے رہتے تھے، سلام کا جواب بھی کچھ ناگواری سے دیتے تھے، وہ بہت جزبز ہو رہے تھے، شکایتیں کر رہے

تھے ''اس بے وقوف ڈرائیور نے گاڑی یہاں کیوں روکی ہے.. یہ کوئی جگہ ہے.. ادھر تو باتھ روم نہیں ہے.. میرے ساتھ خواتین ہیں، یہ کدھر جائیں گی..''

اس پر یوسف شاہ نے دبے لفظوں میں کہا ''جدھر ہماری خواتین جائیں گی سائیں اُدھر آپ کی خواتین بھی جائیں گی.. یہ ادھر ادھر ٹیلے تھوڑے ہیں جہاں یہ جائیں گی.. شکر کریں جگہ مل گئی ہے..''

لیکن ڈاکٹر صاحب بڑبڑاتے رہے.. سب سمجھاتے رہے کہ بھلے سائیں رب کا شکر ادا کرو کہ کالے خان نے یہ کرتب دکھایا ہے ورنہ ہم ابھی تک بھٹک رہے ہوتے لیکن وہ نہ سمجھے.. اور ہمارے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ انہیں مزید سمجھاتے تو اُن کو اُن کے حال پر چھوڑ دیا..

ہمارے اِس موجودہ گروپ میں خاصے معتبر لوگ تھے.. ایک تو ہمارے فیورٹ یوسف شاہ تھے، نہایت دیرینہ اور تجربہ کار سفارت کار.. برما میں پاکستان کے سفیر.. بار بار مجھے رنگون مدعو کرتے کہ آیئے آپ کو بہادر شاہ ظفر کے مزار پر لے چلیں گے اور وہ جب بھی رنگون کہتے تھے، مجھے بچپن میں سنا ہوا شمشاد بیگم کا ایک گانا یاد آ جاتا تھا کہ.. میرے پیا گئے رنگون.. وہاں سے کیا ہے ٹیلی فون، تمہاری یاد ستاتی ہے.. اُن کی بیگم تھیں کسی سوس سکول کی تعلیم یافتہ شاید اور یورپ کی یونیورسٹیوں کی نہایت پڑھا کو طالبہ رہ چکی یقیناً.. انگریزی ایسی ستھری اور نفیس بولتیں کہ شاہ صاحب کو بھی پسینہ آ جاتا.. ہمہ وقت حجاب میں اور تلاوت میں.. ویسے جب بھی وہ ایک دوسرے کو دیکھتے تو ان کے دیکھنے سے کھل جاتا کہ یہ شادی والدین کی مرضی سے ہرگز نہیں ہوئی تھی.. ان کو ایک دوسرے کے پلّے زبردستی نہیں باندھا گیا تھا جیسے ہم بندھے تھے بلکہ انہوں نے خود یہ پلّے محبت سے باندھے تھے..

ایک خاموش طبع فلسفی قسم کے ڈی آئی جی تھے، سفید گھنگھریالے بالوں والے اور ان کی بیگم تھیں جو دفتر خارجہ میں کسی اہم عہدے پر تعینات تھیں کہ سلجوق انہیں دیکھتے ہی جی میڈم کہہ کر مؤدب ہو جاتا تھا.. ان کے سوا سلجوق کے کچھ کولیگ بھی تھے اور ایسے نامعتبر بھی نہ تھے.. جانباز تھا انقرہ میں تھرڈ سیکرٹری.. بول بچن میں بادشاہ اور آنکھ او جھل پہاڑ او جھل اور زاہد تھا.. پل میں یہاں پل میں جانے کہاں اور شدید قنوطی.. ان میں سے کسی ایک نے بھی سفر کے دوران ذرہ بھر شکایت نہ کی تھی.. بس ایک یہ نیم نوجوان ڈاکٹر صاحب تھے جو بڑبڑاتے رہتے تھے اور قدرے بے وقوف تھے..

اب یہاں کھلے آسمان تلے.. جب کہ شاہراہ پر سے گھنی ٹریفک دھوم مچاتی.. ہم پر خاک بلکہ ریت اڑاتی ہماری آنکھوں میں فل لائٹس کے تیز برچھے اتارتی چلی جاتی تھی تو یوسف شاہ کی بیگم انہیں ڈانٹ رہی ہیں ''یوسف.. یہ تم کونسا بیگ اٹھا لائے ہو.. اس میں تو میرا ٹوتھ برش ہی نہیں ہے''

اور شاہ صاحب کھسیانے ہو کر فوراً اٹھتے ہیں، کوسٹر میں جا کر اپنی بیگم کا ٹوتھ برش تلاش کر کے لوٹتے ہیں اور نہایت پیار سے کہتے ہیں ''جاناں کچھ اور..''

اسی لیے تو میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اس قسم کی والہانہ وابستگی والدین کی پسند کردہ لڑکی سے کبھی نہیں

ہوتی.. میں نے ان کو یوں بیگم کے ہاتھوں سرعام محبت سے بے عزت ہوتے دیکھ کر بہت طمانیت محسوس کی کہ میرے رازداں اور بھی ہیں، میں تنہا نہ تھا جو بیگم کی سرزنش پر کورنش بجالاتا تھا اگرچہ ہماری شادی سے پیشتر اگر فریقین کی مرضی دریافت کر لی جاتی تو پھر ہم دونوں ابھی تک کنوارے پھرتے..

''شاہ جی آپ ماشاءاللہ برما میں ایک عزت مآب سفیر ہیں تو یہاں مزدلفہ میں یوں کھلے آسمان تلے ایک چٹائی پر فقیروں کی مانند بے آسرا بیٹھے کیا محسوس کرتے ہیں؟''

''تارڑ صاحب'' شاہ صاحب کے سپید چہرے پر جو کھلنڈرا پن تھا، وہ ایک گہری سنجیدگی میں ڈھل گیا.. وہ آبدیدہ سے ہو گئے ''کیا بتاؤں کہ اپنی اوقات اور حیثیت کو جان کر کیا مزا آ رہا ہے.. یوں فٹ پاتھ پر بے آسرا پڑے ہوئے... بے حیثیت اور لاچار پڑے ہوئے.. قیام کرنا.. ایک شخص کو آسمان سے اُتار کر زمین پر لے آتا ہے کہ تم دراصل یہ ہو.. تمہاری کچھ حیثیت نہیں ہے... بتا نہیں سکتا کہ کیسا مزا آ رہا ہے.'' یہ کہہ کر شاہ صاحب آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے اور تسبیح اور تلاوت میں مشغول ہو گئے اور اگلی سویر ہم نے انہیں اسی حالت فراموشی میں غرق دیکھا.

اور ہاں عرفات کے راستے میں اُن کی بیگم نے نہایت معصومیت سے ایک بچگانہ عقیدت سے کوسٹر کے باہر جو خشک بھوری پہاڑیاں گزرتی تھیں اُنہیں دیکھتے ہوئے شاہ صاحب سے پوچھا تھا ''یوسف.. کیا یہ پہاڑیاں بھی اُنہی زمانوں کی ہیں جب ہمارے حضورؐ یہاں آئے تھے اور ان میں چلے تھے؟''

یہ سوال اگر کوئی اور پہاڑیوں کے بارے میں پوچھا جاتا تو کتنا بے وقوفانہ ٹھہرتا کہ پہاڑیاں تو وہی رہتی ہیں بدلتی کہاں ہیں.. لیکن ان پہاڑیوں کے بارے میں پوچھا گیا.. یہ سوال اُلفت کی شدت کی بے یقینی سے جنم لے رہا تھا کہاں میں کہاں یہ مقام اللہ اللہ کہ میں اُن پہاڑیوں کو دیکھتی ہوں جن میں کبھی میرے رسولؐ چلے تھے.. یہ وہی گزرگاہیں تو نہیں ہو سکتیں..

یہ جگہ جہاں یوسف شاہ نے تو اپنے گیان دھیان کے لیے جگہ بنا لی تھی، مختصر بہت تھی.. یہاں جتنی گنجائش تھی، اُس سے دوگنے افراد اس میں سمٹے جُڑے بیٹھے تھے.. اس لیے کچھ لوگ مطمئن نہ تھے اور آس پاس جائزہ بھری نگاہیں دوڑاتے تھے کہ کیا کہیں اور کچھ امکان ہے.. تو انہیں ایک امکان دکھائی دیا..

سُمیر نے شاہراہ کے پار اُٹھتی ہوئی ایک ویران بھوری بلندی پر نگاہ کی ''ابا.. آپ یہاں ٹھہرو.. ہلنا نہیں یہاں سے.. میں اور بھائی ذرا چیک کر کے آتے ہیں.. ذرا کوہ نوردی کرتے اُس سامنے والی پہاڑی پر چڑھتے ہیں شاید وہاں کسی گھاٹی میں یا اوپر کوئی ایسا مقام ہو جہاں ہم آرام سے رات بسر کر سکیں..''

وہ دونوں اور ان کے ہمراہ جانباز اور زاہد بھی اٹھے اور سڑک کو پار کرنے لگے.. اور میرا دل دھڑکا کہ یہ بچے سڑک کیسے پار کریں گے.. جیسے میرے اباجی جب کہ میں پچپن برس کا ہو چکا تھا، سڑک پار کرتے ہوئے میرا ہاتھ تھام لیتے تھے کہ بیٹے جلدی نہ کرو.. دائیں بائیں دیکھ لو.. میری انگلی نہ چھوڑنا.. اور میں ان کی سادگی پر مسکراتا تھا.. میرے بچوں کو بھی اگر علم ہوتا کہ میرا دل دھڑکتا ہے کہ وہ کیسے سڑک پار کریں گے تو وہ بھی میری

سادگی پر مسکراتے..

سڑک پار کر کے وہ نیم روشن بھوری پہاڑی پر چڑھنے لگے..

اس دوران سب چپ تھے.. اپنے اپنے دھیان میں تھے اور واحد احتجاجی آواز شکائتی ڈاکٹر کی تھی "یہاں کہاں اُتار دیا ہے اُس بدتمیز ڈرائیور نے.. میں شکایت کروں گا واپس جا کر.. اسے نوکری سے برخواست کروا دوں گا.. باتھ روم نہیں ہے.. مجھے پیاس لگی ہے اور پانی نہیں ہے.. کھانا کہاں سے کھائیں گے.. کیسا بدتمیز ڈرائیور ہے.. پتہ نہیں کہاں ہے.."

اور معلوم یہ ہوا کہ بدتمیز ڈرائیور.. کالے خان.. بے شک سفیر صاحب یا قونصل جنرل صاحب وغیرہ تو برخواست ہو سکتے تھے وہ نہیں ہو سکتا تھا تو وہ ہرگز فرار نہیں ہوا تھا.. کوسٹر سے اُتر کر ادھر اُدھر قلانچیں بھر کر فوری طور پر واپس آ گیا تھا اور سب سے پچھلی نشست پر متوازی ہو کر لیٹ گیا تھا اور جب پولیس والے کوسٹر میں شور مچاتے داخل ہوئے تھے تو وہ کالا شاہ کالا خدا کا بندہ پچھلی نشست کی تاریکی میں دراز خراٹے لے رہا تھا..

سمیر اور اس کے کوہ نورد ساتھی کچھ دیر بعد واپس آ گئے..

"چلو اباجی.."

اباجی نے فوراً اپنی چٹائی سمیٹی.. اپنا بیگ سنبھالا جو فوراً سمیر نے چھین لیا کہ اباجی چڑھائی بہت ہے.. اس بوجھ کے ساتھ اوپر تک پہنچنا ممکن نہ ہوگا.. اور میں نے کچھ احتجاج نہ کیا کہ بیٹا میں متعدد بار اس سے کہیں بلند اور دشوار بلندیوں کو عبور کر کے چوٹی تک جا پہنچا ہوں یہ کیا بلندی ہے..

ہمارے رخصت ہونے پر.. جگہ خالی کرنے پر.. یقیناً وہاں براجمان ساتھیوں نے شکر کیا ہوگا کہ اب وہ اپنے پاؤں پسار سکتے تھے..

بس یوسف شاہ بے دھیان رہے.. ایک پٹھان مہاتما بدھ کی مانند دھیان میں مگن رہے..

آہنی جنگلے کو ٹاپ کر سڑک کے پار جاتے ہوئے بجائے اس کے کہ میں بچہ لوگ کا ہاتھ تھام کر انہیں پار لے جاتا، وہ میرے دونوں ہاتھ گرفت میں لے کر ابھی تک رواں ٹریفک کے ہجوم میں سے جگہ بناتے مجھے پار لے گئے..

پار ایک بھوری پہاڑی تھی.. کچھ جھاڑیاں تھیں.. کچھ نشیب و فراز تھے اور کہیں چٹانیں تھیں.. میں سانس سنبھالتا ہولے ہولے چڑھنے لگا جب کہ سمیر سلجوق جانباز اور زاہد نوخیز بندروں کی مانند رات کی تاریکی میں بھی دیکھتے اوپر جانے لگے.. جھاڑیوں سے اُلجھتا کہیں سنگریزوں پر پھسلتا.. چٹانوں پر ہاتھ رکھ کر سنبھلتا بالآخر میں بھی اوپر پہنچ گیا..

اور اوپر ایک اور شاہراہ تھی.. بل کھاتی پہاڑیوں میں سے اُبھرتی.. جانے کہاں سے آتی اور کہاں جاتی.. اگرچہ ایک شاہراہ تھی لیکن اُس کے کنارے تقریباً بے آباد تھے.. یہاں وہ ہلچل اور گہما گہمی نہیں تھی، کسی

حد تک سکون تھا۔۔

اُس شاہراہ کے کنارے۔۔ جہاں وہ ایک بھنور سا بناتی گزرتی تھی۔۔ جس پہاڑی پر چڑھ کر ہم یہاں تک پہنچے تھے وہاں ایک کھلی جگہ تھی۔ مکمل طور پر بے آباد تو نہ تھی۔۔ ریت پر چند عرب خواتین محوِ خواب تھیں اور چند عرب حضرات بے خبر نیند میں مدہوش تھے۔۔ان کی سواری ایک کاروان تھا جسے وہ یہاں پارک کر کے اُس کی اوٹ میں سو رہے تھے۔۔

ہم ہندی اور پاکستانی لوگوں نے تو حج کو ایک وبالِ جان بنا رکھا ہے۔۔ ہر دم خوفزدہ رہتے ہیں کہ یہ رُکن شاید پورا نہیں ہوا۔ وہاں نمازیں نہیں پڑھیں۔۔ شیطان کو کنکریاں مارتے ہوئے ایک کنکری نہیں لگی۔ ایک بال گر گیا ہے۔۔ پاؤں تلے ایک چیونٹی آ گئی ہے۔۔اب تو دم دینا ہوگا۔۔ایک بکرا قربان کرنا ہوگا لیکن عرب برادران اسے روزمرہ کی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات میں سے ایک اور واقعہ سمجھتے ہیں۔ جیسے وہ بہت سی بیویوں کے شائق ہوتے ہیں۔ سمندر کنارے چٹائی بچھا کر روسٹ چکن اور پلاؤ نوش کرتے ہیں ایسے ہی وہ حج کرتے ہیں۔۔

منیٰ کو ذرا سا ہاتھ لگاتے ہیں۔ عرفات میں وقوف کرتے ہیں اور پھر مزدلفہ میں حاضری لگوا کر گھروں کو لوٹ جاتے ہیں۔۔

شاید مکہ اور مدینہ سے جو لوگ جتنے دور ہوتے ہیں، اتنے ہی ان کے دعوے اور شبہے طویل ہوتے ہیں۔

اور جو جتنے قریب ہوتے ہیں، گھر بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں، حاضری پر یقین رکھتے ہیں۔۔ حاضری کے رجسٹر پر اندراج کرنے کی خاطر ہلکان نہیں ہوتے۔۔

یہ۔۔ جہاں ہم پہنچے تھے ایک پرفضا مقام تھا۔۔

بے شک بل کھاتی شاہراہ پر سواریاں گھومتی ہوئی۔ نشیب میں سے نمودار ہوتی ہوئی آتی تھیں لیکن ہجوم نہ تھا۔

یہاں جگہ جو بلندی پر تھی۔۔ ریت اور تنہائی میسر تھی۔۔

یہ عرش پر اک مکان تھا جو ہمیں مل گیا تھا۔۔

یہاں ہوا صاف اور صحرائی تھی کیونکہ مزدلفہ میں گھوں گھوں کرتا پاگل ہو چکی ٹریفک کا شور اس بلندی پر کم پہنچتا تھا۔۔

ایک گوشہ سا تھا، الگ تھلگ۔۔ ایک مختصر جزیرہ ریت کا۔۔ اور ایک شاہراہ نیچے سے گھومتی گھماتی آتی تھی اور اُس کے کناروں سے لگ کر گھومتی ہوئی نکل جاتی تھی۔۔

یہ ایک معلّق سا مقام تھا۔۔

کارواں کی اوٹ میں سوئے ہوئے زائرین سے ذرا آگے چند پتھر تھے، پھر بھورے رنگ کی سنہری

ہوئی کچھ جھاڑیاں تھیں اور یہی آخری کنارا تھا جہاں کھڑے ہو کر جھانکتے تو نیچے سڑک کے کنارے کھڑا ہمارا کوسٹر ویران نظر آتا تھا اور اُس سے ذرا آگے ٹیلے کے نیچے ہمارے بقیہ ساتھی آباد تھے اور ان میں شاہ صاحب اپنے گیان میں گم صاف نظر آتے تھے..

اِس شاہراہ پر جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں، ٹریفک بہت کم تھی.. کوئی بس یا ویگن چڑھائی چڑھتی ہولے ہولے بلند ہوتی یکدم ہماری سطح پر آتی تو اُس کی رفتار تیز ہو جاتی اور وہ ایک زناٹے سے گزر کر گم ہو جاتی.. بس یہی دھڑکا لگا رہتا کہ کہیں کوئی سواری گھومتی ہوئی بے قابو نہ ہو جائے اور ہمارے گوشے پر نہ چڑھ آئے.. اُس گوشے میں ہمیں آرام بہت اس لیے بھی تھا کہ کاروان کے سائے میں استراحت فرماتے چند زائرین کے سوا آس پاس کوئی نہ تھا.. پچیس لاکھ حاجیوں میں سے یہی دو چار تھے جو نظر آتے تھے ان کے سوا کوئی ایک فرد بھی دور دور تک دکھائی نہ دیتا تھا..

اور یہ رات کی بات ہے..

مزدلفہ کی رات کی بات..

ہم نہایت آرامدہ بستر تیار کر چکے تھے.. چینی چٹائیاں اور اُن کے اوپر نرم کمبل ٹرے بے شک گدے کے طور پر استعمال کر دیا رضائی کے طور پر اوڑھ لو..

ظہر اور عصر کی نمازیں ملا کر پڑھنے کے بعد سوچا کہ اب کیا کیا جائے.. میں ایک بار پھر پہاڑی کے کنارے تک گیا.. اب ہمارا کوسٹر تنہا نہ تھا دو تین بسیں بھی وہاں رُک چکی تھیں.. ہمارے ساتھیوں کی بسائی ہوئی چھوٹی سی بستی تاریکی میں ہو گئی تھی، سوئی ہوئی لگتی تھی لیکن شاہ صاحب جاگ رہے تھے..

ہوا میں ٹھنڈک تھی.. اور پہاڑی کی ڈھلوان پر جو جھاڑیاں تھیں وہ کسی ایک تیز نشیب میں سے اٹھتے جھونکے کی زد میں آ کر ذرا حرکت میں آتیں اور پھر ساکت ہو جاتیں.. میں ایک بیان میں نہ آنے والی آزادی اور خوشی کو اپنے پورے بدن میں محسوس کر رہا تھا.. منیٰ سے عرفات اور پھر مسجد نمرہ تک کا پرہجوم حکم پیدل سفر.. سارے دن کی صعوبت کے باوجود بدن تر و تازہ اور آزاد تھا.. یہ ایک چھوٹے سے معجزے سے کم نہ تھا کہ مزدلفہ میں ایک بلندی میں اُس شب یکسر تنہا کھڑا تھا.. اگرچہ لاکھوں لوگ اسی شب میں سانس لیتے تھے لیکن وہ اوجھل تھے اور میں تنہا تھا..

میں کنارے سے اتر کر اپنے گوشے کے قریب شاہراہ کے کنارے آ گیا.. ٹریفک اب بھی جاری تھی.. کوئی ایک ویگن یا بس گھومتی ہوئی اوپر آتی اور دائیں جانب ایک خالی جگہ نظر آنے پر بریکیں لگاتی آہستہ ہونے لگتی اور پھر ہیڈ لائٹس کی زد میں ایک کاروان.. کچھ خوابیدہ زائر اور کچھ ابھی تک جاگتے ٹہلتے زائر نظر آنے پر وہ اپنی رفتار پھر سے تیز کر کے آگے نکل جاتی.. ان میں سوار حاجی بابا ہمیں یوں آسودہ حال.. چٹائیوں پر استراحت فرماتے.. سیاحوں کی مانند ٹہلتے دیکھ کر یقیناً جل جل کر راکھ ہوتے تھے کہ ہم شاد و آباد ہو چکے تھے اور وہ ابھی سفر میں تھے..

"نکلے کنکریوں کی تلاش میں"

میں بھی واپس ہوا اور اپنی چٹائی پر لیٹ کر اپنی خوش بختی کا سوچ کر مسکرانے لگا..

میں استراحت فرما تا تھا اور سلجوق اینڈ کمپنی دھر ادھر نوافل ادا کرنے میں مگن تھی.

شاہراہ کے پار ایک اور پہاڑی اٹھتی تھی اور اس کی گھاٹیوں اور کھائیوں کے اندر جو تاریکی معلق تھی..اس میں تھوڑی دیر کے بعد مجھے کبھی کبھار شائبہ سا ہوتا کہ کچھ ہے جو حرکت کرتا ہے..کچھ سائے ہیں جھکے جھکے سے..جیسے کسی گہرے سیاہ قدیم جنگل میں..اس کی سیاہ رات میں کچھ قدیم جانور حرکت کرتے ہوں..

پہاڑی پر کیا ہے جو حرکت کرتا ہے اور کیوں ہے اور جھکا جھکا سا کیوں ہے..

بہت دھیان کرنے پر بھی مجھے کچھ سجھائی نہ دیا کہ کیا ہے

پھر شاہراہ پر گھومتی ہوئی قدرے بے قابو اور پارکنگ نہ ملنے پر خصیلی ہو چکی ایک کوچ اوپر آئی تو اس کی ہیڈ لائٹس نے بھی قدرے بے قابو ہو کر اس سیاہ پوش پہاڑی کو پل بھر کے لیے اپنی تیز روشنی سے منور کر دیا..اس کا بوٹا بوٹا..پتھر پتھر عیاں ہو گیا اور کیا نظر آیا کہ وہاں درجنوں کی تعداد میں سفید سفید دھبے آہستگی سے حرکت کرتی تھیں..جھکی جھکی..کچھ تلاش کرتیں..کچھ بیٹھی ہوئیں اور پہاڑی کو کریدتی..پتہ نہیں یہ لوگ کیا کر رہے تھے..شاید رات بسر کرنے کے لیے کسی ہموار جگہ کی تلاش میں تھے..یا کسی اور حاجت کو پورا کرنے کی خاطر تنہائی کی کھوج کرتے تھے..کوچ اسی ایک پل کو روشن کر کے گزر گئی اور پہاڑی پھر سے تاریکی میں چلی گئی..

کچھ دیر بعد..جب بہت دیر تک نیچے سے کوئی سواری اوپر نہ آئی اور ہم خاموشی میں رہے اور تاریکی میں رہے تو سلجوق کی آواز آئی "ابا..سوتا نہیں..ابھی تو کنکریاں چننی ہیں کل شیطانوں کو مارنے کے لیے..آپ نے دیکھا نہیں سامنے والی پہاڑی پر کتنے لوگ جھکے ہوئے کنکریاں تلاش کر رہے ہیں.!

"یہ کہاں سے آ گئے ہیں؟"

"اس وقت پورے مزدلفہ میں لاکھوں لوگ کنکریاں جمع کر رہے ہیں..تو نیچے جو لوگ میدانوں میں یا شاہراہوں پر ہیں تو وہاں تو کنکریاں کم کم ہوں گی تو یہ لوگ ادھر آ گئے ہیں..آ جاؤ ابا.."!

میں چونکہ استراحت فرماتا تھا، اس لیے میرا کوئی موڈ نہ تھا اندھیرے میں یوں نابیناؤں کی مانند

بھٹکنے کا اور وہ بھی محض کنکریاں تلاش کرنے کی خاطر" یار کل منیٰ جا کر وہاں سے چن لیں گے۔"

"منیٰ میں تو ابا خیمے ہی خیمے ہیں یا تارکول کی سڑکیں ہیں۔۔ وہاں آپ کو سونے کی ایک ڈلی تو شاید مل جائے، ایک کنکری نہیں ملے گی اور ابا آپ کو پتہ نہیں ہے کہ حکم ہے۔۔ مزدلفہ کی رات میں کنکریاں جمع کرنے کا حکم ہے۔۔ اب آ جاؤ۔"

عجیب حکم ہے، میں نے سوچا۔۔

پھر خیال آیا کہ ادھر جتنے بھی حکم آتے ہیں عجیب ہی آتے ہیں تو اک اور عجیب حکم سہی۔۔ حج کے لیے جتنے بھی احکام تھے اُن کا مجبوراً میں کوئی نہ کوئی جواز تلاش کر لیتا تھا لیکن یہ شیطان کو کنکریاں مارنے والے حکم کے لیے کوئی توجیہہ کارآمد نہ ہوتی تھی۔۔ اور پھر آدھی رات کو اُٹھ کر اُس غریب پر برسانے کے لیے پہاڑیوں میں اور کھائیوں میں کنکریاں تلاش کرنا تو اللہ معاف کرے خاصا مجنونانہ سا فعل لگتا تھا۔ لیکن اب آ گئے ہیں تو تعمیل ایک مجبوری تھی۔۔

اس دوران سلجوق، سمیر، جانباز اور زاہد شاہراہ پار کر کے پہاڑی کے دامن تک جا چکے تھے۔۔۔ اور وہاں بھٹکتی سفید سفید روحوں میں شامل ہو کر اپنا وجود کھوتے تھے۔۔

میں بھی اپنا احرام سنبھالتا ہوا اُٹھا۔۔

اور میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ احرام میں اور رومیوں کے لبادے ٹوگا میں بے حد مماثلت ہے اور اگر کوئی شخص مجھ ایسا ہوتا، تھلتھلی بوڑھی آنکھوں والا ہو تو وہ احرام میں لپٹا ایک سست اور عیاش طبع آدمی ہی لگتا تھا بلکہ بروٹس ہی لگتا تھا!

بروٹس اس لیے بھی کہ اگلے روز جب وہ شیطان کو پہلی کنکری مارنے کے لیے ہاتھ بلند کرتا ہے تو کسی اور کو سنائی دے یا نہ دے، اُسے صاف سنائی دیتا ہے کہ پتھر کا شیطان اُس سے شکایت کرتا ہے کہ۔۔۔ یُو ٹو بروٹس!

میرے بیٹے جو حج کے دوران میرا خیال رکھتے رہتے، ہر آڑے وقت پر میرے کام آتے تھے، صرف عبادت کے دوران مجھ سے لاتعلق ہوتے تھے وہ محض چند کنکریوں کی خاطر مجھ سے غافل ہو گئے۔۔ نہایت انہماک سے کنکریاں ڈھونڈنے لگے۔۔

یعنی ابا جی اپنی جگہ۔ لیکن کنکریاں اپنی اپنی۔۔

اب میں ایک نابینا کی مانند۔۔

کہ مزدلفہ کی رات بینائی کی دشمن ہے۔۔ یہاں دیکھنا گناہ ہے۔۔ روشنی ممنوع ہے۔۔ اگر عرفات سورج ہے تو مزدلفہ رات ہے۔۔ عرفات میں روشن دن میں داخل ہوتے ہیں اور غروب سے پیشتر کوچ کر جاتے ہیں اور مزدلفہ میں رات میں داخل ہوتے ہیں اور طلوع سے پیشتر تاریکی میں ہی اسے چھوڑ دیتے ہیں۔۔

تو اب میں ایک اندھے بروٹس کی مانند تو ندپر سے گرتا اپنا ٹوگا سنبھالتا اُس پہاڑی پر چڑھنے کی سعی

کرتا ہوں..کبھی گرتا پڑتا..اکثر پڑتا اور جھکتا پتھریلی زمین کو اپنے ہاتھوں سے پھرولتا ٹٹولتا کیا کرتا ہوں..کنکریاں تلاش کرتا ہوں..بروٹس کو کس کام پر لگا دیا ہے اللہ تعالیٰ نے..اور نہ اُسے اس عجیب حکم کی سمجھ آرہی ہے کہ شب کی سیاہی میں ہی کیوں کنکریاں جمع کرتی ہیں چوروں کی طرح..

اور یہ کچھ ایسا ستھرا کام بھی نہیں ہے..

کبھی تاریکی میں ٹٹولتے ہاتھ میں ایک مینگنی آ جاتی ہے جو اس پہاڑی پر چرنے والی کسی مقدس بکری کی ہے اور کبھی کچھ اور آ جاتا ہے جس کا پتہ نہیں چلتا کہ یہ کچھ اور کیا ہے..جو بھی ہے کنکری نہیں ہے..

کیوں..ایک سیاہ شب میں چپکے سے چوروں کی مانند یہ کنکریاں چننے کی پابندی ہے؟ علی شریعتی اس ''کیوں'' کا جواز کچھ یوں پیش کرتے ہیں..

''اے اُس کے عشق میں مبتلا..اللہ کے عشق میں مبتلا سپاہی..مشعر الحرام کی رات کے پجاری..منیٰ کے میدان کے شیر..اور جہاد کرنے والی سپاہ کے ایک فرد تم بیداری کے عالم منتظر ہو اُس اگلے روز کے جب تم شیطان کے خلاف صف آرا ہو گے..اس سے جنگ کرو گے..تو اپنا کفن پہنو..اور اپنے ہتھیار سنبھالو..کون سے ہتھیار؟ کنکریاں اس پر برسانے کے لیے''

یعنی اگلے روز پیشی ہے شیطان کے سامنے..ملاقات ہونی ہے لیکن صلح کے مذاکرات نہیں ہونے..اس کی کوئی ایک بھی شرط قبول کر لیتے ہو تو ہار جاتے ہو اس لیے جنگ ناگزیر ہے..

''تم کل کی جنگ کے لیے تیاری کرو کیونکہ منیٰ میں شیطان تمہارا منتظر ہے..''

شیطان کیسے زیر ہو سکتا ہے..

آج تک نہیں ہوا..

اگرچہ یہ بھی تو اُس کی رضا سے ہے کہ وہ زیر نہ ہو..اُس نے اُسے اجازت دے رکھی ہے کہ تم بے شک میرے بندوں کو بدگمان کرتے رہو..

تو ہم بدگمان ہو جاتے ہیں تو ہمارا کیا دوش..

''مزدلفہ کی رات میں ہر فرد نہایت جانفشانی سے..جھکا ہوا..سنگلاخ زمین میں سے کنکریاں تلاش کر رہا ہے جو منیٰ کے میدان میں اُس کا ہتھیار ہوں گی..اور اس تلاش میں بہت احتیاط کرو..دیکھ بھال کر

کنکریاں چنو.. اگرچہ اس سیاہ رات میں کنکریاں تلاش کرنا از حد مشکل کام ہے لیکن انہی کنکریوں سے تم نے دشمن کو ہلاک کرنا ہے اس لیے از حد احتیاط کرو.. ایسی کنکریاں چنو جو قدرے گول ہوں.. اُن کی سطح صاف اور چکنی ہو.. ایک بادام سے چھوٹی اور پستے کے ایک دانے سے بڑی.. اور یہ کنکریاں کس ہتھیار کی نمائندگی کرتی ہیں؟ گولی کی.. ایک بلٹ کی.. چنانچہ یہ کنکریاں نہیں گولیاں ہیں جن کا چناؤ تم کر رہے ہو.. اس لیے احتیاط کے ساتھ.. کل حضرت ابراہیم کی سپاہ نے منیٰ کے میدان جنگ میں دشمن پر ستر گولیاں فائر کرنی ہیں.. دشمن کے سر پر، جگر پر اور دل پر تم نے نشانے لگانے ہیں.. اور اگر تم ماہر نشانہ باز نہیں ہو تو زیادہ کنکریاں جمع کر لو تاکہ کم از کم ستر نشانے تو لگ سکیں.. یاد رکھو اگلے تین روز تم نے منیٰ میں گزارنے ہیں یعنی ذی الحج کی دسویں، گیارہویں اور بارہویں اس لیے دھیان رکھو کہ جنگ کے دوران کوئی کنکری کوئی گولی ضائع نہ جائے.. جو گولی دشمن کو لگے گی صرف اس کا اندراج ہو گا.. اس لیے دھیان سے..

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں مجھے حج کا یہ حصہ کہ آپ اپنے ہوش و حواس کھو کر دیوانوں کی مانند ایک پتھر پر کنکریاں برسا رہے ہیں.. ایک پتھر کو شیطان سمجھ رہے ہیں تو کیسے سمجھ رہے ہیں تو یہ حصہ ہمیشہ مجھے شعور سے بہت دور لگتا تھا..

لیکن شریعتی نے ایک انوکھی سی اگرچہ فلسفیانہ توجیہہ پیش کر دی تھی جو دل کو لگتی تھی.. کہ رات کی یہ تنہائی کیوں.. دشمن سے مقابلے کی تیاری روزِ روشن میں تو نہیں کی جاتی.. پوشیدہ ہو کر تاریکی میں ہی جنگ کے لیے ہتھیار چنے جاتے ہیں..

تو میں بھی سنجیدہ ہو گیا..

مزدلفہ کی رات میں ایک تاریک پہاڑی میں بھٹکتا اپنی کنکریاں کھوجتا تھا.. اُسی تندہی اور سنجیدگی سے جو دریائے سندھ کے کناروں پر ریت چھاننے والے ایک سونے والے کے چہرے پر ہوتی ہے اور وہ ہر لمحہ امید کرتا ہے کہ ابھی میری چھلنی میں سے ریت چھن جائے گی اور سونے کی ایک ڈلی اس میں ڈھلکنے لگے گی اور پر اسرار چمکا دے گی.. ایسے میں اپنی سونے کی ڈلی.. ایک کنکری کی تلاش کرتا تھا..

میں رات کی سیاہی میں اس انجمن میں جو سفید پوش تھی تنہا تو نہ تھا..

میرے آس پاس درجنوں جھکے جھکے کفن پوش حرکت کرتے تھے.. مجھ سے بات کیے بغیر.. بیگانے سے.. میرے وجود سے بے خبر اپنی اپنی کنکریاں تلاش کرتے تھے لیکن اُن میں سے ایک صاحب.. جانے وہ کہاں کے تھے.. گورے.. پیلے یا کھورے تھے، دراز قامت تھے وہ جھکے ہوئے جب کسی ایک کنکری کو پا جاتے تھے تو اسے دیر تک پرکھتے اور تولتے تھے.. جیسے کچھ حضرات پھل خریدتے ہوئے ہر سیب کا رنگ اور نسل پرکھتے ہیں ایک آدھ ہتھیلی پر رکھ کر اس کے وزن کا اندازہ لگاتے ہیں.. ہر آم کو سونگھتے ہیں.. انگور کے دانوں کو چکھ کر

تادیر غور کرتے رہتے ہیں... اور تب کہیں جا کر کچھ خریدتے ہیں.. اور اس دوران پھل فروش ان کا نمونہ اُٹھا کر اُن سے خلاصی حاصل کرنے کے بارے میں حتمی نتیجے پر پہنچ چکا ہوتا ہے.. تو وہ دراز قد صاحب بھی اسی قبیل کے گاہک تھے.. کوئی بھی کنکری اُن کے جی کو نہ بھاتی تھی، پسند نہ آتی تھی.. اٹھاتے تھے.. تولتے تھے.. کبھی سونگھتے تھے اور کبھی تاریکی میں اُس کی شکل ملاحظہ کرنے کی کوشش کرتے تھے اور پھینک دیتے تھے..

تو انہیں دیکھ کر میں نے اپنی کنکریوں کو بھی دوبارہ پرکھا اور پھر اُن میں سے کچھ ناپسند کرکے اُن سے بہتر کی تلاش میں جت گیا..

میں جب واپس اپنے بلند گوشے میں اُترا ہوں کنکریوں کی ایک پوٹلی سنبھالتا اور کھلی رات میں ریت پر بچھی چٹائی پر لیٹتا ہوں تو نہایت آسودہ حال جیسے کوئی انہونا کارنامہ سرانجام دے کر آیا ہوں.. کل سورج سے مقابلہ ہونا تھا اُس کے لیے میرے پاس کچھ ہتھیار تھے.

میں کنکریوں کی پوٹلی کو سرہانے تلے رکھ کر سونے کی سعی کرنے لگتا ہوں..

نیند نہیں آرہی..

اس لیے بھی کہ شاہراہ پر سے اب بھی ٹریفک گزرتی جاتی ہے اور جب کوئی بس یا کوچ مڑتی ہے تو لگتا ہے کہ سیدھی ہماری آرام گاہ کی جانب چلی آرہی ہے اور کنارے کے ساتھ ٹمیر سویا ہوا ہے تو میں سو نہیں سکتا اور وہ کوچ یا بس گھوم کر آگے چلی جاتی ہے تو میں سکھ کا سانس بھرتا ہوں... یہ بھاگ دوڑ.. افراتفری.. چندھیاتی ہیڈ لائٹس اور ٹائروں کے گھسٹنے کی آوازیں اور یہ ہنگامہ صبح ڈھائی بجے تک جاری رہتا ہے اور پھر سب کچھ انہی قدموں پر رُک جاتا ہے.. خاموشی چھا جاتی ہے.. چپ آجاتی ہے اس لیے کہ روکنے والے اہلکاروں نے اب جان بوجھ کر ہتھیار ڈال دیئے تھے اور جس کو جہاں جگہ ملی تھی.. شاہراہ کے بیچ پلوں کے نیچے.. کسی فٹ پاتھ پر، ریتلے ٹکڑے پر وہ وہیں تھم گیا تھا اور عرفات سے آنے والے کُل مسافر مزدلفہ کے کھلے آسمان تلے آگئے تھے۔

”شاندار خاموشی میں اپنے دوست سے باتیں کرو.. اللہ چاندنی کی قسم کھاتا ہے“

سلجوق اور سُمیر سو چکے تھے کہ جوانی کا خمار دس بیس ہزار ویگنوں اور بسوں کے شور کو خاطر میں نہیں لاتا، سو جاتا ہے.. اور عمر رسیدگی پانی کی ایک بوند کے ٹپکنے کی تاب نہیں لا سکتی اور شب بھر آنکھیں جھپکتی رہتی ہے..

جب چپ ہو گئی.. خاموشی چھا گئی تو میں نے ذرا دھیان کیا کہ یوں کھلے آسمان تلے رات بسر کرنے میں کیا حکمت ہو سکتی ہے.. شاید نہیں یقیناً یہی واحد موقع تھا جب تیری سرکار میں پہنچنے والے سچ مچ واقعی ایک ہو جاتے ہیں.. وہ بے شک ایک نہ ہونا چاہیں پھر بھی ایک کر دیے جاتے ہیں.. مزدلفہ میں کوئی گھر نہیں.. کوئی در نہیں اور کوئی چھت نہیں سوائے کھلے آسمان کے.. اور بے شک وہ گداگر ہوں، ہم جیسے یا کوئی شاہ اور تونگر ہوں بہت سوں جیسے انہیں بہر صورت یہ رات کھلے آسمان تلے بوریہ نشیں ہو کر ہی گزارنی پڑتی ہے.. اور آپ جانئے پچیس لاکھ زائرین میں بادشاہ ہوں گے.. سربراہان سلطنت ہوں گے.. امیر کبیر ایسے ہوں گے جو زندگی میں پہلی بار یوں بے آسرا، خدام اور آسائشوں کے بغیر تخت زمین پر لیٹے شب گزارتے ہوں گے.. کیسے کیسے پُر تکبر بت ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے ہوں گے، ریت میں ملتے ہوں گے.. اور اپنی اصلیت کی پہچان کر کے روتے ہوں گے کہ حیثیت یہ ہے.. ایک کنگال فقیر بھی کوئی کھنڈر تلاش کر لیتا ہے، کسی شکستہ چھت کے نیچے پناہ گزیں ہو جاتا ہے.. تو یہ حیثیت ہے..

میمونہ نے واقعی درست کہا تھا کہ حج کے دوران مزدلفہ کی رات سے بڑھ کر کیف آور اور کوئی رات نہیں ہوتی..

میں نے اپنی آوارگی کے دوران بہت سی راتیں کھلے آسمان تلے گزاری تھیں.. کبھی کسی فٹ پاتھ پر کبھی پہاڑوں کے اندر.. لیکن یہ رات اُن سب راتوں پر حاوی تھی، جدا تھی.. کہ آج میری آنکھیں رو رو کر نڈھال ہوئی تھیں.. نمی کی ایک جھلی پر رنگینیاں بکھیرتی سورج کی ایک کرن میری آنکھوں میں اُتری تھی.. میں نے اس کی موجودگی کو محسوس کیا تھا.. تصوف کی جہتیں نکھریں سی تھیں اور میں حاجی ہو گیا تھا..

ہر سُو خاموشی تھی..

کبھی کسی جھاڑی میں سے کوئی جھینگر نزانے لگتا اور چپ ہو جاتا..

رات اتنی چاندنی نہ تھی..

دسویں کا چاند تھا جو اُس پہاڑی کے عقب میں روپوش تھا جہاں سے میں کنکریاں چُن کر دیتا۔ اُس کی مدھم روشنی پہاڑی کی اونچ نیچ کو نمایاں کرتی جارہی تھی..

ستارے اتنے روشن نہ تھے جتنے اندھیری راتوں میں ہوا کرتے ہیں لیکن قریب آتے، اترتے ہوئے محسوس ہوتے تھے.. جیسے بدن میں اُترتے بجھتے جاتے تھے اور ان کی جگہ کچھ اور ستارے نمودار ہو جاتے تھے.. ان میں سے کچھ میرے احرام کی چادر پر ٹانکے جاتے تھے اور وہ ایک کہکشاں بھرے دوپٹے کی مانند دکھائی دیتی تھی.. اگرچہ یہ میرا وہم، میرا خیال تھا، ایسا ہوتو نہیں رہا تھا لیکن لگتا تھا کہ ایسا ہو رہا ہے لیکن مزدلفہ کی اس رات میں کچھ بعید بھی نہ تھا.. کہ میں انھوں تو ستاروں کی کہکشاں سے مزین میں نے ایک اوڑھنی اوڑھ رکھی ہو.. دم روکے کھڑا رہوں کہ کہیں سانس لینے سے یہ ستارے گر نہ جائیں.. میری چادر پھر سے خالی نہ ہو جائے..

اُس رات میں عجیب عجیب خیال آئے..

یہ بھی ذہن میں آیا کہ اگر پچیس لاکھ افراد ان بے آباد پہاڑیوں میں سے پچاس کنکریاں فی کس بھی چنتے ہیں تو کل کتنی کنکریاں ہوئیں.. بارہ کروڑ سے کہیں زیادہ.. تو کتنی صدیوں سے اگر یہیں سے کنکریاں چنی جارہی ہیں تو اب تک ختم کیوں نہیں ہو گئیں.. اگر یہ پہاڑیاں بھی ڈھیر سے ڈھیر کنکریوں میں بدلتی تھیں تو انہیں بھی اب تک معدوم ہو جانا چاہیے تھا تو کیوں نہیں ہوئیں..

کہیں ایسا تو نہیں کہ جب یہاں سے جمع شدہ سب کنکریاں شیطانوں کو ماری جاتی ہیں تو ہر شیطان انہیں سمیٹتا ہے اور پھر سے مزدلفہ میں بکھیر جاتا ہے کہ میں تو اس برس بھی ہلاک نہیں ہوا.. تمہارے ہتھیار واپس کر رہا ہوں، اگلے برس پھر مقابلہ کر لینا.. کہیں ایسا تو نہیں..

شاہراہ اب اتنی خاموش اور اتنی ویران پڑی تھی جیسے جب سے تعمیر ہوئی ہے آج تک اس پر کوئی بس یا ویگن تو کیا ایک بچہ سائیکل بھی نہیں گزری..

مزدلفہ میں.. مشعر الحرام پر.. ہر گردش کو ہر دھڑکن اور ہر نبض کو بھی چپ کرا دینے والی راز بھری پرشکوہ رات اُترتی تھی..

میں بازو پر سر رکھے اپنے اوپر معلق گنبد مینائی کو تکتا تھا.. اُس گنبد بے در سے، بے آواز، دبے پاؤں نہ سرگوشی کرتی نہ اپنے پاؤں کی آہٹ سناتی رات اُترتی تھی..

آخر آپ عرفات میں بروز روشن میں ہی کیوں جاتے ہیں..

مزدلفہ میں تاریکی میں ہی کیوں داخل ہوتے ہیں اور روشنی ہونے سے پیشتر ہی کیوں کوچ کر جاتے ہیں..

''کیونکہ عرفات علم و آگہی اور سائنس کی منزل ہے جو کہ سوچ اور دنیاوی حقیقتوں کے درمیان ایک خارجی رشتے کی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ اس کے لیے ایک شفاف اور روشن نظر درکار ہے جو صرف دن کے وقت جب ہر شے واضح اور نمایاں ہو جاتی ہے تبھی ممکن ہے.. جبکہ مزدلفہ شعور کی ایک ایسی منزل ہے جہاں سوچ کے درمیان ایک خارجی کی بجائے.. ایک داخلی رشتہ ہے، چنانچہ اپنے آپ میں گم ہو کر سوچنے اور سمجھنے کی جو طاقت درکار ہے وہ صرف رات کی خاموشی میں ہی ذہن میں اُترتی ہے۔''

تو عرفات باہر ہے.. روشن عیاں.. آمنے سامنے.. دنیاوی حقیقتوں کا سامنا کرتے ہوئے.. اور مزدلفہ اندر ہے.. رات کی تاریکی.. اپنے آپ میں گم.. اپنا سامنا کرتے ہوئے.. اس لمحے مزدلفہ کی شب کی سیاہی میں کتنے لوگ میری طرح کھلے آسمان کو تکتے ہوں گے.. کچھ عبادت میں مگن.. کچھ نیند میں گم.. کھلے آسمان تلے بچھی برف پاتھوں، شاہراہوں، بس سٹینڈز کے آس پاس، گھاٹیوں اور بلندیوں پر یوں رات گزارتے ہوئے.. تو اُن کی کیا کیفیت ہوگی.. اُن کے طے شدہ نظریات زندگی گزارنے کے درہم برہم نہیں ہو گئے ہوں گے.. عالی شان گھروں.. محلات اور قلعوں جیسے باسیوں کے لیے یہ رات کیا انہیں آسمانوں سے اُتار کر زمین پر اُن کو خاک پر خاک نہیں کر رہی.. کسی ایک بھی فرد کی آج رات کوئی حیثیت نہیں.. دنیاوی وقار، شان و شوکت نہیں اور نہ ہی کوئی ایک فرد سر اٹھا کر یہ کہہ سکتا ہے کہ میں تم سے افضل ہوں کہ یہاں سب کے سب ایک ہی سطح پر بچھے ہیں.. بے شک لاکھوں لوگ آپ کے ہمسائے ہیں اس آسمان تلے آباد ہیں لیکن اس کے باوجود آپ تنہا ہیں.. نہ صرف اکیلے ہیں بلکہ آپ کا کوئی پوسٹل ایڈریس نہیں ہے... آپ بے نشان اور بے پتہ ہیں.. یہاں کوئی گلی محلہ نہیں.. کوئی اشارہ نہیں کہ یہ فلاں علاقہ ہے.. کوئی بازار نہیں، کوئی دیوار، کوئی چھت نہیں.. کوئی گھر نہیں تو پتہ کیسے ہو سکتا ہے.. کوئی اگر آپ کو خط لکھے تو کس پتے پر لکھے.. جناب تارڑ صاحب.. گلی نامعلوم.. گھر نامعلوم.. بس ایک بلند گوشے میں ریت پر بیٹھے ہوئے.. شہر مزدلفہ.. تو اس پتے پر تو خط پہنچنے سے رہا.. یہاں بس ایک ہی خط براہِ راست آپ تک پہنچ جاتا ہے جو کہ بڑے پوسٹ ماسٹر صاحب کی جانب سے بھیجا جاتا ہے اور وہ خوب جانتے ہیں کہ آپ کہاں ہیں..

آپ بے نام بے پتہ لاکھوں کی موجودگی میں ایک ذرّے کی موجودگی ہیں سب سے الگ تھلگ اُس ایک خط کے منتظر جو بڑے پوسٹ ماسٹر صاحب کی جانب سے آتا ہے.. اور وہ اس رات میں آتا ہے..

پھر آپ ہیں اور وہ خط ہے.. اور اسے پڑھتے ہوئے آپ شرمندہ ہوتے ہیں.. اس میں آپ کی زندگی بھر کی درج ہے.. خط میں روشنی کا کوئی ایک آدھ ذرّہ ہے اور بقیہ صحرا سیاہی میں ڈوبا ہوا ہے.. چادر جو شفاف بے داغ عطا کی گئی تھی، سیاہ ہو چکی تھی.. یہ نہیں کہ بڑے پوسٹ ماسٹر صاحب آپ کو جان بوجھ کر

شرمندہ کر رہے ہیں.. چادر کی سیاہی کا احساس دلا رہے ہیں.. نہیں.. اُن کی جانب سے تو محبت نامہ آیا ہے..
آپ ہیں جو سطروں کے درمیان جھلکتی سیاہی کو پڑھ لیتے ہیں..

آپ.. رات اور اُن کا بھیجا ہوا خط..
ویسے تو آپ بھی کہاں ہیں..
آپ کی ذات اور حیثیت تو اُسی لمحے فنا میں چلی گئی تھی جب آپ نے دنیا کے لباس اُتار کر
آپ کو احرام کے کفن میں لپیٹ لیا تھا.. اُس لمحے آپ نے تو اپنا وجود کھو دیا تھا..
خاموشی.. راز بھری.. تاروں سے بھری.. حیرتوں کو جگا کر انہیں بھی حیرت میں ڈال دینے والی..
رات میں ایک مرتبہ پھر آپ اپنی ذات اور وجود سے آگاہ ہو جاتے ہیں کہ اس سے پیشتر آپ طواف کے
سیلاب میں ایک بوند تھے.. عرفات کے سمندر میں ایک قطرہ تھے.. اجتماع کا ایک حصہ تھے لیکن مزدلفہ کی رات
میں تنہا ہوئے تھے تو اپنے آپ کو پہچان رہے تھے.....
یہ کیسی انوکھی رات ہے کہ جس میں کسی اور کی یاد نہیں آتی.. بس اُسی کی آتی ہے جس کی یاد
عرفات اور مزدلفہ کے صحراؤں میں ہونے سے بادِ نسیم چلتی ہے اور چٹائی پر لیٹے ہوئے ایک پیار کو بے وجہ رونا
آ جاتا ہے..

"یہ اقرار کرنے.. اپنے گناہوں کو قبولیت کرنے کے اقرار کرنے کی رات ہے..
اپنے آپ کو اپنے آپ سے بھی آزاد کر دو..
اپنے آپ کو اس رات کی تحویل میں دے دو..
اپنی متلاشی آنکھوں اور بے چین قلب کو اس رات کی چپ میں گم کر دو..
اور پھر اپنے دل میں اُتر کر اُس کی گہرائی میں جا کر وہ تنہائی تلاش کرو جس کی بہر طور تمہیں سزا سنائی
گئی ہے..
اور پھر اُس شاندار خاموشی میں.. اپنے دوست سے باتیں کرو.."

ہاں یہ ایک شاندار خاموشی تھی..
میں اپنے دوست سے.. عرفات میں.. بہت باتیں کر آیا تھا..
بلکہ باتونی ہو گیا تھا.. باتیں کر کر کے اسے بور کر دیا تھا تو اب اور کیا باتیں کروں..
آس پاس میرے علاوہ بے حساب لوگ بھی تو کھلے آسمان تلے پڑے اُسی سے باتیں کرنے کی
آس میں ہیں..

وہ عرفات کی کھلی کچہری میں درخواستیں وصول کرنے کے بعد رات گزارنے یہیں آ گیا ہے.. شاید اُن جھاڑیوں کی اوٹ میں.. یا اُس پہاڑی کے دامن میں جہاں سے میں کنکریاں چن کر آیا ہوں.. یہیں کہیں آس پاس اپنا خیمہ لگا لیا ہے اور مجھ سے.. صرف مجھ سے باتیں کرنے کے لیے آ گیا ہے.. بقیہ بے حساب لوگوں کو بھول کر صرف اور صرف میرے لیے یہیں کہیں آس پاس قیام کر رہا ہے..

میں یقیناً ایک سفارشی اُمیدوار تھا..

لیکن اُس سے بالا تو کوئی اور نہ تھا جو سفارش کرتا. تو پھر اُس نے خود ہی سفارش کی تھی اور مجھے رعایتی نمبر دے کر پاس کرنے کے لیے آ گیا تھا..

آپ مزدلفہ کی رات میں مجرم بھی محسوس کرتے ہیں کہ میں نے پچیس لاکھ لوگوں کو اس کی قربت سے محروم کر دیا ہے.. وہ کسی اور کی جانب دیکھتا ہی نہیں، اپنے آپ کو میرے لیے وقف کر لیا ہے اور پھر کچھ جذبہ تفاخر بھی سیاہ چادر کی اوٹ میں سے جنم لیتا ہے کہ میں نے اُسے بھلا دیا تھا.. اور اُس نے میری خاطر سب کو بھلا دیا ہے اور مجھے نہیں بھلایا.. یاد رکھا ہے..

اور میں ایسا تھا جسے بھول جانا ہی بہتر تھا..

شکوک کا مارا ہوا.. تحریک کرنے والا.. الحاد کی جانب راغب.. نہ کبھی باقاعدگی سے سجدہ ریز ہوا اور نہ اُس کے احکام پر ذرّہ بھر عمل کیا اور اس کے باوجود وہ اپنا خیمہ میرے برابر میں آس پاس کہیں ایستادہ کر کے مجھ سے کہتا ہے کہ "مجھ سے باتیں کرو.. میں سن رہا ہوں.."

"رات مشعر الحرام میں آ گئی ہے اور وہاں کوئی روشنی نہیں ہے..

ہاں ستارے ہیں.. دمکتے چمکتے صحرا کو روشن کرتے.. اور اس رات کو وہ تو نہیں جانتے جو آبادیوں اور شہروں کے باسی ہیں.. اس جنت مثال خوش نظر آسمان کو نہیں جانتے.. وہ جو اپنا زمانہ.. اپنا وقت اور حیات دنیاوی خواہشوں اور حرص میں ضائع کرتے ہیں.. ان کی راتیں تو بالکل مختلف ہوتی ہیں.. اور یہ رات تو تخیل اور اُس جنت کا ایک پرتو ہے جس کا وعدہ ہے.. ایک اشارہ، ایک استعارہ ہے.. چاندنی ہے.. شفاف ٹھنڈک بھری اور مہربان ہے.. اللہ کی مسکراہٹ ایسی اور یہیں مزدلفہ میں ہے تو آپ کا قلب اللہ کی اُس قسم کا مشاہدہ کرتا ہے اور ایمان لاتا ہے جب وہ قرآن میں چاندنی کے نام کی قسم کھاتا ہے.."

یہ جو میرے آس پاس.. یہیں کہیں.. میری شہ رگ سے قریب جو خیمہ زن ہے اور اُس کی موجودگی.. میرے کانوں میں.. قلب میں.. رگوں اور شریانوں میں اور ہڈیوں میں جو گودہ ہے اُس کے ایک ایک خلیے میں اُترتی ہے.. محسوس ہوتی ہے اور میرے بدن کے ہر مسام میں وہ اپنا خیمہ نصب کر کے قیام کرتی ہے.. اور ہر

مسام ہر مُوایک آنکھ ہے جو کبھی میں کھولتا ہوں اور کبھی ڈھکتا ہوں اور جب کھولتا ہوں تو اُسے سامنے پاتا ہوں اور اُس سے باتیں کرتا چلا جاتا ہوں..

ثُمیر بار بار پہلو بدل رہا ہے.. نیند میں کچھ بڑبڑا رہا ہے..

اولاد بھی ایک ایسی کمبخت نعمت ہے کہ اُس دوست کے دھیان سے بھی آپ کو غافل کر دیتی ہے جو محض آپ سے باتیں کرنے آیا ہے..

''کیا بات ہے بیٹے؟''

وہ بیدار ہو جاتا ہے ''کچھ نہیں ابو..''

''کچھ تو ہے بے بی..'' وہ ہمیشہ اصرار کرتا ہے کہ بہن اور بڑے بھائی کی چونکہ شادی ہو چکی ہے، اس لیے اب میں ایک بے بی ہوں..

''ابا.. ایک کیڑا ہے.. مکوڑا ہے.. یا شاید بچھو ہے جو میرے بدن پر رینگتا چلا جاتا ہے اور میں کسمساتا ہوں.. پہلو بدلتا ہوں.. اپنے آپ کو جھٹکتا ہوں کہ یہ میری جان چھوڑ دے لیکن اس پر کچھ اثر نہیں ہوتا، رینگتا چلا جاتا ہے..''

میں تشویش میں مبتلا اٹھ کر بیٹھ جاتا ہوں ''اسے مسل دو بیٹے..''

''نہیں ابا، حکم نہیں ہے.. میں اس مکوڑا صاحب کو درخواست تو کر رہا ہوں کہ بھائی جان آپ پلیز میرے بدن سے اُتر جائیں.. مہربانی آپ کی رخصت ہو جائیں.. میں نہ تو آپ کو مسل کر ہلاک کر سکتا ہوں اور نہ آپ کو گزند پہنچا سکتا ہوں کیونکہ اجازت نہیں ہے تو کیوں میرا حج خراب کرتے ہو.. مجھے نہیں معلوم کہ آپ جو بھی ہیں، زہریلے ہیں کہ نہیں.. اگر ہیں تو ہم مارے گئے، اور اگر آپ کو مارتے ہیں تو بھی ہم مارے گئے..''

ثُمیر بڑبڑا تا رہا۔

اگلی سویر ایک نہایت غیر معروف کن کھجورا سا ثُمیر کی چٹائی کے برابر میں بے جان پڑا تھا ''ابا میں نے اسے کچھ نہیں کہا تھا.. شاید کروٹ بدلتے ہوئے نیچے آ گیا ہے یا شاید میری تیکھی ناک پر چڑھتے ہوئے دو نیم ہو گیا ہے، بہر حال میں نے اسے ہلاک نہیں کیا..''

بے شک وہ میرا دوست تھا جو میں سمجھتا تھا کہ پچیس لاکھ لوگوں میں سے بے اعتنائی برت کر صرف اور صرف میرے لیے میری قربت میں خیمہ زن ہوا تھا تاکہ ہم باتیں کر سکیں.. لیکن انسان کب تک باتیں کر سکتا ہے۔

سارے دن کی تھکن جو اب تک دور کھڑی منتظر تھی، صرف اس لیے کہ مجھے اس کے ساتھ باتیں کرنے کا موقع دے.. اس نے دیکھا کہ باتیں ختم نہیں ہو رہی ہیں آئی.. آئی اور میرے بدن میں ہولے ہولے گھر بناتی چلی گئی.. اس نے جونہی اُس گھر کی آخری اینٹ رکھی تو نیند دبے پاؤں اس میں داخل ہونے

گئی.. میں مطمئن تھا.. میں نے اپنے حصے کی کنکریاں چن لی تھیں.. میں بھی رات کی طرح چپ تھا، خاموش تھا۔ ایک سکوت میں تھا جیسے میرے دونوں کاندھوں پر خوشی اور روحانی خوشحالی کے جو پرندے بیٹھے ہیں، ذرا سی آہٹ سے اُڑ جائیں گے.. اس لیے میں دم روکے آسمان کو تکتا تھا جس کے ستارے آنکھوں میں نیند کا جو خمار اُترتا تھا اُس میں بجھتے جاتے تھے..

خاموشی اتنی تھی کہ پچیس لاکھ لوگوں میں سے جتنے بھی اس شب میں بیدار تھے، اُن کے ایک ایک آنسو کے گرنے کی آواز بھی مجھ تک آتی تھی..

"رویا میں ہزار آنکھ سے صبح تلک...
شبِ مزدلفہ کے خمار میں"

مزدلفہ میں نیند آتی ہے تو مدہوش نہیں کرتی.. ہم خوابی کی ایک کشتی میں ہولے ہولے تیرتی رہتی ہے۔ پھر کچھ لمحوں بعد آپ کو خالی کر دیتی ہے.. کچھ پرے ہو کر منتظر ہو جاتی ہے.. نیند اس لیے ساتھ نہیں چھوڑتی کہ کھلے آسمان تلے جو بے آرامی ہے، وہ اس کا سبب بنتی ہے.. بے یار و مددگار پڑے ہوئے خوف آتا ہے.. نہیں اس کھلے آسمان سے ہی تو یار اور مددگار کی موجودگی اترتی ہے.. بلکہ اس حیرت کے باعث نیند کم آتی ہے کہ میں کہاں ہوں.. کیوں ہوں.. کب سے.. یہاں میری موجودگی کا جواز کیا ہے.. اور یہ جواز ہرگز نہیں کہ چونکہ پچیس لاکھ لوگ ایسا کر رہے ہیں تو میں بھی اُسی بھیڑ چال میں شامل ہوں.. نہیں..

اگر میں اس برس تنہا حاجی بھی ہوتا..

منیٰ کے میدان میں صرف میرا ایک خیمہ ہوتا..

عرفات کے شہر آفتاب میں صرف میرے دو ہاتھ ہوتے جو دعا کے لیے اٹھتے.. اور یہاں مزدلفہ میں کوئی ایک فرد بھی آس پاس نہ ہوتا.. میں تن تنہا ہوتا تو بھی میں یونہی ریت پر چٹائی بچھائے.. آسمان کو تکتا اس سے باتیں کرتا.. اور حقیقت بھی تو یہی ہے کہ بے شک لاکھوں لوگ اس شب کے مہمان ہیں، پھر بھی میں تنہا ہوں..

ستارے مدھم ہوتے جا رہے تھے.. اُن میں بھی تھکاوٹ کے آثار تھے اور اُن کے دھیمے پن اور چاند کی لو گھٹنے کے باعث گرد و نواح کی پہاڑیاں واضح شکل اختیار کر رہی تھیں.. اپنی شکل میں نمودار ہو رہی تھیں..

سُمیرا اور سلجوق گہری نیند میں تھے اور سُمیر کے قریب وہ مکوڑا یا زہریلا کیڑا اب کچھ کچھ نظر آنے لگا تھا جو شاید اس کی کروٹ تلے آ گیا تھا اور چٹائی کے برابر میں بے جان پڑا تھا..

آخر شب کے ہم سفر.. ہمارے ہم گوشہ عرب زائرین بھی بار بار پہلو بدلتے تھے.. کروٹیں لیتے تھے.. ایک لمبے چوغے میں ڈھکی خاتون اٹھی اور خاموشی سے جھاڑیوں کی جانب چلی گئی..

شاہراہ کی ویرانی بھی ہولے ہولے آباد ہونے لگی تھی.. جیسے بارش کے بعد صحرا میں ہولے ہولے

بوٹے اور گل نمودار ہوتے ہیں..

اکادکا گاڑیاں گزرنے لگیں، اگرچہ ابھی اتنی تاریکی تھی کہ ان کی ہیڈ لائٹس گل نہیں ہوئی تھیں..

مجھے یہ تو یاد نہیں کہ فجر کی اذان کہیں سنائی دی یا نہیں لیکن سپیدی کے ظہور نے اذان کا کام کیا.. کہ فجر ہو چکی ہے.. میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ حج کے دوران آپ کے اندر ایک بہت حساس گھڑیال نصب ہو جاتا ہے جو اذان سے بے نیاز ہیں اس لیے جب کسی بھی نماز کا وقت سر پر آتا ہے تو منادی کرنے لگتا ہے.. ایک ٹائم بم کی مانند ٹک ٹک کرنے لگتا ہے.. رگوں شریانوں میں خون کی گردش میں ٹک ٹک کرتا خبر کرتا تیرتا چلا جاتا ہے.. اور آپ آگاہ ہو جاتے ہیں:

فجر کی نماز ادا کرنے کے فوراً بعد پھر سے بھگدڑ مچ گئی.. کہرام بپا ہو گیا.. محشر کی ایک اور گھڑی سر پر آ گئی..

صرف اس لیے کہ مزدلفہ میں داخل ہونا ہے تو رات میں ہونا ہے اور جب نکلنا ہے تو نیم سیاہی کی چادر اوڑھ کر شتابی سے نکل جانا ہے..

مزدلفہ میں روشنی ممنوع ہے.

روشنی میں.. سورج کی تمازت میں.. دھوپ میں آنا اور جانا ممنوع ہے..

عرفات دن ہے.. مزدلفہ رات ہے اور یہی کل حیات ہے.. صبح ہوتی ہے، شام ہوتی ہے.. گویا آپ نے ایک دن عرفات میں گزارا تو حیات کے کل دن گزار لیے اور مزدلفہ میں رات بسر کی تو زندگی کی سب راتیں بسر ہو گئیں..

نماز فجر کے فوراً بعد کاروان میں سفر کرنے والے عرب خواتین و حضرات رخصت ہو گئے.. ہم نے بھی اپنی چٹائیاں لپیٹیں.. مزدلفہ کی رات کے بستر لپیٹے، بیگ سنبھالے اور اُس بلندی پر جو ہم نے عارضی مکان بنا رکھا تھا اس ریتلے گوشے سے جہاں ہم نے قیام کیا تھا، رخصت ہو کر پہاڑی سے نیچے شاہراہ کی جانب اُترنے لگے جہاں ہمارا کوسٹر درجنوں کوچوں اور بسوں میں گھرا کھڑا تھا اور ہمارے ہم سفر اپنا سامان سمیٹ رہے تھے البتہ یوسف شاہ ابھی ٹس سے مس نہیں ہوئے تھے، اپنے دھیان میں مگن آلتی پالتی مارے تسبیح کر رہے تھے..

میں نے اپنی حیات میں بہت سارے اجنبی مقامات کو صرف ایک شب گزار کر چھوڑا ہے مگر یقین جانیے جتنا قلق مجھے مزدلفہ کے اس ریتلے بلند گوشے کو چھوڑ جانے پر ہوا.. کبھی نہ ہوا.. اس کا ایک ایک ذرّہ.. آس پاس جو جھاڑیاں تھیں ان کی رنگت اور مہک.. اور مہک کا ایک ایک سانس.. قریب سے گزرتی شاہراہ کا موڑ.. اور آسمان کا وہ ٹکڑا جو صرف میرے لیے اس شب میری آنکھوں پر معلق کر دیا گیا تھا.. یہ سب میری یادداشت میں یوں محفوظ ہے جیسے پہلی محبت کی پہلی حدت..

کوسٹر سُوئے منیٰ رواں تھا..

کسی کو یاد نہ آیا کہ ابھی ہم نے دانتوں کو برش نہیں کیا.. چہرے پر پانی کے چھینٹے نہیں مارے.. باتھ روم نہیں گئے.. ناشتہ نہیں کیا... جیسے سوئے تھے ویسے ہی اُٹھ کر آ گئے ہیں کہ کوئی بھی ہوش میں نہ تھا..

سب شبِ مزدلفہ کے خمار میں تھے..

.. یہ مئے خانۂ مزدلفہ سے بے خود ہونے والے تھے.. اور مے خانہ بھی ایسا جس میں ساقی گری کی لاج رکھنے کے لیے یار اور مددگار خود عرش سے اُتر آیا تھا..

یہ وہ بادہ خوار تھے وہ روسیاہ تھے جنہیں مَے سے غرض نشاط تھی.. وہ اِک گونہ بے خودی کا بہانہ نہ بناتے تھے..

نشاط میں مدہوش تھے

بیگم یوسف شاہ نے پھر ایک ایکشن ری پلے کیا.. باہر گزرتی پہاڑیوں کو نہایت عقیدت سے آنکھوں میں سموتی اپنے میاں سے کہتی ہیں "یوسف.. یہ پہاڑیاں بھی تو انہی زمانوں کی ہوں گی جب ہمارے نبیؐ ہمارے طرح.. مزدلفہ سے منیٰ جاتے تھے اپنی اونٹنی پر.."

اور یوسف شاہ الفت بھری مسکراہٹ سے جواب دیتے ہیں "بیگم.. یہ پہاڑیاں کیسے بدل سکتی ہیں.. وہی ہیں.."

اور بیگم یوسف اپنے جدید بھولپن میں ایک ایسی بات کہتی ہیں جو میرے دل پر ایک آہ کی مانند اثر کر جاتی ہے.. وہ کہتی ہیں "میں بھی جانتی ہوں کہ یہ وہی پہاڑیاں ہیں جہاں ہمارے حضورؐ چلے تھے.. لیکن یقین نہیں آتا.."

واقعی اس سفر میں یقین نہیں آتا کہ بابا ہمارے ہم رکاب ہیں.. وہ بھی ادھر سے گزرے تھے جہاں سے ہم گزرتے ہیں.. قصویٰ انہی راستوں پر چھم چھم چلتی تھی اور اس کا سوار نہ اُسے چابک سے پیٹتا تھا اور نہ تیز اپنی سواری کو چلاتا تھا..

یہ یقین نہیں آتا..

بیک ٹو منیٰ...

ایک مرتبہ پھر منیٰ میں واپسی..

سب کے سب بے وفا اور بے اعتنا.. پچیس لاکھ طوطا چشم جو پل بھر میں آنکھیں پھیر لیتے ہیں.. کبھی منیٰ سے بے وفائی کرتے ہیں اور عرفات کی جانب نکلتے ہیں.. اتنے خود غرض کہ حاجی قرار دیے جانے کے بعد اسے بھی فراموش کر دیتے ہیں اور مزدلفہ کی جانب کوچ کر جاتے ہیں اور پھر ایک شب بسر کر کے اسے بھی ترک

کر کے منیٰ کا رخ کر لیتے ہیں..

ان کا کچھ اعتبار نہیں..

لالچ کے بندے لگتے ہیں لیکن حکم کے بندے ہیں..

یہ خود سے بے وفا نہیں ہوتے..ان کے نصاب میں یہی درج ہے اور وہ روگردانی نہیں کر سکتے..

یہ جنھوں نے منیٰ کو ویران کیا تھا اسے پھر سے آباد کرنے کے لیے ایسی بے تابی سے چلے جاتے ہیں جیسے وہ شتابی سے نہ پہنچے تو ان کے خالی کردہ خیمے پر کسی اور کا قبضہ ہو جائے گا..

حج کے دوران کیسے چشم زدن میں یہ بارونق بڑے بڑے شہر یکدم ویران ہو جاتے ہیں۔ ایسے کہ ان میں کوئی ایک ذی روح بھی سانس نہیں لیتا اور پھر کیسے اگلے روز ایسے آباد ہو جاتے ہیں جیسے ازل سے یونہی پر رونق اور زندگی سے اُبلتے تھے..

ابھی منیٰ ویران تھا:

اس کے لاکھوں سفید احرام نما خیموں میں کوئی ایک بھی ذی روح نہ تھا: پھر اگلے لمحے اتنی لاکھوں روحیں اُتر آتی ہیں کہ کسی ایک اور رُوح کی گنجائش باقی نہیں رہتی..

چنانچہ منیٰ پھر سے شاد و آباد ہو گیا۔ اس کے بھائیں بھائیں کرتے خیمے..خالی گلیاں، ویران بازار اور خاموش شاہراہیں لوگوں سے بھر گئیں..

لیکن پہلے کے منیٰ میں اور عرفات اور مزدلفہ سے واپسی کے منیٰ میں ایک فرق تھا۔ اس سے منہ موڑ لینے والے جب واپس آتے ہیں تو ہر ایک کے سینے سے لگی ایک پوٹلی ہوتی ہے جسے وہ جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا ہے اور اس پوٹلی میں وہ کنکریاں ہیں..وہ ہتھیار ہیں جن کے ساتھ اس نے آج ہی ایک جنگ کا آغاز کرنا ہے..اس نے بڑے شیطان کو ہلاک کرنا ہے..

مزدلفہ سے واپسی پر ہر شخص اپنی اپنی کنکریوں کی یوں حفاظت کرتا ہے جیسے وہ ایک ایسا پاسپورٹ ہوں جس کے سہارے کوئی حساب کتاب نہ ہو گا اور وہ سیدھے جنت میں چلے جائیں گے..

اور منیٰ میں..واقعی جیسا کہ سلجوق نے کہا تھا..یا تو خیمے ہیں..شاہراہیں اور کنکریٹ کی عمارتیں ہیں..سارا کام پختہ اور پائیدار ہے تو وہاں کہیں بھی ایک بھی کنکری کیسے ہو سکتی ہے..اور اگر آپ انہیں مزدلفہ کی شب میں جمع کر کے ساتھ نہیں لائے تو جیسا کہ صوفی تبسم اپنے لازوال کلام "ایہہ پتھر ہٹاں تے نہیں ملدے..توں لبھدی پھریں بازار کڑے.." میں کہتے ہیں..

ایہہ سودا نقد و نقد دا اے
توں لبھدی پھریں اُدھار کڑے

تو یہ سودا دنیا کے کسی بازار میں نہیں ملتا..

S

یہ ایسی کنکریاں ہیں کہ انہیں کوئی بھی فروخت کرنے پر تیار نہیں ہوتا..

تو ادھار دینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا..

آپ بے شک اپنے عزیز ترین دوست سے گزارش کریں کہ برادر صرف ایک دو کنکریاں عنایت کر دیں..کم پڑ گئی ہیں تو وہ بھی یہی کہے گا کہ جانِ من جان حاضر ہے..مال درکار ہے تو وہ پیش کر دیتے ہیں.لیکن کنکریاں اپنی اپنی..

مجھے معلوم تھا کہ سلجوق اور سمیر بھی معذرت کر لیتے کہ ابا اپنی جگہ لیکن سوری کنکریاں اپنی اپنی..

"بروٹس کا.. بڑے شیطان سے مقابلہ"

منیٰ تو گھر لگتا تھا..

اپنے خیمے میں داخل ہوئے تو یوں لگا جیسے برسوں کے سفر کے بعد گھر لوٹے ہیں..

اور واقعی ہم کیسی کیسی منزلیں طے کر کے لوٹے تھے.. پھر تھکاوٹ نے ہمیں اس سحر انگیز رات سے بھی غافل کر دیا جو ہم مزدلفہ میں بسر کر کے آئے تھے.. چنانچہ ہر کوئی بے سدھ ہو کر اپنے اپنے گدے پر گرا اور ایئر کنڈیشنر کی خرابی کے باوجود گرمی کے باوجود ٹانگیں پسارے محوِ خواب ہوتا گیا..

لیکن جیسے فرصتِ گناہ بھی پروردگار کے مختصر حوصلے کی وجہ سے صرف چار دن ملی تھی ایسے فرصتِ نیند بھی بس چار لمحوں کی تھی کہ آج تو مقابلہ تھا.. ہر ایک نے اپنی اپنی کنکریاں سینے سے لگائیں، اُس کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے نکل کھڑا ہوا جو زندگی بھر اُن کے ساتھ ساتھ تھا.. بظاہر ہمدرد بھی تھا اور راہنما بھی.. جدھر وہ کہتا تھا ادھر وہ چل نکلتا تھا.. جس راستے پر وہ ڈال دیتا تھا اس پر ہو لیتا تھا.. تو اس زندگی بھر کے ساتھی کو ہلاک کرنے کی نیت سے خیمے میں سے نکلے.. اگرچہ ہمیشہ اُسی کا کہنا مانا تھا لیکن آج انکاری ہو گئے تھے.. عرفات اور مزدلفہ میں احساس ہو گیا تھا کہ ہم غلطی پر تھے.. چنانچہ ہم نے بغاوت کر دی تھی اور کنکریاں سینے سے لگائے اسے نابود کرنے کو جاتے تھے..

اگر اس لمحے ہم صرف دو چار ہوتے تو خیر تھی لیکن ہمارے علاوہ پچیس لاکھ لوگ اور بھی اشتعال میں آ چکے تھے، ہر ایک کی مٹھی میں.. جیب میں، پوٹلی میں کنکریاں تھیں اور وہ اس دیرینہ دوست کو سنگسار کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے تھے، لاکھوں کا ہجوم تھا جو بڑے شیطان کی جانب بڑھتا تھا..

شیطان تین تھے..

پہلا شیطان..

درمیانہ شیطان..

اور سب سے بڑا شیطان..

یعنی جمرۂ اولیٰ، جمرۂ وسطیٰ اور جمرۂ کبریٰ..

آج ہمیں پہلے اور درمیانے شیطان کو درگزر کرنا تھا، ان سے پرہیز کرنی تھی اور سب سے بڑے شیطان پر حملہ آور ہونا تھا..

حکمت یہی ہے کہ اگر آج بڑا شیطان مار گرایا تو اُس سے کم سن اور کم تجربہ کار بچہ شیطان کو بعد میں آسانی سے شکار کیا جاسکتا ہے.. بڑا شیطان زیر کر لیا گیا تو اس کے متاثرین خوفزدہ ہو کر خود ہی ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنے لگیں گے.. تو اس لاکھوں کے اشتعالی ہجوم میں ہم بھی دھکم پیل کرتے، رکتے چلتے.. آگے ہوتے جاتے تھے اور جب سب سے بڑے شیطان کے مقابل آئے ہیں تو اُس کے مقابل ہزاروں افراد تھے اور غضب ناک تھے.. جس کو اس نے زیادہ بھٹکایا تھا، وہ اسی حساب سے زیادہ غضب ناک تھا..

اس بے چارے پر مجھے کچھ ترس بھی آیا.. بے چارہ ایک تھا اور اُس پر کنکریاں برساتے بعض گالیاں دیتے ہزاروں تھے..

''میں اللہ کا نام لے کر کنکری مارتا ہوں''۔ اللہ سب سے بڑا ہے.. میرا یہ عمل شیطان کو ذلیل کرنے اور رحمٰن کو راضی کرنے کے لیے ہے.''

میں جو آج تک اس فعل کو، شیطان کو.. ایک عام سے پتھر کو.. اسے خواہ مخواہ کنکریاں مارنے کے فعل کو اللہ معاف کرے، پاگل پن سمجھتا تھا.. جہالت گردانتا تھا اور ایام حج کے دوران یہی الجھن سوچ کو الجھاتی تھی کہ میں کیسے یہ عمل کروں گا جس کی تک سمجھ میں نہیں آتی.. اور یہاں پہنچ کر شیطان کے روبرو ہوئے ہیں۔ پتھر کی لاٹھ کے سامنے ہوئے ہیں تو کیا ہوتا ہے.. سلجوق بار بار میرے احرام کو گرفت میں لے کر مجھے آگے جانے سے روک رہا ہے کہ ابا کیا کر رہے ہیں، ہوش میں آئیں.. آگے بہت ہجوم ہے، گر جائیں گے، سانس رک جائے گا۔ آپ یہیں سے کنکریاں ماریں اور ابا جی ہیں کہ تُلے اشتعال میں آئے ہوئے ہیں.. احرام چھڑاتے ہیں، بیٹے کو ڈانٹتے ہیں کہ چھوڑ دو.. اور بہر صورت اُس دیوار تک پہنچنے کے درپے ہیں جہاں اُن کے اور شیطان کے درمیان کوئی اور نہ ہو اور وہ اُسے جی بھر کر سنگسار کر سکیں اور بالآخر وہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں..

ہم چہرہ بہ چہرہ روبرو تھے..

میرے اور اُس کے درمیان کوئی حائل نہ تھا..

مجھ پر.. میرے پورے وجود پر.. پاؤں سے لے کر کندھوں تک شدید دباؤ تھا، میرے پیچھے جو ہزاروں لوگ اس قدیمی ساتھی پر سنگ برسانے کی خاطر دیوانے ہوئے جاتے تھے، ان سب کے اشتیاق اور غضب کا دباؤ تھا.. لیکن میں اپنے مقام پر مضبوطی سے قائم رہا اور سلجوق نے میری کمر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر سہارا دے کر مجھے اس مقام پر قائم رکھا کہ آج تو ابا جی شیطان کے روبرو ہیں، دیکھیے کون جیتتا ہے..

شیطان صاف دکھائی نہ دے رہا تھا..

اس پر جو ہزاروں کنکریاں بارش ہو رہی تھیں. اس پر جو بارشِ سنگ ہو رہی تھی، اُس میں وہ کیسے صاف دکھائی دے سکتا تھا..

وہ اگرچہ ایک ان گھڑا سپاٹ پتھر تھا لیکن برستی کنکریوں کے درمیان میں کبھی اس کی ایک آنکھ نمودار ہو جاتی جو مجھے دیکھ کر پل بھر کے لیے بند ہو جاتی. شرارت سے کہ ہیلو تم بھی آ گئے ہو..

کبھی اس کی شکل ابھرنے لگتی کہ مجھے نہیں پہچانا..

میں اس شیطان کو سراسر الزام نہیں دے سکتا تھا..

اسے مکمل طور پر مجرم قرار نہیں دے سکتا تھا..

کہ اگر اس نے مجھے بھٹکایا. تو میں بھٹکایا جانا چاہتا تھا..

اگر اس نے مجھے راستے سے ہٹایا تو میرے اندر ایسے جرثومے تھے جو اس راستے سے ہٹنے کے لیے بے چین کلبلاتے تھے..

اور پھر یہ محض میرا اور اس کا معاملہ نہ تھا..

اس میں اُس کی رضا بھی تو شامل تھی..

اُسی نے تو اسے مجھے بھٹکانے اور علانیہ بہکانے کے لیے مامور کیا تھا؟

ہم دونوں اسی کی مرضی کے تابع مجبور تھے..

تو دوش کس کا تھا؟

تب میں نے اپنی پوٹلی میں سے پہلی کنکری نکالی..اور یاد رہے کہ اُس پر ہزاروں لاکھوں کنکریاں برس رہی تھیں..اور وہ کنکریوں کی اس برسات میں نہایت اطمینان اور تحمل سے..استقامت سے کھڑا تھا کہ تم بے شک آج جوش میں ہو، مجھ پر کنکریاں برساتے ہو لیکن جونہی تم اپنی اپنی دنیاؤں میں واپس جاؤ گے تو تمہارا یہ جوش اور جذبہ سرد ہو جائے گا اور تم پھر سے میرے راستے پر ہی چلنے لگو گے..میں انتظار کر سکتا ہوں..ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے، تم تو پہلی بار رُوبرُو ہوئے ہو اور میں ہزاروں برسوں سے تم جیسوں کے رُوبرُو ہوتا چلا آیا ہوں..

پہلی کنکری میرے ہاتھ میں تھی..

نشانہ میرے سامنے تھا..اور میں اولمپک کھیلوں میں شامل کسی نشانہ باز کی مانند حساب لگا رہا تھا کہ فاصلہ کتنا ہے..ٹارگٹ کا حجم کیا ہے اور اس پر کتنی قوت سے..کمان کو کتنا کھینچ کر تیر چلایا جا سکتا ہے..

مجھے یقین نہ آیا کہ یہ میں ہوں..

یہ میں..جو اس عمل کو ایک قدرے مزاحیہ انداز میں لیتا تھا..اسے ایک دانش سے عاری عمل سمجھتا تھا

اور یہ میں ہی تھا جو دیوانگی میں نہیں بلکہ مکمل حواس میں.. جوش سے الگ ہوش میں.. انتہائی سنجیدگی کے ساتھ پہلی کنکری پھینکنے کے بعد نہایت غصیلی حالت میں کنکریاں برساتا چلا جاتا تھا..

ایسا کیوں ہوا تھا؟

میں نے بہت بعد میں.. وطن واپس آ کر.. دنیا کے جھمیلوں میں ایک مرتبہ پھر الجھ کر.. جب کہ مجھے کبھی کبھار ہی یاد آتا تھا کہ میں نے حج کیا ہے اور وہ بھی تب یاد آتا تھا جب دودھ والا رمضان نہایت عقیدت سے دروازے پر دستک دے کر پکارتا تھا کہ حاجی صاحب دودھ کا برتن لے آئیں..

یہ بھی عجیب بات ہے کہ میں اس "حاجی صاحب" کی پکار پر خوش ہوتا تھا اور دل میں افسردہ ہوتا تھا کہ دوستوں اور عزیزوں میں سے کوئی بھی نہیں جسے یاد ہو کہ میں نے حج کیا ہوا ہے.. ان کا کیا قصور مجھے بھی یاد نہیں رہتا تھا..

تب میں نے اس ماہیت قلب کا تجزیہ کیا

کہ جس عمل کو میں بے جواز اور کسی حد تک بیوقوفانہ سمجھتا تھا، اس کی ادائیگی کیلئے میں کیوں ایک ایسے انسان میں بدل گیا تھا جو ہوش میں تھا لیکن اس میں جوش بھی تھا.. میں کیوں اتنے طیش میں تھا..

اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ انسان اس شیطان کی علامت پتھر پر نہیں دراصل اپنے آپ پر کنکریاں برساتا ہے، اپنے بھٹک جانے اور صراط مستقیم پر نہ چلنے کی خفت اور شرمندگی میں اس پر کنکریاں پھینکتا ہے..

شاید اسی لیے ہر کنکری جو وہ شیطان پر پھینکتا ہے اس کے اپنے بدن کو گھائل کرتی تھی.. اسے زخمی کرتی تھی..

پتھر سے تراشیدہ وہ شیطان تو محض ایک علامت تھی.. اس پر جتنی بھی کنکریاں بے شک ہزاروں برسوں سے.. لاکھوں کی تعداد میں برستی جائیں اسے کیا فرق پڑ سکتا تھا..

یہ تو تم.. آپ ہو..

اپنے رُوبرُو کھڑے..

چہرہ بہ چہرہ..

آمنے سامنے.. شرمندہ خجل.. وہاں بھی تم ہو، ایک پتھر کی صورت اور یہاں بھی تم ہی ہو اپنے آپ پر کنکریاں برساتے...

ایک دوسرے کے آمنے سامنے..

جیت کس کی ہوتی ہے.. اس سے کیا فرق پڑتا ہے..

کہ سامنے بھی تم ہو اور اس تم پر کنکریاں برساتے بھی تم ہو..

بس تم ہی تم ہو..

میں جتنی شدت سے.. جتنے شدید ہیجان میں.. تاؤ میں آ کر.. ایک ایک کنکری کو تولتا اندازہ لگاتا تھا کہ اس کنکری سے اُس کے دھڑ میں شگاف کرنا ہے اور اس کنکری سے اُس کے دل پر وار کرنا ہے.. میں اتنی شدت اور شدید ہیجان میں شاید اپنے سامنے آنے والے ایک ایسے دشمن پر بھی وار نہ کرتا جس کے بارے میں مجھے پیشگی اطلاع مل چکی ہو کہ وہ گھر سے صرف مجھے قتل کرنے کی نیت سے نکلا ہے..

نہ صرف ہڈیوں پسلیوں کو توڑ دینے والا دباؤ مجھے دھکیلتا تھا بلکہ میرے سر کے اوپر ہزاروں کنکریوں کی شائیں شائیں کرتی قطاریں حواس باختہ کونجوں کی مانند گزرتی تھیں اور ان میں سے کوئی ایک مجھے آ لگتی تو میں درد سے کراہ اٹھتا.. اگر وہ کسی حساس حصے پر جا لگتی تو میں کراہنے کی بجائے وہیں مسمار ہو جاتا.. لیکن مجھے کوئی ڈر نہ تھا..

یہ تو میرے حصے کی کنکریاں تھیں جو مجھے لگ رہی تھیں..

کچھ لوگ مجھے ہی شیطان جان کر مجھ پر کنکریاں برسا رہے تھے..

یہ جوڑ وہ بے جوڑ تھا..

چہرہ بہ چہرہ بڑا شیطان تھا تو یہ دو منزلہ تھا..

اس کی بنیاد اُس فلائی اوور کے نیچے ایک وسیع چھت کے تلے تھی جہاں سے رونما ہو کر جہاں ہم تھے، اوپن ایئر میں وہاں نمودار ہو رہا تھا..

یہ ایک جدید بندوبست تھا..

جن دنوں زائرین کی تعداد ہزاروں میں ہوا کرتی تھی تب اکیلا ہی شیطان کافی تھا.. جب یہ لاکھوں میں ہونے لگے تو اُن کی سہولت کی خاطر اس کا قد بڑھا کر دو منزلہ کر دیا گیا تا کہ گراؤنڈ فلور پر اور اوپر پہلی منزل پر بیک وقت اس کی گوشمالی کی جا سکے.. آج سے سو دو سو برس بعد جب زائرین کروڑوں کو چھونے لگیں گے، کیا ہوگا.. یہی ہوگا کہ شیطان کا گھر ایک سکائی سکریپر میں بدل جائے گا.. اس کا قد بڑھا کر اسے درجنوں منزلوں تک لے جایا جائے گا.. شنید ہے کہ اس امکان پر بھی غور کیا جا رہا ہے کہ ایک خودکار بیلٹ جس پر حاجی لوگ سوار ہوں.. خود بخود حرکت کرتی شیطان کے قریب آئے اور وہ کنکریاں برساتے گزرتے جائیں..

فی الحال یہ دو منزلہ تھا..

چنانچہ اس کا دھڑ نیچے تھا اور سر دوسری منزل پر ہمارے سامنے..

شیطان زائرین کی سہولت کے لیے دو حصوں میں بانٹ دیا گیا تھا.. سلجوق نے نیچے کی بجائے اس اوپن ایئر شیطان کا چناؤ اس لیے کیا تھا کہ یہاں دم گھٹنے کا امکان کم تھا.. نیچے کی نسبت کم ہجوم تھا اور کھلے آسمان تلے ہوا کا ایک آدھ جھونکا بھی آ جاتا تھا..

آج کے روز.. عرفات اور مزدلفہ سے لوٹ کر.. ایک محتاط اندازہ لگایا جائے تو ڈیڑھ کروڑ سے زائد

کنکریاں اُس اکیلی جان پر برس رہی تھیں..

کنکریوں نے ہمیشہ غلبہ پایا تھا..ہمیشہ فتح حاصل کی تھی..چاہے وہ ابابیلوں کے پنجوں میں ہوں یا ہمارے ہاتھوں میں..سوائے اس فرق کے کہ ابرہہ کی فوج تو ان کی یلغار سے بھوسہ بن گئی تھی اور یہ شیطان ایسا ڈھیٹ تھا کہ ہزاروں برسوں سے کنکریاں کھانے کے باوجود ابھی تک اس کا ایک بال بھی بیکا نہیں ہوا تھا۔اتنا پختہ اور مستقل مزاج تھا..

میں نے اپنی آخری کنکری کو نشانے پر لگتے دیکھا..

اس کا سر یہ نشانہ تھا..

میں یہ کیسے جانتا تھا کہ یہ میری ہی کنکری تھی جو اس کے سر کو جا لگتی تھی..کہ اس پر تو کنکریوں کی ایک برسات ہو رہی تھی۔

یقین جانیے وہ سب سے الگ نظر آتی تھی..

آپ کی آنکھیں اور بدن کی تمام تر حسیات اس کنکری کے پیچھے پیچھے یوں چلی جاتی ہیں کہ بقیہ ہزاروں کنکریاں بے آواز اور بے شکل ہو کر فضا میں تحلیل ہو جاتی ہیں اور صرف آپ کی پھینکی ہوئی ایک کنکری ہوتی ہے..مکمل تنہائی میں جو اُس کی جانب اُڑتی چلی جاتی ہے..سب سے الگ..واضح طور پر دکھائی دیتی ایسے کہ اس کا رنگ بھی جدا نظر آتا جاتا ہے۔اسی لیے میں نے اپنی آخری کنکری کو شیطان کے سر پر جا کر لگتے دیکھ لیا تھا۔

ویسے جی تو یہی چاہ رہا تھا کہ مزدلفہ کی رات میں سے جتنی بھی کنکریاں چن کر لایا ہوں، اُن سب کو بے دریغ داغ دوں کہ جی ابھی بھرا نہیں لیکن مجبوری تھی۔حکم تھا کہ آج کے روز صرف سات کنکریاں مارنے پر ہی اکتفا کرنا ہے..اور شرافت سے لوٹ جانا ہے۔ابھی دو مزید شیطان باقی ہیں اُن پر یلغار کرنے کے لیے کنکریاں سنبھال رکھنی ہیں..اور یوں بھی حلق میسر ہے احرام کو کھینچے چلا جا رہا تھا کہ ابا جی..بس بس..کیا ہو گیا ہے..بس کریں!

''اب ٹنڈیں کرانی ہیں حاجی ابا جی.. اور عید مبارک''

ابا جی یوں بھی اس دھکم پیل میں ادھ موئے ہو چکے تھے.. انہوں نے بس کر دی ہانپتے ہوئے سنگساروں کے حصار سے نکلے کہ سنگ ہر شخص نے اٹھا رکھا ہے اور نہایت طمانیت اور فتح مندی کے احساس کے ساتھ بچوں سے پوچھا ''ہاں جی اب کیا کرنا ہے؟''

''اب ٹنڈیں کرانی ہیں ابا جی۔'' سلجوق میرا احرام درست کرتے ہوئے بولا ''قربانی تو ہم پر واجب نہیں کیونکہ ہم جدہ کے مکین ہیں لیکن فی بندہ ایک ایک بکرا دَم کے طور پر قربان کرنا ہے جس کے لیے رقم جمع کروا دی ہے.. جونہی ہمارے بکرے قربان ہوتے ہیں ہمیں اطلاع آ جائے گی.. اس اطلاع کے بعد احرام کھول دینے ہیں.. نئے کپڑے پہننے ہیں یعنی نہا دھو کر اور پھر.. عید منانی ہے۔''

اگرچہ حج کا پورا شیڈیول مجھے ازبر تھا.. کہ احرام باندھو منیٰ جاؤ.. عرفات پہنچو.. خطبہ حج سن کر حاجی ہو جاؤ.. مزدلفہ میں رات گزارو.. کنکریاں چنو اور اگلے روز منیٰ واپس آؤ.. بڑے شیطان کو ہلاک کر کے.. قربانی کے بعد عید مناؤ.. لیکن یہ حقیقت ہے کہ شیطان وسوسہ انداز نے مجھے سب کچھ بھلا دیا تھا.. مجھے قطعی طور پر یاد نہ تھا آج تو عیدالاضحیٰ بھی ہے..

''تو عید ملیں؟''

''نہیں ابا.. ٹنڈیں کروا کے.. احرام کھول کر پھر ملیں گے.. آ جاؤ..''

''کہاں..؟''

''ٹنڈیں کروانے..''

اور وہ بھی کیا پُرلطف منظر تھا کہ شیطان سے جنگ و جدل سے فارغ ہو کر منیٰ کے طول و عرض میں ٹنڈیں ہو رہی ہیں.. لاکھوں لوگ سر جھکائے اپنے سروں پر مزے سے اُسترے پھروا رہے ہیں.. خون و خون ہو رہے ہیں کہ بیشتر اُسترے کُھنڈے ہیں اور انہیں پھیرنے والے ناتجربہ کار ہیں پھر بھی پھروانے والے اُف تک نہیں کر رہے اور اپنے سروں کو مختلف سائزوں کے تربوزوں میں بدلتے دیکھ کر نہایت پُرانبساط ہو رہے ہیں..

بیشتر حجام ایسے تھے جو ابھی ابھی حجام ہوئے تھے، زندگی میں پہلی بار اُسترا پکڑا تھا اس کا الٹا سیدھا بھی نہیں جانتے تھے اور تب جانتے تھے جب اس کے چلانے سے خون نکلتا تھا کہ اچھا یہ سیدھا ہے.. اور یہی وہ حضرات تھے جو حاجی بابا ز کے سروں پر ٹک ٹک اُسترے سے دستک دے کر خون برآمد کرتے تھے اور یہ فریضہ سرانجام دے رہے تھے اور بجائے اس کے کہ ایک تیز دھار آلے سے حملہ آور ہونے اور ایک معصوم شخص کو زخمی کرنے کے جرم میں انہیں پولیس پکڑتی وہ بے تابی سے ریالوں کے وہ پلندے پکڑ رہے تھے جو انہیں اس خدمت کے عوض پیش کیے جا رہے تھے..

ان نو آموز کاریگروں میں سے بیشتر سوڈانی، یمنی اور پاکستانی تھے جنہوں نے پہلے سے ہی اپنے احرام میں کند استرے اور سستے بلیڈ چھپا رکھے تھے اور اب کھلے عام ان کی نمائش کر رہے تھے کہ جس نے فوری طور پر عید منانی ہے، وہ ہمارے پاس آئے ہم نہایت سستے داموں اسے شتابی سے فارغ کر دیں گے.. بے شک سر پر پٹیاں باندھ کر عید منائے لیکن منائے گا فوراً..

یہ حجام فٹ پاتھوں پر، شاہراہوں کے بیچ.. ریستورانوں اور پہاڑیوں کی اوٹ میں اپنے استرے لہرا رہے تھے کہ ہے کوئی ہم سا جو سامنے آئے اور ٹنڈ کرائے.. کچھ ایسے صاحب کمال بھی تھے جنہوں نے فٹ پاتھ پر اپنے ساتھ دو تین حضرات ایسے بٹھا رکھے تھے جو فارغ البال ہو چکے تھے اور وہ ان کی ٹنڈوں کی جانب اشارہ کرتے بلکہ کبھی ایک آدھ دھپ لگا کر حاجیوں کو متوجہ کر رہے تھے کہ یہ دیکھو ہمارے کمالات اسی نوعیت کی ٹنڈ تمہاری بھی کریں گے.. آ جاؤ..

بعد میں معلوم ہوا کہ ہجوم میں یہ تو پتہ نہیں چلتا کہ یہ حجام حضرات کہاں پائے جاتے ہیں تو یہ کسی دوست یا ایک دو حاجیوں کی ٹنڈیں مفت میں کر دیتے ہیں اور انہیں پبلسٹی کے لیے ساتھ بٹھا لیتے ہیں.. اور حاجی بابا ز جب ہجوم میں ان کی ٹنڈیں لشکتی ہوئی دیکھتے ہیں تو کشاں کشاں ادھر کا رخ کرتے ہیں۔ ان صاحبانِ کمال و فن کو دیکھ کر مجھے اپنے گاؤں کا نائی ریشم کا گھبرو والا یاد آتا ہے جو پہلے اپنی بھینس کیلئے چودھریوں کے کھیت میں سے اپنے استرے سے چارہ کاٹتا تھا اور پھر اسی استرے کے ساتھ چودھری صاحب کی حجامت بناتا تھا اور ہر زخم پر روئی کے پھاہے لگاتا چودھری صاحب کے چہرے کو کپاس کا ایک کھیت بناتا چلا جاتا تھا..

لیکن حسن کارکردگی کے ان صاحبانِ فن کے علاوہ بھی.. ان سے الگ سرکاری قسم کا نسبتاً کم پرخطر بندوبست بھی تھا..

ایک بڑے ہال میں سینکڑوں کی تعداد میں نہایت تجربہ کار اور دیدۂ بینا رکھنے والے حجام اُسترے اور ریزر چلا رہے تھے.. اور نہایت مہارت سے چلا رہے تھے اور ان کے گاہکوں میں کوئی خال خال ہی تھا جو زخم کھاتا تھا ورنہ ان کے تراشیدہ سر فن کے نہایت ہی نادر نمونے تھے.. البتہ ان کا فی ٹنڈ ریٹ قدرے گراں تھا.. ایک نہیں.. دو تین ایسے بڑے بڑے عارضی طور پر ایستادہ ہال تھے..

یہاں.. داخلے کے دروازے پر آپ کو پہلے ٹکٹ یا ٹوکن خریدنا ہوتا تھا.. آپ سے دریافت کیا جاتا تھا کہ آپ حلق کروائیں گے یعنی مکمل طور پر فارغ البال ہو کر ٹنڈ لشکاتے کے آرزومند ہیں. صرف خشخشاشی کی خواہش رکھتے ہوئے سر پر محض مشین پھروائیں گے یا بس قصر کا ارادہ ہے یعنی بالوں کی ایک لٹ کٹوا کر شہیدوں میں شامل ہونے کی تمنا سے بے تاب رکھتے ہیں. تو ان سب آرزوؤں. خواہشوں اور تمناؤں کے ریٹ الگ الگ تھے..

آپ پیشگی ادائیگی کر کے تمنا کا پروانہ حاصل کر کے اس ہال میں داخل ہوتے ہیں جس کا فرش تراشیدہ بالوں سے ڈھکا ہوا تقریباً سیاہ ہو رہا ہے. تقریباً اس لیے کہ ان میں جہاں سیاہ... گھنگھریالے.. لہریئے لیتے بال ہیں تو کہیں کہیں بھورے بھی دکھائی دیتے ہیں اور کہیں سنہری رنگت کے گیسوئے آبدار بھی نظر آتے ہیں. سینکڑوں آرٹسٹ کہہ سابر بوز تخلیق کر رہے ہیں جو لیموترے ہیں. کہیں خربوزے بنے نمودار ہو رہے ہیں اور کہیں پچکے ہوئے کدو ہیں تو کہیں شاندار شکلوں کے ایسے فٹ بال تراشے جا رہے ہیں جو ورلڈ کپ کے پیمانوں پر پورے اُترتے ہیں.. اور کہیں عجیب سے بینگن بھی ظاہر ہو رہے ہیں.

ایسا لگتا تھا جیسے ہم نیشنل کالج آف آرٹس کی مجسمہ سازی کی کسی کلاس میں آنکلے ہیں..

مجھے افسوس ہے کہ حج کا بیان کرنے والے کسی بھی صاحب نے اس منفرد آرٹ فارم کا تذکرہ نہیں کیا جس کی مثال پوری دنیا میں نہیں ملتی.

سلجوق نے ایک حج دیدہ. تجربہ کار حاجی کی حیثیت سے ہمیں بے تاب نہ ہونے کا مشورہ دیا اور پورے ہال میں سرگشت کر کے ہر حجام، ہر نائی یا ہر مجسمہ ساز کی مشاقی اور کاریگری کا معائنہ کیا کہ کون ہے جو اس فن کو سنجیدگی سے لیتا ہے.. کون ہے جو استرے پر مکمل گرفت رکھتا ہے. حقیقت پسند ہے اور تجریدی آرٹ کا دلدادہ اُوٹ پٹانگ مجسمے نہیں تراشتا.. اور ان سب میں کون ہے جس کے آگے بے خطر سر جھکایا جا سکتا ہے کہ بعد از ٹنڈ سر جو ہے وہ سر ہی دکھائی دے. خون آلود میدانِ کارزار نہ دکھائی دے تو اُس کی نظر ایک ایسے حجام پر ٹھہر گئی جس کے سر پر بلوچی شیشہ گری کی ایک ٹوپی تھی اور وہ ہر حاجی کا استقبال یا حاجی کہہ کر نہیں.. میڈھا سائیں کہہ کر کرتا تھا.. اگرچہ ہمیں اپنی باری کے لیے کچھ انتظار کرنا پڑا لیکن وہ میڈھا سائیں ایسا سائیں تھا جس کے لیے کچھ انتظار کیا جا سکتا تھا..

باری باری سلجوق اور سمیر نے اپنے ظاہری حسن کو تذیر اُسترا کر دیا.. اور خاص طور پر سمیر نے جس کے بال گھنگھریالے اور کشش والے تھے..

میں آج تک ان دونوں کے درمیان صورت کی جو ہم آہنگی اور ہم شکلی تھی وہ کبھی جان نہیں پایا تھا..

وہ ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے..

سلجوق کا چہرہ الگ تھا. ستواں ناک اور ریشمی سیاہ آنکھوں والا اور سمیر کے چہرے پر جو رنگ رُوپ

تھا وہ بھائی سے بہت جدا تھا لیکن جونہی وہ دونوں فارغ البال ہوئے تو حیرت انگیز طور پر ایک جیسے ہو گئے.. جڑواں ہو گئے..

ابھی ان کی شباہت اور رنگ اتنے جدا تھے کہ بھائی نہ لگتے تھے..

اور ابھی میری نظروں کے سامنے یہ تبدیلی ظہور میں آئی کہ انہیں الگ الگ پہچاننا مشکل ہو گیا.. وہ بالوں سے فارغ ہوئے تو ایسے ہو گئے..

بالکل ایک دوسرے کی فوٹو سٹیٹ ہو گئے..

جڑواں ہو گئے..

میں جسے سلجوق کہہ کر پکارتا وہ سمیر نکل آتا..

اور جسے میں سمیر کہہ کر آواز دیتا تو سلجوق "ابی اِ!!" کہہ کر میرے قریب آ جاتا.. حج کے بعد سر منڈھانے میں.. ظاہری شباہت کو ترک کر دینے میں شاید یہی فلسفہ کارفرما ہے کہ کسی کی کوئی پہچان نہ رہے. کوئی ایک دوسرے سے الگ دکھائی نہ دے.. سبھی جڑواں ہو جائیں..

اس لمحے.. بڑے شیطان سے نبرد آزما ہونے کے فوراً بعد جب لاکھوں افراد اپنے بالوں سے فارغ ہو کر.. کچھ اپنے زخم سہلاتے تھے اور بیشتر نہایت فخر سے اپنی ٹنڈوں کو سہلاتے، ان پر ہاتھ پھیرتے تھے تو سچ کہتا ہوں کہ اس لمحے میری سب سے بڑی تمنا یہی تھی کہ میں بھی سر منڈھا ڈالوں اور پھر اس ہجوم ٹنڈاں میں شامل ہو جاؤں جو ہر سو بہار دکھاتا تھا. میرے سر میں کھجلی ہو رہی تھی کہ مجھ پر بھی بے شک ایک کند استرا چلے لیکن چلے.. لیکن اس تمنائے بے تاب کے راستے میں کچھ معاشی مجبوریاں حائل تھیں.. انہی دنوں ٹیلی ویژن پر میرا ایک شو آن ایئر جا رہا تھا اور واپسی پر مجھے میزبان کی کرسی پر بیٹھنا تھا اور اسی طرح دکھائی دینا تھا جیسے میں دکھائی دیا کرتا تھا. روزگار کے حصول کا معاملہ تھا.. اس لیے میں محض قصر کروا سکتا تھا.. چند بال کٹوا سکتا تھا.. سب کے سب اتروا نہیں سکتا تھا..

اگر میں جذبات کی رو میں بہہ کر ایسا کر لیتا اور ٹیلی ویژن سکرین پر ایک تربوز نما ٹنڈ کے ساتھ جلوہ گر ہو جاتا تو اپنی ہیئت کی اس یکسر تبدیلی کے دفاع کے طور پر مجھے اقرار کرنا پڑتا کہ سوری میں حج کر کے آیا ہوں.. میں یہ اقرار نہ بھی کرتا.. مُہر بہ لب رہتا تو بھی دیکھنے والے اس ہیئت کا سبب جان جاتے.. اور یہ میں ہرگز نہ چاہتا تھا.. اپنے حج کی تشہیر ہرگز ہرگز نہ کرنا چاہتا تھا کہ یہ میرا اپنا معاملہ تھا جس کا میری اشتہاری زندگی سے کوئی واسطہ نہ تھا.. بس یہی مجبوری تھی جس کی بنا پر میں محض ایک لٹ کٹوا کر سرخرو ہوا ورنہ کیسی شدت کی تمنا تھی کہ میں بھی اپنے سر پر استرا لگوا کر فارغ البال ہو جاؤں اور پھر اپنی ٹنڈ کو جو بے شک پکے ہوئے کدو ایسی نکل آئے، اُس کی نمائش کروں اور ہجوم میں دور سے پہچانا جاؤں کہ آہا حاجی صاحب چلے آ رہے ہیں..

ایک عجیب و غریب تبدیلی ظہور میں آئی..

پچھلے چند روز سے جتنے بھی لاکھوں زائرین تھے، نہایت پھونک پھونک کر قدم رکھتے تھے.. احرام سنبھالتے احتیاط سے چلتے تھے.. سر جھکائے کچھ نہ کچھ پڑھتے تھے.. تسبیح کے دانے گراتے تھے.. مدھم آواز میں بات کرتے تھے.. ایک دوسرے کے پاؤں پر پاؤں رکھنے سے اجتناب کرتے تھے.. یعنی نہایت ہی تمیزدار زندگی گزارتے چلے آئے تھے.. لیکن جونہی یہ اپنے بالوں سے فارغ ہوئے ہیں تو ہر پابندی سے فارغ ہو گئے ہیں.. بے پروا اور چلبلے اور نٹ کھٹ ہو گئے ہیں.. کھلے عام پر مسرت ہو کر قہقہے لگا رہے ہیں.. آزاد ہو گئے ہیں اور منیٰ کی شاہراہوں پر ایسے بے حجاب چلتے ہیں جیسے پیرس کی شانزے لیزے پر چہل قدمی فرماتے ہوں.. یہاں تک کہ حاجی خواتین بھی زیادہ حجاب میں نہیں اور ادھر اُدھر نظر بھٹکانے سے گریز نہیں کرتیں.. اور کیوں کرتیں.. آج عید کا دن تھا۔

یہ فرض تھا جو ادا ہو گیا..

ادا ہو گیا تو زندگی سے گریز کیسا..

منیٰ کی شاہراہوں پر منڈھے ہوئے سر ہچکولے کھاتے حرکت کرتے نظر آتے تھے.. جیسے وہ ایک دریائے چناب ہو جس کے پانیوں میں بہتے تربوز کندھے مارتے کبھی ڈوبتے ہیں اور کبھی دکھائی دیتے ہیں..

منیٰ مصر کا بازار تھا۔

افریقی ممالک سے آئی ہوئی خواتین نٹ پاتھوں کو یوں گھیرے ہوئے تھیں جیسے ان کے بدن کے گھیر تھے.. منیٰ کی دھوپ میں اُن کے رنگ رنگ پیراہن زینیا کے پھولوں کی مانند کھلتے اور گرمی کی شدت میں شوخ ہوتے تھے اور وہ فٹ پاتھوں پر.. ملک ملک کی ٹوپیاں.. جانماز.. خواتین کے پرس.. موتی منکے.. سستی لپ سٹکیں.. آئینے.. افریقی جھاڑیاں اور پتہ نہیں کیا کیا سجائے بیٹھی تھیں..

نہ صرف خواتین ہی نہیں حضرات بھی بے شمار تھے جو اوپن ایئر دکانیں سجائے اپنی اپنی زبانوں میں حاجیوں کو ورغلا رہے تھے..

اور حاجی بابا انہیں مایوس نہیں کر رہے تھے.. احراموں میں اب تک محفوظ ریالوں کو ہوا لگوا رہے تھے..

لگا ہے مصر کا بازار دیکھو..

یہاں زیادہ تر بازار جو تھا وہ مصر کا تھا یعنی جہاں مصر تھا اور مصر افریقہ میں تھا تو وہاں کا تھا..

سمیر ان فٹ پاتھی سٹالوں پر بار بار رکتا اور جھکتا تھا.. اپنی نئی نویلی اُسترا شدہ ٹنڈ پر کبھی کوئی انڈونیشین ٹوپی جماتا تھا.. کبھی افریقہ کی شوخ رنگی ایک ٹوپی سر پر دھپ لگا کر قائم کرتا تھا اور مجھ سے داد طلب کرتا تھا کہ ابا میں کیسا لگتا ہوں..

اپنے خیمے میں آتے ہیں..

فوری طور پر نہاتے ہیں.. اور جس طرح یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لینا تو منیٰ میں بھی یہ نہانا نہیں

آسان عید کی مسرت میں بس اتنا سمجھ لینا کہ غسل خانے میں جو گھس جاتا تھا، نکلنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ پچھلے کئی روز سے بدن میں سرایت کردہ ریت اور دُھول اور پسینے کو بہا کر ہی نکلتا تھا۔ غسل خانے کے اندر جاتا تھا تو احرام میں ہوتا تھا باہر نکلتا تھا تو دنیاوی کپڑوں میں جھجکتا ہوا نکلتا تھا کہ ان کی عادت نہیں رہی تھی۔۔

خیمے میں واپس آکر پھر یاد آیا کہ آج تو عید ہے۔۔

لیکن یہ کیا کہ اس عید میں وہ ہیجان وہ بے بہا مسرت اور خوشی کا اضطراب سرے سے مفقود ہے جو گھریلو عید کا خاصا ہوتا ہے۔۔ بے شک یہ منیٰ تھا لیکن آج کے دن لاہور کا ہم پلہ نہ ہوا۔۔

نہ سویرے سویرے کوئی بھگدڑ مچی۔ نہ بچوں نے غسل خانے کے دروازے کو بار بار پیٹا کہ ابا جلدی کرو، نماز کے لیے دیر ہو رہی ہے۔۔ نہ کھڑ کھڑاتی لٹھے کی شلوار اور اکڑتے ہوئے کرتے میں چپلیں گھسیٹتے بھاگم بھاگ لبرٹی پارک میں پہنچے۔۔۔ نہ لوگوں سے گلے مل مل کر پسلیوں پر بوجھ ڈالا اور نہ ہی نماز کے بعد پھول خرید کر اپنے والدین کی قبروں پر حاضری دی۔۔ اور گھر واپس آکر۔۔۔ سویاں۔۔

گھریلو عید کی داستان تو بہت طویل ہے۔۔

لیکن منیٰ کی عید کی داستان شروع ہوتی ہے مزدلفہ کی سویر میں۔۔ بڑے شیطان کی دوپہر میں۔۔ اور ٹنڈ کروانے کے بعد احرام کھولنے پر ختم ہو جاتی ہے بلکہ اس عید پر یکدم ایک ایسی تبدیلی رونما ہوتی ہے کہ ذہن فوری طور پر اسے قبول نہیں کرتا۔۔

میں جب خیمے سے باہر منیٰ کے بازاروں میں آیا تو وہاں لوگ بدل چکے تھے۔۔ جو کبھی تھے وہ نہ رہے تھے، کچھ اور ہو چکے تھے۔۔ لاکھوں افراد جو اب تک پہچان نہ رکھتے تھے کہ جدا جدا پیراہنوں میں نہیں ایک ہی سفید لباس میں حرکت کرتے تھے، واپس چلے گئے تھے۔ اپنے اپنے خطوں کے مختلف رنگوں کے لباسوں میں۔۔۔ پہلے ایک ہی چہرہ لگتے تھے، اب ہر ایک کی شناخت الگ الگ ہو گئی تھی۔۔ ہزاروں چہروں میں بٹ گئے تھے، بکھر گئے تھے، منتشر ہو کر معمولی اور بے وقت ہو گئے تھے۔۔

اگرچہ آج عید تھی لیکن آج ایک المیہ بھی ظہور پذیر ہوا تھا کہ احرام اُتر گئے تھے۔ جس سفیدی نے ہم سب کو اپنا آپ بھلا کر یکجا کر دیا تھا، وہ کھل گئی تھی، ہم پھر سے اپنے لباسوں، قومیتوں، شناختوں اور چہروں میں واپس چلے گئے تھے۔۔

''طوافِ زیارہ... حج ہاجرہ ہے' ایک سیاہ فام کنیز کے گھر کے گرد''

''تمام انسانیت میں سے ایک عورت..
اور تمام عورتوں میں سے.. ایک کنیز ایک غلام
اور تمام کنیزوں میں سے ایک سیاہ فام کنیز.. جس کا نام ہاجرہ تھا''
علی شریعتی کا کہنا ہے کہ وہ ایک سیاہ فام کنیز جس کا نام ہاجرہ تھا.. حج دراصل اس کے لیے خراج عقیدت ہے..

اگر اس کی جڑوں تک جایا جائے.. اس کی تہوں تک اُترا جائے تو حج ہاجرہ ہے.. طواف کے دوران مقام ابراہیم سے مڑتے ہوئے آپ خانہ کعبہ سے دور ہو جاتے ہیں کہ وہاں حطیم کا گوشہ ہے جس کے گرد دیوار ہے اور آپ اس دیوار سے لگ کر گزرتے ہیں.. وہی حطیم جو کبھی خانہ کعبہ کا ایک حصہ ہوا کرتا تھا اور وہاں نفل ادا کرنا گویا خانہ کعبہ کے اندر نفل ادا کرنا ہے.. تو اس گوشے کو مارٹن لنگز ''حاجراز سکرٹ'' کا نام دیتا ہے.. ہاجرہ کا حاشیہ.. لہنگا یا کنارہ..

ہاجرہ کا وہ کنارا حطیم.. جہاں حضرت اسماعیل کی پرورش کی گئی تھی..
ہاجرہ کا گھر یہاں تھا..
اور اُن کی قبر خانہ کعبہ کے تیسرے ستون کی قربت میں بتائی جاتی ہے..

کعبہ کے اندرون کی عمارت میں تین ستون ہیں جن کے روبرو ہو کر وہ خوش بخت جنہیں اندر جانا نصیب ہوتا ہے، ہر ستون کے روبرو ہو کر نفل ادا کرتے ہیں اور یہ مجھے سلجوق نے بتایا تھا.. تو وہاں جو تیسرا ستون ہے وہیں ہاجرہ کی قبر ہے... مارٹن لنگز جو اسلام کے قدیم ترین حوالے کھوج نکالتا ہے، اس کا بھی یہی کہنا ہے کہ جہاں حطیم کی دیوار ہے اس کے پیچھے ہاجرہ دفن ہیں..

یہ کیسا اعزاز ہے کہ کوئی بھی.. کوئی پیغمبر بھی یہاں دفن نہیں ہو سکا اور ایک سیاہ فام کنیز وہاں دفن

ہے.. اللہ کے گھر کے پڑوس میں ہے.. اس کی ہمسائی ہے.. اور وہ اس کا ہمسایہ ہے.. یہ کیسا مقام ہے..

وہ جو اللہ کے بلاوے پر یہاں آتے ہیں ان میں سے بیشتر اس حقیقت سے لاعلم ہوتے ہیں کہ ان کا حج مکمل نہیں ہو سکتا جب تک وہ ہاجرہ کے لیے حطیم کی دیوار کے قریب ہو کر طواف نہ کریں۔

ایک سیاہ فام افریقی کنیز اور دنیا کی ماؤں میں سے سب سے ممتاز ماں کی قبر کعبہ کا ایک حصہ ہے اور ابد تک لوگ اس کے گرد طواف کرتے رہیں گے..

اللہ تعالیٰ اپنی شان و شوکت اور یکتائی میں یکتا ہے.. اسے نہ کسی کی ضرورت ہے اور نہ ہی اپنی یکتائی کی تکمیل کیلئے کسی ایک ذرے کی حاجت.. تو وہ اپنی ان گنت تخلیق کردہ دنیاؤں میں سے صرف ایک ذی روح کو اپنی ہمسائیگی کے لیے چنتا ہے.. ایک سیاہ فام مصری یا افریقی کنیز کو..

انسانیت میں سے سب سے کمزور اور سب سے کمتر سمجھی جانے والی مخلوق کو اس نے اپنے برابر میں جگہ دی ہے.. اسے اپنے مکان میں کرائے کے بغیر ہمیشہ کے لیے رکھ لیا ہے.. ذرا سا غور کرنے سے کیسے کیسے پرت کھلتے جاتے ہیں..

حج کے دوران جتنے بھی عمل ہیں ان میں سے بیشتر ہاجرہ کی یاد میں ہی تو ہیں.. ہاجرہ نہ ہوتیں تو کس کا خاوند اور کس کا بیٹا خانہ کعبہ تعمیر کرتا..

ہاجرہ نہ ہوتیں تو مکہ نہ ہوتا..

نہ زم زم کا چشمہ پھوٹتا..

نہ ان کے بیٹے کو اس کا باپ اللہ کی راہ میں قربان کرنے کے لیے لے جاتا.. یہاں تک کہ ہجرت کا لفظ بھی ہاجرہ کی ذات کا مرہون منت ہے.. اور مہاجر بھی ہاجرہ کے نام کی ایک شکل ہے..

ذرا سا غور کرنے سے یہ بھی کھلتا ہے کہ حضرت ہاجرہ کی مادری زبان میں ان کے نام کا مطلب "شہر" ہے.. کونسا شہر.. مکہ!

تو پھر حج کیا ہے؟.. ایک سیاہ فام کنیز کو خراج تحسین پیش کرنا..

طواف زیارہ جاری تھا..

میں جب کبھی حطیم کی کمر تک آتی دیوار کے ساتھ ساتھ طواف کے دوران گزرتا تو مجھے وہاں اللہ تعالیٰ کی واحد ہمسائی ہاجرہ کی موجودگی کا یوں احساس ہوتا جیسے ابھی ابھی ایک چٹیل خشک آگ برساتی سلگتی جھلساتی ویران وادی میں کسی آتش فشاں کے اربوں برس پیشتر اُبلنے والے لاوے سے وجود میں آنے والی دنیا کی سب سے نامہربان وادی میں.. جہاں بچھو، سانپ اور کیڑے مکوڑے بھی سلگ کر راکھ ہو جائیں، وہاں تنہا بے یار و مددگار ماں ہاجرہ اپنے بیٹے کو سینے سے لگائے قہرناک دھوپ کے آتش عذاب میں سلگتی ہیں.. صرف اس لیے کہ وہ کمتر ذات کی تھیں.. ان کے بیٹے اسماعیل نے اپنے چھوٹے بھائی اسحاق کو غصے میں آ کر تھپڑ مار دیا

تھا اور بی بی سارہ نے اپنے خاوند سے کہا تھا کہ میں نے تمہیں ایک کنیز سے شادی کر لینے کی اجازت اس لیے دی تھی کہ میں اولاد سے محروم تھی، اب میں بھی ثمر آور ہوگئی ہوں تو اس کنیز کے بیٹے کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ میرے بیٹے پر ہاتھ اٹھائے.. اسے مجھ سے دور لے جاؤ..

اور جب اماں ہاجرہ کو ہم سب کے دینی سربراہ پیغمبروں کے باپ حضرت ابراہیم نے اس بے آباد ویرانے کی سلگتی چٹانوں میں چھوڑ دیا اور چلے گئے تو اماں ہاجرہ نے کوئی احتجاج نہ کیا۔

کوئی واویلا نہ کیا.. آہ وزاری، منت سماجت نہ کی...

اپنے خاوند کے حکم کے سامنے.. سر تسلیم خم کر دیا.. اس لیے نہیں کہ ان کی ذات کمتر تھی.. وہ کنیز تھیں.. مجبور تھیں.. نہیں.. ہرگز نہیں.. بلکہ اس لیے کہ اس لمحے دنیاؤں میں کوئی ایک شخص.. آزاد یا غلام.. کمتر یا بہتر ایسا نہ تھا جو اماں ہاجرہ کی مانند اللہ پر اتنا یقین رکھتا ہو کہ بے شک مجھے تنہا چھوڑ دیا جائے لیکن میں تنہا نہیں.. بے شک میرے اسماعیل کو چھوڑ دو لیکن اللہ ہمیں چھوڑنے والا نہیں، وہ ہماری نگہبانی کرے گا.. اور اگر میرے خاوند نے ہمیں یہاں چھوڑا تو بھی اللہ کے حکم کے تابع چھوڑا۔

یہ ایک عورت تھی..

یہ ایک عورت نہ ہوتی.. حقیر اور سیاہ فام کنیز تو خانہ کعبہ نہ ہوتا.. ایک بچے کی ماں نہ ہوتی تو ہمارے پیغمبر نہ ہوتے.. ہم آل ابراہیم پر اسی لیے تو درود بھیجتے ہیں.. عورت دنیا کے کسی مذہب میں.. یہودی، عیسائی یا بدھ میں.. عورت کہیں بھی اتنی ممتاز اور برتر نہ ہوئی جتنی کہ اسلام میں.. اور اس کے باوجود اسی اسلام کے نام پر اُسے حقیر اور کمتر جان کر ایک کنیز جان کر جانوروں کی مانند ہانکا جاتا ہے.. کیا ہم ذرا سا غور نہیں کر سکتے..

طواف کے دوران ہاجرہ کے لبادے سے چھوتے ہوئے مجھے ایسے ہی خیال آئے.. اور یہ طواف زیارہ تھا۔

ہم نے عید سے اگلی سویر منٰی کے بڑے پل پر.. آج سویر.. پل پر کھڑے ہو کر آس پاس ڈولتی سینکڑوں ویگنوں کو متوجہ کرنے کے لیے ''مکہ مکہ'' کے نعرے بلند کیے تھے..

کیونکہ ہم جلد از جلد مکہ پہنچنا چاہتے تھے..

طواف زیارہ کرنا چاہتے تھے..

لیکن ہمارے سوا بھی تو لاکھوں لوگ تھے جو ''مکہ مکہ'' پکارتے تھے.. طواف زیارہ کی تکمیل کے خواہش مند تھے..

اور ہم میں سے جو اصحاب.. ہمت اور درجات میں ہم سے بلند.. ثواب کی شراب کی آخری بوند تک کے طلبگار تھے، وہ منیٰ سے پیدل مکہ جا رہے تھے..

ہم میں ہمت نہ تھی اور ہم نے چونکہ پہلی بار اس شراب کو چکھا تھا اس لیے ہم پہلے ہی بہت مخمور تھے، اس لیے پیدل جانے کی بجائے سہارے تلاش کرتے تھے..

یوں بھی ہم میں اب وہ شوخی اور چلبلاہٹ باقی نہ رہی تھی جو حج کے ابتدائی ایام میں ہمارے تن بدن میں ٹھاٹھیں مارتی تھی.. کہ ہم ایک چہرہ نہ رہے تھے، کئی چہرے ہو گئے تھے.. اسی سطح پر آ گئے تھے جس سطح سے احرام زیب تن کرتے ہی ہم بلند ہو گئے تھے.. اپنے روزمرہ کے لباسوں میں کچھ بے آرام اور شرمندہ سے محسوس کر رہے تھے..

خانہ کعبہ کو ہم نے بھرے ہوئے پایا..

اُس کے اندر ایک دریا کی طغیانی تھی.. سیلاب آیا ہوا تھا..

ایک سیاہ پوش چاردیواری کے گرد اور ایک معمولی پتھر کے گرد ہجوم ایک گرداب کی مانند گردش کر رہا تھا.. جیسے سورج کے گرد لاکھوں سیارے گھومتے چلے جاتے ہوں..

خانہ کعبہ کا صحن ان سیاروں سے لبریز ہو کر کناروں تک.. صحن میں اترنے والی سیڑھیوں تک چھلک آتا تھا..

اور ہمیں اس گرداب میں شامل ہونا تھا..

جیسے ایک بلند پہاڑوں سے اترنے والی بے خود اور بے اختیار ندی کے تند و تیز دھارے میں شامل ہونے کے خیال سے ایک تنکا.. گریز کرتا ہے، پرہیز کرتا، ٹھٹکتا اور ہچکچاتا ہے کہ میں اس میں گیا تو بس گیا.. ڈوب گیا.. تو میں اپنے کنارے پر کھڑا گریز کرتا تھا..

یہ ندی اتنی پر شور اور تند تھی..

شور تو نہ تھا، سرگوشیاں، دعائیں اور التجائیں اور خواہشیں تھیں اور ایک بھنبھناہٹ تھی..

میں کتنی دیر گریز کر سکتا تھا.. شامل ہو گیا..

حجر اسود کی جانب سے آنے والی سیاہ پٹی پر رُک کر دونوں ہاتھ بلند کر کے اللہ اکبر کہا.. اس سے ہاتھ ملایا اور پھر سیلابی دھارے میں بہہ گیا.. بے اختیار ہوا اور گرداب میں ایک تنکا ہوا اور بے بس گھومنے لگا..

ہر وہ شخص جو اس گرداب میں شامل ہوتا ہے.. جان بوجھ کر اپنی من مرضی اور چاہت سے شامل ہوتا ہے تو دراصل وہ اپنے محور کی تلاش میں ہوتا ہے.. اس سے پیشتر وہ دنیاوی خلاء میں ایک بے وزن کیفیت میں ادھر ادھر ڈولتا پھرتا ہے.. اسے ہر وقت اپنی تمام تر قوت صرف کرنی پڑتی ہے.. مسلسل زور لگانا پڑتا ہے تاکہ وہ اس خلاء میں معلق رہے.. کہیں فنا کی کھائیوں میں گر کر اپنا وجود ہمیشہ کے لیے نہ کھو بیٹھے..

اور وہی شخص جب طواف کی گردش میں پاؤں رکھ کر اس کے بہاؤ کا ایک حصہ بن جاتا ہے.. تو اس دوران کوئی ایک مقام آتا ہے.. کوئی ایک لمحہ ایسا وجود میں آ جاتا ہے کہ اسے محسوس ہوتا ہے کہ اب اسے اپنی

قوت صرف کرنے کی حاجت نہیں رہتی.. زور لگا کر اپنے آپ کو سنبھالے رکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی.. اس کے راستے کا تعین کوئی اور کرنے لگتا ہے.. وہ اپنے ذہن اور خیال اور شک کو فراموش کر کے سب کچھ فراموش کر کے اپنے آپ کو اس محور کے حوالے کر دیتا ہے کہ اب جو کرے.. سو وہ کرے..

کعبہ ایک سیاہ سورج ہے..

کل کائنات کا.. اور آپ اس کے گرد گردش کر رہے ہیں..

اپنے محور میں آ گئے ہیں.. کائناتی نظام کا ایک حصہ بن گئے ہیں.. اور اپنے محور میں گھومتے چلے جاتے ہیں..

اس محور میں ہم جیسے بھی ہیں جو ابھی اپنے پاؤں میں چلنے کی سکت رکھتے ہیں اور وہ بھی ہیں جو لاچار اور مضمحل ہیں.. بیمار ہیں اور کہاروں کے کندھوں پر سوار ہیں.. ان کی اٹھائی ہوئی ڈولیوں پر سوار ہیں.. گرد و پیش سے غافل خانہ کعبہ کی جانب کبھی بے اختیاری میں نظر کرتے ہیں ورنہ سر جھکائے کہاروں کے کندھوں کی حرکت کے ساتھ ہلتے دعائیں کرتے ہیں..

ہم ایسی ڈولیوں کے راستے خالی کر دیتے ہیں.. سمٹ کر انہیں گزر جانے دیتے ہیں کہ یہ کہار کچھ لحاظ نہیں کرتے، آپ کو روندتے چلے جاتے ہیں کہ انہوں نے اس لاچار کو شتابی سے فارغ کر کے کسی اور مشتاق اور نیم اپاہج زائر کو اس ڈولی میں ڈال کر پھیرے لگوانے ہیں..

طواف سراسر خاموش رہ کر بھی کیا جا سکتا ہے اور فریادیں بلند کرتے کرتے بھی کیا جا سکتا ہے..

دونوں صورتوں میں کہیں نہ کہیں ذہن بھٹک جاتا ہے..

تو اس بھٹکے ہوئے ذہن میں ایک سوال ابھرا.. میں نے اس سوال کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے ڈبونے کی سعی کی لیکن وہ نہ ڈوبا.. پھر ابھر آیا کہ جو ہمارے آباؤ اجداد تھے اور دھرتی کے بیٹے تھے.. کم از کم میرے تو تھے کہیں باہر سے نہیں آئے تھے تو شاید ہندو تھے، اگر نہیں تو یقیناً سکھ تھے وہ بھی بیاہ کے موقع پر آگ کے گرد پھیرے لگاتے تھے.. میں نہیں جانتا کہ کتنے پھیرے لگاتے تھے، شاید سات ہی لگاتے تھے تو کہیں ہر مذہب میں کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی صورت میں طواف کی رسم موجود ہے؟

وہاں اگر درمیان میں آگ جلتی ہے..

تو یہاں کعبہ ہے جو سورج ہے.. آگ ہے..

اور ہاں یہ مت سمجھ لیجیے گا کہ خانہ کعبہ کے گرد طواف کرتے ہوئے بس روح میں بالیدگی پھوٹ رہی ہے اور آپ تقدس کے جہانوں میں کھوئے ہوئے چلتے جا رہے ہیں.. جناب اس میں دھکے بھی بہت پڑتے ہیں.. زائرین مسلسل اپنی کہنیوں کو آپ کی پسلیوں میں چبھوتے چلے جاتے ہیں.. یوں بھی ہوتی ہے کہ سنے بے شمار بدن ہوتے ہیں اور پاؤں تو برابر مسلے جا رہے ہوتے ہیں.. اور کبھی کبھار اتنی اذیت ہوتی ہے کہ

خانہ کعبہ آؤٹ آف فوکس ہو جاتا ہے..

ویسے اگر آپ اپنی جان عزیز رکھتے ہیں اور اس نیت سے گھر سے نہیں نکلے کہ خانہ کعبہ میں لوگ آپ کی نماز جنازہ پڑھنے کی سعادت حاصل کریں تو براہ کرم ٹرک زائرین کے راستے میں نہ آئیے گا.. ان کے بہاؤ میں رکاوٹ نہ بنئے گا کہ ان کے منصوبہ بند گروپ اپنی خواتین کو گھیرے میں لیے ایک بل ڈوزر کی مانند راستے میں آنے والے دیگر زائرین کو مسمار کرتے بڑھتے چلے جاتے ہیں.. علاوہ ازیں افریقی بہن بھائیوں کے جذب وشوق کو بھی فوراً راہ دے دیجیے وہ مضبوط آبنوسی پنڈوں کے سیاہ مجسمے ہوتے ہیں اور ان کے راستے میں جو بھی آئے گا، اگر کہیں جائے گا تو جان سے جائے گا.. میں نے ازراہ مروت اور اسلامی اخوت کے جذبے کے تحت ایک ایسے ہی رقص کرتے کہ وہ طواف کرتے ہوئے بھی اپنے بدن کو رقص کی کیفیت میں رکھتے ہیں، گروپ کو راستہ دیا لیکن شتابی سے نہ دیا تو افریقی بہنوں کی کہنیوں نے میری پسلیوں پر جو کرم کیا، وہ بعد ازاں مدتوں اک ٹیس کی صورت اُن کی یاد دلاتا رہا..

میرے پہلے طواف کے دوران اگر حجر اسود مجھ سے دو چار ہاتھ رہ گیا تھا تو آج اس کے اور میرے درمیان سینکڑوں ہاتھوں کا فاصلہ تھا اس لیے آج بھی اس کے ساتھ بوسہ بازی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا.. البتہ مجھ سے بڑھ کر کہیں جی دار اور مستقل مزاج باہمت خواتین وحضرات کسی نہ کسی طرح خانہ کعبہ کی دیوار تک پہنچ چکے تھے اور کعبہ کی عمارت سے منسلک ایک رتے پر پر جانے کیسے قائم ہو کر کھڑے تھے اور قطار بنائے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے.. وہ الگ الگ تو دکھائی ہی نہ دیتے تھے.. آپس میں جڑے ہوئے تھے اور نہایت پُرسکون حالت میں اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے.. جانے وہ اپنے آپ کو ایک رتے پر کیسے قائم رکھے ہوئے تھے.. ان کے نچلے دھڑ تو طواف کرنے والوں کے بدنوں اور جذبوں میں ڈوبے لگتے تھے: طواف کے بہاؤ کا اتنا زور تھا کہ جیسے ابھی ان کے دھڑ الگ ہو کر بہہ جائیں گے.. دیوار کے ساتھ یوں چمٹے رہنا بھی ایک کارنامہ تھا جیسے کوئی فری کلائمب کرنے والا راک کلائمبر صرف اپنے پنجوں سے اپنے آپ کو چٹان کے ساتھ قائم رکھتا ہے.. اور جو قطار تھی مجھے تو وہ حرکت کرتی محسوس نہ ہوتی تھی.. یوں بھی حجر اسود کے قریب تھوڑی سی بے ایمانی ہو رہی تھی.. لوگ ادھر ادھر سے گھس کر قطار والوں کا حق مار رہے تھے اور قطار والے اپنی اپنی زبان میں احتجاج کے نعرے لگا رہے تھے..

کبھی میرے برابر میں.. کبھی میرے آگے ایک عمر رسیدہ شخص.. اتنا کہ وہ جھکا ہوا تھا.. کمر سے اوپر کا دھڑ تقریباً زمین کے متوازی ہو رہا تھا.. اس کا پورا چہرہ کبڑے ہو جانے کے باعث فرش کعبہ کے رُو بہ رُو تھا.. اوپر تو کیا دائیں بائیں دیکھنے سے بھی لاچار تھا اور اس کی نظر صرف فرش پر پڑتی تھی اور ان ہزاروں ننگے پاؤں پر پڑتی تھی جو طواف میں تھے اور وہ ان پاؤں کے چہروں کو دیکھنے کے قابل بھی نہیں تھا.. بقیہ بدن کی مانند اس کی گردن کی رگیں بھی خشک ہو چکی تھیں..

اس شخص کا طواف کیسا ہے.. جو چاہتا تو ہوگا کہ اپنے بائیں جانب خانہ کعبہ کی سیاہ پوشی پر ایک نظر ڈال لے اور نہیں ڈال سکتا تھا.. اپنے ارد گرد بہتے چہروں کا جائزہ تو لینا چاہتا ہوگا لیکن مجبور تھا.. ایک ہی کبڑی حالت میں.. جیسے ایک درخت سوکھ چکا ہو.. تو یہ شخص کیا محسوس کر رہا ہے.. آبدیدہ ہے.. گلے شکوے کر رہا ہے کہ تو نے میری ایسی حالت کیوں کر دی کہ میں تیرا گھر بھی نہیں دیکھ سکتا.. کیوں بلاوا بھیجا تھا جو دیدار سے محروم رکھنا تھا.. تو جانتا تھا کہ میں جھک کر اکڑ چکا ہوں.. تو کیوں بلایا تھا.. میں اس کی جگہ ہوتا تو شاید ایسی ہی شکایت کرتا اور ناراض ہو کر کرتا.. لیکن اس کا سوکھا ہوا بدن فخر میں تھا اور خوشی میں تھا.. اس پر کسی رنجش، کسی ملال کا اثر نہ تھا.. بلکہ شاید اس کی یہ بےبسی اور لاچاری ہی اس کے جثے میں کوئی ایسی کیفیت بھر رہی تھی جو دوسروں کے نصیب میں نہ تھی.. ہم تو دائیں بائیں.. حرم کعبہ کے ستونوں اور برآمدوں کو اور اس کی منزلوں کو کبھی کعبے کو اور کبھی حجر اسود کو حسرت سے دیکھتے تھے اور وہ کچھ بھی نہ دیکھتا تھا.. سوائے حرم کے فرش کے اس ٹکڑے کو جس پر اس نے اپنا اگلا لرزتا ہوا قدم رکھنا ہوتا تھا.. شاید اسی لیے اس ساعت میں جس میں ہزاروں بلکہ لاکھوں لوگ طواف میں مگن تھے.. ان تمام لوگوں کی نسبت اس کے جذب کی کیفیت مکمل ترین تھی.. اس میں کوئی رخنہ کوئی نزاع نہ تھا.. اس کا خیال بٹتا نہ تھا.. توجہ ہٹتی نہ تھی.. ایک یکسوئی تھی بلکہ یک نظری تھی اور وہ اس میں گم.. آس پاس کے چہروں.. عمارتوں.. دیواروں اور اوپر جو آسمان تھا اس سے بےخبر اپنے دھیان میں گم ہولے ہولے چلتا جاتا تھا.. بغیر کسی سہارے کے..

میں بھی توجہ ہٹانا نہ چاہتا تھا لیکن اس کرخمیدہ شخص کی چال میں اور جذب میں ایسا سحر تھا کہ میں اسے دیکھتا جاتا تھا.. اس نے اپنا حج کیسے مکمل کیا ہوگا.. سوتا ہوگا تو اسی سکڑی حالت میں.. وضو کیسے کرتا ہوگا.. ویسے ہی دائمی رکوع کی حالت میں تھا تو رکوع کیسے کرتا ہوگا.. شیطان کو کیسے کنکریاں ماری ہوں گی.. وہ چل رہا تھا اسی کیف میں اور مکمل جذب میں صرف اگلا قدم رکھنے والے حرم کے فرش کے حصے کو دیکھتا.. جیسے صرف بھنور کی آنکھ کو دیکھتا ہو.. جیسے موم بتی کے شعلے میں ایک ایسا نکتہ ہوتا ہے جس پر توجہ مرکوز کرنے سے اسے تادیر دیکھنے سے انسان آس پاس سے بےخبر ہو کر کسی اور جہان میں چلا جاتا ہے..

میرا خیال تھا کہ وہ تنہا ہے لیکن نہیں.. دو شخص جن میں سے ایک اس کا بیٹا لگتا تھا کہ ڈھلتی عمر کا تھا اور دوسرا یقیناً اس کا پوتا تھا وہ اس کا دھیان رکھ رہے تھے.. اس پر نظر رکھ رہے تھے اور جونہی وہ متفکر ہوتے کہ کہیں وہ گر نہ جائے اور آگے بڑھ کر اسے سہارنے لگتے تو وہ دائیں ہتھیلی کو اٹھا کر انہیں ڈانٹ دیتا کہ پیچھے ہو جاؤ..

پہلا پھیرا مکمل ہونے پر جب وہ اس مقام پر پہنچا جہاں تمام زائرین اسی کی مانند کبڑے ہو جاتے.. جھک کر اپنی نگاہیں فرش کعبہ پر متلاشی رکھ دیتے اس سیاہ لکیر کو دیکھنے کی غرض سے جس پر رک کر انہوں نے حجر اسود اور اللہ کی جانب ہاتھ بڑھانا تھا تو وہ ان سب میں سے افضل ہو جاتا کہ اس کی آنکھیں سب سے پہلے اسے دیکھ لیتیں اور اس لکیر کے قریب ترین ہوتیں.. اگرچہ اس کی گردن کے اکڑے ہوئے پٹھے اسے حجر اسود پر

نگاہ کرنے کی اجازت نہ دیتے تھے لیکن وہ اپنا بایاں ہاتھ اپنے کوہان سے اونچا کر کے اتنی بلند آواز میں ''اللہ اکبر......'' پکارتا کہ سب زائرین ادھر ادھر دیکھنے لگتے کہ یہ آواز کہاں سے آئی ہے..

چوتھے پھیرے پر میں نے دیکھا کہ وہ کمر خمیدہ بوڑھا فرش حرم پر نڈھال ہو کر سانس درست کرنے کے لیے اسی کبڑی حالت میں سر جھکائے بیٹھا ہے اور اس کے دونوں عزیز زائرین کے آگے اپنے ہاتھوں سے بند باندھنے کی سعی کر رہے ہیں کہ کہیں وہ کچلا نہ جائے..

میرے رومی ستون محافظ بیٹے جانے کہاں تھے لیکن میں جانتا تھا کہ اگر میں کسی بھی مسئلے سے دوچار ہوتا ہوں تو وہ فوراً نمودار ہو جائیں گے..

لوگوں کے سروں پر تیرتی، ہچکولے کھاتی ایک بچی زائرین کے بہاؤ کی سطح پر بہتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی..

وہ نہایت سرخ سیب گالوں اور قدیم ہو چکے سونے کے زیور کی رنگت کے سنہری بالوں والی چھ سات برس کی ایک بچی تھی جسے کسی دراز قد نے اپنے کاندھوں پر اٹھایا ہوا تھا اور وہ سب زائرین سے الگ اور ممتاز نظر آ رہی تھی.. اسے اٹھانے والا تو نظر نہ آتا تھا بس وہ نظر آتی تھی اور ایک سنہری راج ہنس کی مانند خانہ کعبہ کے گرد دھیرے دھیرے ہچکولے کھاتی تیرتی دکھائی دیتی تھی..

میں شرمندہ تو تھا کہ خانہ کعبہ سے میری توجہ ہٹتی جا رہی تھی.. ہٹتی جا رہی تھی اور بار بار اس کا طواف کرنے والے چہروں پر مرکوز ہوتی جا رہی تھی..

ویسے مجھ میں اگر مکمل طور پر جذب ہو جانے غرق ہو جانے کی صلاحیت ہوتی جو ہونی تو چاہیے تھی تو میں اس سفر کے بارے میں ایک سطر بھی نہ لکھ پاتا.. میرے مشاہدے میں، یہ آج تک میرے مشاہدے میں آنے والے تمام لوگوں سے ممتاز اور انوکھے لوگ کیسے آتے.. میں اگر ان کو بیان کرتا ہوں تو رب کے گھر کو بیان کرتا ہوں..

ایک بابا جی کو دیکھا.

وہ اتنے بابا جی تو نہ تھے.. میں اگر اپنے بال رنگنا چھوڑ دوں.. داڑھی بڑھا لوں ایسی جو ناف تک آتی ہو تو میں ان سے کہیں بڑھیا بابا ہو سکتا تھا. تو یہ بابا نہایت متانت سے ایک ہی رفتار سے چلتے.. دھکے کھاتے.. ہجوم کے ساتھ کعبہ کے گرد گھومتے یہ بھی کہیں اور نہ تکتے تھے، سر جھکائے قرآن پڑھتے چلتے جاتے تھے.. دونوں ہاتھوں سے ایک بڑے حجم کا قرآن تھامے اسے اپنے آنکھوں سے ایک ہی فاصلے پر دھکوں کے باوجود قائم رکھے پڑھتے چلے جاتے تھے.. یہاں تک کہ جب وہ حجر اسود کی سیدھ میں پہنچتے اور ان کے آس پاس جو زائرین تھے، وہ لمحہ بھر کے لیے ٹھٹکتے رکتے تاکہ سیاہ لکیر شناخت کر کے اس پر ٹھہر کر ہاتھ اٹھا کر اگلے پھیرے شروع کر دیں.... تو وہ بابا جی چونک جاتے کہ اب کیا ہوا ہے.. قرآن سے نظریں اٹھاتے اور پھر شرمندہ سے ہو

کرایک ہاتھ سے قرآن سہارتے دوسرے ہاتھ کو بلند کر کے اللہ سے ہاتھ ملا کر پھر سے قرآن کے اوراق میں گم ہو جاتے..

میں نے اپنے پہلے طواف کے دوران عرض کیا تھا کہ یہاں دو چار نہیں سینکڑوں چہرے ایسے سامنے آتے ہیں کہ جن میں سے ہر ایک کی الگ کیفیت، جدا جذب، سرشاری اور مسرت اور اس کے ساتھ گمشدگی اور بیچارگی بھی.. اضطراب اور بے خودی بھی ایسی ہوتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے بارے میں کیسی آسانی سے ایک بھرپور ناول لکھا جا سکتا ہے..

لیکن نہیں لکھا جا سکتا..

یہ زندگی ناکافی ہے..

اگر تمام سمندر روشنائی ہو جائیں اور تمام درخت قلمیں تو بھی میں ان سب چہروں کو بیان نہیں کر سکتا کہ ان سب چہروں پر وہ تھا.. یہ سب اسی کے چہرے تھے جس کی ثناء کرنے کے لیے تمام سمندروں کی روشنائی اور تمام درختوں کی قلمیں ناکافی ہیں..

ساتواں پھیرا مکمل کرنے کے بعد ہم فی الحال حجر اسود کی جانب رخ کر کے آخری سلام کرتے ہیں اور ہم تنہا نہیں درجنوں اور بھی ہیں جو آخری سلام کرنے کے بعد بہاؤ کی مخالف سمت میں لوگوں کو بدتمیزی سے دھکیلتے اس گرداب میں سے جلد از جلد نکل جانا چاہتے ہیں..

کچھ دیر پہلے اسی گرداب میں شامل ہونے کے لیے کیسے بے چین تھے اور اب اسی بہاؤ میں سے نکلنے کے لیے کسی کا کچھ لحاظ نہ کرتے تھے..

ساتواں پھیرا مکمل ہو جاتا ہے..

لیکن سات پھیرے ہی کیوں..

سات کا ہندسہ ہمیشہ سے سب ہندسوں سے ممتاز رہا ہے..

خانہ کعبہ کے گرد پھیرے بھی سات.. ہفتے کے دن بھی اور آسمان بھی سات.. موسیقی کے سُر بھی سات.. اور شیطان کو سنگسار کرتے کے لیے کنکریاں بھی سات.. اور صفا و مروہ کے درمیان دوڑتے ہوئے بھی سات چکر.. تو ہم محض ایک طواف کر کے نہیں آئے تھے.. ہفت آسمان کی سیر کر کے بھی آئے تھے.. زمانے گزار آئے تھے.. سات سُروں کی سنگت میں گنگنا کر آئے تھے.. اور اس دوران شیطان کا تیا پانچہ بھی کر آئے تھے..

تقریباً ایک گھنٹہ پیشتر جب ہم اس خلق کے بہتے دریا کے کنارے کھڑے اس میں شامل ہونے کی سعی کرتے تھے تو اس لیے ہم محض کیچڑ اور گیلی مٹی تھے اور بے کار تھے.. اور جب اس دریا میں اترے ہیں تو اس کمہار نے ہمیں گھما گھما کر.. پھیرے پہ پھیرا لگوا لگوا کے.. اپنے چاک پر.. اپنے ہاتھوں سے ہماری بیکار کیچڑ مٹی کو ایک کوزے میں ڈھال دیا تھا..

وہ عجیب کوزہ گر تھا کہ بیکار سے بیکار مٹی سے ایک صراحی دار گردن والی صراحی تخلیق کر دیتا تھا۔ اور اس صراحی میں بے خودی کی بہت قدیم انگوروں کی شراب بھی بھر دیتا تھا۔۔ اور اسی لیے تو ہم چھلکتے جاتے تھے۔۔

تو ایک کوزے، ایک ابھی ابھی اس کے ہاتھوں کی ڈھالی ہوئی صراحی کے لیے چاک سے یکدم جدا ہو جانا بہت مشکل ہوتا ہے۔۔

اس دنیا کو چھوڑ کر ایک اور دنیا میں جانا کتنا دشوار ہوتا ہے۔۔

کس کا جی چاہتا ہے کہ وہ اس چاک سے الگ ہو جائے۔۔

لیکن یہ ایک اور دنیا چونکہ اماں ہاجرہ کی دنیا ہوتی ہے، اس لیے اتنا قلق نہیں ہوتا بلکہ انسان مزید پُر اشتیاق ہو جاتا ہے۔

ساتواں پھیرا مکمل ہونے پر حسب ہدایت ہم نے مقام ابراہیم کے جتنا نزدیک ہو سکتے تھے اتنا نزدیک ہو کر دو نفل ادا کیے اور پھر اپنی پیاس بجھانے کے لیے ایک چشمے کا رُخ کیا جو ہزاروں برسوں سے ہم جیسوں کی پیاس بجھاتا چلا آیا تھا

”زمزم ہی پہ چھوڑو، مجھے کیا طوفِ حرم سے
آلودہ بہ مئے جامۂ احرام بہت ہے“

بیئر زم زم۔

ٹھہر جا ٹھہر جا چشمہ۔

میرے جیسے کوہ نورد اور آوارہ صفت کے ذہن میں جب ایک چشمہ پھوٹتا ہے تو وہ راکاپوشی کے دامن میں ایک کنج کی پوشیدگی میں سے ظاہر ہوتا ہے اور میں اور میرے بچے گرمی کے ستائے ہوئے اس کے پانیوں سے ٹھنڈک پاتے ہیں.. یا شاہ گوری کے راستے میں پائن کے درختوں کی چھاؤں میں.. رُوپل کی وادی میں.. فیری میڈو کے قدیم جنگلوں میں.. جھیل صد پارہ کے کناروں کی ریت میں سے ظاہر ہوتا سونے کے ذرات سے سنہری ہوتے پانیوں والا ایک چشمہ..

لیکن یہ بیئر زم زم ان سے جدا کوئی اور چشمہ تھا.. بلکہ جتنے بھی چشمے میں نے بیان کیے ہیں، ان سب کا سرچشمہ تھا..

حضورؐ نے فرمایا کہ اگر ہاجرہ اس چشمے کو ”زم زم“ ٹھہر ٹھہر کا ذکر کر کے نہ روکتیں تو یہ پوری دنیا میں پھیل جاتا..

صحنِ حرم میں سے سنگِ مرمر کی سیڑھیاں نیچے اُتر رہی تھیں.. نیچے ایک اپنے تہہ خانے تک جاتی تھیں جس کی چھت پر تو طواف ہو رہا تھا اور نیچے قطار اندر قطار بے شمار نل کھلے تھے اور ان میں پانی ٹھہرتا نہیں تھا، رواں رہتا تھا.. وضو کیجیے.. پیاس بجھائیے یا اُس پانی سے اپنے چہرے پر چھینٹے مار کر تر و تازہ ہو جائیے.. جس پانی نے ہاجرہ کے بیٹے کے حلق میں اُتر کر اس کی پیاس بجھائی تھی..

یہ کوئی قدیم شکل کا کنواں نہ تھا کہ ڈول ڈال کر بوکا ڈبو کر اس سے بندھی رسی کو چرخڑی پر لپیٹ کر پانی نکالا جاتا.. اگرچہ چشمِ تصور یہی تصویر دیکھتی آئی تھی بلکہ نہایت ماڈرن سیٹ اپ تھا..

شیشے کی ایک دیوار جو اس تہہ خانے کو دو حصوں میں بانٹتی تھی اس کے پیچھے کچھ مشینیں نصب تھیں،

ٹیوب ویل نوعیت کی اور بے آواز چل رہی تھیں.. آواز تو ہو گی لیکن شیشے کی دیوار اسے ہم تک آنے سے روکتی تھی..
ان مشینوں کے پاس دفتر لگائے ایک پاکستانی انجینئر نہایت اطمینان سے بیٹھا کچھ حساب کتاب کر رہا تھا..

یہ بہت دنوں کا قصہ نہیں جب اس مقام پر واقعی ایک سچ مچ کا قدیم کنواں تھا اور اس میں ڈول ڈال کر پانی نکالا جاتا تھا اور زائرین اپنی پیاس بجھاتے تھے.. بوتلوں میں بھر بھر وطن لے جاتے تھے.. کچھ عزیزوں کو پیش کرتے تھے اور کچھ محفوظ کر لیتے تھے کہ جب مجھے دفن کرو تو اس پانی کو میرے چہرے پر چھڑک دینا..

شنید یہی ہے کہ زم زم کا ٹیوب ویل تو ایک ہی ہے جس میں دیگر درجنوں ٹیوب ویلوں سے پانی نکال کر اس میں آمیزش کر دی جاتی ہے.. تو ایسے کہ ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں.. لاکھوں زائرین تک دور جام تبھی آ سکتا ہے جب ساقی کچھ نہ کچھ ملا کر پیش کرے.. ویسے ساقی اس شراب کے ایک قطرے میں بے شک ایک دجلہ ملا دے لیکن اس قطرے کی خصلت اور خوشبو تو برقرار رہے گی..

چاہ زمزم مدتوں سے گمشدہ تھا.. کوئی نہیں جانتا تھا کہ کس مقام پر ہوا کرتا تھا..

لوگ چاہ زمزم کا صحیح محل وقوع بھول چکے تھے.. وہ صرف اجتماعی یادداشت میں ایک دھندلاہٹ میں گم تھا.. قیاس تھا کہ ارد گرد کے پہاڑوں سے بارشوں کے پانیوں کے ساتھ بہہ کر آنے والی مٹی کی تہہ کے نیچے یہ کنواں دفن ہو گیا تھا اور اس کا کوئی سراغ باقی نہ رہا تھا..

پھر حضرت عبدالمطلب کو بی بی ہاجرہ کے گوشے میں خواب کی حالت میں چاہ زمزم کے مقام کی نشاندہی کی گئی..

حضرت عبدالمطلب نے اپنے بیٹے حارث کی مدد سے اس مقام پر کھدائی شروع کر دی جس کی نشاندہی خواب میں کی گئی تھی.. منتظر پانی اُبلنے لگے.. مزید کھدائی پر اس کی تہہ کے کیچڑ میں سے کچھ نایاب تلواریں، زرہ بکتریں اور سونے کے بنے ہوئے ہرن برآمد ہوئے جو کبھی کعبے کے بتوں کو نذرانے کے طور پر بھینٹ کیے گئے تھے.. پوشیدہ کر دیئے گئے تھے تاکہ چرائے نہ جا سکیں اور اب زمزم کے ساتھ وہ بھی ظاہر ہو گئے تھے.. حضرت عبدالمطلب نے تلواریں اور زرہ بکتریں فروخت کر کے کعبہ کے بوسیدہ دروازے دوبارہ تعمیر کروائے اور سونے کے ہرن ان دروازوں پر سجاوٹ کی خاطر آویزاں کر دیئے..

ایک زمانے میں یہ عقیدہ بھی عام تھا اور عام مسلمانوں کا تھا کہ اگر اس کنویں میں چھلانگ لگا کر موت کو گلے لگا لیا جائے تو انسان سیدھا جنت میں جاتا ہے کہ اس کی تہہ میں جنت ہے.. یہ تو پرانے وقتوں میں ہوا کرتا تھا، ان دنوں بھی لوگ بہشتی دروازے میں سے گزرنے کے لیے جان داؤ پر لگا دیتے تھے کہ گزر گئے تو جنت کی ایڈوانس بکنگ ہو گئی..

چاہ زمزم میں جب ایسے معتقدین کی لاشوں سے پانی آلودہ ہونے لگا اور بدبو اٹھنے لگی تو کنویں کے اوپر ایک آہنی جالی نصب کر دی گئی تاکہ اس میں چھلانگیں نہ لگائی جا سکیں.. زمزم کے پانیوں سے وضو کرتے

ہوئے جب آپ اپنے پاؤں دھوتے ہیں اور آپ کی انگلیاں ایڑھیوں کو چھوتی انہیں صاف کرتی ہیں تو ایک لمحے کے لیے جھجک جاتے ہیں کہ کہیں ان کے رگڑنے سے کوئی اور چشمہ نہ پھوٹ نکلے..

دو ننھی منی ایڑھیوں نے کل جہان کو سیراب کر دیا..

اگرچہ روایت میں تھوڑا سا فرق ہے..

یہ چشمہ ننھے اسماعیل کی ایڑھیوں کی رگڑ سے جاری ہوا تھا..

یا بی بی ہاجرہ اپنے بچے کی پیاس سے نڈھال آہ و فغاں کرتی کبھی صفا پر دوڑتی جاتی تھیں اور کبھی واپس آ کر مروہ پر چڑھ جاتی تھیں اور اللہ سے مدد کی طالب ہوتی تھیں تو ساتویں چکر کے بعد جب وہ بیٹے کے پاس واپس آئیں تو ایک شخص یا فرشتہ اپنی ایڑھیوں کی رگڑ سے وہاں ایک چشمہ جاری کر رہا تھا..

کیا زمزم کا منبع صرف ایک ہے.. زیر زمین پانی کا کوئی ایک خاص دھارا ہے جو سطح پر آتا ہے اور زمزم کہلاتا ہے یا شہر مکہ کے نیچے پانی کے جتنے ذخائر ہیں انہیں بھی زمزم کہا جا سکتا ہے.. کیا یہ امکان بھی ہے کہ آج سے کئی سو برس بعد یہ چشمہ ایک مرتبہ پھر اوجھل ہو جائے.. گم ہو جائے یا خشک ہو جائے تو کیا اسے جزو ایمان بنانا چاہیے... یا ذہنی طور پر تیار رہنا چاہیے.. ہمیں نہیں ہمارے بعد آنے والی نسلوں کو..

شاید تب ایک اور عبدالمطلب آئے اور اس چشمے کو کھود نکالے

یا پھر ازل تک اس کے پانی کم نہ ہوں گے.. پیاس بجھاتے رہیں گے سیراب کرتے رہیں گے..

اپنے پاؤں دھوتے ہوئے ایڑھیوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آپ کو یہ احساس ہو جاتا ہے کہ یہ وہ ایڑھیاں نہیں ہیں جن کی رگڑ سے زمزم وجود میں آتے ہیں..

طواف کے دوران آپ حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسماعیلؑ اور اپنے اس نجن کے قدموں پر قدم رکھتے ہیں جس کی باداہی ڈاچی چھن چھن کرتی گلی میں سے گزرتی ہے..

جب کہ بیئر زمزم سے فارغ ہو کر آپ جب سعی کرنے کے لیے نکلتے ہیں تو گویا صرف بی بی ہاجرہ کے نقش قدم پر چلتے جاتے ہیں..

"طواف مکمل عشق، سعی مکمل دانش....

وہ سب ہاجرہ ہو چکے تھے"

سعی کے لیے بھی دو منزلہ سہولت ہے.. طواف کی تین منزلہ سہولت کی مانند..

حرم کعبہ کا ہی ایک حصہ.. ایک طویل ہال جس کے آخر تک نظر نہیں پہنچتی تھی.. درمیان میں کمر تک آتی ہوئی ایک حد بندی.. جو جا رہے تھے اور جو آ رہے تھے، ان کو الگ کرتی ہوئی..

یہاں نہ ان زمانوں کی دھوپ ہے اور نہ تپتے ہوئے سنگریزے.. نہ آس پاس ویرانہ ہے اور نہ سنگلاخ پہاڑ اور نہ پیاس.. جگہ جگہ خنک آبِ زمزم دستیاب ہے اور ایئر کنڈیشننگ کی ٹھنڈک ہے..

بہت دن نہیں ہوئے جب یہ سب آرام میسر نہ تھے.. یہاں صفا و مروہ نام کی پہاڑیاں اور ان کے پتھر موجود تھے اور زائر ایک بھرے پرے بازار کے بیچ اور کھلے آسمان تلے یہ فریضہ ادا کرتے تھے..

صفا اور مروہ.. جن کے درمیان بھاگ بھاگ کر بی بی ہاجرہ نے اپنے آپ کو بے حال کر لیا تھا کہ شاید صفا کی چوٹی پر پہنچوں تو کوئی کاروان اس ویرانے کو آتا دکھائی دے جائے.. شاید مروہ کے عقب میں کوئی نخلستان دکھائی دے جائے.. لیکن وہ وہاں تا دیر نہ ٹھہرتی تھی کہ بچہ اسماعیل تنہا ہے اور پیاسا ہے.. بھاگتی ہوئی اس کے پاس لوٹ آتی تھیں..

یہاں وہ کونسا ایسا مقام ہو سکتا ہے ایئر کنڈیشنڈ ہال.. سنگ مرمر کے فرش اور تیز روشنیوں میں جہاں حضرت اسماعیل ایڑھیاں رگڑتے تھے.. چاہ زمزم بھی تو اسی مقام پر ہونا چاہیے تھا جو نہیں ہے.. یہاں سے دور ہے حرم کے صحن میں.. ہو سکتا ہے کہ وہ اس ہال کے درمیان میں کہیں ہو اور اُس کے پانی سہولت کی خاطر اُدھر لے جائے گئے ہوں.. کیونکہ اسے تو صفا اور مروہ کے درمیان میں ہی کہیں ہونا چاہیے اور وہ نہیں ہے..

یہ بھی ممکن ہے کہ جہاں وہ آج ہے، وہی اس کا اصل مقام ہو اور وہیں حضرت اسماعیلؑ پیاس سے بلکتے تھے اور بی بی حاجرہ بالکل ناک کی سیدھ میں تو نہیں دوڑتی ہوں گی.. صفا پر چڑھتے ہوئے کبھی کوئی راستہ اختیار کرتی ہوں گی اور کبھی کوئی اور.. مروہ سے اترتے ہوئے بھی مختلف راستے آسانی کے مطابق اختیار کرتی

ہوں گی.. ہم آج جو ناک کی سیدھ میں دوڑتے چلے جاتے ہیں تو بی بی ہاجرہ ایسے تو ہرگز نہ دوڑتی ہوں گی.. چنانچہ ہمارا دوڑنا بالکل ان کے نقش پا کے مطابق ہرگز نہیں.. ایک علامت ہے، ایک یاد ہے..

ممکن ہو تو سعی پہلی منزل پر ہی کرنی چاہیے کہ اب بھی دونوں جانب تھوڑی سی چڑھائی ہے اور کچھ پتھر انہی زمانوں کے صفا کے بھی اور مروہ کے بھی موجود ہیں۔ اگرچہ انہیں محفوظ رکھنے کے لیے پلاسٹک کی ایک باریک تہہ سے ڈھانپا گیا ہے اتنی نفاست سے کہ ان کی اصل صورت پوشیدہ نہیں ہوتی صاف ظاہر ہوتی ہے اور دور سے شائبہ بھی نہیں ہوتا کہ ان پتھروں پر پلاسٹک کوٹنگ کی گئی ہے..

سعی کا آغاز صفا کے پتھروں سے ہوتا ہے.. آپ بی بی ہاجرہ اور حضرت اسماعیل کی موجودگی محسوس کرتے دعا کرتے ہیں اور اترنے لگتے ہیں.. چند قدموں کے بعد سطح ہموار ہو جاتی ہے اور آپ تیز تیز چلنے لگتے ہیں، تنہا تو نہیں.. ہزاروں ایسے افراد کے ہجوم میں جن کی ایڑھیوں میں وہی کسک ہے جو اسماعیل کی پیاسی ایڑھیوں میں تھی اور وہی بے چینی اور گھبراہٹ ہے جو بی بی ہاجرہ کی ایڑھیوں میں تھی۔

مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے اور وہ بھی ہر نسل کے.. قد بت جدا اور شباہتیں الگ چلتے جا رہے ہیں..

یہاں بھی طواف کی مانند سات کی قید تھی..

سات آنے جانے کرنے تھے.. اور ابھی پہلا جانا شروع ہوا تھا..

یہاں طواف کی نسبت زیادہ دشواری تھی.. وہاں اپنی مرضی سے اپنی رفتار سے بے شک افیونیوں کی مانند اونگھتے ہوئے بھی چلا جا سکتا تھا لیکن یہاں ایک ہی رفتار سے ایک ہی سمت میں مسلسل چلنا تھا.. یہاں سعی کرتے ہوئے تکلیف ہوتی تھی.. ننگے پاؤں سخت فرش پر کبھی چلتے اور کبھی بھاگتے اذیت ہوتی تھی..

ہم کوئی ہاجرہ تھوڑے تھے کہ آگ کی مانند سلگتے دہکتے کنکروں پر قدم رکھتے اور پھر بھی ثابت قدم رہتے..

آپ سعی کرتے ہوئے کچھ بھی کر سکتے ہیں.. دعائیں مانگ سکتے ہیں.. قرآن پاک پڑھ سکتے ہیں.. دائیں جانب جو راستے اور محرابیں حرم کی عمارت میں اترتے ہیں انہیں نظر میں لا سکتے ہیں کہ شاید کسی زاویے پر کسی اوٹ سے اللہ کا گھر نظر آ جائے جو نظر نہیں آتا.. یا پھر بائیں جانب حد بندی کے پار جو زائر مروہ سے واپس آ رہے ہیں آپ سے مخالف سمت میں چلے جا رہے ہیں، انہیں دیکھ سکتے ہیں اور ان سے پرے جو چھت تک پہنچتی کھڑکیاں ہیں ان کے پار مکہ کی عمارتوں کو دھوپ میں سلگتا دیکھ سکتے ہیں یا پھر آپس میں باتیں بھی کر سکتے ہیں۔ آپ جو کچھ بھی کرتے ہیں آپ کے اندر انہی زمانوں کی دھوپ اور تختی ہوتی ہے.. ہاجرہ کی بے چینی اور اسماعیل کی پیاس ہوتی ہے.. آپ محسوس کرتے ہیں کہ آپ محض ایک رسم ادا نہیں کر رہے ایک یاد تازہ نہیں کر رہے بلکہ بی بی ہاجرہ کے ساتھ ساتھ دوڑتے چلے جا رہے ہیں، پانی کی تلاش میں ان کے مددگار ہونے کی سعی کر رہے ہیں..

اس راستے پر چلتے ہوئے ایک پر لطف تجربہ ہوتا ہے..

اس ٹھنڈک بھرے ہال کی بلند چھت پر سبز رنگ کی روشنی بکھیرتی ٹیوب لائٹس آ ویزاں ہیں جو یہ آگاہ کرتی ہیں نشاندہی کرتی ہیں کہ تم اب اس مقام پر ہو جہاں بی بی ہاجرہ چلتے چلتے یکدم دوڑنے لگتی تھیں، اس تشویش سے ڈری ہوئی کہ میں اپنے بیٹے کو تنہا چھوڑ آئی ہوں۔ وہ یہاں سے نظر نہیں آ رہا، جانے وہ سانس لے رہا ہے یا نہیں۔ میں اس کے پاس پہنچوں تو وہ یکدم دوڑنے لگتی تھیں..

یہاں پہنچ کر ہر زائر اس سبز رنگ کی عامیانہ قسم کی ٹیوب اپنے اوپر روشن دیکھ کر یکدم دوڑنے لگتا ہے۔ تقریباً پچاس ساٹھ قدموں کے بعد چھت پر کچھ اور سبز رنگ کی ٹیوب لائٹس نشاندہی کرتی ہیں کہ یہاں آ کر ہاجرہ کو اپنا لخت جگر نظر آ گیا تھا اور وہ اطمینان سے چلنے لگی تھیں تو زائر بھی اطمینان کا سانس لیتے ہیں اور آرام سے چلنے لگتے ہیں..

میں اس پس منظر سے آگاہ نہ تھا، اس لیے اپنی دھن میں چلا جا تا تھا تو جونہی چھت پر نصب سبز ٹیوب لائٹس کے عین نیچے ہوئے تو سلجوق نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "ابا جی.. دوڑنا شروع کر دو"

ابا جی کے لیے چلنا محال ہو رہا تھا، دوڑتے کیسے تو بھلا کر کہتے ہیں "پر کیوں بچے؟"

"اس لیے کہ یہاں پہنچ کر بی بی ہاجرہ بھی دوڑنے لگی تھیں۔"

چنانچہ ابا جی بگٹٹ ہو گئے۔ ایسے کہ وہ مریل گھوڑے ہو گئے جو عام حالات میں مرے مرے سے مریل قدم اٹھاتے ہیں اور پھر ایک زوردار چابک لگنے سے چند لمحوں کے لیے بگٹٹ دوڑنے لگتے ہیں۔ ایسے ہو گئے..

صرف ہم تینوں نہیں.. بلکہ ہزاروں افراد جو ابھی اطمینان سے چلے آ رہے تھے.. ان ٹیوب لائٹس کے نیچے سے گزرتے ہی ڈربی ریس کے گھوڑے ہو گئے۔ کیا بوڑھے کیا جوان اور کچھ بچے لوگ بھی دوڑنے لگے جیسے گارڈ نے روانگی کی سیٹی بجا دی ہے اور گاڑی حرکت میں آ رہی ہے اور اس پر بہر صورت سوار ہونا ہے..

وہ جو بوڑھے تھے ان کی دوڑ دیکھنے کے لائق تھی.. وہ نوخیز شتر مرغوں کی مانند گردنیں ہلاتے لمبی لمبی پلانگیں بھرتے جوان ہو گئے تھے اور ہم سے کہیں آگے نکلتے تھے۔

ان شتر مرغوں اور وہ بھی نوخیز شتر مرغوں کا مجھ ایسے مریل گھوڑے سے کیا مقابلہ.. اسی لیے وہ مجھ سے آگے نکلتے تھے..

سعی کے اس حصے کو میں نے بہت پسند کیا اور اس میں ایک قدیم کہانی کو زندہ کر دینے والی جو قوت تھی، اسے اپنے سراپے میں محسوس کیا اور اس سے کیف حاصل کیا..

جہاں جس مقام پر بی بی ہاجرہ یکدم اپنے بچے کے لیے بے چین ہوئی تھیں کہ وہ یہاں سے نظر نہ آتا تھا.. کہیں اس پر کوئی آفت نازل نہ ہو گئی ہو.. کوئی جنگلی درندہ اسے اپنا نوالہ نہ بنا لے.. کہیں وہ پیاس سے مر نہ جائے.. ماتا کی کسک سے مجبور یکدم بھاگنے لگی تھیں وہاں اسی مقام پر ان کی یاد میں ہزاروں افراد.. ہر روز لاکھوں لوگ اور ہر برس کروڑوں زائر اسی مقام پر پہنچ کر بھاگنے لگتے تھے.. ان گنت صدیوں سے یونہی دوڑ

رہے تھے اور ان سب میں ہاجرہ کی روح حلول کر گئی تھی.. وہ ہاجرہ ہو چکے تھے جیسے ہر فرد ہاجرہ کے لیے نہیں اپنے آپ کے لیے.. اپنی خود غرضی میں مبتلا اس لیے دوڑتا ہے کہ اس فرد کا ایک بیٹا ہے جو پیاس سے بلک رہا ہے اور وہ یہ سعی اپنے لیے.. پانی کی تلاش کے لیے کر رہا ہے....

ایسی بے تابی اور اضطراب کسی رسم ادا کرنے سے.. کسی یاد کو تازہ کرنے سے جنم نہیں لیتے.. اپنے اوپر یہ سب کچھ بیتے تو یہ کیفیت طاری ہوتی ہے..

سعی کیا ہے؟

سعی ایک تلاش کا نام ہے..

یہ ایک ایسا تحرک ہے جو بے مقصد اور رکی نہیں.. اس میں مقصد ہے..

یہ سعی لا حاصل نہیں..

اور یہاں آپ کو کیا حاصل ہوتا ہے.. کیا سبق ملتا ہے؟

بے شک آپ خالق پر مکمل ایمان رکھتے ہیں، اس کی مرضی کے بغیر پتہ بھی نہیں ہلتا۔ اس پر یقین رکھتے ہیں تبھی تو ایک پُر ہول ویرانے میں تنہا ہو جاتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ موجود ہے، میں تنہا نہیں ہوں.. لیکن اس ایمان اور یقین کے باوجود آپ ہاتھ پر ہاتھ دھرے سب کچھ اسی پر چھوڑ دیے.. اس کی مددگاری کے منتظر بیکار نہیں بیٹھتے، محض دعائیں نہیں کرتے... بے شک صدق دل سے آہ و زاری کرتے محض دعائیں نہیں مانگتے کہ یا اللہ کافروں کی توپوں میں کیڑے ڈال دے.. ان کے ٹینکوں کا پٹرول ختم کر دے.. کشمیر، فلسطین، بوسنیا اور افغانستان کے مسلمانوں کو آزاد فرما.. کفار کو نابود کر دے.. امریکہ کو تباہ و برباد فرما اور طاغوتی طاقتوں کا قلع قمع کر کے ہمیں ان سب پر غالب کر دے.. اُمت مسلمہ کی مدد فرما اور اسلام کا غلبہ کر دے..

نہیں ایسی جذباتی اور کھوکھلی دعاؤں سے کچھ حاصل نہیں ہوا کرتا..

اگر ہونا ہوتا تو ہو چکا ہوتا..

اگر صرف دعاؤں سے کچھ ہو سکتا.. تو پیغمبروں کے باپ ابراہیم کی بیوی اور ایک پیغمبر کی ماں.. اور آخری نبی تک نبوت پہنچانے والی کی دعا میں قبولیت اور اثر انگیزی سے بڑھ کر کسی اور کی دعا ہو سکتی تھی..

لیکن نہیں..

بی بی ہاجرہ نے اس بیابان میں ایک آگ اگلتے ویرانے میں ایسی آگ اگلتے جس میں ان کے خاوند کو ڈالا گیا تھا.. ایسے ویرانے کے بڑے تندور میں سلگتے ہوئے اپنے بچے کے سرہانے بیٹھ کر محض دعاؤں پر اکتفا نہیں کیا تھا.. انہوں نے بھی جدوجہد کی تھی.. بھاگ دوڑ کی تھی.. سعی کی تھی.. پانی کی تلاش جاری رکھی تھی.. جستجو کی تھی.. ہاتھ پر ہاتھ دھرے.. رب سے مدد کی التجا کر کے.. کہ اب وہی سب کچھ کرے گا.. بیٹھی نہیں رہی

تھیں.. بھاگتی پھرتی تھیں.. تلاش کرتی رہی تھیں.. جدوجہد میں مصروف رہی تھیں اور چین سے نہ بیٹھتی تھیں..
اور وہ کوئی معمولی عورت نہ تھی..

جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں.. ایک نبی کی بیوی.. ایک نبی کی ماں.. اور نبی آخرالزماں کو وجود میں لانے والی عورت.. اللہ کے گھر میں جگہ پانے والی.. اس کی واحد ہمسائی وہ بھی دعاؤں پر انحصار نہ کرتی تھی.. حوصلہ نہ ہارتی تھی، مسلسل جدوجہد کرتی چلی جاتی تھی۔

بس یہی حاصل ہوتا ہے اس سعی میں..

سعی کے بغیر دعائیں محض بڑبڑاہٹ اور طفل تسلیاں ہیں.. فریب ہیں.. بے شک وہ دل کی صداقت سے اٹھتی ہوں.. بیکار ہیں..

حج کے بھی مقامات عجیب ہیں..

جب تک آپ خود نہیں آتے.. ساری حیات مطالعے میں مصروف رہیں.. حج کے ہر قدم کے بارے میں کتابچے اور کتابیں پڑھتے رہیں جب تک آپ خود نہیں آتے ان عجیب مقامات سے آگاہ نہیں ہو سکتے..

آپ نہیں آگاہ ہو سکتے کہ ان دوران کبھی تو آپ ابراہیم ہو جاتے ہیں اور کبھی اسماعیل کی پیاسی ایڑھیوں میں سرایت کر جاتے ہیں اور کبھی ڈاچی والے کے پیچھے پیچھے چلتے وہ جو قصوئی پر سوار ساجن ہے، اس کے رنگ میں رنگے جاتے ہیں..

سعی میں پوشیدہ ایک اور راز بھی ہے..

بہت کم لوگ اس راز کی تہہ تک پہنچتے ہیں..

حضرت ابراہیم کو آگ میں ڈال دیا جاتا ہے جسے پانی بجھا سکتا ہے.. سوائے اس کی منشا کے.. اور ہاجرہ بھی اسی پانی کی تلاش میں سرگرداں ہیں جو بیٹے کی پیاس کی آگ کو بجھا سکے..

آگ اور پانی کا کھیل سعی ہے..

مدتوں بعد فرات کے کناروں پر بھی پیاس اور پانی کا ایک اور کھیل کھیلا گیا..

بالآخر ہم ہانپتے ہوئے دوسرے کنارے پر مروہ کے پتھروں تک.. اور وہ بھی پلاسٹک کی تہہ میں محفوظ پتھر ہیں، ان تک پہنچتے ہیں..

ابھی تو مزید چھ راستوں پر چلنا تھا..

ابھی تو پہلا راستہ طے ہوا تھا..

پلاسٹک کی تہہ میں حنوط شدہ مروہ کے پتھروں کے اوپر.. ذرا بلندی پر بہت سے باہمت زائرین پہنچے ہوئے تھے شاید شوق کوہ پیمائی رکھتے تھے اور ہال کی چھت کی قربت میں مروہ کی وہ پہاڑی جو کبھی دھوپ میں سلگتی ویران تھی اور اب ڈھکی ہوئی ٹھنڈی ہو رہی تھی.. وہاں کچھ پرشوق براجمان تھے اور دعائیں مانگ رہے

تھے کہ یہاں سے اللہ کے گھر کا سیاہ لبادہ بھی دکھائی پڑتا تھا۔

شوق کوہ پیمائی تو میں بھی رکھتا تھا.. دو چار پتھروں پر ننگے پاؤں رکھ کر ذرا اوپر بھی گیا، پھر سوچا کہ پہلے سعی سے فارغ ہو جائیں پھر کوہ نوردی کریں گے.. مروہ کے پتھروں پر جو لوگ بیٹھے ہوئے تھے، ان میں سے بیشتر خواتین تھیں.. ایک سوڈانی عورت کی سیاہ آنکھوں کی سرخی میں سے مسلسل آنسو بہتے تھے.. جیسے آگ میں سے پانی ٹپکتا ہو.. ایک جانب فلپائن کی کچھ خواتین ایک جیسے لباس میں ایک جیسی ہی دکھائی دے رہی تھیں اور وہ بھی روتی تھیں تو ایک جیسی ہی روتی تھیں.. ان کے آنسو چپٹی ناک کے گرد خاصا فاصلہ طے کر کے گردن تک پہنچتے تھے.. اور وہ یاد کرتی تھیں اپنی اس ماں کو جس نے ان سب کی.. جو آج تک آئی ہیں.. جو آج کے بعد اس دنیا میں آئیں گی ان سب کی نمائندگی کر دی تھی.. ان کے حصے کی سعی کر دی تھی..

کہا جاتا ہے کہ اگر کعبہ کے گرد طواف سراسر روحانی بالیدگی کے لیے ہے تو یہ سعی اس دنیا کے لیے ہے.. یہ بدن کو آزار دینے والا ایک عمل ہے، اسے تھکا دینے والی کوشش ہے.. اس کا مطلب ہے کہ آپ اپنے پانی کے لیے زندگی کو بچانے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں، اپنے بچوں کے لیے یہ کشت کاٹتے ہیں.. یہ آپ کا فرض ہے کہ سب کچھ اللہ پر چھوڑ کر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ نہیں جانا بلکہ تگ و دو کر کے اُس چشمے کو دریافت کرنا ہے جو آپ کی قوم.. آپ کے بچوں کی زندگی میں جتنی پیاس ہے اُسے بجھا دے..

''طواف مکمل عشق ہے..

اور سعی مکمل دانش..

طواف میں بس وہ ہی وہ ہے..

اور سعی میں بس تم ہی تم ہو..

طواف اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے..

اور سعی تمہاری مرضی ہے..''

یعنی طواف.. صرف اللہ ہے..

اور سعی.. صرف انسان ہے..

طواف... روح ہے..

اور سعی... بدن ہے..

ہم پہلا سفر مکمل کر کے مروہ سے ذرا اونچے ہوئے اور پھر بائیں جانب اُتر کر جدھر سے آئے تھے

پھر اِدھر کا.. یعنی صفا کا رُخ کر لیا..

دو رویہ ٹریفک جاری تھی.. اور دونوں حصوں میں ون وے کے اصول پر سختی سے پابندی کی جاتی تھی.. البتہ درمیان میں ایک چھوٹا سا راستہ تھا اُن وہیل چیئرز کے لیے جنہیں افریقی اور سعودی دھکیلتے تھے اور جن پر وہ بوڑھے یا لاچار بیٹھے تھے جو خود چلنے کی سکت نہ رکھتے تھے.. اور میں انہیں دیکھ کر رب کا شکر ادا کرتا تھا کہ ابھی اپنے پاؤں پر چل سکتا ہوں.. خانہ کعبہ کے گرد ڈولیاں گھومتی تھیں اور یہاں وہیل چیئرز چلتی تھیں.. ان میں سبھی لاچار اور بوڑھے نہ تھے دو چار تن و توش کے ہاتھوں مجبور موٹے حضرات بھی ان میں بیٹھے دکھائی دیتے.. ایسے بے چارے کوشش تو کرتے ہیں.. ہمت کرتے ہیں لیکن دو یا تین چکروں کے بعد چکرا جاتے ہیں اور مجبوراً وہیل چیئر کرائے پر حاصل کر کے اس میں ڈھیر ہوتے ہیں اور سعی مکمل کرتے ہیں..

کچھ وہیل چیئرز کو بچے دھکیل رہے تھے.. اُن کے لیے یہ روزگار بھی تھا اور ایک کھیل بھی.. اس میں بیٹھا زائر تو دعاؤں میں مگن ہوتا لیکن وہ کھیل کود اور تفریح کے موڈ میں ہوتے.. دوسری وہیل چیئرز کے ساتھ دوڑیں لگاتے.. اپنی وہیل چیئر کے ہینڈل تھامے اسے معمول کی رفتار پر چلانے کی بجائے خوب زور لگا کر دھکیلتے چلتے جاتے اور جب وہ تیز رفتار ہو جاتی تو فوراً پیڈسٹل پر پاؤں جما کر اس پر سوار ہو جاتے اور قہقہے لگاتے دوسرے بچوں کو متوجہ کرتے کہ دیکھو میں مفت میں سیر کر رہا ہوں.. خاص طور پر جب وہ ایک چکر مکمل کر کے صفا یا مروہ کی معمولی اونچائی پر زور لگاتے چڑھتے اور پھر دوسری جانب اترتے ہوئے جب وہیل چیئر خود بخود رفتار پکڑ لیتی تو وہ اس پر سوار ہو جاتے.. اس دوران اکثر ایسا ہوتا کہ زائر جو دعا میں کرنے میں مگن ہے، آنسو بہا رہا ہے، اسے محسوس ہوتا ہے کہ شاید وہیل چیئر کی بریکیں فیل ہو گئی ہیں اور وہ ہراساں ہو کر سب کچھ بھول بھال کر دونوں ہینڈل مضبوطی سے تھام کر کہ پتہ نہیں میں اب کہاں جا کر یش کروں گا!! احتجاج کرنے لگتا..

صفا کو لوٹتے ہوئے اب میں جانتا تھا کہ تھوڑی دیر میں چھت پر نصب سبز ٹیوب لائٹس دکھائی دیں گی اور جونہی وہ نظر آئیں.. ان کے نیچے سے گزرتے تو بھاگنے لگے.. وہ منظر دیکھنے کے لائق ہوتا ہے جب ابھی تو رواں دواں ہجوم اپنی اپنی رفتار سے چل رہا ہے اور پھر یکدم سب کے سب بھاگنے لگتے ہیں.. اور ایسے نہیں کہ وہ ہراساں ہیں یا مجبور ہیں بلکہ ایسے جیسے مراتھن دوڑ میں حصہ لینے والے اپنی خواہش اور مرضی سے پر مسرت ہو کر بھاگتے ہیں..

اور ہر کوئی اپنی اپنی بدنی ہیئت اور شوق کے مطابق بھاگتا ہے..

کچھ جن کی ٹانگیں لامبی اور نوخیز ہوتی ہیں، سو میٹر والی برق رفتار ڈیش لگا دیتے ہیں.. کچھ دوڑتے نہیں بلکہ کاندھے ہلاتے سر ہلاتے چلتے جاتے ہیں.. ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس دوڑ میں سب سے آگے نکلنا چاہتے ہیں..

سلجوق اور سُمیر مستی میں آئے ہوئے سیاہ ہرنوں کی مانند قلانچیں بھرتے..

اور میں ایک فربہ دریائی گھوڑے کی مانند بے ڈھب ہانپتا ہوا..

صرف مرد بھاگتے ہیں.. عورتیں نہیں..

وہ اطمینان سے معمول کی رفتار سے چلتی یہ تماشا دیکھتی ہیں..

صرف اس لیے کہ بی بی ہاجرہ نے ان کے حصے کی دوڑ دھوپ کر لی تھی..

چنانچہ انہیں ہمیشہ کے لیے چھٹی مل گئی ہے..

اور مرد اس شرمندگی کو مٹانے کی خاطر دوڑتے ہیں کہ ایک عورت ہم پر بازی لے گئی تھی.. ہم اُسے بے یارومددگار چھوڑ کر چلے گئے تھے.. تنہا چھوڑ دیا تھا اور پھر بھی اس نے ہمت نہ ہاری تھی..

''انسان کے لیے کچھ بھی نہیں سوائے اس کے جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے''

اللہ کے اس فرمان پر صرف ایک عورت نے دھیان دیا تھا اور کوشش کی تھی.. اس نے ہم سب کو خبردار کیا تھا کہ تمہیں اتنا ہی ملے گا جتنے کے لیے تم سعی کرو گے تو صرف ایک عورت نے سعی کی تھی..

مرد اس خفت کو مٹانے کے لیے دوڑتے ہیں کہ وہ اس سعی میں شامل نہ تھے اور عورتیں ان دوڑنے والوں میں اطمینان سے چلتی جاتی ہیں..

اس سبز لائٹ کو سروں پر روشن دیکھ کر جونہی میں تیز رفتار ہوا.. بھاگنے لگا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک چینی باباجی ہیں جو شکل اور داڑھی کے چند بالوں سے کنفیوشس کے قریبی عزیز لگتے ہیں بلکہ وہی لگتے ہیں، سر جھکائے ایک جیبی سائز کے قرآن پاک کی تلاوت میں کھوئے ہوئے ہیں، انہیں کچھ خبر نہیں کہ وہ کہاں ہیں۔ بس کبھی کبھار سر ہلاتے ہیں تو ان کی داڑھی کے کُل پانچ سات سفید بال قرآن کے صفحوں پر لہراتے ہیں اور اطمینان سے گمشدہ حالت میں چل رہے ہیں تو میں بھاگتے ہوئے ذرا بریک لگا کر ان کے کندھے کو چھوتا ہوں، وہ چونک کر سر اٹھاتے ہیں کہ یہ کون نامعقول ہے جو مجھے جذب کی اس کیفیت میں ڈسٹرب کرتا ہے تو میں انگلی سے اوپر سبز ٹیوب لائٹ کی طرف اشارہ کرتا ہوں کہ بابو آپ چہل قدمی فرما رہے ہیں جب کہ یہاں تو دوڑنے کا حکم ہے.. وہ آس پاس کا جائزہ لیتے ہیں تو ان کے سوا سب حضرات ضرورت سے زیادہ متحرک گزرتے ہیں، پھر میری اٹھی ہوئی انگلی کی سیدھ میں اوپر نظر کرتے ہیں تو انہیں سبز روشنی نظر آتی ہے اور وہ ایک بے اختیار چینی سی ''ہوئے ہوئے'' کرتے ہیں اور یکدم سٹارٹ ہو کر یوں ڈُبکی لگاتے ہیں جیسے ان کی جان پر بن گئی ہو.. ایسے بھاگتے ہیں کہ دو کوہانوں والے باختری اونٹ بھی کیا بھاگتے ہوں گے.. مجھ سے بھی آگے نکل جاتے ہیں..

جب انہیں دوسری سبز لائٹ دکھائی دی جہاں پر عام رفتار میں آ جانے کا حکم تھا تو چینی بابا نے مڑ کر میری جانب دیکھا کہ ''ہوئے ہوئے'' اور پھر سے قرآن پاک کھول کر اس پر اپنی داڑھی کے چند بال لہرانے لگے..

جب ہم سعی کے چوتھے مرحلے میں تھے.. ٹھنڈے ماندے ننگے فرش پر ننگے پاؤں گھسیٹتے مروہ سے صفا کی جانب چلتے تھے تو وہاں ایک چھوٹا سا ''سانحہ'' ہو گیا.. مروہ کی جانب چلتے ہوئے دائیں جانب حرم کعبہ کی محرابیں اور دروازے ہیں.. اور صفا کی طرف لوٹتے ہوئے دائیں ہاتھ پر دیواریں ہیں جو چھت تلک پہنچتی ہیں

اور ان میں کہیں کہیں اونچی.. بھاری دبیز شیشوں اور آہنی سلاخوں اور پُر پیچ نقش و نگار والی شاندار کھڑکیاں ہیں جو کھلی نہیں تھیں بند تھیں، مضبوطی سے تاکہ جس موسم کو زائرین کے لیے خوشگوار بنایا گیا تھا، وہ ان کے راستے خارج نہ ہو جائے..

ان کھڑکیوں میں سے شہر مکہ دکھائی دیتا رہتا ہے..

کبھی کعبہ کے باہر کا کوئی حصہ.. کبھی کوئی ایسی چٹان جسے تراش کر اس پر تعمیر کردہ کوئی آسمان کو چھوتا ہوٹل.. یا کسی شہزادے کا کوئی محل.. اور کبھی کچھ مکان اور کبھی کچھ آسمان دکھائی دیتے جاتے ہیں..

تو ایک ایسی ہی بلند و بالا کھڑکی کے قریب سے ہم گزرتے تھے جب سلجوق نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے متوجہ کیا ''ابا وہ چٹان دیکھ رہے ہیں جو تراشی جا چکی ہے.. اس کے آس پاس ہی حضرت خدیجہ الکبریٰ کا آبائی گھر تھا.. اور اب وہاں حاجیوں کی سہولت کے لیے غسل خانے تعمیر کر دیئے گئے ہیں۔''

میں اس خبر پر.. یہ اطلاع پاتے ہی غائل سا ہو گیا اور بابا غار حرا سے اترتے جبل نور سے اتر کر اس گھر کی جانب چلتے دکھائی دیئے جس گھر میں انہوں نے ایک کمبل اوڑھنا تھا اور ایک عورت نے تصدیق کرنی تھی۔

''اور ابا،'' سلجوق کہہ رہا تھا ''کھڑکی میں سے آپ کو وہ چھوٹی سی عمارت نظر آ رہی ہے جو ان دنوں ایک لائبریری ہے اور اس کے ماتھے پر ایک سبز عبارت کا بورڈ آویزاں نظر آ رہا ہے..''

میں نے دیکھنے کی کوشش کی لیکن اتنی دیر میں ہم رکے نہ تھے چونکہ چلتے تھے اس کھڑکی سے گزر گئے لیکن فوراً ہی ایک اور کھڑکی آ گئی..

تپتی دھوپ میں.. مکہ کی چند ایک سیاہ پہاڑیاں جو ابھی تک موجود تھیں جنہیں ابھی تک ڈھایا نہیں گیا تھا.. نابود کر کے ان پر عمارتیں اور شاپنگ پلازہ تعمیر نہیں کیے گئے تھے ڈر کے مارے سمٹی ہوئی مکہ کی حدود پر بلند ہوتی تھیں اور ان پر غرباء اور مساکین کے کم حیثیت والوں کے مکان ایک دوسرے میں جڑے ہوئے تھے، ڈرے ہوئے تھے کہ وہ جانتے تھے کہ آج نہیں تو کل ان کی باری بھی آ جائے گی.. تو ان کے دامن میں.. حرم کی موجودہ حدود سے زیادہ پرے نہیں بلکہ وہاں جہاں ایک وسیع صحن میں ہزاروں کبوتر اترتے ہیں اور افریقی خواتین، اردو انگریزی اور پنجابی میں بھی زائرین کو متوجہ کرتی ہیں کہ کعبہ کے کبوتروں کے لیے دانہ لے لو.. اور وہ زائر جن کے پلے میں حج کی مراد نہ پالینے والے حسرت اور حسد کے مارے کچھ رقم باندھ دیتے ہیں کہ میری طرف سے خانہ کعبہ کے کبوتروں کو دانہ ڈال دینا.. سبز گنبد کے گرد جن کی اڑان ہے، ان کبوتروں کو بھی ان پیسوں سے دانہ ڈال دینا تو وہ بصد شوق یہ دانہ خریدتے ہیں تو اس صحن کے کناروں پر ایک معمولی سی.. اونی سی.. حال ہی میں تعمیر کردہ ایک دو منزلہ.. لوہے کی بے روح اور بے جمال کھڑکیوں والی ایک عمارت نظر آتی ہے جس کی پیشانی پر ایک بورڈ آویزاں تو نظر آتا تھا..

''ہاں بیٹے.. نظر آ رہی ہے..''

''ہمارے حضورؐ یہیں پیدا ہوئے تھے۔''

''پھر ترکوں نے ایک پہاڑ کی کوکھ میں اُس چھوٹے سے گھر کا تعین بھی کیا جس کی پہلی منزل پر شمال کی جانب قائم ایک چھوٹے سے بالکل چوکور کمرے میں کہ جہاں چہار آئینوں کی اوٹ میں چہار کتبیں ملتی تھیں، ایک بچہ جس کو کائنات کی امان تھی، ظہور میں آیا تھا۔ پھر اس بچے کو ایک بزرگ انسان نے اپنے سخت اور سورج سے کملائے ہاتھوں سے اپنی ایک چادر میں لپیٹا تھا اور وہ پگڈنڈی طے کی تھی جو اللہ کے گھر تک جاتی تھی۔۔

پہلی ربیع الاول کو اس کمرے کے اندر سفید رنگ کیا جاتا۔۔رنگ ساز حافظ قرآن ہوتے۔۔اور پھر ربیع الاول کی اُس رات جب آپ کا ظہور ہوا معصوم بچے اس کمرے میں آ کر قرآن کی تلاوت کرتے۔۔اگلی صبح پرندے آزاد کرنے کا رواج تھا۔''

(''خاک حجاز کے نگہبان'' ۔صلاح الدین محمود)

''ہیں۔'' میں نے صرف اتنا کہا۔

''ہاں جی ابا جی۔''

اور میں رُک گیا۔

''ہاں ابا یہ وہی مقام ہے جہاں حضورؐ کی پیدائش ہوئی تھی۔۔اُن کا مولد ہے۔۔آپ رکیں نہیں پلیز چلتے جائیں۔۔سعی کے دوران رکنا مناسب نہیں۔''

میں جان بوجھ کر تو نہیں رُکا تھا۔۔

ایک تنہا شخص پر اگر ایٹم بم گرا دیا جائے تو وہ جان بوجھ کر تو بھسم نہیں ہوتا۔۔اپنی مرضی سے تو فنا نہیں ہوتا۔۔

تو ''سانحہ'' یہی ہوا کہ میں نہ صرف سعی سے بلکہ طواف زیارہ سے بھی غافل ہو گیا۔۔راہ راست سے بھٹک گیا۔۔ہاجرہ کی نسل میں سے جنم لینے والے ایک شخص کے گھر نے یا اُس مقام کی نشاندہی نے جہاں کبھی وہ گھر ہوا کرتا تھا مجھے اُس کے گھر سے بھی لاتعلق کر دیا۔

اب میں مزید تیز چلتا تھا تا کہ جلد از جلد صفا تک پہنچوں۔۔پھر مروہ کی جانب لوٹ آؤں اور ایک مرتبہ پھر اس کھڑکی میں سے مجھے اس گھر کی ایک جھلک دکھائی دے جائے۔۔

میں اسی عامیانہ سی دو منزلہ عمارت کے ماتھے پر آویزاں سبز رنگ کے بورڈ کو ایک مرتبہ پھر دیکھنے کی آرزو میں سعی کرتا تھا۔۔

میرا دھیان بٹ گیا تھا۔۔

اب میں کعبہ سے غافل ہو رہا تھا۔۔

میرا دھیان کسی اور طرف چلا گیا تھا۔۔

بھٹک گیا تھا..

میرے دھیان میں بس چھمن چھمن کرتی گلی میں سے گزرتی ایک ڈاچی بادامی رنگ کی تھی.. اور کچھ نہ تھا.

میرے دھیان میں ایمان میں خلل آ گیا تھا..

بس یہی ''سانحہ'' ہو گیا تھا..

حاجی لوگ مکے کی جانب جا رہے تھے اور ہم کہیں اور جا رہے تھے..

اور ہم یوں بھٹک جانے پر کچھ ایسے شرمندہ بھی نہ تھے کہ رب کعبہ بھی تو اس کی محبت میں بھٹک گیا تھا.. اسے اپنا محبوب ٹھہرایا تھا.

تو یہ گھر خانہ کعبہ کی اتنی قربت میں قیام پذیر تھا..

وہاں سے.. جہاں اب کبوتروں سے اٹا ایک وسیع صحن ہے.. ایک بدوضع لائبریری کی عمارت اپنی پیشانی پر ایک سبز رنگ کا بورڈ آویزاں کیے نظر آتی ہے تو اس مقام پر کبھی جو گھر ہوا کرتا تھا، اس گھر سے یہاں تک.. جہاں میں تھا.. وہ کیسے آتا ہوگا.. کبھی پیدل.. اور اس کے نقش پا محلات اور آسمانی رفعتوں والے ہوٹلوں کے نیچے کہیں دفن ہو چکے ہوں گے.. تو وہ کیسے آتا ہوگا.. چلتے ہوئے وہ ایسا لگتا تھا جیسے اترائی اُتر رہا ہو.. اپنے سفید تہبند کو سنبھالتا.. کھدر کے کُرتے میں.. جس میں مکہ کی گرمی اور اُس کے مہک آور پسینے کی نمی تھی.. اپنی گھنیری زلفوں کو سنوارتا اور دستار درست کرتا..

کبھی حجرِ اسود کو ایک جھولی میں سے اُٹھا کر نصب کرنے کے لیے..

اور کبھی جو اُس پر اترتا تھا.. اس کا اعلان کرنے کے لیے..

اور کبھی دشنام سہنے کے لیے..

وہ اسی گھر سے ادھر آتا ہوگا..

اور کبھی اپنی سانڈھنی پر سوار بھی!

کہ بابا نے اپنی ڈاچی پر سوار خانہ کعبہ کا طواف بھی کیا تھا.

کیا وہ طواف کے دوران ڈاچی کی مُہار موڑتے تھے تو وہ کعبہ کے گرد مڑتی تھی یا اُسے کُھلا چھوڑ دیتے تھے اور وہ جانتی تھی کہ اُسے مڑنا ہے.. طواف کرنا ہے جیسے مدینہ پہنچ کر بابا نے کہہ دیا تھا کہ جہاں یہ ڈاچی بیٹھ جائے گی میں وہیں قیام کروں گا کہ یہ اللہ کی رضا سے بیٹھے گی..

تو میں بھی اگر غافل ہوا تھا تو اللہ کی رضا سے ہوا تھا..

چھمن چھمن کر دی گلی وچوں لنگدی
ساڈھے سجناں دی ڈاچی بادامی رنگ دی

"بچہ شیطانوں اور اُن کے ابّا جی کو ہلاک کرنے کی سعی لاحاصل"

اب جو طواف زیارہ سے فارغ ہو کر مکہ سے منیٰ لوٹے ہیں.. اپنے گھر لوٹے ہیں۔

تو اپنے خیمہ شہر منیٰ میں اپنے خیمے میں لوٹے ہیں تو معلوم ہوا کہ شیطان ہمارے منتظر ہیں.. بے شک ہم نے ابھی کل ہی بزرگ شیطان کو کنکریاں مار مار کر ادھ موا کر دیا تھا لیکن اس کے ہمراہ اس کے بال بچے بھی ہیں جن کی فوراً سرکوبی نہ کی گئی تو وہ موقع غنیمت جان کر بڑے ہو جائیں گے اور کبھی نہ کبھی بزرگ شیطان بن جائیں گے۔

"چلیں ابا.. آج ایک نہیں اکٹھے تین شیطان ہمارے منتظر ہیں۔" شاید سمیر نے کہا..

"بچہ.. یہ تو ازل سے ابد تک کا ساتھ ہے.. ہم نے کہاں جانا ہے اور ان پتھریلے شیطانوں نے کونسا اپنا مقام بدل لینا ہے.. ہزاروں برسوں سے وہیں مقیم ہیں تو انہیں تھوڑا سا اور انتظار کر لینے دو.. کہ میں بہت نڈھال ہو چکا ہوں۔" میں اپنے گدّے پر گرا اور بے سدھ ہو گیا..

پچھلے پہر نماز عصر کے بعد کچھ سدھ میں آیا، اُڑان کے قابل ہوا تو اپنی اپنی کنکریاں سنبھالے لاکھوں کے ہجوم میں سے راستے بناتے ہم بڑے شیطان کے سامنے پہنچ گئے۔ وہ غریب تو پہلے سے ہی ادھ موا تھا اسے مکمل طور پر ہلاک کرنے میں کوئی دقت نہ ہوئی.. اگرچہ اس کے بغل بچے ابھی تازہ دم اور نوخیز تھے لیکن وہ بھی ہماری کنکریوں کی بارش کی تاب نہ لا سکے اور انہوں نے بھی ہتھیار ڈال دیئے یا ہمیں گمان ہوا کہ انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں..

البتہ دوسرے چھوٹے شیطان کو کنکریاں مارتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ اُس کے چہرے پر ایک شیطانی مسکراہٹ ہے.. "تم مجھے اور ہمارے ابا جی کو ہزاروں برسوں سے کنکریاں مار رہے ہو جس کا مطلب یہ ہے کہ تم ہمیں ابھی تک ہلاک نہیں کر سکے تو آج کیا کرو گے.. تم موجود نہیں رہو گے لیکن ہم موجود رہیں گے۔"

اب ایک شیطان کی یاوہ گوئی پر کیا کان دھرنا.. اور وہ بھی بچہ شیطان..

جب ہم تیسرے شیطان کی جانب بڑھ رہے تھے تو میں نے دیکھا کہ کچھ ٹرک بچیاں چلتے چلتے یکدم جھکی ہیں اور چیخیں مارتی ہوئیں.. بے پناہ مسرت میں دیوانی ہوئی جاتیں فرش پر سے کچھ اٹھا رہی ہیں اور ایک دوسرے کو دھکیلتی آپس میں جھگڑ بھی رہی ہیں کہ یہ.. یہ میرا حصہ ہے.. میں نے پہلے اسے دیکھا تھا..

میں نے اُن کو یوں چیخیں مارتے زمین پر گری متاع کے لیے چھینا جھپٹی کرتے دیکھ کر یہی قیاس کیا کہ کوئی بہت ہی گراں بہا شے اُن کو پڑی مل گئی ہے.. کچھ اشرفیاں یا سونے کی کچھ ڈلیاں جن کے حصول کے لیے اتنے شدومد سے مارکٹائی ہو رہی ہے.. نہ اشرفیاں تھیں نہ ڈلیاں..

کچھ کنکریاں تھیں جنہیں زمین پر بکھرا دیکھ کر وہ اُن پر جھپٹی تھیں..

محض اس لیے کہ منیٰ میں اشرفیاں اور سونے کی ڈلیاں تو کسی نہ کسی طرح حاصل کی جا سکتی تھیں لیکن اس کی پکی سڑکوں، خیموں، پہاڑیوں یا ریت میں سے کسی ایک کنکری کا حصول بھی تقریباً ناممکن تھا..

زمین پر بکھری ہوئی یہ کنکریاں شائد کسی زائر کی پوٹلی میں سے گر گئی تھیں.. ہجوم کی دھکم پیل میں شائد کسی حاجی کی مٹھی کھل گئی تھی.. ہو سکتا ہے کسی کی جیب اُن کے بوجھ سے پھٹ گئی ہو.. ان میں سے جس کسی کی بھی یہ متاع تھی، وہ یقیناً خیمہ خیمہ بھیک مانگتا ہو گا کہ بابا ایک کنکری کا سوال ہے..

تیسرے اور آخری شیطان کو بھی اپنے تئیں زیر کر کے ہم خیر یت سے اپنے خیمے میں لوٹ آئے جہاں قونصلیٹ کے مظہر صاحب کے کچھ گرائیں جو مدت سے مکہ میں مقیم تھے، ان کے لیے اور ہمارے لیے بھی قربانی کے گوشت کی ایک دیگ بھون کر لائے تھے..

ہم مسلمان اُس پُرذائقہ.. ایسا ذائقہ جو صرف پاکستانی ہاتھوں کے بُھنے ہوئے گوشت میں ہوتا ہے اُسے شوق سے کھاتے ہوئے یہ بھول گئے کہ وہ تینوں شیطان لاکھوں کنکریوں کی بارش کے باوجود ابھی تک موجود ہیں.. اور رہتی دنیا تک موجود رہیں گے..

اس دوران سلجوق اور سمیر کی ٹنڈوں نے پھر بہت پریشان کیا.. میں اپنے گدے پر آرام کر رہا ہوتا تو خیمے کے پردے میں سے ایک ٹنڈ جھانکتی.. میں کہتا، سمیر بیٹے باہر گرمی کا کیا حال ہے..

تو وہ کہتا.. ابا میں تو سلجوق ہوں..

پھر میں ذرا احتیاط کرتا اور پردے میں سے جھانکنے والی ٹنڈ کو نہایت غور سے دیکھ کر کہتا.. سلجوق بیٹے مجھے چائے کا ایک کپ تو پلا دو..

اور وہ دانت نکال کر کہتا.. ابا لا دیتا ہوں مگر میں سمیر ہوں..

اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ بال اُتروانے کے بعد وہ بالکل ایک دوسرے کی فوٹو کاپی ہو گئے

تھے.. ویسے مجھے یہ بھی شک ہے کہ جسے میں ثمیر سمجھتا تھا وہ سلجوق نکلتا تھا تو وہ دراصل ثمیر ہی ہوتا تھا اور بابا جی کے ساتھ دل لگی کرتا تھا..

جب ہم شیطانوں کو سنگسار کرنے کی خاطر چلے جا رہے تھے.. سب سے آگے ثمیر اُس کے پیچھے سلجوق اور پھر میں.. سلجوق چھوٹے بھائی کی لشکتی ٹنڈ کو دیکھ کر رہ نہ سکا اور چپکے سے ایک ٹھونگا مار دیا.. اس پر میں بھی نہ رہ سکا اور آگے چلتے سلجوق کی ٹنڈ پر شرارت سے ایک ٹھونگا رسید کر دیا.. اور اُسی لمحے پیچھے سے کسی نے میرے سر پر بھی ایک ٹھونگا لگا دیا.. میں نے غصے سے پیچھا دیکھا تو ایک نوجوان سوڈانی آسمان کی جانب لاتعلقی سے دیکھ رہا تھا.. لیکن اس کی قابو میں نہ آتی سفید مسکراہٹ بتاتی تھی کہ وہ بھی نہ رہ سکا تھا...

مجھے اُس کی یہ حرکت بری لگنے کی بجائے اچھی لگی۔

"منیٰ کے گمشدہ بابے اور سُمیر"

میں نے ابھی تک منیٰ کے گمشدہ بابوں کا ذکر نہیں کیا۔

یوں تو پچیس لاکھ حاجیوں میں سے کوئی ایک حاجی بھی شاید قسم کھا کر یہ نہ کہہ سکے کہ پورے حج کے دوران میں.. کسی نہ کسی لمحے.. وضو کرتے.. سعی کرتے.. طواف کے دوران.. کہیں نفل ادا کرتے یا نماز کے بعد گم نہیں ہوا.. مکمل طور پر نہ بھی گمشدہ ہوا ہو تو عارضی یا وقتی گمشدگی تو ہر ایک کے حصے میں آتی ہے..

پچیس لاکھ لاگوں میں کسی نہ کسی وقت کھو جانا.. دوسروں سے.. اپنے گروپ یا عزیزوں سے بچھڑ جانا ایک نارمل وقوعہ ہے۔

سلجوق اور سُمیر مجھے ایک فٹ پاتھ پر بٹھا کر "ال بیک" سے کھانا حاصل کرنے کے لیے جاتے ہیں اور انہیں دیر ہو جاتی ہے اور میں ذرا ادھر اُدھر ٹہلتا ہوں تو وہ فٹ پاتھ دوبارہ نہیں ملتا.. اور یکدم میں اس خوف کا شکار ہو جاتا ہوں کہ میں گم گیا ہوں.. پتہ نہیں میرا خیمہ کہاں ہے اور میں کہاں ہوں.. خدا خدا کر کے وہ فٹ پاتھ پہچانا جاتا ہے اور میں وہاں براجمان ہو جاتا ہوں۔ اب اس وسوسے کے ساتھ وہ اس دوران آئے ہوں گے اور مجھے یہاں نہ پا کر چلے گئے ہوں گے.. میں اپنی پریشانی میں ہوں تو ایک مجھ سے کہیں زیادہ پریشان حال اور بوکھلائی ہوئی پنجابی دیہاتی خاتون نہایت لجاجت سے اپنی کلائی آگے کر کے کہتی ہے "وے بھرا.. میں گواچ گئی آں.." کلائی اس لیے آگے کرتی ہے کہ اس میں لوہے کا ایک بریسلٹ ہے جس پر اس کے مکتب کا نام وغیرہ درج ہے تا کہ ایسے گمشدہ لوگ اپنے ٹھکانے پر پہنچ جائیں۔ یہ تردد پاکستان سے آنے والے حاجیوں کیلئے کیا جاتا ہے جن میں بیشتر پڑھے لکھے نہیں ہوتے.. میرے پاس نظر کی عینک نہیں ہے، اس لیے بریسلٹ پر کندہ عبارت پڑھنے میں دشواری ہو رہی ہے اور وہ خاتون پھر کہتی ہے "ہا ہائے بھرا پتہ نہیں تینوں پنجابی سمجھ آؤندی کہ نئیں" میں اُسے یقین دلاتا ہوں مجھے بھی یہی زبان تو سمجھ میں آتی ہے.. اور اس دوران وہ کیا دیکھتی ہے کہ اُس کی ساتھی گمشدہ خاتون بالکل بے خبر کہ وہ فٹ پاتھ پر براجمان ایک بھرا سے گھر کا راستہ دریافت کرنے کے لیے رُک چکی ہے.. شاہراہ کے آخر تک پہنچ کر نظروں سے اوجھل ہونے کو ہے تو یکدم ہراساں ہو کر مجھے یعنی اپنے بھرا کو بھول کر اُسے آوازیں دینے لگتی ہے کہ.. میں فاطمہ ٹٹ پینئے.. مینوں کلی چھڈ چلی ایں.. کھلو جا۔

اور پھر وہ دوپٹہ سنبھالتی اُسے جا لینے کے لیے بھاگنے لگتی ہے۔۔

اتنی دیر میں سلجوق اور سُمیر بھی چکن کے ڈبے اٹھائے۔ فرینچ فرائز چباتے چلے آتے ہیں۔۔

ویسے تو گمشدگی کے لیے عرفات کا بھی کوئی جواب نہیں لیکن مکمل طور پر لاپتہ ہونے کے لیے منیٰ سب سے مناسب مقام ہے۔۔

ایک ہی رنگ اور شکل کے سفید سفید اہرام نما لاکھوں خیمے۔۔ ایک ہی طرز کی شاہراہیں اور پھر وہاں گھومتے لاکھوں افراد بھی ایک ہی لباس میں جن میں اُن کی شکلیں بھی ایک ہو جاتی ہیں۔۔ یہ بھی نہیں کہ آپ گم ہو گئے ہیں اور آپ کسی سے راستہ پوچھ لیں۔۔ کس زبان میں پوچھیں گے۔ سب یاروں کی زبان ترکی ہوتی ہے۔۔ اگر ایک تُرکی ہو تو پھر بھی دال دلیا ہو جائے یہاں تو درجنوں تُرکیاں ہوتی ہیں۔۔ اور من تُرکی نمی دانم۔۔

اگر پوچھ بھی لیں تو کیا پوچھیں گے۔۔ یہی کہ یا حاجی فلاں مکتب کدھر ہے اور اُس کا فلاں نمبر کہاں ہے۔ تو یہ یا حاجی کیا جانے کہ اُس کے مکتب کے سوا منیٰ میں کوئی اور مکتب بھی ہے۔۔

چنانچہ کوئی شخص اگر زندگی بھر نہیں گم ہوا تو منیٰ میں آ کر یہ شوق پورا کر لے۔۔ گارنٹی ہے کہ گم ہو گا۔۔ نہ گم ہوا تو پیسے واپس۔۔

اس متوقع گمشدگی کے سدباب کے طور پر لاکھوں کے ہجوم میں حرکت کرتے ہوئے حاجیوں کے تمام گروپ اپنا کوئی نہ کوئی امتیازی نشان فضا میں بلند رکھتے ہیں تا کہ دور سے دکھائی دے جائے اور اگر کوئی بچھڑ گیا ہے تو جان لے کہ یہ پاکستان سے آیا ہوا ہے، کراچی کے فلاں سکول سے آنے والی استانیوں کا گروپ ہے۔۔ اور وہاں بلوچ خواتین و حضرات مجتمع ہیں۔۔ اور اُدھر سوڈان کے رنگا رنگ پھریرے لہرا رہے ہیں۔۔

یہ امتیازی نشان لاکھوں کے ہجوم میں سربلند۔۔ نہایت انوکھے اور جدت آمیز ہوتے ہیں۔ خاص طور پر پاکستانی برادران کے۔۔

مثلاً کسی گروپ کے سربراہ نے اور میں ظاہر ہے تفننِ طبع کی خاطر یہ رپورٹ نہیں کر رہا، ایک بانس پر لوٹا اُلٹا کر کے اُسے فضا میں بلند کر رکھا ہے اور اس گروپ کے حجاج کرام اگر اِدھر اُدھر ہو جاتے ہیں تو وہ دور سے اپنا لوٹا دیکھ لیتے ہیں اور "یہ تو ہمارا لوٹا ہے" پکارتے آن ملتے ہیں۔۔

مختلف رنگوں کے پرچم بھی لہراتے ہیں لیکن رنگ تھوڑے ہوتے ہیں اور پرچم بے شمار تو یہ گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔۔

ملائیشیا سے آنے والی خواتین سفید پیراہنوں میں ہیں اور انہوں نے اپنے سروں پر سُرخ رنگ کے بڑے بڑے کنول کے پھول سجائے ہوتے ہیں۔۔ اور یہ کنول ہجوم میں تیرتے پھرتے ہیں۔۔

زرد گلاب بھی پسندیدہ ہیں..

ایک اور گروپ کا امتیازی نشان "چپل" تھا.. چھڑی میں اٹکائی ہوئی ایک سفید چپل حاجیوں کے ہجوم کے سروں پر دکھائی دیتی ہے..

غرض کہ سینکڑوں بلکہ ہزاروں گروپ اور ہر گروپ کا ایک ایسا امتیازی نشان جو سب سے جدا نظر آ سکے..

البتہ "عرب نیوز" کی رپورٹ کے مطابق اس برس کے حج کے دوران سب سے انوکھا امتیازی نشان ایک ایسے پاکستانی گروپ کا تھا جس کے لیڈر نے کرکٹ کا ایک بیٹ فضا میں بلند کر رکھا تھا.. اُس کا کہنا تھا کہ میں نے بہت سوچ بچار کیا کہ کوئی ایسا امتیازی نشان جنوں جو فضا میں بلند ہو تو ایسا منفرد ہو کہ میرے گروپ کے اِدھر اُدھر ہو چکے، بچھڑ جانے والے افراد اُسے دیکھیں تو فوراً جان جائیں اور کشاں کشاں اپنے گروپ سے آن ملیں۔ پھول، چپلیں، غبارے، مصلے.. گھٹیں چادریں اور پرچم بہت تھے تو ان سب میں ایک کرکٹ بیٹ نمایاں ہو جانے کی صلاحیت رکھتا ہے.. اور ان تمام جدتوں اور انوکھی نشانیوں کے باوجود لوگ گم.. ہو جاتے ہیں.. اگر گم ہوتے ہیں تو بیشتر پاکستان اور ہندوستان کے لوگ ہوتے ہیں.. بے شک ایک سفید احرام سب کو برابر اور یکساں کر دیتا ہے لیکن اس کے باوجود ہر نسل اور قومیت کے لوگ دور سے پہچانے جاتے ہیں..

افغان.. جھاڑیوں ایسی داڑھیوں.. آریائی تیکھی ناکوں اور گھنی ابروؤں سے.. صومالیہ والے اپنی پرتمکنت چال سے.. مجھے نہیں معلوم کہ اللہ تعالیٰ نے صرف اس قوم کے جینز میں کوئی ایسی خصلت کیوں سرایت کر دی ہے کہ وہاں کا ہر باشندہ.. بے شک وہ قحط کا مارا سر نے ڈالا ہو یا حج پر آیا ہو جب چلتا ہے تو شاہانہ اور پر وقار چلتا ہے.. جب کہ ہم پاکستانیوں کے جینز میں بھیڑوں کی بھگدڑ کے سوا کچھ اور شامل نہیں کیا گیا..

سوڈان کو بھی آپ دور سے پہچان لیں گے.. اکثر دراز قامت ہوگا.. ہمہ وقت مسکراتا ہوگا اور دھوپ میں اُس کے دانت لشکتے موتی ہو رہے ہوں گے.

مصری.. بیشتر مصری اپنی فرنچ کٹ داڑھیوں سے پہچانے جاتے ہیں..

ایرانی بہت گورے گورے ہوتے ہیں اور ترک ہمیشہ دعاؤں میں مگن رہتے ہیں..

ملائیشیا اور انڈونیشیا سے آنے والے حاجی جتنے بھی ہوتے ہیں، کم عمر اور نوجوان ہوتے ہیں کہ وہاں رواج ہے کہ شادی سے پیشتر حج کر لینا چاہیے..

اور برصغیر میں رواج یہ ہے.. کہ اپنی شادی کے بعد.. پھر اپنے بچوں کی شادی اور اگر گنجائش ہو تو بچوں کے بچوں کی شادی کے بعد.. جب دنیا اندھیر ہو جائے کچھ دکھائی نہ دے.. کچھ سنائی نہ دے.. دکھائی دے تو بھی عزرائیل دکھائی دے اور اگر سنائی دے تو بھی پھونکا ہوا صور سنائی دے اور گورکن آپ کا ناپ لینے کے لیے آ جائے کہ قبر کشادہ ہو.. گھر والے بیزار ہو جائیں کہ بابا رخصت کیوں نہیں ہوتا اور بڑھیا ہمیں کب تک

موسم کے میٹھے چاولوں سے محروم رکھے گی، تب حج پر آتے ہیں..

اسی لیے منیٰ میں گمشدہ باباؤں میں سے بیشتر کا تعلق برصغیر سے ہوتا ہے..

سمیر چونکہ بچپن سے ہی ہر نوعیت کے بابوں کے بارے میں فکر مند رہتا آیا ہے.. تو اس نے یہ فکرمندی یہاں بھی جاری رکھی. یعنی میں پوچھتا ہوں کہ بیٹے آج سکول سے دیر سے آئے ہو تو وہ کہتا ہے.. ابا ایک بابا جی سڑک پر کھڑے تھے انہوں نے ٹاؤن شپ جانا تھا.. کسی روز وہ گھر میں داخل ہو رہا ہے اور میں اس کا پژمردہ بجھا ہوا پرتشویش چہرہ دیکھ کر خود تشویش میں مبتلا ہو جاتا ہوں اور پوچھتا ہوں کہ بیٹے کیا بات ہے..

گرمی بہت ہے.. طبیعت تو ٹھیک ہے ناں.. تو وہ کہتا ہے.. دھیان سے کھانا نہیں کھا رہا اور کہتا ہے.. ابا حسین چوک کے پار ایک اماں جی سر پہ گٹھڑی اٹھائے دھوپ میں کھڑی تھیں.. پتہ نہیں کیوں کھڑی تھیں تو میں معاملے کی تہہ تک پہنچ جاتا ہوں اور مشورہ دیتا ہوں کہ آپ گاڑی لے جاؤ اور اس کمبخت اماں جی نے جہاں جانا ہے انہیں پہنچا کر آ جاؤ.. کہ شام تک تم ایک فکرمند اداس شکل بنائے ہماری زندگی اجیرن کر دو گے.. وہ جاتا ہے اور فوراً واپس آ جاتا ہے.. ابا جی.. وہ اماں جی تو وہاں نہیں.. پتہ نہیں کہاں چلی گئی ہیں..

میں ایک پتھر دل کا کسی حد تک بے حس بندہ ہوں جس پر کچھ اثر نہیں ہوتا اور اگر سمیر میں ہمدردی اور دوسروں کے دکھ بانٹنے کے کچھ جرثومے ہیں تو میری وجہ سے نہیں میرے والد کی ودیعت ہیں..

سول سروس کے انٹرویو کے دوران چیئرمین جو ایک ریٹائرڈ جرنل ہے سمیر سے سوال کرتا ہے..

تمہارے والد بہت جانے پہچانے اور معتبر ہیں تو یقیناً وہ تمہارے آئیڈیل ہیں..

اور سمیر اتنا کمینہ بچہ ہے کہ کہتا ہے ''نہیں جناب، وہ ہرگز میرے آئیڈیل نہیں ہیں.. میرے داداجان میرے آئیڈیل ہیں۔''

چنانچہ سمیر نے منیٰ میں پہنچ کر بھی یہی ڈیوٹی سنبھال لی.. گلیوں میں گھوم پھر کر، دوپہروں میں اور گئی راتوں میں وہ گمشدہ بابوں کو تلاش کر کے انہیں ان کی منزل، ان کے مکتب تک پہنچاتا رہا..

ان میں ایک بنگالی بابا تھا جو عرفات سے واپسی پر اپنے گروپ سے بچھڑ گیا تھا اور مزدلفہ میں جانے کیسے رات گزاری پھر وہاں سے پیدل ہی چل دیا.. منیٰ پہنچ تو گیا لیکن مکتب کیسے ملے.. سارا دن اور ساری رات بھوکا پیاسا گلی کوچوں میں فریاد کرتا پھرا..

ایک صومالی بوڑھا تھا جس کی چھاتی بمشکل چھ سات انچ چوڑی ہو گی اور اس پر مرجھائے ہوئے سفید بال تھے.. بہت منحنی اور ناتواں لمبی.. صرف ایک چھوٹی سی لنگی میں ملبوس.. اپنی زبان میں بولتا چلا جا رہا ہے..

اگرچہ میں بھی یہ قسم تو نہیں کھا سکتا تھا کہ حج کے دوران بالکل گمشدہ نہیں ہوا.. کئی ایسے لمحے آئے ہیں کہ میں اپنے بیٹوں سے بچھڑا اور مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہم نہیں ملنے کے.. لیکن یہ عارضی بچھڑنا ثابت ہوتا تھا.. اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ تھوڑی بہت خجل خواری کے بعد اپنے خیمے کو تلاش کر ہی لوں گا..

ویسے مٹی کے گمشدہ بابوں پر ترس کھانے کے علاوہ مجھے رشک بھی آتا تھا کہ یہ تو مکمل طور پر گم ہو گئے ہیں اور میں بالکل گم نہیں ہوا.. اس کا مطلب ہے کہ میں بہت چالاک اور ہوشیار ہوں.. حج کے دوران بھی اپنی ہستی اور حیثیت کو فراموش نہیں کر سکا، ہمہ وقت آگاہ ہوں، حواس میں ہوں اور یہ بابے ایک خودفراموشی کی حالت میں چلے گئے ہیں.. نہیں جانتے کہ جانا کہاں ہے، ٹھکانہ کہاں ہے.. بھولے اور کھرے ہیں اس لیے گم گئے ہیں..

”شیطان کی فتح اور وہ موت کا بُل ڈوزر چلاتا ہے“

آج صبح حج کا واشنڈ اپ تھا..

اختتام ہو رہا تھا..

نگاہ پردہ گرنے کی منتظر تھی..

ڈرامہ نکتہ عروج تک پہنچ رہا تھا

اور کیا کلائمکس تھا..

اگرچہ سبھی جانتے تھے کہ انجام کیا ہوگا لیکن اس کے باوجود بھی ہیجان میں تھے کہ دیکھیں کیا انجام ہوتا ہے..اور انجام المیہ ہوا..موت پر ہوا

ہم تینوں کے سروں کے اوپر... سلجوق، سمیر اور میرے اور لاکھوں سروں کے اوپر گرمی میں پھنکتا منیٰ کا جو آسمان تھا اس میں نیچی پرواز کرتے متعدد ہیلی کوپٹر تھے جو ہمارے اوپر سستی سے یوں گھومتے جاتے تھے جیسے اُن میں کوئی مکینکی خرابی پیدا ہوگئی ہے..آؤٹ آف کنٹرول لگتے تھے..اُن کے پنکھوں کے بلیڈ فضا کو کُترتے کاٹتے چلے جاتے تھے اور اُن کی گھنی اور دل میں دہشت بھر کر دینے والی گہری گونج آوازیں ہمارے سروں پر بلاؤں کی مانند منڈلا رہی تھیں.

میں سانس نہ لے سکتا تھا..میرا بدن اس بری طرح پھنسا ہوا تھا کہ ذرا سا پھیلنے یا سکڑنے کی بھی گنجائش نہ تھی..حشر کے روز جتنی خدائی ہوگی، آج کا ہجوم اس سے کم تو نہ لگتا تھا..لاکھوں لوگوں کے آپس میں جڑے ہوئے اجسام میں کہیں میرا بھی جسم تھا..دباؤ اس قدر شدید تھا کہ اسے مزید دو چار سیکنڈ بھی برداشت کرنا ناممکن لگتا تھا..ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں یہ دباؤ صرف اس لیے سہارے جا رہا ہوں کہ میں نے اپنی توجہ اسے سہارنے پر مرکوز کی ہوئی ہے اور اگر یہ ذرا بھی بھٹکی تو میں بکھر جاؤں گا اور میری مٹی دیکھتے دیکھتے لاکھوں سانسوں میں شامل ہو کر فنا ہو جائے گی۔

چنانچہ میں دانت بھینچے اپنے پاؤں پر قائم رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔اس دباؤ کو جانے کیسے برداشت کیے جا رہا ہوں..اور اگر میں گر جاتا تھا تو پھر میرے بچے بھی میری کچھ مدد نہ کر سکتے تھے..جیسے مجھے علم نہ تھا کہ

میرے پاؤں تلے کیا آ رہا ہے.. پلاسٹک کا کوئی ڈبہ ہے یا کسی کی کھوپڑی ہے۔ ایسے کسی ایک فرد کو بھی پتہ نہیں چلتا تھا کہ اُس کے پاؤں تلے کیا آ رہا ہے.. کہ آنکھیں نیچے کرنے سے آپ کو اگلے شخص کے کندھے اپنے سینے میں جڑے دکھائی دیتے تھے..

نہ صرف ہیلی کاپٹروں کی میکانکی آوازیں کانوں میں مرگ صدائیں انڈیلتی تھیں بلکہ ہجوم میں پھنسی ہوئی ایمبولینسوں کے سائرن بھی دل میں خوف بھرتے چلے جاتے تھے.. جیسے ایک جیٹ ہوائی جہاز کسی ایئر پاکٹ میں داخل ہوتے ہی یکدم گرنے لگتا ہے اور گرتا ہی چلا جاتا ہے تو آپ بے بسی میں صرف نشست کے بازوؤں کو گرفت میں بھینچ سکتے ہیں۔ ایسے خلق کے اس اژدہام میں پھنسے آپ کے بس میں کچھ نہیں ہوتا، آپ صرف ایک اور سانس کھینچنے کی جدوجہد میں نڈھال ہوتے جاتے ہیں..

لاکھوں کا یہ ہجوم.. شیطان کو کنکریاں مارنے کی خاطر اپنے خیموں سے نکلا تھا اور اب ایک ہی مقام پر سکوت میں آ چکا تھا.. ذرہ بھر حرکت کی گنجائش نہ تھی۔ اور پچھلے پندرہ منٹ سے سکوت اور دہشت کی یہی کیفیت ٹھہری ہوئی تھی..

بڑے شیطان کی رہائش گاہ کی جانب ہموار سڑک سے اٹھتی ہوئی شاہراہ پر لاکھوں لوگ ایک دوسرے میں پھنسے ہوئے تھے اور ان میں سے کچھ تو ایسے تھے جو سانس نہیں لے رہے تھے اور اُن کے آگے پیچھے جو لوگ تھے، وہ آگاہ ہی نہیں تھے کہ وہ مر چکے ہیں، کیونکہ وہ گرتے نہیں تھے، ایک چپہ برابر جگہ نہ تھی.. پھنسے ہوئے اُسی حالت میں ایستادہ رہتے تھے..

اس کے باوجود میرے آگے ماشاء اللہ میرا اُردوی ستون سلجوق تھا اور پشت پر میرا یونانی ستون سمیر ایستادہ تھا مجھے بچانے کی کوشش میں بے حال ہوتا تھا لیکن میری پسلیاں دباؤ سے چٹخنے کو آتی تھیں اور اُن میں کتنی سکت باقی تھی اس دباؤ کو سہنے کی اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا..

آج کے دن شیطان نے ہمیں زیر کر لیا تھا..

ہم سب اُسے ہلاک کرنے کی خاطر نکلے تھے اور یہاں ہمیں ہلاکت کا سامنا تھا..

اُس کے قریب جانا بھی ممکن نہ رہا تھا.. اب یہاں سے بچ نکلنا اور جان بچا لینا بھی ممکن نظر آتا تھا..

شیطان کو مارنے کے شوق میں.. ہم کچھ ثواب کمانے کی خاطر آئے تھے اور اُلٹا ایک عذاب ہمارے گلے پڑ گیا تھا..

شاید میرے اس بیانیے سے یہ تاثر اُبھرتا ہو کہ میں مرنے سے خوفزدہ دہشت میں آیا تھا.. بالکل آیا ہوا تھا لیکن یہ سارا خوف اور دہشت میرے بچوں کی وہاں موجودگی سے جنم لے رہا تھا.. اگر کسی نہ کسی طرح وہ اس ہجوم سے نکل کر کسی عافیت میں چلے جاتے، خیریت کی چھاؤں میں جا بیٹھتے تو مجھے اطمینان ہو جاتا اور مجھ میں یقیناً اتنا خوف نہ ہوتا..

میں اُن کی یہاں کوئی مدد نہ کر سکتا تھا.. دہشت کا یہی منبہ تھا..

اگر مجھے اس لمحے یہ انتخاب دیا جاتا کہ تمہارے بچے اس ہجوم میں سے نکل سکتے ہیں بہ شرط کہ تم اپنے حج سے دستبردار ہو جاؤ تو میں ایک لمحے کی جھجک کے بغیر پیشکش قبول کر لیتا..

ہمارے اوپر جو ہیلی کاپٹر اُڑان کر رہے تھے، وہ ہماری کچھ مدد نہ کر سکتے تھے.. صرف تماشا دیکھ سکتے تھے اور اپنے ہیڈکوارٹر کو رپورٹ دے سکتے تھے کہ جمرات کے راستے میں اتنے لاکھ کے قریب حاجی پھنس چکے ہیں اور شاید کچھ اموات بھی واقع ہوئی ہیں تو انہیں بچانے کے لیے ہنگامی طور پر کچھ بندوبست کیا جائے..

کبھی عقب سے دباؤ کا ایک ریلا سا آتا تو پورا ہجوم اُسی ٹھوس حالت میں دو چار قدم آگے ہو جاتا..

اِن دو چار قدم کے فاصلے کو میں اپنے قدموں سے طے نہیں کرتا تھا.. میرے پاؤں نیم معلق سے رہتے تھے اور میرا بدن آگے ہو جاتا تھا

رکاوٹ محسوس ہوتی تو معلوم ہوتا کہ ہم سے آگے کچھ حاجی حبس اور ہجوم کے دباؤ سے بے ہوش پڑے ہیں اور شاید جان کنی کے عالم میں ہیں اور ان کو اٹھایا جا رہا ہے.. جس ایمبولینس میں انہیں ڈالا جا رہا تھا وہ بھی حرکت کرنے سے قاصر تھی، سائرن بجاتی سکوت میں تھی.. کبھی ڈرائیور لاچار ہو کر اسے ذرا سی حرکت دیتا.. حاجیوں کو دھکیلتا تو وہ سرکت کر آگے ہو جاتی اور پھر رُک جاتی.. ایمبولینس میں جو زخمی اور نیم مردہ پڑے تھے، وہ اپنے ہاتھ کھڑکیوں سے نکال کر اپنے عزیزوں کو مدد کے لیے پکارتے تھے..

ایک عرب حاجی بار بار ہر ایک سے مخاطب ہو کر "موت موت" پکارتا تھا اور اپنے حواس میں نہ تھا..

بعد میں خبر ملی کہ اس روز شیطان کو مارنے کی آرزو میں چودہ حاجی مارے گئے تھے اور سانحہ عین اسی وقت رونما ہوا تھا جب ہم ٹھوس ہجوم میں پھنسے ایک کے بعد دوسرا سانس کھینچنے کی تگ و دو میں مصروف تھے..

حج کے تمام ایام سرمستی اور خوش بختی کے چاؤ میں گزرے تھے اور آج آخری دن بد بختی نے دھاوا بول دیا تھا..

سروں پر اُڑتا اگر کوئی ہیلی کاپٹر رُخ بدل کر ہجوم کے کسی خاص حصے کی جانب جاتا تو ہم جان جاتے کہ اُدھر سے کسی اور بری خبر کی اطلاع پائلٹ کو پہنچی ہے..

میں زندگی بھر اتنی بڑی اجتماعی دہشت کی زد میں نہیں آیا تھا جس میں آپ کے اختیار میں ایک سانس لینا بھی نہیں اور اپنے مقام سے ذرہ برابر حرکت کرنا بھی بس میں نہیں..

اس ٹھوس ہجوم میں ایک بڑا ٹریلر جس پر سامان خورد و نوش ڈھویا جاتا ہے، ایک جزیرے کی مانند اُبھرا ہوا ہے.. پولیس کے کچھ اہلکار یہ جان چکے ہیں کہ صورت حال اُن کے بس سے باہر ہو چکی ہے اور وہ اپنی جان بچانے کی غرض سے اس ٹریلر پر چڑھ گئے ہیں.. اس دوران چند ہاتھ ایک سات آٹھ برس کے بچے کو بلند کیے ہوئے ہیں اور پولیس والوں سے درخواست کی جا رہی ہے کہ خدا کے لیے اسے تو سنبھال لیں.. وہ بچے کو تھام کر

اُٹھا لیتے ہیں اور قطعی طور پر نہیں جان سکتے کہ یہ بچہ ہزاروں کے ہجوم میں سے کس کا ہو سکتا ہے.. بچ گیا ہے تو بعد میں اس کے والدین کیسے تلاش کیے جائیں گے..

میرے بچے بھی ذر کے بغیر نہیں تھے.. وہ فضا میں.. ہوا میں جو کسی ناگہانی المیے کی سیاہ مہک تھی اسے سونگھ سکتے تھے..

کسی بڑے المیے کا جو موسم اُتر چکا ہے.. یہ جو دباؤ ہے مرگ صفت یہ کیا تخصیص کرے گا کہ کون جوان ہے اور کون بوڑھا.. یہ خیال مجھے دہلاتا تھا..

تب سلجوق نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ابا کسی نہ کسی طرح یہاں سے نکل جائیں.. واپس ہو جائیں، آگے تو حالات خراب ہیں..''

''لیکن کیسے؟''

اگر لاکھوں کے ٹھوس ہجوم میں پھنسے آپ کے اختیار میں ایک سانس لینا بھی نہیں اور ذرّہ بھر حرکت کرنا بھی نہیں تو آپ اپنے بدن کو چھڑا کر مڑ کیسے سکتے ہیں.. ٹین میں بند ایک سارڈین مچھلی کروٹ کیسے بدل سکتی ہے.. اور اگر کسی طور آپ کسی ایسی طاقت کو بروئے کار لا کر جو آپ نہیں جانتے کہ آپ کے بدن میں ہے، فرض کیجیے پلٹنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو آپ رُو بہ رُو ہیں دیوار بنی ایک لاکھوں کی فوج کے.. آپ کا واحد چہرہ ہے جو اُن کے سامنے ہے.. اور ان کے لاکھوں چہرے آپ کے سامنے ہیں تو آپ مخالف سمت میں اُن کے درمیان کیسے راستہ بنا سکتے ہیں.. اُن کے ٹھوس ہو چکے بدنوں کے درمیان اگر ذرّہ بھر گنجائش ہوگی تو بنے.. اگر راستہ بنے.. یہ دونوں عمل، پلٹنا اور پھر پلٹ کر اُس دیوار میں راستہ بنا کر لوٹنا.. نہ صرف ناممکن تھے بلکہ ان کے بارے میں سوچنا بھی دیوانگی تھی.. اسی لیے میں نے پوچھا کہ.. لیکن کیسے؟

لیکن چند لمحوں بعد اس سوچ کی ناممکن دیوانگی میں ایک معجزہ سا رونما ہوا.. ایک غیبی مدد نمودار ہوئی..

ایک ترک گروپ اپنی گریہ کرتی خوفزدہ خواتین کو گھیرے میں لیے ہوئے.. شائد اُن کا کوئی فرد موت کے حوالے ہو گیا تھا.. ساٹھ ستر ترکوں کا ایک منظم ریلا حاجیوں کے ٹھوس ہجوم کو دھکیلتا اُن میں راہ بناتا واپس آ رہا تھا.. جونہی وہ ہمارے قریب ہوئے ہم ہاتھ پاؤں مارتے جدوجہد کرتے اُس ریلے میں شامل ہو گئے.. اُن کے ہلّے میں شریک ہو گئے.. ہم یہاں بھی اپنے پاؤں پر نہ چلے اُس متحرک گروپ کا حصہ بن کر اُن کے بہاؤ میں بہتے گئے اور بالآخر ہجوم کے گھنے پن سے نکل کر ''ال بیک ریستوران'' کے نواح میں آ گئے جہاں ہجوم تو تھا لیکن ٹھوس نہ تھا.. اُس میں حرکت کی جا سکتی تھی اور سانس لیا جا سکتا تھا اور راستہ بنایا جا سکتا تھا.. ہم نے فٹ پاتھ کے قریب ایک دیوار کے ناکافی سائے میں کھڑے ہو کر بدن کی لرزش کو قابو میں کیا۔ اپنے حواس بحال کیے اور ایک عرصے کے بعد پہلی بار ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے.. بڑے شیطان کی جانب جانے والے فلائی اوور پر وہ بے بس ہجوم ٹھوس سکوت میں تھا اور اُس پر پہلی کاپٹر پرواز کر رہے تھے اور کچھ ایمبولینسیں اب کھوئے ل

رفتار سے اُس میں سے نکلنے کی سعی کر رہی تھیں..

''ابا واپس خیمے میں چلتے ہیں، ابھی سارا دن پڑا ہے کنکریاں مارنے کے لیے..'' سلجوق کا سانس سوکھ رہا تھا اور شمیر میرے کندھے تھپک رہا تھا کہ وہ دونوں اُس تناؤ اور کھچاوٹ سے باہر آ چکے تھے جس میں وہ وسوسہ تھا کہ کہیں ابا حضور شیطان وسوسہ انداز کے مقابلے میں کام نہ آ جائیں..

''چلتے ہیں بیٹا، لیکن یہ دیکھ لو کہ یہاں سے واپس خیمے تک بہت فاصلہ ہے.. اگر ابھی واپس جاتے ہیں تو پھر بہر صورت آنا تو پڑے گا.. کیوں نہ یہاں کچھ دیر انتظار کر لیں شاید صورت حال بہتر ہو جائے..''

شاید ان کے دل میں بھی یہی تھا، وہ معترض نہ ہوئے..

شمیر کسی ٹریلر شاپ سے لبن یعنی لسّی کے متعدد پیک خرید لایا اور ہم اُس کے گھونٹ بھرتے اپنے آپ کو بحال کرنے لگے.. یوں بھی لسّی کی سفید اور دیسی فرحت آمیزی پیتے ہوئے بندہ اپنے وطن کے قریب محسوس کرتا ہے اور جلد بحال ہو جاتا ہے..

یہاں سے ''ال بیک'' کے نواح میں ایک دیوار کے ناکافی سائے میں کھڑے جب ہم اُن ٹھنسے ہوئے لاکھوں ساکت ہجوم پر نگاہ کرتے ہیں تو وہ یہاں سے اتنا پُر خطر اور پُر ہیجان نہ لگتا تھا.. کہیں کہیں لوگ حرکت کرتے بھی نظر آ جاتے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے ہم خواہ مخواہ خائف ہو گئے تھے.. کسی نانگا پربت ایسے قاتل پہاڑ کے بیس کیمپ سے جب آپ دوربین کی آنکھ سے بلندی کی برفوں میں بھٹکتے اپنے ساتھی کوہ نوردوں کو دیکھتے ہیں اور واکی ٹاکی پر اُن کے پیغام سنائی دیتے ہیں کہ یہاں ایسی گہری کھائیاں سامنے آ گئی ہیں ہم ان میں گر سکتے ہیں یا برف کے تودے ہم پر گرنے والے ہیں تو دوربین کی آنکھ سے دیکھتے ہوئے آپ اُن کی حالت کا اندازہ نہیں کر سکتے، وہ خطرے میں دکھائی نہیں دیتے، نارمل دکھائی دے رہے ہوتے ہیں.. یہاں بھی یہی قصہ تھا.. چونکہ ہم محفوظ ہو چکے تھے، اس لیے فاصلے سے وہ مقام پُر خطر دکھائی نہ دیتے تھے..

تقریباً ایک گھنٹے کی بحالی کے بعد میں نے تجویز پیش کی کہ ہجوم اب آسانی سے حرکت کرتا نظر آ رہا ہے اس لیے اس میں شامل ہو کر ایک اور کوشش کر دیکھیں.. ڈیڑھ دو کلومیٹر ہجوم میں دھکے کھاتے دھوپ کی تپش میں اپنے خیمے کو واپس جائیے اور پھر پچھلے پہر یہی فاصلہ طے کر کے یہاں آنے کی بجائے ابھی ایک اور کوشش کر دیکھیں..

اور ہم نے وہ ایک اور کوشش بھی کر دیکھی..

لیکن آج تو شیطان کا دن تھا..

جیسے ان دنوں رواج ہو چلا ہے کہ فلاں دن 'مدرز ڈے' ہے اور فلاں دن 'فادرز ڈے' ہے تو اس مغربی رسم پر عمل کرتے ہوئے آپ ماں یا باپ کو اس دن محبت بھرے ''آئی لو یو مام، ڈیڈ'' قسم کے کارڈ روانہ کرتے ہیں اور پھول پیش کرتے ہیں تو اسی طور آج کا دن ''ڈیولز ڈے'' تھا.. اور جانے اُسے دنیا بھر سے

کتنے کروڑوں کارڈز آئے ہوں گے کہ.. آئی لو یو.. اور کتنے ڈھیروں پھول موصول ہوئے ہوں گے تو وہ ان کارڈوں اور پھولوں میں گھرا متکبر اور پرفخر ہم کنکریاں مارنے والوں کو کہاں قریب پھٹکنے دیتا تھا..

تو یہ کوشش بھی اس نے ناکام بنا دی تھی اور ہم نے ہار تسلیم کر لی..

''آؤ بچو واپس چلتے ہیں.. یہ انکل کا دن ہے..''

واپس.. ہارے ہوئے.. ثواب حاصل کرنے والے جواری.. تھکے ٹوٹے اور شکست خوردہ منیٰ میں اپنے خیمے میں آئے تو وہاں بھی ہار جانے والے جواریوں کا ایک ہجوم تھا.. زرد چہرے.. ڈرے ہوئے تھکن سے نڈھال پژمردہ چہرے.. انہیں دیکھ کر بہت طمانیت ہوئی کہ اپنی شکست تسلیم کر کے مقابلے میں فرار ہونے والے صرف ہم نہ تھے..

اور ان کی داستانیں ہم سے کہیں زیادہ ہولناک تھیں..

''تارڑ صاحب.. آپ جانتے ہو کہ ہم کیسے جان بچا کر آئے..'' یوسف شاہ ایسے نڈر سپاہی کے چہرے پر بھی خوف کی سیاہی تھی ''ہم تو اپنے تئیں تفریح کے موڈ میں شیطان کو کنکریاں مارنے کے لیے جب ال بیک سے آگے اس فلائی اوور تک پہنچے ہیں اور ہجوم میں شامل ہوئے ہیں تو گویا موت کے قافلے میں شامل ہوئے ہیں.. نہ سانس آتا تھا اور نہ ہل سکتے تھے اور جب کبھی پیچھے سے ریلا آتا تھا دھکیلے جاتے تھے تو پاؤں اکھڑ جاتے تھے اور ہمارے آگے بہت سے لوگ گرے اور پھر اٹھے نہیں اور جب ہم پلٹنا چاہتے ہیں تو پلٹ نہیں سکتے.. تب ہم نے دیکھا کہ بائیں جانب پولیس کے دو ٹریلر کھڑے ہیں اور ان پر پناہ لینے والے پولیس مین کسی حاجی کی نہ مدد کرتے ہیں اور نہ اسے ہجوم میں سے نکالنے کا چارہ کرتے ہیں.. تب ہم نے اپنے گروپ کی ایک خاتون کو جو کہ قدرے فربہ تھیں انہیں آگے کیا اور فریاد کی کہ یہ خاتون حاملہ ہیں، انہیں بچہ ہونے والا ہے کم از کم اس کی مدد کریں، اسے اپنے ٹریلر پر چڑھا لیں تو اس خاتون کے ہمراہ ہم بھی لواحقین کے طور پر ٹریلر پر چڑھ گئے اور یوں اس عذاب سے نکلے..''

''کیا واقعی خاتون کو بچہ ہونے والا تھا؟''

''آپ بہانوں کو حقیقت کی کسوٹی پر نہ پرکھیں تارڑ صاحب.. کیا یہ کافی نہیں کہ ہم بچ کر آ گئے ہیں..''

''درست..''

''تو اب ہم سب کمانڈر سلجوق کے ڈسپوزل پر ہیں کہ وہ ہمارے کوسٹر کا انچارج ہے.. یہ جب فیصلہ کرے گا کہ ہمیں شیطان کو کنکریاں مارنے جانا ہے.. تب جائیں گے..''

سلجوق نے اپنی لامبی پلکیں جو عینک کے عقب میں پوشیدہ تھیں جھپکائیں ''انکل سر.. فی الحال آپ آرام کریں.. پچھلے پہر تک ہجوم کم ہو جائے گا.. اور ہم بائیں جانب فلائی اوور کی دیوار کی قربت میں چلیں گے

یہاں کم لوگ ہوتے ہیں اور انشاء اللہ شیطان تک پہنچ جائیں گے۔''

یوسف شاہ کے علاوہ بہت سے ہارے ہوئے جواریوں نے بلند آواز میں انشاء اللہ کہا اور فی الحال آرام کرنے لگے۔۔

ایک جواری تھا جو فی الحال آرام نہ کرتا تھا۔۔بے چین تھا، کروٹیں بدلتا تھا۔۔

اور خوف اُس کے بدن سے خارج نہ ہوتا تھا اور وہ۔۔ میں تھا۔۔

ہم موت کی شکل دیکھ کر آئے تھے۔۔

اُس کے بیاہ سانس اپنے چہروں پر محسوس کر کے آئے تھے جو سرد خانے میں پڑی ایک لاش سانس لے تو ویسے سانس تھے۔۔

مجھے اپنے خیمے کی عافیت میں اپنے آپ کو محفوظ محسوس کرنا چاہیے تھا۔ شکر ادا کرنا چاہیے تھا کہ میں اپنے بیٹوں کے ہمراہ شیطان کے پھیلائے ہوئے جال میں سے نکل کر آ گیا تھا۔۔

مجھے یہی لگ رہا تھا کہ یہ سب کچھ شیطان کا کیا دھرا ہے۔۔ اُس وسوسہ انداز کی منصوبہ بندی ہے۔۔وہ ہر برس بدلہ لے لیتا تھا۔ آپ نہیں مرتا تھا، کنکریاں برسانے والوں کو مار ڈالتا تھا۔۔

اس میں کسی حد تک تو حکومت بھی قصور وار ٹھہرتی تھی کہ اُسے اب تک تو سیکھ جانا چاہیے تھا کہ اتنے بڑے ہجوم کو کن راستوں پر اور کیسے چلایا جائے کہ اموات نہ ہوں۔۔ اور بہت حد تک یہ ایک قدرتی قانون کا شاخسانہ بھی تھا کہ لاکھوں لوگوں کے اجتماع میں لاکھ احتیاط کرنے کے باوجود بھی کوئی نہ کوئی حادثہ تو ہو ہی جاتا ہے۔۔اس سے کہیں بڑھ کر نقصان بھی ہو سکتا تھا۔ لیکن آخری تجزیہ یہی پکارتا ہے کہ اس میں شیطان کا ہاتھ ہے۔۔

اور میں اپنے خیمے میں پہنچ کر زیادہ غیر محفوظ محسوس کرتا تھا جیسے ایک حادثے کے دوران۔۔ یکدم کسی گہری کھائی میں گرتے ہوئے۔۔ایک کار کے یکدم اُلٹنے سے انسان کے اُس لمحے حواس جواب دے دیتے ہیں وہ ایک بے حس سناٹے میں چلا جاتا ہے اور جب یہ حادثہ گزر جاتا ہے اور اُس لمحے وہ سناٹا ٹوٹتا ہے تب اسے احساس ہوتا ہے کہ اُس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔۔اور اُس کا بدن لرزش میں آ جاتا ہے اُس پر خوف طاری ہو جاتا ہے کہ میں مر بھی سکتا تھا۔۔

یہاں اس سوگوار ماحول میں مجھے وہ میراثی یاد آ گیا جو خانہ کعبہ سے لپٹ کر رو رو کر نڈھال ہوتا تھا، گڑگڑا کر دعائیں مانگتا تھا کہ یا اللہ میں نے اب واپس نہیں جانا۔۔ مجھے اپنے پاس ہی رکھ لو۔۔ مجھے اپنے قدموں میں جگہ دے دو۔۔ میں نے وطن واپس نہیں جانا اور جب اگلے روز یکدم اُسے تیز بخار ہو گیا جو اُترنے کا نام ہی نہ لیتا تھا تو میراثی بمشکل تمام پاؤں گھسیٹتا خانہ کعبہ تک پہنچا اور اُس سے پھر لپٹ کر آہ و زاری کرنے لگا کہ یا اللہ یہ ضروری تو نہیں کہ تو میری سبھی دعائیں قبول کر لے۔۔میں نے اگر حماقت کر ہی لی تھی تو تو ہی کچھ

خیال کر لیتا..

تو موت بے شک مکہ یا منیٰ میں آپ کے سامنے آئے.. بے شک بخشش اور جنت کا پروانہ لے کر آئے اسے قبولنے میں تامّل ہوتا ہے.. انسان اللہ تعالیٰ سے بھی کہتا ہے کہ تو کچھ خیال کر.. گھر واپس پہنچا دے وہاں مار لینا یہاں اپنے گھر میں نہ مار..

ہمیں مغرب سے پہلے پہلے منیٰ چھوڑ دینا تھا..

منیٰ چھوڑنے سے پیشتر بہرطور کنکریاں مارنے کا فریضہ بھی سرانجام دینا تھا..

میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ اگر پچھلے پہر تک یہی صورت حال برقرار رہی، بہتر نہ ہوئی تو میں اپنے بیٹوں کے ہمراہ ہرگز شیطان کی جانب نہ جاؤں گا.. دم کے طور پر بکرے قربان کر دوں گا.. اور اگر حج نامکمل بھی رہتا ہے تو رہ جائے، میں یہ رسک نہ لوں گا.. زندگی رہی تو پھر آ جائیں گے، اسے مکمل کرنے کے لیے.. اور یہ زندگی اچھی بھلی پرسکون، پرلطف اور ہموار چلی جا رہی تھی اور شیطان نے یکدم آخری روز روڈ بلاک کر دی تھی.. موت کا ٹل ڈوزر راستے میں حائل کر کے زندگی کی سپورس کار کو رُک جانے پر مجبور کر دیا تھا..

باقی تو فی الحال آرام کر رہے تھے..

لیکن لوگ آ جا رہے تھے.. گھبراہٹ میں آئے ہوئے چہرے خیمے میں جھانکتے تھے اور اطلاع کرتے تھے کہ شاہراہ شیطان کی موجودہ صورت حال کیا ہے.. وہ بتا رہے تھے کہ اس حادثے کے بعد سعودی پولیس اور فوج نے اس شاہراہ کو اپنی تحویل میں لے لیا ہے... رکاوٹیں کھڑی کر کے حاجیوں کو آگے جانے سے روک دیا ہے اور کچھ انتظامات کیے جا رہے ہیں.. فی الحال منیٰ کے طول و عرض میں.. بازاروں اور گلیوں میں.. آس پاس کی بھوری پہاڑیوں میں جو ہزاروں لاؤڈ سپیکر نصب تھے، ان پر مسلسل اعلان ہو رہا تھا کہ آپ فی الحال جمرات یعنی شیطان کی جانب نہ جائیں.. وہاں خطرہ ہے.. اپنے خیموں میں رہیں.. بار بار، عربی، انگریزی، اردو، فارسی، ترکی اور کچھ افریقی زبانوں میں یہ وارننگ دہرائی جا رہی تھی..

ہیلی کاپٹروں کے پنکھوں کی گھر گھراہٹ.. ایمبولینس کے سائرن اور لاؤڈ سپیکروں پر گونجتی مختلف زبانوں میں وارننگ..

باہر تو شیطان کا راج تھا..

اس نے پتھر کا ہونے کے باوجود لاکھوں ایمان والوں کو زیر کر لیا تھا..

جس آدم کو سجدہ نہ کرنے کی پاداش میں اس کی تمام عبادتیں باطل ہوئیں اور وہ اپنے رب کی قربت کھو کر راندۂ درگاہ ہوا.. ابلیس قرار پایا تو بھلا وہ اس آدم کو کیسے معاف کر سکتا تھا..

پچھلے پہر کے قریب خبریں آئیں کہ..

لاشیں اٹھائی گئی ہیں..

اُن کی گنتی کر لی گئی ہے..

کُل چودہ افراد ہلاک ہوئے تھے..

چار پاکستانی.. تین ہندوستانی.. دو مصری.. ایک سوڈانی.. ایک ایرانی اور ایک یمنی..

لیکن یہ تو بارہ بنتے تھے..

گنتی میں کہیں نہ کہیں کوئی غلطی ہو گئی تھی..

پچھلا برس ایسا تھا کہ جس میں شیطان کا ہر وار خالی گیا تھا.. اور کوئی ایک زائر بھی اس کے جال میں پھنس کر ہلاک نہ ہوا تھا.. لیکن اُس سے پچھلے برس پینتیس زائرین ہجوم میں کچلے گئے تھے.. 1998ء میں ایک سو اسی اور 1994ء میں دو سو ستر حاجی اپنے گھروں کو لوٹنے کی بجائے منیٰ کی خاک میں چلے گئے تھے تو اُن برسوں کے مقابلے میں یہ بارہ یا چودہ کا ٹوٹل کچھ اتنا برا نہ تھا.. بلکہ خاصا حوصلہ افزا تھا۔

پچھلے پہر ہمارے خیمے کے برابر میں جو وی آئی پی خیمہ تھا اُس میں ایک جنگی حکمت عملی طے کرنے والی کونسل کا اجلاس ہوا جس میں شیطانوں کی جانب سے آنے والی تازہ ترین اطلاعات کی روشنی میں یہ فیصلہ کیا گیا اور اطلاعات اور خبریں یہ تھیں کہ اب وہاں حالات قابو میں ہیں.. امن و امان ہے.. کوئی خطرہ نہیں.. تو ہم آخری کنکری باری کی رسم ادا کرنے کے لیے بے خطر وہاں جا سکتے ہیں..

اور یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ شیطان کے خلاف اس مہم میں سلجوق صاحب کمانڈر ہوں گے اور سینئر زعماء کی سربراہی کرتے ہوئے اور اپنی جونیئر سفارتی صلاحیتیں بروئے کار لا کر شیطان کو عجیجہ دیں گے کیونکہ وہ حج دیدہ ہونے کے باعث خوب جانتے تھے کہ کدھر سے.. کس سمت سے اور کیسے اُس لعنتی پر حملہ آور ہونا ہے..

ہم سب نے ایک مرتبہ پھر اپنی اپنی کنکریاں سنبھالیں.. پہلے تو ہم شیطان کو لفٹ نہیں کراتے تھے.. اس زعم میں مبتلا تھے کہ ہم تو اللہ کے مہمان ہیں یہ لعین ہمارا ایک بال بھی بیکا نہیں کر سکتا اور جب اُس نے کچھ لحاظ نہ کیا.. یہ بھی نہ سوچا کہ ان میں سے بیشتر میرا کہنا ماننے والے ہیں.. انہیں بھٹکاتا ہوں تو بھٹک جاتے ہیں، بہکاتا ہوں تو آسانی سے بہک جاتے ہیں تو اُس نے ایک بال تو کیا پورے کے پورے بندے بیکے کر دیئے.. اس لیے ہم اس دشمن کی تعظیم کرنے لگے تھے.. اس کا ادب کرنے لگے تھے.. اور یوں پُر تکبر ہو کر نہیں کہ ہم اس پر غلبہ پا جائیں گے بلکہ مؤدب ہو کر.. نہایت عاجزی سے اپنے خیموں سے نکل کر اس ابلیس مشن پر روانہ ہو گئے..

اور وہاں حالات ہی نہیں.. دنیا بھی اور آوازیں بھی بدلی ہوئی تھیں.. جب ہم منیٰ کی شاہراہ سے.. البیک ریستوران کے دائیں جانب مڑ کر اس فلائی اوور کی گھاٹی پر پہنچے جس کے آگے تین شیطانوں کا غلبہ اور اُن کی سلطنت تھی تو وہاں ہمارے سروں پر جو آسمان تھا.. خالی تھا.. وہاں کسی ایک ہیلی کاپٹر کی دہشت زدہ کر دینے والی بدن کو کاٹتی گھوں گھوں کی آواز نہ تھی.. نہ ہی کسی ایمبولینس کا سائرن غل کرتا تھا.. لاؤڈ سپیکر بھی چپ تھے..

خاموشی تھی..

لیکن یہ خاموشی سناٹے میں نہ تھی.. بولتی تھی.. سرسراہٹ تھی لبادوں کی.. اور آہستہ دھیمے سُروں میں گنگناہٹ تھی لاکھوں لبوں کی دعاؤں کی..

ہجوم تھا لیکن دباؤ نہ تھا.. دہشت نہ تھی..

ایک خاص تنظیم وجود میں آ چکی تھی.. جسے سعودی پولیس کے جوان منظم کر رہے تھے.. وہ حاجیوں کے ریلے کے سامنے قطاریں باندھے کھڑے تھے کہ ذرا تحمل سے کام لیں.. کچھ دیر انتظار کریں.. جو آگے جا چکے ہیں انہیں کنکریاں مار لینے دیں اور پھر آپ چلے جایئے گا..

ٹریفک کنٹرول کا محکمہ بھی چوکس ہو چکا تھا کہ اس متعین راستے پر چلتے جایئے.. شیطان پر اپنا غصہ اتار کر دو حکم پہ عمل کرتے ہوئے پھر واپس نہ آیئے بلکہ دوسری جانب اُتر جایئے۔

کچھ تسلی ہوئی.. ڈھارس بندھی..

اور میں نے اپنے بیٹوں کے ہاتھوں کی انگلیوں کو جو اپنی انگلیوں میں جکڑ رکھا تھا.. اُن پر اپنی گرفت ڈھیلی کی.. اگرچہ انہوں نے میری انگلیوں کو اپنی گرفت کی شدت میں لے رکھا تھا کہ کہیں اباجی اِدھر اُدھر نہ ہو جائیں.. اور میں اِن کے سہارے آگے بڑھتا تھا.. تو مجھے اباجی پھر یاد آ گئے.. میں اُن کے بارے میں شدید فکرمند ہوں کہ اسی برس کی عمر میں وہ یہ بھیڑ بھری شاہراہ کے پار کیسے جائیں گے تو وہ میرا ہاتھ پکڑ لیتے ہیں.. اپنی لرزش میں آئی ہوئی کپکپاتی انگلیوں میں.. اور مجھ سے کہتے ہیں.. بیٹے ذرا دھیان سے.. دائیں بائیں دیکھ کر اطمینان کرتے ہیں کہ کوئی ٹریفک تو نہیں آ رہی.. ان کی نیلی آنکھوں میں جب کوئی کار یا ویگن نہیں اُبھرتی تو وہ مجھ سے کہتے ہیں.. بیٹے آ جاؤ.. اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کرتے اور بجائے اس کے کہ میں انہیں وہ مجھے سڑک کے پار لے جاتے ہیں.. پچپن برس کے بیٹے کا ہاتھ تھام کر اسے پار لے جاتے ہیں..

تو اب میں وہی اباجی ہو چکا تھا..

بے شک بوڑھا ہونے کو آیا تھا لیکن اپنے ننھے منے بچوں کے ہاتھ نہیں چھوڑتا تھا جو مجھ سے دو گنے سائز کے ہو چکے تھے..

جیسے میں محسوس کیا کرتا تھا اور اپنے باپ کی سادگی پر مسکراتا تھا کہ اباجی خود تو لرزتے ہیں اور اس کے باوجود مجھے سڑک پار کروانے کی خاطر میرے ہاتھ کو گرفت میں لیتے ہیں تو یقیناً میرے بیٹے بھی مجھ پر مسکراتے ہوں گے..

لیکن اس کا کوئی علاج نہ تھا..

کوئی اُپائے نہ تھا..

اولاد کے لیے یہ تشویش اور یہ کہ میرے بچے.. بے شک بالغ ہو چکے.. مجھ سے قد میں کہیں بلند ہو چکے اور نہ صرف قد میں بلکہ دانش اور علم میں بھی مجھ سے کہیں آگے نکل چکے.. ابھی بچے ہیں اور یہ میری مدد کے

بغیر یہ سڑک پار نہیں کر سکتے..

ہمارے قدموں تلے آج دوپہر کے آثار بکھرے ہوتے تھے اور ہم اُن پر پاؤں دھرتے چلتے تھے.

اور وہ بکھرے ہوئے آثار کیا تھے جن پر ہم چلتے تھے..

پلاسٹک کی ہزاروں چپلیں..اوندھی..سیدھی..ٹوٹی ہوئی..حاجیوں کے پاؤں سے بچھڑی ہوئی..

چند سیاہ چھتریاں جن کی کمانیاں ٹوٹی ہوئی تھیں اور وہ مردہ چمگادڑوں کی مانند بے جان پڑی تھیں..

مردوں اور عورتوں کے پیراہن..کچھ تار تار اور کچھ ایسے جیسے ان کے پہننے والے اپنی من مرضی سے انہیں اُتار کر یہاں پھینک گئے ہیں..

سامان سے بھرے ہوئے بیگ اور گٹھڑیاں..بہت سے لوگ اپنا سامان سر پر اُٹھائے آتے ہیں کہ شیطان پر کنکریاں برسا کر وہیں سے گھروں کو لوٹ جائیں گے.

سوٹ کیس..کمر کے گرد باندھنے والی پیٹیاں.

ایک گھڑی..جو کسی حاجی بابا کی کلائی پر بندھی ہوگی اور ہجوم کے دباؤ میں آ کر اُس کا سٹریپ کھل گیا ہوگا.

دعاؤں کے پمفلٹ..قرآن کے اوراق..اور ایک عینک..

ایسے بے شمار آثار تھے اور جن لوگوں کے یہ آثار تھے اُن میں سے کچھ اب مِنیٰ کے مردہ خانے میں تھے..

ہجوم کم تھا، حرکت میں تھا، دھیرے دھیرے آگے بڑھتا تھا، دباؤ نہیں تھا اور سانس لینے کی گنجائش تھی..

جیسے ایک حادثہ شدہ پچکی ہوئی کار دیکھ کر آپ اس میں سوار لوگوں کیلئے تشویش میں مبتلا ہوتے ہیں کہ پتہ نہیں وہ محفوظ رہے ہیں یا نہیں اور اگلے لمحے آپ شکر کرتے ہیں کہ آپ اس کار میں سوار نہیں تھے. ایسے ہم اُن پھٹے ہوئے پیراہنوں اور چپلوں پر چلتے تھے کہ شکر ہے یہ ہمارے نہیں..

ہمارے آگے نہایت ضعیف و نزار اور لاچار ایک کھچولی سوتی ساڑھی میں لپٹی ایک ہندوستانی اماں تھیں..نہ اُن سے چلا جاتا تھا اور نہ دیکھا جاتا تھا اور انہیں اُن کا اتنا ہی نحیف اور منحنی سا بیٹا سہارا دیتا انہیں آگے بڑھنے پر اُکساتے ہوئے کہتا تھا "ارے اماں تھوڑا اور چل لے..دور نہیں"

"چلا نہیں جاتا بیٹا..کہاں تک جانا ہے"

اور نحیف برخوردار اُن کی ڈھارس بندھانے کی خاطر انہیں تاریخ میں اُلجھاتا تھا "اماں یہی تو وہ مقام ہے جہاں میں اور تم کھڑے ہیں جہاں حضرت ابراہیم کھڑے تھے تو انہیں کمبختی مارا شیطان بہکاتا تھا کہ ارے ابراہیم کدھر جاتا ہے ادھر تو آ..میرا کہا مان....تو اماں ابراہیم نے اُس پر لعنت بھیجی اور چل دیے..اماں تو بھی چل"

اور اماں کہتیں "بیٹا بھیڑ بہت ہے..کیسے چلوں.."

اور فرمانبردار بیٹا بھنا کر کہتا ہے "اماں بھیڑ تو ہو گی.. تو اکیلی تو نہیں.. لاکھوں اور بھی ہیں.."

"اچھا تو ابراہیم کو شیطان نے یہاں پر روکا تھا.. اور وہ سنی ان سنی کر کے چل دیئے.."

"ہاں اماں.."

"تو پھر چل.." اور اماں واقعی چلنے لگیں لیکن بڑبڑاتی ہوئی کہ بیٹا بھیڑ بہت ہے..

حج کے دوران درجنوں مختلف زبانوں میں بڑبڑاہٹ مسلسل سنائی دیتی رہتی ہے.. مکہ کی گلیوں اور ریستورانوں میں.. فٹ پاتھوں پر.. منیٰ کے خیموں میں عرفات کے میدان میں.. نامانوس فقرے آپ کے آس پاس فضا میں تیرتے ہیں لیکن قابل فہم طور پر عربی زبان کا آہنگ سب سے واضح ہوتا ہے اور ان دنوں میرے جیسے عربی سے ناواقف لوگ بھی نہایت خوشدلی سے.. جب آپ کے پیچھے آنے والے کبھی جان بوجھ کر اور کبھی بے اختیار ہو کر آپ کو دھکیلتے ہیں تو مڑ کر درخواست کرتے ہیں کہ "شویا شویا" یعنی آرام سے آرام سے.. یا کسی بہت بدتمیز حاجی سے گزارش کرتے ہیں "صبر یا حاجی" یعنی آپ مڑ کر اسے لاہوری انداز میں دھمکی نہیں دیتے کہ اوئے بندے دا پتر بن ہمیں تے گھنے سیک دیاں گا.. بلکہ مسکراتے ہوئے صبر کی تلقین کرتے ہیں.. اور اگر آپ بے صبر ہوئے جاتے ہیں اور ہجوم کو چیرتے ہوئے کہیں پہنچنا چاہتے ہیں تو "یا حاجی طریق" پکارے چلے جاتے ہیں کہ اے حاجی راستہ دے دو.. بندے کا پتر بن کر راستہ دے دو.. پلیز!

تو ہم تینوں شویا شویا پکارتے.. صبر یا حاجی.. اور یا حاجی طریق کی درخواستیں گزارتے آگے بڑھتے گئے..

ہم جو ابھی تک آج دوپہر کی دہشت میں تھے ہمیں یقین نہ آیا جب ہم نے نہایت اطمینان سے تینوں شیطانوں پر کنکریاں برسائیں.. ٹھیک ٹھیک نشانے لگائے اور پھر اپنے خیمے کو لوٹ آئے..

خیمے میں ہم زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکتے تھے..

ہمیں مغرب سے پیشتر یہاں سے نکل جانے کا حکم تھا.

حج مکمل ہو چکا تھا.

اگر کسی مجبوری کے باعث یا اپنی مرضی سے آپ مغرب کے بعد بھی یہاں موجود ہیں تو پھر آپ کو منیٰ میں ایک اور شب بسر کرنی ہو گی اور اگلی صبح پھر سے تینوں شیطانوں کو کنکریاں مارنی ہوں گی..

اور یہ خطرہ مول لینا مناسب نہ تھا.

کیا جانئے کہ آج جو شیطان ادھ موئے ہو چکے ہیں کل سویر تک مکمل طور پر صحت مند ہو کر پھر سے زور آور ہو جائیں.. ہم پر غلبہ حاصل کر لیں تو یہ رسک نہیں لیا جا سکتا تھا تو یا حاجی نکل لو.. منیٰ سے نکل لو..

تو ہم نکل گئے..

حج مکمل ہو چکا تھا اور اب بالآخر رخصت ہونے پر طواف وداع کی وداعی رسم خانہ کعبہ کے گرداگرد

کرنی تھی لیکن حج مکمل ہو چکا تھا..

ہم کوسٹر میں سوار ہوئے تو ہمارے اردگرد منیٰ کا خیمہ شہر مسمار ہو رہا تھا. خالی ہو رہا تھا. کھنڈر ہو رہا تھا..

ہر شخص جتنے والہانہ اشتیاق سے یہاں آیا تھا اُس سے کہیں بڑھ کر اسے ترک کر دینے پر آمادہ اور پر اشتیاق تھا..

یہ منیٰ جو کبھی ایک موہنجوداڑو جو بسا ہوا پر رونق اور آباد تھا، ہماری آنکھوں کے سامنے کھنڈر ہوا جاتا تھا..

یہ منیٰ جو دو چار روز پیشتر ایک مہر گڑھ تھا جو کبھی.. جانے کونسے زمانوں میں ایک ہنستا بستا زندگی سے بھرپور دھڑکتا شہر تھا، ہمارے سامنے اُجڑ رہا تھا..

ٹھیکریوں اور شکستہ ظروف میں بدل رہا تھا..

ہم منیٰ کی اس کارواں سرائے میں دو چار روز پیشتر ہی تو آئے تھے..

اور ہم یہاں دور کے شہروں سے آئے تھے..

شی آن۔ جاکرتا۔ دہلی۔ لاہور۔ کاشغر۔ ہرات۔ نیشاپور۔ ارض روم۔ دمشق۔ سکندریہ۔ خرطوم۔ شاگو ایسے کئی دور کے شہروں سے آئے تھے.. ہم کیسے کیسے دور افتادہ جزیروں سے اپنی نیت کی بادبانی کشتیوں کو کھیتے یہاں تک آئے تھے.. مالدیپ.. سری لنکا.. بالی.. غرب الہند.. انڈیمان اور جنوبی سمندروں میں اُبھرتے کیسے کیسے دور کے جزیروں سے آئے تھے..

منیٰ کی کارواں سرائے میں اُترے تھے..

اور اب کوچ کر رہے تھے..

اور ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر ہم کیوں کوچ کر رہے ہیں.. منیٰ کو ہم نے گھر بنا لیا تھا تو ہمیں ہجرت کرنے پر کیوں مجبور کیا جا رہا ہے..

ہم اپنی اپنی میکانکی سواریوں پر سوار.. سفر کی دھول میں اٹے ہوئے.. میکانکی اونٹوں پر سوار.. ابھی دو چار روز پیشتر اس کارواں سرائے میں اُترے تھے اور ابھی کوچ کر رہے تھے..

ہمیں اپنے اپنے دور کے شہروں اور جزیروں کو لوٹ جانے پر سکھ نہ ہوا.. دُکھ ہوا.. قلق ہوا..

کوسٹر کی ایئر کنڈیشنڈ ٹھنڈک کی آسودگی میں جب کہ ہم منیٰ سے نکل آئے.. کالے خان اطمینان سے ڈرائیو کرتا چلا جاتا تھا.. ہم مکہ سے منہ موڑ کر جدہ جانے والی شاہراہ پر سفر کرنے لگے اور دیگر مسافر مطمئن تھکے ہوئے اونگھتے تھے تو میں نے اپنے آپ سے پوچھا.. تم منیٰ میں اُترے تھے تو محض تارڑ تھے اور اب وہاں سے رخصت ہوئے ہو تو حاجی تارڑ ہو چکے ہو تو کیا کوئی فرق پڑا؟.. جو تم پہلے تھے اور جو تم اب ہو تو کچھ تبدیل ہوئے؟.. کیا تمہارے شک اور شبے کے موسم بدلے؟.. تم میں جو آلودگی اور خمار تھا، اس میں کچھ کمی واقع

ہوئی؟.. کیا تُو اُو گن بھری جس سیاہ چادر کو اوڑھ کر یہاں تک پہنچی تھی.. وہ دُھل کر سفید ہوئی یا جوں کی توں ہے..
کوئی ایک دھبہ بھی زائل ہوا.. مختصر یہ کہ جب تم یہاں آئے تھے اور اب یہاں سے جا رہے ہو تو کچھ بدلا بھی یا نہیں؟.. کوئی فرق پڑا یا نہیں؟.. یا یہ سفر رائیگاں گیا.. کوئی جواب نہ آیا.. اُدھر چپ ہی چپ تھی.. سوائے ایک سرگوشی کے.. کہ قیتوں کا فر کا فرآ کھدے.. تُوں آ ہو آ ہو آ کھ.. یعنی ملامت لا کھ سے چھٹکارا نہ ہوا تھا..

جدہ پہنچ کر.. پپی فیملی ہوم کے کمپاؤنڈ کے اندر داخل ہو کر.. سوئمنگ پول کے کنارے اپنے پُر آسائش وِلا میں داخل ہو کر حاجی سلجوق نے سب سے پہلا یہ کام کیا کہ اپنا ڈی وی ڈی آن کر دیا.. اور انکل گلزار کا گیت ہر اُس آرائش اور درجنوں مہک آور رنگا رنگ اُن موم بتیوں پر دستک دینے لگا جو میری بہو رابعہ نے ہر کونے اور ہر شیلف میں یہاں تک کہ غسل خانوں میں بھی سجا رکھی تھیں۔

ساتھیا..
مدھم مدھم گیلی ہنسی
سُن کے ہم نے پی لی تیری ہنسی..
ساتھیا!

"تمہیں کیسے بتاؤں کہ میں کس شاہ گوری کو دیکھ کر آیا ہوں"

حج سے واپسی پر اپنی نارمل زندگی میں واپس آ کر.. جو میرے لیے تو فی الحال جدہ کی زندگی تھی، انسان نارمل نہیں رہتا..

اُس کی نظر کو عادت ہو چکی ہوتی ہے، دن رات لاکھوں سفید پوشوں کو ہمہ وقت مگن.. اور مصروف عبادت دیکھنے کی.. خیموں کا ایک شہر.. سورج کا ایک شہر اور اللہ کا ایک شہر دیکھنے کی.. اور اس کے سوا کچھ نہ دیکھنے کی یہاں تک کہ آئینہ بھی نہ دیکھنے کی.. اور جب اُس کی نظر کے سامنے آئینے ہی آئینے آتے ہیں، چمکتی دمکتی رہائشی اور کاروباری عمارتیں نظر آتی ہیں تو وہ نظر حیران ہوتی ہے کہ یہ کونسی دنیا ہے اور یہ کیا ہے.. اور جب شاہراہوں پر ہزاروں کاریں شرلاٹے بھرتی گزرتی ہیں اور اُن میں حیرت انگیز طور پر حاجی سوار نہیں ہوتے، عام لباس میں عام انسان ہوتے ہیں تو اُسے سمجھ نہیں آتی کہ ایسا کیوں ہے..

انسان فوری طور پر اس نئی دنیا سے جڑ نہیں سکتا اس میں داخل ہو کر اس کا ایک حصہ نہیں بن سکتا..

وہ یہ طے کرنے سے قاصر ہوتا ہے کہ اس کی زندگی پہلے نارمل تھی اور حج کے دوران ابنارمل ہو گئی تھی یا پہلے ابنارمل تھی اور چند روز کے لیے نارمل ہونے کے بعد پھر سے اصل کو لوٹ آئی ہے..

وہ اس تبدیلی کو قبول نہیں کرتا اور کچھ روز کے لیے وہیں رہتا ہے جہاں سے وہ آیا تھا.. چونکہ میں نے تہیہ کر رکھا ہے کہ کم از کم اس سفرنامے میں سچ لکھوں گا، اس کے سوا اور کچھ نہ کہوں گا.. تو اگر اس سچ میں جذبات کی شدت اور ایک نئے انوکھے تجربے میں سے گزرنے کے اضطراب کے باعث کچھ ملاوٹ در آتی ہے تو اس میں میری نیت شامل نہیں ہے.. تو ایک سچ یہ بیان کرتا ہوں کہ میں نے زندگی بھر.. آج تک جتنے بھی سفر کیے ہیں.. جتنی بھی صحرا نوردی، کوہ نوردی اور آوارگی کی ہے، وہ سب اس ایک سفر کے سامنے ہیچ ہیں.. مجھے ذاتی گمان نہ تھا کہ ابھی میری حیات میں ایک ایسا تجربہ بھی رونما ہوگا جس کے سامنے ماضی کے سارے رنگ پھیکے پڑ جائیں گے... بلکہ کچھ نئے رنگوں کا ظہور ہوگا جو اس سے پیشتر آنکھ نے نہ دیکھے تھے.. میں قطعی طور پر اس تجربے کو صرف عقیدت اور مذہب کے حوالے سے نہیں پرکھ رہا بلکہ ایک آوارہ گرد کہ اُس ہیجان کے حوالے سے پرکھ رہا ہوں جو اجنبی سرزمینوں، ان دیکھے حیرت بھرے مقامات اور سحر طراز مناظر کے مشاہدے سے بدن میں

شدت کا شور برپا کرتا ہے.. کیونکہ میں نے اپنی اولین کتاب "نکلے تری تلاش میں" کے آغاز میں ایک آوارہ گرد کا منشور وارث شاہ میں تلاش کیا تھا..

"کونجاں وانگ مولیاں دیس چھڈے
اساں ذات صفات تے بھیس کہیا
اور شینہ سپ درویش دا دیس کہیا
پتھر جوڑنا نال سریش کہیا.."

ایک آوارہ گرد کی کوئی ذات نہیں ہوتی..

اور حج کے ایام میں بھی کسی کی کوئی ذات نہیں ہوتی.. نہ کوئی صفت ہوتی ہے.. ہوتی ہے تو صرف اُس کی صفت ہوتی ہے، جس کے گھر کے گرد لوگ.. پانیوں میں بدل کر ایک گرداب کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جو اُس گھر کے اندر سرایت کرتے اپنا وجود کھو دیتے ہیں..

خانہ کعبہ..

جیسے یہ سیاہ مکعب ایک مدھانی ہے جو رڑھکی جا رہی ہے.. اسے وہ مٹیار رڑھک رہی ہے جس کی یہ مدھانی ہے اور چاٹی میں جتنا بھی سفید دودھ ہے، وہ احرام کی سفیدی کا دودھ ہے جو بلویا جا رہا ہے.. وہ تلاطم میں ہے اور مسلسل اُتھل پتھل ہو رہا ہے.. اُس کے درمیان جو مدھانی گھومتی ہے تو یوں گھومتی ہے کہ دودھ کے ہر قطرے.. اور ہر قطرہ ایک احرام پوش ہے اُسے چھوتی رڑھکتی اس میں سے اُس کا اصل جوہر.. اُس کا ست نکالتی ہے جو دھیرے دھیرے مکھن کی سفید پاکیزگی کی صورت اختیار کر جاتا ہے.. دودھ کی اپنی ذات ختم ہو جاتی ہے.. باقی صرف بے رنگ پھیکی لسی رہ جاتی ہے.. احرام پوش کی ذات بھی مدغم ہو جاتی ہے اور صرف مکھن کی سفید پوتر تا چاٹی میں تیرنے لگتی ہے..

اور بھیس کا تو ذکر ہی کیا..

یہاں ہر ایک.. ایک ہی سفید بھیس میں ہوتا ہے.. الگ سے پہچان باقی نہیں رہتی..

اور جیسے شیر، سانپ اور درویش کا کوئی دیس نہیں ہوتا.. کوئی قومیت نہیں ہوتی ایسے ہی آوارہ گرد بھی کسی ایک دیس یا قومیت سے وابستہ نہیں ہوتا.. وہ کل انسانیت سے جڑا ہوتا ہے اور ہر ملک ملک بات پر یقین رکھتا ہے.. تو یہ شرط بھی حج میں ہی پوری ہوتی نظر آتی ہے..

اور یہ پتھر.. جو کہ آوارہ گرد ہے، اُسے آپ سریش سے گوند سے کسی اور پتھر.. کسی اور بت سے جوڑ نہیں سکتے..

وارث شاہ نے صرف ایک آوارہ گرد کا ہی نہیں گویا حج کا منشور بھی ان شعروں میں بیان کر دیا ہے..

اور اس میں گناہ اور ثواب کا خوف اور لالچ بھی شامل نہیں کہ ایک آوارہ گرد حساب کتاب کرنے والا بنیا نہیں ہوتا اپنے کھاتے کھول کر نفع نقصان کا حساب کرنے والا نہیں ہوتا..

تو میں واپس آ چکا تھا..

جدہ میں تھا..

ابھی نارمل یا شاید ابنارمل زندگی کو قبول نہیں کر رہا تھا.. سمجھوتہ نہیں کر پا رہا تھا. تو اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہ تھی..

کسی بھی بڑے سفر، کوہ پیمائی کی کسی پُر خطر اور دور دراز کی بلندیوں اور برفوں کی مہم سے واپس آنے والا انسان بھی قبول نہیں کرتا.. سمجھوتہ نہیں کرتا..

دنیا کے طویل ترین برفانی راستے بیافو ہسپر ٹریک کے دوران کئی روز کی برف تنہائیوں.. مرگ ملاقاتوں اور سانس گھونٹ دینے والی بلندیوں میں سے بچ کر جب میں آبادیوں میں داخل ہوا تھا اور کریم آباد کے ایک ہوٹل میں آیا تھا تو اس کے ستھرے بستر عجیب لگتے تھے.. کمرے کی دیواریں قید خانہ لگتی تھیں کہ آخر ان کی کیا ضرورت ہے، چھت کے لیے آسمان کافی ہوتا ہے اور اس کا غسل خانہ مریخ کے باشندوں کی آماجگاہ لگتا ہے کہ یہ کیا ہے...اور کریم آباد کے بازار میں چہل قدمی کرتے نارمل شیو شدہ استری شدہ پتلونوں اور قمیضوں میں ملبوس لوگ کسی اور کائنات کے لگتے تھے جن سے میں آشنا نہ تھا.

یہی کیفیت جدہ میں داخل ہونے سے ہوئی تھی.

کے ٹو کے دامن میں واقع کنکورڈیا کی برف زار سلطنتوں سے واپسی پر جب میں نے آئینہ دیکھا تھا تو اس میں بھی مجھے ایک ابنارمل شخص دکھائی دیا تھا جو میں نہ تھا..

"پچھلی شب میں نے شاہ گوری کو خواب میں دیکھا"

اور میں نے دیکھا کہ ایک آئینہ ہے جس میں میرا چہرہ مجھے دیکھتا ہے اور پوچھتا ہے کہ تو کون ہے.. میں تجھے نہیں پہچانتا.. تو کس دنیا کا باسی ہے، کدھر سے آیا ہے اور آنکھوں میں یہ سُرخی کیوں ہے اور تیری بے ترتیب داڑھی کی سفیدی تو برفوں ایسی ہے تو یہ کہاں سے آئی ہے۔"

اور جب جدہ پہنچ کر اگلی سویر میں نے اپنے آپ کو آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی بڑھی ہوئی سفید داڑھی شیو کرنے کی خاطر اپنے آپ کو دیکھا تو جو شکل دکھائی دی، اسے میں نے نہیں پہچانا. اس سے پوچھا کہ تو کس دنیا کا باسی ہے.. کدھر سے آیا ہے اور آنکھوں میں یہ سُرخی کیوں ہے.. کونسی شاہ گوری کو دیکھ کر آیا ہے جو تیرا یہ حال ہے..

توجواب آیا.. کہ یہ میں ہوں جسے تم آج تک پہچان نہیں سکے تھے.. تمہیں کیسے بتاؤں کہ کس شاہ گوری کو دیکھ کر آیا ہوں.. جس کے سامنے زمانے بھر کی شاہ گوریاں ہیچ ہیں اور میں کیسے وصل کا احوال بیان کردوں کہ یہ اُس شاہ گوری اور میرے درمیان کے معاملے ہیں جو ظاہر نہیں کیے جا سکتے.. یہ شیخ حرم کے گناہ اور ثواب کے حساب کتاب کے معاملے نہیں ہیں.. میرے اور شاہ گوری کے آپس کے معاملے ہیں..

یہ میں ہی ہوں جسے تم آج تک پہچان نہیں سکے تھے..

"ایک کارخانہ کعبہ کے گرد طواف کررہی ہے"

صحرا اندر صحرا۔

اور اُس سے پرے ایک اور صحرا کا سامنا۔

اور ان ریت کی بے انت وسعتوں میں کہیں کہیں قیمتی نویں نکور گاڑیاں سکوت میں۔۔ایک ڈنکی کھلونے کی مانند دکھائی دیتیں اور اُن کے برابر صحرا میں خیمے۔۔ایک صحرا نورد کی جصلت کیسے بدل جائے۔۔کتنی دیر امارت اور آسودگی میں۔شہر کے اُلجھاؤ کی گھٹن میں سانس لے۔۔اور وہ سانس لینے کے لیے چھٹی کے دو روز صحرا میں آکر خیمہ زن ہو جاتا ہے اور پھر سانس لینے لگتا ہے۔۔

ایک بار جب مغرب نے دھمکی دی تھی کہ ہم تمہارے تیل کے کنوئیں تباہ کر دیں گے تو پھر کیا کرو گے تو شاہ فیصل نے کہا تھا کہ تمہارے پہیے رُک جائیں گے تو تم کیا کرو گے، ہم تو اپنے اونٹوں پر سوار ہو کر اپنے صحرا میں نکل جائیں گے، اپنے آباؤ اجداد کی مانند۔۔

تب شاید ایسا ممکن ہو جاتا لیکن اب ایک عرب ویک اینڈ تو صحرا میں گزار سکتا ہے۔۔پوری زندگی نہیں۔۔

یہ صحرائی منظر ہمارے دائیں بائیں پھیلا ہوا تھا اور گزرتا جاتا تھا۔۔

دھوپ کی تیز حدت میں۔۔صحرا کے ہر ذرّے میں سُلگتی دھوپ میں۔۔ جدہ سے نکل کر ایک مرتبہ پھر ہم روڈ ٹو مکہ کے مسافر تھے۔۔

بے شک ہم شاہراہ مکہ پر سفر کرتے تھے لیکن ہماری منزل مکہ نہ تھی۔۔طائف تھی۔۔

جب میں جدہ کی راحتوں۔جھلیا کی فیشن سٹریٹ اور بحیرہ اسود کے کناروں پر سیر سپاٹے کرتا تنگ آ گیا تو میں نے سلجوق سے کہا۔"بے شک تم اب اپنے سفارتی معاملات میں کھو چکے ہو۔۔صبح جاتے ہو اور شام کے بعد واپس آتے ہو اور میں اس دوران صبح کا پہلا سگریٹ کمپاؤنڈ کے سوئمنگ پول کے کنارے پام کے جھومتے۔۔ جدہ کی سمندری ہواؤں کے زور سے جھولتے درختوں تلے بیٹھ کر پیتا ہوں۔۔جونہی دھوپ میں حدت بڑھتی ہے تو تمہارے ولا کی ٹھنڈک میں اکیا کے نرم و گداز صوفوں میں دھنس کر یا تو کوئی کتاب پڑھتا ہوں اور یا

تمہارے ڈی وی ڈی پر امریکی فلمیں دیکھتا ہوں جن کے کچھ مناظر مجھ حاجی کے ایمان کو ڈانواں ڈول کرتے ہیں اور بے شک تم نے وعدہ کر رکھا ہے کہ اگلے ویک اینڈ پر ہم مدینہ چلیں گے لیکن ابھی کچھ دن باقی ہیں اور میں ان راستوں سے تنگ آ گیا ہوں تو اس دوران کہیں اور بھی لے چلو..

تو سلجوق نے میری اس تقریر دل پذیر سے متاثر ہوئے بغیر نہایت ٹھنڈے سفارتی لہجے میں کہا ''ٹھیک ہے ابا.. میں ایک روز کی چھٹی کر لیتا ہوں.. ہم طائف چلتے ہیں.. ڈے ٹرپ لگا لیتے ہیں..''

تو ہم طائف جا رہے تھے..

اور سلجوق قونیہ کے درویشوں کی مانند وجد میں آیا ہوا تھا.. اور کار کا سٹیئرنگ یوں گھما رہا تھا جیسے اُس کے مرشد رومی نے اُسے حکم دیا تھا کہ بچہ جتنی زیادہ ڈرائیونگ کرو گے، اتنے ہی تمہارے درجات بلند ہوں گے اور اتنے ہی مجھ سے قریب ہو گے..

میں بیان کر چکا ہوں کہ سلجوق ڈرائیونگ کے عشق میں فنا ہو جانے والا ایک بچہ تھا.. وہ نہ تھکتا تھا، نہ آرام کرتا تھا.. بلکہ اسے آرام بھی تبھی آتا تھا جب وہ ڈرائیور کی نشست پر بیٹھ کر سٹیئرنگ گھمانے لگتا تھا.. قونیہ کے درویشوں کی مانند گھومنے لگتا تھا اور تب وہ دنیا کا سب سے آسودہ، مست اور پرمسرت بچہ ہوتا تھا..

جب ہم پہلے طواف کے لیے مکہ گئے تھے تو رات تھی..

جب حج کے لیے جدہ چھوڑا تھا تب بھی رات تھی..

اور آج پہلی بار دن کے اُجالے میں.. تپتی دھوپ میں.. میں یہ سفر کر رہا تھا اور آس پاس جو صحرا دھوپ میں سلگتا گزرتا تھا اُس کے اندر کہیں کہیں قیمتی گاڑیاں ساکت کھڑی تھیں اور اُن کے پہلو میں مجھ کوہ نورد ایسے مختصر خیمے نہیں بلکہ شاندار اور وسیع اور شاہانہ خیمے نصب تھے.. بدو حضرات کے بدو بچے ریت کے ٹیلوں پر تین پہیوں والی نئی نکور موٹر سائیکلیں دوڑاتے پھرتے تھے..

اور یہ بدو اتنے آزاد منش اور لحاظ نہ کرنے والے ہوتے ہیں کہ ایک غزوہ کے دوران جب مسلمان پسپا ہو رہے تھے اور یکدم رسول اللہ کی پکار نے شکست کو فتح میں بدل ڈالا تو ہر کوئی مال غنیمت کے حصول کے لیے بے چین ہوا اور ایک بدو کو جب اور کچھ ہاتھ نہ آیا تو اُس نے رسول اللہ کی چادر چھینی اور بھاگ نکلا..

کیا جانئے ان کی خصلت ابھی تک بدلی ہے یا نہیں..

اپنے بابا کے صبر کی داد دیجیے کہ ان کا پالا کیسے لوگوں سے پڑا تھا.. وہ تحمل کے کیسے سمندر تھے کہ نہ صرف ان لوگوں کو برداشت کیا بلکہ ان کے نصیب کو بھی سنوار دیا..

پہلی بار دن کی روشنی میں.. تیز دھوپ میں اُسی بابا کا آبائی شہر مکہ نظر آیا.. دو خشک اور ویران پہاڑیوں کے درمیان میں سے ایک جزیرے کی مانند اُبھرتا نظر آیا.. شہر مکہ کے گرد جو سوکھی چٹانیں تھیں، اُن پر جو تہہ در تہہ

آپس میں ایک دوسرے سے ڈرے ہوئے اور جڑے ہوئے جو مکان نظر آئے تو وہ شہر مجھے لاہور جیسا نظر آیا۔۔
یہ قدیم مکہ کا منظر تھا جو پہاڑیوں پر آباد دکھائی دیتا تھا۔۔
خانہ کعبہ سے پرے۔۔ بلندیوں پر ٹھہرا ہوا۔ ڈھلوانوں پر آباد۔ نشیب میں جو گھر تھا اُس سے لاتعلق۔۔
وہ ابھی تک مصالحت نہ کر پایا تھا کہ اگر ایک رسول نے آنا ہی تھا تو وہ مکہ اور طائف کے بڑے سرداروں میں سے کیوں نہ آیا۔ ایک بے آسرا، یتیم اور لاوارث۔ لوگوں کی بھیڑ بکریاں چرا کر روزی کمانے والا ہی کیوں رسول ہوا۔۔ ہاں۔۔ مجھے شک ہے کہ ابھی تک مصالحت نہ ہو سکی تھی۔ نجد کے باسی حکمران۔ حجاز کے ایک نبی سے مصالحت نہ کر پائے تھے۔ محض مجبوری کی بنا پر۔ معاشی اور مذہبی مجبوری کی بنا پر وہ اُسے قبول کرتے تھے۔ اگر نہ کرتے تو اور کیا کرتے۔۔
ہم نے ایک موڑ پر مکہ سے منہ موڑ لیا اور طائف کا رُخ کر لیا۔۔
جیسے بابا کی بات مکہ میں کوئی نہ سنتا تھا تو انہوں نے طائف کا رُخ کر لیا تھا۔ کہ شاید وہاں میری بات سُنی جائے۔ طائف میں صنم کدۂ کعبہ کے بعد منات دیوی کا سب سے بڑا معبد تھا۔
بابا نے اُس منات کو باطل ثابت کرنے کے لیے طائف کا رخ کیا تھا۔۔
ہم نے مکہ سے اگر منہ موڑا تو آسانی سے نہیں۔۔ بہت دشواری ہوئی۔۔ اپنے آپ پر جبر کیا۔ اپنے آپ کو ایک مقناطیسی قوت سے الگ کرنے کے لیے بہت تردد کرنا پڑا۔ اس لیے کہ ہم منہ موڑ کر مڑتے تھے اور وہاں مکہ کے نشیب میں ایک مدھانی رِڑھکی جا رہی تھی۔۔ جو گرداب ہیفیدیلی کا ٹھاٹھیں مارتا تھا اُس کی تندی اور تیزی ایسی تھی کہ وہ یہاں تک۔۔ جہاں ہم مکہ سے منہ موڑ کر طائف کا رُخ کرتے تھے یہاں تک مار کرتی تھی۔۔ کناروں کو ڈھاتی تھی۔۔ جہاں ہماری کار طائف کی جانب مڑتی جاتی تھی۔۔ اُس گردش کی گھمارٹ اتنی زورآور تھی کہ یہاں تک پہنچ کر ہماری کار کو اپنی لپیٹ میں لے کر اسے بے اختیار کر کے اپنا ایک حصہ بنا کر واپس اُسی مدھانی تک لے جانے پر قادر تھی۔۔
اور یہ محض گردش نہ تھی۔۔
میرا بدن بھی تھا۔۔
میرا بدن بھی تھا جو اُس جانب نشیب میں واقع سیاہ مدھانی کی چاٹی میں شامل ہونے کے لیے کھنچا چلا جاتا تھا۔ لوہے کا ایک ذرہ تھا جو اُس سیاہ مقناطیس کی کشش کی تاب نہ لا کر اُس کی جانب اُڑا جا رہا تھا۔ اور کیسا مقناطیس جو کل جہانوں کو کائناتوں کو تخلیق کرنے کے بعد انہیں اپنی جانب کھینچتا ہو۔ تو مجھ ذرے کی بساط کیا۔ کیسی مدافعت اور کیسی نو سری۔ ایک ذرے کے بس میں کیا ہے۔ محض مجبور ہو جانا۔ لیکن یہاں اپنی مرضی سے مجبور ہو جانا۔۔
بس ایک مسئلہ درپیش تھا۔۔
اگر ہم اس گرداب کی لہروں کے آگے ہتھیار ڈال دیتے ہیں جو سیاہ مکعب سے ٹھاٹھیں مارتا ہوا اس

طائف کی جانب مڑتی ہوئی شاہراہ کے کناروں تک آن پہنچا ہے... اور صرف اُدھر سے بلاوا نہیں آ رہا بلکہ ادھر سے بھی لبیک لبیک کی پکار اُٹھتی ہے تو ہم بھی خوشی اس گرداب میں شامل ہو کر بہہ جاتے ہیں.. منہ ول کعبے شریف بہتے جاتے ہیں.. حرم شریف میں داخل ہوتے ہیں اور تب یہ مسئلہ در پیش ہوتا ہے کہ خانہ کعبہ کے گرد ننگے پاؤں جو مخلوق اپنے سیارے کے گرد گھوم رہی ہے تو اُن میں ایک کار بھی جا شامل ہوتی ہے..

ایک کارخانہ کعبہ کے گرد طواف کر رہی ہے..

چاروں ٹائروں پر نہیں چل رہی بلکہ ہجوم میں بہتی جاتی ہے..

اور اُس کار میں سوار جو میں ہوں تو نہایت مجرم محسوس کر رہا ہوں.. بے شک یہ ایک ڈولی ہوتی، ایک اونٹ ہوتا لیکن ایک کار پر سوار ہو کر طواف کرنا کتنی بڑی بے ادبی ہے اور میں اُترنا چاہتا ہوں اور اُتر نہیں سکتا..

کچھ مقناطیس نے کرم کیا اور کشش میں کمی کر دی اور کچھ میں نے اپنے آپ پر جبر کیا اور ہم سوئے طائف مڑ گئے..

منیٰ، مزدلفہ اور عرفات کے سائن بورڈ ہماری تیز رفتاری کے سر پر سے شپ شپ گزرتے جاتے تھے..

عرفات ویران پڑا تھا۔ اتنا ویران کہ مسجد نمرا کی کل وسعت مینار گنبد اور صحن ایک پکچر پوسٹ کارڈ کی مانند عرفات کی روشنیوں میں آویزاں نظر آتے تھے.. ایک ایسا شہر جو سال میں صرف ایک بار بہار سے آشنا ہوتا ہے لیکن اس بہار میں رنگا رنگ مختلف قسموں کے پھولوں کی بجائے صرف اور صرف سفید رنگ کے لاکھوں کنول کھلتے ہیں.. ہاں اس کی ویرانی میں بھی البتہ ایک گل سنگ ایسا تھا جو پچھلے چودہ سو برس سے نہ کملایا تھا نہ مرجھایا تھا.. جبل رحمت.. جو سال میں ایک مرتبہ سفید کنول کے سفید ہزاروں پھولوں سے ڈھک جاتا تھا ایسے کہ ایک بہت بڑا متحرک کنول نظر آنے لگتا تھا..

میں پھر پاس سے گزر جاتا تھا..

جبل رحمت میرے پاس سے گزر جاتا تھا..

مجھے پھر نا آسودگی نے ستایا کہ میں اُس کے دامن تک نہیں پہنچ پایا تھا اور مجھے کار میں بیٹھے ہوئے دامن جبل رحمت کا نظر آ رہا تھا اور اُس کے دامن سے مجھ تک ایک ڈاچی کی چھن چھن چلی آتی تھی.. مجھے بلاتی تھی لیکن میں کیا کرتا جس کمبخت ڈاچی پر میں سوار تھا، وہ مجھے سوئے طائف لے جاتی تھی.. سلجوق نے مجھ سے وعدہ کر رکھا تھا کہ کسی روز ہم صرف عرفات کو آئیں گے.. جبل رحمت کے سائے تلے زندگی بھر کی تھکاوٹ اُتاریں گے.. پسینہ پونچھیں گے شاید اُسی مقام پر کھڑے ہو کر جہاں اونٹ کے سیاہ بالوں سے بنے ہوئے خیمے تک پہنچ کر قصوئی پہلے اپنی پچھلی ٹانگوں میں خم دے کر پھر اگلی دونوں ٹانگوں کو جھکا کر یوں بیٹھی تھیں کہ اُس پر سوار بجز دھیرے سے نیچے اُترے تھے.. شاید اُسی مقام پر..

''صدقے جاں اُن راہاں تُوں جن راہاں تُوں شوہ آیا ای''

عرفات کے بعد ہر سُو صحرا حاوی ہو گیا.. ہماری کار ایک ذرّہ ہو گئی..

لیکن یہ ریت کے ٹیلوں والا وہ خاص نوعیت کا صحرا نہ تھا جس میں بس ریت ہی ریت نظر کی حدوں تک پھیلتی ہے.. بلکہ اسے چٹیل چٹانوں کا ایک لامتناہی بیابان کہنا مناسب ہوگا.. ایک خاموش اور ویران دنیا.. ایک بے پایاں بے آباد وسعت اور اس میں جو سنگلاخ لیکن سرخ کہیں بھوری چٹانیں ساکت ہیں اور یقیناً وہاں صرف گرم ہوا تھی جس میں کوئی ایک پرندہ بھی نہ ہو سکتا تھا.. اگر ہوا تو پر جلا کر گر چکا ہوگا.. یہ محض چٹان کی شکلوں کی چٹانیں نہ تھیں بلکہ ان میں سے کئی ہاتھ سے تراشی ہوئی لگتی تھیں اور ان میں کچھ شباہتیں سی نمودار ہوتی لگتی تھیں.. یہ ممکن نہ تھا کہ ویرانے کے اس وسیع سنگلاخ ہول میں آج تک کبھی مسافر نے سفر کیا ہو.. لیکن ایک مسافر نے کیا تھا.. وہاں ہم سے پوشیدہ اس چٹانی بے آب دُنیا ہی کی دھوپ میں وہ راستے تھے جن پر سفر کرتے ہوئے اہلِ مکّہ طائف پہنچتے تھے..

تو ایک مسافر نے اسی صحرائے ہول میں نامہربان سنگی چٹانوں کے اندر سفر کیا تھا.. ایک بے آسرا مسافر.. قریبی رشتے داروں اور قبیلے کا دھتکارا ہوا ایک ایسا شخص سفر کرتا تھا سوئے طائف جس کے دل میں ایک مقدس آگ بھڑکتی تھی.. کوہِ طور کی جھاڑی میں سے پھوٹتا جو نور ظہور تھا، اُسے اپنے سینے میں پوشیدہ کیے، غارِ حرا میں پڑھایا جانے والا وہ شخص تن تنہا اور ایک روایت کے مطابق زید بن حارث کے ہمراہ طائف کو جاتا تھا کہ شاید جو بات اہلِ مکّہ کے سنگ دلوں پر اثر نہیں کرتی اہل طائف کے دلوں میں اتر جائے..

کار کی رفتار ہولی ہولی مدھم ہو گئی..

سلجوق کی کار کا مدھم ہو جانا باعث تشویش ہو سکتا تھا کہ وہ ایک تیز رفتار پنچھی تھا لیکن اب وہ بے بس تھا کہ چڑھائی کا آغاز ہو چکا تھا..

جیسے شاہراہ قراقرم پر یکدم کار آہستہ آہستہ ہونے لگتی ہے اور آپ اس خدشے میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ انجن میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے لیکن یہ وہ نامحسوس چڑھائی ہوتی ہے جو بظاہر ہموار نظر آتی ہے...

کار مزید مدھم ہوگئی..

دائیں ہاتھ پر جہاں بیاباں کے راستے میں اب بلند چٹانیں حائل ہونے لگی تھیں، ان کے دامن میں.. ایک کھلی وادی میں پہاڑوں کے آغوش میں ایک تفریحی پارک کے آثار تھے.. ریستوران.. جھولے.. سبزہ، کار پارک اور وہاں سے آہنی رستوں سے جھولتی ڈولتی کیبل کارز بلند ہو رہی تھیں..

سلجوق نے ایک تجربہ کار گائڈ کی مانند فوراً معلومات مہیا کر دیں "ابو.. بیشتر سعودی اپنے بال بچوں اور بیویوں سمیت نشیب میں واقع اس تفریحی پارک میں پہنچ کر وہاں اپنی کاریں پارک کرتے ہیں اور پھر کیبل کار میں سوار ہو کر اوپر طائف کے ایک جنگل میں پہنچ کر خنک ہواؤں سے سارا دن لطف اندوز ہو کر اور ڈھیر دل چکن اور پلاؤ نوش کر کے شام سے پہلے لوٹ آتے ہیں.."

کیبل کارز ایک تواتر کے ساتھ.. ایک ان تھک کوہ پیما کی مانند بلندی کی جانب سرکتی اٹھتی جا رہی تھیں..

پھر باقاعدہ چڑھائی کا آغاز ہو گیا. کار کا انجن زور لگاتا سنائی دینے لگا.. چڑھائی کے ساتھ موڑ بھی شروع ہو گئے.. شاہراہ بلند ہوتی بل کھانے لگی. آس پاس کا منظر جو ابھی کچھ دیر پہلے وسعت میں حد نظر کے پار تھا سمٹتا ہوا قریب ہو گیا. چٹانیں کار پر سایہ کرنے لگیں. لیکن یہ چٹانیں خشک اور بانجھ نہ تھیں، ان کی کوکھ کہیں کہیں ہری ہو رہی تھی.. کونوں کھدروں میں سے روئیدگی پھوٹنے لگی تھی. جھاڑیاں.. جنگلی گھاس اور خودرو بوٹے لٹکتے تھے جو ظاہر کرتے تھے کہ آب و ہوا میں فرق آ گیا ہے، رنگت بدل چکی ہے.. کچھ دیر پہلے جو بندہ صحرائی تھا.. وہ سرد کوہستانی میں بدل رہا تھا..

بس ویسے.. جیسے ہمارے شمال میں ایک خاص بلندی پر پہنچ کر آپ جب سانس لیتے ہیں تو اس میں یکدم ایک مست کر دینے والی مہک شامل ہو جاتی ہے اور آپ جان جاتے ہیں کہ اب ہم ایک ایسی اونچائی پر آ گئے ہیں جہاں صرف وہ گھاس اور گل بوٹے سر اٹھاتے ہیں جو صرف سرد موسموں میں ہی پنپ سکتے ہیں اور اسی لیے ان کی مہک الگ ہے.

لیکن یہ علاقہ ہمارے شمال ایسا دل نشین نہ تھا، کہ ویسی دل نشینی کا تصور عرب میں محال ہے لیکن یہ ایک مماثلت تھی.. بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جیسے ڈیرہ غازی خان سے سفر کرتے ہوئے سخی سرور کے مزار کے قریب سے دھول اڑاتے گرمی سہتے.. راکھی ندی کو عبور کر کے جونہی آپ کوہ سلیمان کے سلسلۂ کوہ میں داخل ہو کر بلند ہونے لگتے ہیں تو وہاں بھی خشک چٹانوں کی اوٹ سے روئیدگی جھانکنے لگتی ہے. صحرا.. کوہستان میں بدلنے لگتا ہے.. بس ایسے ہی..

یہ چڑھائی کسی حد تک کلر کہار کی پُرپیچ مسافت کی مانند تھی.. شاہراہ اٹھتی چلی جاتی تھی، مڑتی چلی جاتی تھی اور کار گھومتی چلی جاتی تھی جیسے طائف پہنچنے کے لیے بھی ایک مسلسل گھماوٹ، ایک طواف درکار ہے..

وہ تفریحی پارک اور کھلی وادی بہت نیچے رہ گئی تھی..

کان سناٹے میں چلے گئے تھے، ان کے پردے آواز کی راہ میں رکاوٹ ہو رہے تھے..اس شاہراہ پر سفر کرتی بیشتر گاڑیاں ہم سے حجم میں بہت بڑی تھیں، وہ ہمیں اوورٹیک کرتیں تو ہماری کار ذرا ہچکولے کھانے لگتی..

ٹریفک کا کوئی حساب نہ تھا..اتنے لوگ طائف کی جانب چلے جا رہے تھے..

'''رامائن' کے پیارے ہنومان مہاراج طائف میں''

جب ہم ایک ایسی آخری بلندی پر پہنچ گئے جس کے پار میرے حساب سے طائف کو ہو جانا چاہیے تھا تو میں نے شاہراہ کے کنارے جہاں سے نیچے دیکھنے سے وادی ایک مختصر تصویر دکھائی دیتی تھی، وہاں میں نے ایک ایسا منظر دیکھا جس کے لیے مجھے آج تک کسی کتاب نے یا ان علاقوں میں آنے والے شخص نے تیار نہیں کیا تھا..

مجھے نہیں معلوم کہ آخر اس منظر کو آج تک کیوں بیان نہیں کیا گیا. خفیہ کیوں رکھا گیا تھا..

شاہراہ کے کنارے پر.. اس کی پتھریلی حفاظتی دیوار پر.. اور برابر میں کھڑی ہوئی کاروں اور لینڈ رووروں پر.. اور آس پاس کی چٹانوں پر.. بندر تھے.

کوئی ایک آدھ بندر نہیں. غول کے غول.

کوئی کسی بلند پتھر پر براجمان شانت کھویا ہوا عبادت میں مگن بندر.. لاتعلق! ایک اور اپنے بچے کو گردن سے چمٹائے ایک چٹان پر کودتا پرواز کرتا ایک اور چٹان پر لینڈ کرتا ہوا..

گاڑیاں رکی ہوئی تھیں..

اور بندران گاڑیوں کے بانٹ پر براجمان طائف میں داخلے کا ٹول ٹیکس وصول کر رہے تھے اور کس صورت میں؟.. مونگ پھلیوں، کیلوں، آئس کریموں اور کہیں برگروں اور چپس کی صورت میں.. جو متعدد سعودی اور ان کے بچے ان کی خدمت میں پیش کر رہے تھے.. ایک فربہ بندر نہایت اطمینان سے ایک چکن پیس کھا رہا تھا..

ان میں سے کچھ تو بس معمولی بندر تھے لیکن چند ایک بہت ہی بندر تھے.. یعنی جسم میں بڑے بڑے.. بیون اور بن مانس کی نسل کے.. پلے ہوئے.. توانا.. غراتے ہوئے.. انسانوں کو گھورتے ہوئے کہ تم ارتقاء کی چند سیڑھیاں آگے ہو تو کیا.. ذرا غور کرو کیا میری شکل تم سے ملتی جلتی نہیں ہے..

بھلا یہ ہمارے ہنومان مہاراج یہاں سعودی عرب میں کیسے آ گئے.. والمیکی کی ''رامائن'' میں سے نکل کر ایسے دیار میں کیوں چلے آئے جہاں ان کی حیثیت ایک دیوتا کی نہیں.. بس ایک بندر کی ہے.. تو یہاں کیوں آ گئے

ہنومان نے سیتا سے کہا۔ ''اے ماں.. میں فوراً جا کر رام کو لاتا ہوں. لیکن آپ دُکھ کیوں کرتی ہیں اگر آپ چاہیں تو میری پشت پر سوار ہو جائیں.. میں آپ کو سمندر پار کروا کے لحہ بھر میں رام کے ہاں لے جاتا ہوں. میرے اندر نہ صرف آپ کو رام تک پہنچانے بلکہ سارے لنکا کی بنیادیں اکھاڑنے اور اس کے حکمرانوں کو رام کے قدموں میں ڈالنے کی طاقت ہے.. آیئے میری پشت پر سوار ہو جایئے..''

(رامائن)

سچی بات ہے میں مذہب کے بارے میں بہت معتدل ہو کر بھی سوچتا تھا تو ایک بندر کی پرستش میری سمجھ میں نہ آتی تھی. لیکن میں یہ بھی اقرار کرتا ہوں کہ ''رامائن'' جو ایک شاہکار ہے پڑھنے کے بعد ہنومان ایک نہایت ہی ہمدرد اور پیار کرنے کے قابل کردار کے طور پر سامنے آتا ہے جو نیکی کی قوتوں کا ساتھ دیتا ہے اور بدی کے خلاف ڈٹ جاتا ہے..

تو یہ ہنومان مہاراج جانے کیوں سعودی عرب کی سرزمین پر بے وقعت ہونے کے لیے آ گئے تھے.. دیوتا کا سنگھاسن چھوڑ کر بندر ہونے کے لیے آ گئے تھے..

بہت بعد میں یہ کھلا کہ سعودی عرب میں بندر کم نہیں.. یہ یہاں ازل سے رہتے آئے ہیں لیکن ان کا تذکرہ کوئی نہیں کرتا.. اردن کی سرزمین کے قریب ایک قصبے میں ہماری نتھیا گلی کے چیڑ کے درختوں سے جھولنے والے بے شمار بندروں کی نسبت زیادہ بندر ہیں.

جبل نور پر.. غار حرا کے آس پاس بھی بندر پائے جاتے ہیں..

اور رچرڈ برٹن بھی اپنے سفرنامہ حج ''ال مدینہ اور مکہ کی زیارت کے بارے میں ایک ذاتی بیانیہ'' میں مکہ کی پہاڑیوں میں اور کبھی شہر میں اتر آنے والے بن مانسوں کا حوالہ دیتا ہے..

بہرحال مجھے اس بندر منظر نے نہایت مسرور کیا کہ شکر ہے یہاں اونٹوں کے علاوہ کوئی اور جانور بھی دیکھنے کو ملا.. بندر ہی سہی..

ذرا اوپر ہوئے تو دائیں ہاتھ پر درختوں کا ایک گھنا جزیرہ پہاڑ کی بلندی پر سرسبز ہو رہا تھا.. اسے میں جنگل تو قرار نہیں دے سکتا لیکن سعودی عرب میں اتنے ڈھیر سارے درخت میں نے کبھی بھی یک مشت نہ دیکھے تھے.. مجھے نہیں معلوم کہ ان کی ذات پات کیا تھی.. چیڑ تھے.. دیودار یا شاہ بلوط تھے جو بھی تھے یہی کافی تھا کہ درخت تھے..

اور پھر میں نے سعودی عرب میں پہلے پھول دیکھے..

اگرچہ جدہ اور مکہ کے سپر سٹور ایسے ایسے خوش رنگ اور خوش شکل پھولوں سے اٹے پڑے تھے کہ جن کی مثال ممکن نہیں.. لیکن ان میں نہ مہک تھی اور نہ تازگی کہ وہ بناوٹی میڈان چائنہ پھول تھے..

تو یہ پہلے بناوٹ کے بغیر مٹی میں اُگے ہوئے سچ مچ کے پھول تھے..

ایسے پھول..

جیسے صحراؤں میں چلے ہولے سے بادنسیم..

ویسے صحراؤں میں ہولے سے یا زور شور سے بادنسیم تو چلتی ہی رہتی ہے لیکن ان میں ایسے پھولوں کا کھلنا ایک معجزہ تھا..

اوران پھولوں کو تکتے ہوئے مجھے پہلی بار یاد آیا کہ یہ وہی موسم ہیں.. وہی دن ہیں جب لاہور میں کیسی کیسی ہری بھری کونپلیں پھوٹ رہی ہوں گی.. اور میرے گھر میں شاید ڈہلیا کا پہلا پھول کھل چکا ہوگا اور اس کا چہرہ ذرا پژمردہ ہوگا کہ مجھے ایک فاتر العقل کیفیت میں تادیر دیکھتے چلے جانے والا شخص یہاں کیوں نہیں ہے.. کہاں چلا گیا ہے اور پینزی ایک تتلی کے روپ میں نمودار ہو چکی ہوگی.. پٹونیا کے پھول بھی سوگ میں ہوں گے کہ وہ کہاں ہے.. وہ آئے تو ہم ایک نامحسوس انوکھی مہک کے ساتھ کھل اٹھیں..

ڈھلوانوں پر رہائش گاہوں کی دیدہ زیبی بکھری ہوئی تھی.. جیسے اطالیہ کی ساحلی چٹانوں پر گھروں کی خوش نمائی نظر آتی ہے..

مجھے میرے پسندیدہ پھول پٹونیا بھی شاہراہ کے کنارے پر کیاریوں میں کھلے ہوئے نظر آگئے..

طائف کی نواحی آبادی کا آغاز ہو چکا تھا

"ایک سوختہ مسجد.. ایک غار.. "وہی مقام" ..جہاں بابا پر پتھر برسائے گئے تھے"

اور پھر دو چٹانوں کے درمیان طائف کا شہر نظر آنے لگا. قریب آنے لگا.. اور جو نظر آرہا تھا وہ میرے تصور سے سراسر مختلف تھا اور ہونا بھی چاہیے تھا کہ دنیا کا ہر تاریخی یا مشہورِ عالم شہر آپ کے تصور میں کچھ ہوتا ہے اور جب آپ اسے اپنے سامنے پاتے ہیں تو وہ کچھ اور ہوتا ہے..

میرے تصور کی کائنات میں طائف کا جو نقشہ تھا وہ چودہ سو برس پرانا تھا..

جب ایک ڈاچی سوار اس میں داخل ہوا تھا..

بے سروسامان تھا اور دور کے شہر مکہ سے آیا تھا.

اور اہلِ طائف کہ وہ بہت متمول تھے.. سرمایہ دار اور خوش حال تھے.. ان کے انگوروں کے باغوں میں جو بیلیں تھیں، وہ پھل کے بوجھ سے سجدہ ریز ہوتی تھیں... ان کے انار ایسے سرخ رنگ دانوں سے بھرے ہوئے تھے کہ ان کا ایک ایک دانہ.. ایک سرخ ہیرے ایسا قیمتی تھا اور ان کے ثمردار درخت بے شمار تھے.. اور ان پر آلوبخارے مٹھاس کے بوجھ کو سنبھالنے سے قاصر تھے.. زرخیز زمینوں میں وہ ایک بیج بوتے تھے تو ہزار ثمر نمودار ہو جاتے تھے.. ان زمینوں میں اُگنے والی سبزیوں کی بہتات کا کوئی شمار نہ تھا اور یہ سب مہربانیاں منات کی تھیں کہ منات کا مندر طائف میں سربلند تھا. تو اہلِ طائف نہ صرف اپنے باغوں، زرخیز زمینوں اور دولت کے انباروں کے تکبر میں تھے بلکہ لات کی ہمسائیگی میں رہنے والی دیوی منات کی قربت پر بھی نازاں تھے.. تو انہوں نے مکہ ایسی بنجر سرزمین سے آنے والے کی کچھ قدر نہ کی کہ نہ وہاں انگوروں کی بیلیں تھیں اور نہ کوئی ایسے کھیت جو سبزے سے ڈھکے ہوتے تھے.. یہ جو نیچے حرا سے اوپر آیا ہے کھردرے کرتے اور تہبند میں ملبوس، سرد راتوں کے لیے اس کے پاس صرف ایک سیاہ کمبل ہے تو اس کی کیا حیثیت ہے ہمارے سامنے..

شاہراہ کے دونوں جانب چٹانیں بلند ہونے لگیں. ان کے درمیان جو بستی نظر آئی وہ میری توقع سے کہیں بڑی نظر آ رہی تھیں.. یہ ایک بستی نہ تھی ایک وسعت بھرا شہر تھا..

یہ کسی حد تک کوئٹہ سے مشابہت رکھتا تھا لیکن اُس کی نسبت شاداب بہت تھا. خوش نظر بہت تھا. ہر سُو ہریاول تھی جس میں کہیں کہیں سرو کے درخت قد نکالتے تھے..

میں نے کھڑکی کا شیشہ سرکا کر نیچے کیا تو خوشگوار خنکی کا ایک جھونکا در آیا. میرے چہرے کو چھونے لگا.. یہ خبر کرتے کے لیے کہ تم کار کی ایئر کنڈیشنگ بند کر دو.. اپنی کھڑکیاں کھول دو اور گہرے سانس لو کہ اس بستی میں سیاہ کمبل والے نے جو سانس لیے تھے شاید تمہارے نصیب میں بھی ان جیسا ایک سانس ہو.. وہی مہک اور تازگی ابھی باقی ہو جو ساجن کے بدن کے پسینے کو چھو کر گزر رہی تھی..

شاید..

طائف میں بھی وہ سب کچھ تھا جو سعودی عرب کے ہر شہر میں ایک اُکتا دینے والی یکسانیت میں موجود ہوتا ہے.. وہی البیک. تازج. امریکی میکڈانلڈ. شاپنگ مالز اور بے روح جدید تجارتی عمارتیں اور کاریں ہی کاریں.

میں کار سے نکل کر باہر آیا تو میرے کانوں میں بلبلے سے اٹھ رہے تھے جو بلندی کی خبر کرتے تھے.
میں نے ناک کو چٹکی میں دبا کر سانس پر زور ڈالا تو بلبلے ایک ایک کر کے بے آواز پھٹتے گئے اور میرے کان کھل گئے.. اور مجھے ایک سویٹر کی ضرورت محسوس ہوئی..

''خندق ابراق'' کے عین سامنے احمد حسن پراچہ اپنے ڈیلن ڈول جیسی کھلی ڈُلی کار سے ٹیک لگائے ہمارے منتظر تھے..

پراچہ صاحب نے نہایت قادر الکلامی سے ایک سفرنامہ.. ''کنارے کنارے'' نام کا لکھا تھا جس کے بارے میں میں نے چند حروف لکھے تھے اور یہ چند بے وقعت حروف ہمارے درمیان ایک پل بن گئے اور میں اسی پل کو پار کرتا ہوا آج طائف میں ان تک پہنچ گیا تھا..

پراچہ صاحب ایک مدت سے طائف میں مقیم ہیں اور مقامی آبادی کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں.. پتہ نہیں وہ آراستہ ہوئی ہے کہ نہیں.. کہ ایسے زیور سے بالعموم ادھر اجتناب ہی کیا جاتا ہے..

''کہاں چلیئے گا تارڑ صاحب؟''

''جہاں سجن گئے تھے''

''تو چلیے..''

طائف سعودی عرب کا گرمائی صدر مقام ہے اور یہاں بھی بے مقصد اور وسیع و عریض شاہی محلات ہیں جہاں شاذ ہی کوئی آتا ہے..

''یہ مسجد عبداللہ بن عباس ہے اور اس کے اندر ان کا مرقد ہے.. یہاں جنازے پڑھائے جاتے

ہیں..آ یئے..''

ہم آ گئے..مسجد کے اندرون میں آ گئے..بہت وسیع اور صاف ستھری تھی..اسے ایک نظر دیکھنے کے بعد باہر آ گئے..

باہر جہاں دھوپ ڈھل رہی تھی..جہاں مسجد کے سامنے جو فٹ پاتھ تھا وہاں کیسی اچھی شکلوں والے..سرخ بھی سفید بھی گلابی اور سبز بھی..طائف کے پھل کریٹوں میں سجے تھے..پہلی بار تازہ پھلوں کو یوں اوپن ایئر میں سجتے دیکھ رہا تھا ورنہ جدہ میں جہاں بھی دیکھا سٹورز کے ڈیپ فریزرز میں حنوط شدہ سرد حالت میں ہی دیکھا..مجھے خوشی ہوئی کہ چلئے سعودی عرب میں کہیں تو خوش شکلی نظر آئی..پھل فروٹ میں ہی سہی۔

نہ صرف پھلوں کے کریٹ فٹ پاتھ پر سجے تھے بلکہ اہل طائف وہاں نہایت خوش وخرم کیفیت میں ایک دوسرے سے چہلیں کرتے..ہنستے مسکراتے چہل قدمی بھی کر رہے تھے اور یہ منظر مجھ جدہ سے آئے والے کے لیے حیرت کا سامان ہوا کہ جدید جدہ میں اول تو فٹ پاتھ ناپید ہیں اور اگر کہیں ہیں تو ان پر یا تو صفائی کرنے والے بنگلہ دیشی کھڑے ہوتے ہیں یا اکا دکا درخت کھڑے ہوتے ہیں اہل جدہ ان پر چلنا پھرنا اپنی توہین سمجھتے ہیں..وہ صرف اپنی بڑی گاڑیوں کے ایئر کنڈیشنڈ تابوتوں میں بند چلتے پھرتے ہیں..

دھوپ صرف بلند عمارتوں کی آخری منزلوں پر زردی میں ڈھل رہی تھی..اس گہما گہمی سے ذرا ہی آگے گئے ہیں تو گویہ طائف کی رونق یکدم گھٹ گئی..فٹ پاتھ ویران نظر آنے لگے اور آبادی کم ہونے لگی..جیسے ہم طائف کے میلے سے نکل آئے ہوں..جس سڑک پر ہماری کار آہستگی سے چلتی تھی ذرا ڈھلوان میں تھی اور ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی..شہروں کی رونقیں تو بہت دور تک چلتی ہیں لیکن یہاں مجھے محسوس ہوا جیسے ایک سرحد آ گئی ہو جس کے پار رونق جا نہیں سکتی تھی، رُک جاتی تھی..

مجھے آج تک اس یکدم بے رونقی کا جواز سمجھ میں نہیں آیا..

شاید وہی جواز تھا جو ہم دیکھنے والے تھے..

دائیں جانب چند چٹانیں نظر آئیں جو زرد رنگ کی تھیں اور رخصت ہونے کو خود دھوپ ان کے آخری کنکروں پر تھی وہ چٹانوں کی زردی کو سنہرا کرتی تھی..چند ایک چٹانیں تھیں اور بہت ویران اور چٹیل اور ان کے دامن میں..اور یہ دامن سڑک کے برابر میں تھا وہاں کسی ڈھے چکی سوختہ عمارت کے باقیات تھے..

پراچہ صاحب نے اپنی کار فٹ پاتھ کے برابر میں پارک کی اور ہم باہر آ گئے..

حیرت کہ آس پاس کہیں بھی کوئی بھی نظر نہ آتا تھا..ہم تنہا تھے..

یہ سوختہ آثار فٹ پاتھ کی سطح پر واقع نہیں تھے بلکہ اس سے تقریباً دو میٹر اونچائی پر چٹانوں کے سائے میں تھے..اور سورج جو کہیں ڈوبنے کو تھا اپنی کرنیں سمیٹتا تھا اور اس جلی ہوئی چھوٹی سی کوٹھڑی نما عمارت پر چٹانوں کے سائے آہستہ آہستہ طویل ہو رہے تھے..

فٹ پاتھ کے ساتھ ساتھ جو حفاظتی دیوار چلتی تھی اس میں تین پتھریلی سیڑھیاں تھیں جو چٹانوں کے قریب سوختہ عمارت کی سطح کے برابر میں لے جاتی تھیں..

ان سیڑھیوں پر قدم رکھتے.. سر اُٹھا کر ان چٹانوں کو تکتے جن پر دھوپ اٹھنے کو تھی اور یقین جانئے کوئی دیرانی سی ویرانی تھی.. ایک عجیب سا ماحول تھا.. نیچے سڑک پر سے کوئی کار تیزی سے گزر جاتی تو احساس ہوتا کہ ہم کسی بستی کے قریب ہیں۔ کسی ایسے صحرا کے ویرانے میں نہیں ہیں جہاں آج تک کوئی نہیں گیا اور وہاں ہم اپنے سامنے وقت کے ہاتھوں کھنڈر ہو جانے والی نہیں بلکہ انسانی ہاتھوں سے سپرد آگ کی جانے والی ایک عمارت کو دیکھ رہے تھے تو یہاں اس ویرانے میں کون آیا اور اسے جلا دیا اور کیوں..

دو تین کوٹھڑیاں سی تھیں جن کی چھتیں ڈھے چکی تھیں.. ایک نیم سوختہ شہتیر کا لکڑ زدہ ابھی قائم تھا.. فرش پر جلی ہوئی اینٹیں بکھری ہوئی تھیں اور ان میں عربی میں رقم کیے ہوئے نیم سوختہ اوراق بھی تھے.. شاید دعائیں تھیں شاید آئتیں تھیں.. نہایت خستہ حالت گندے گندے مندے دو مصلے ایک کونے میں پڑے تھے اور ایک طاقچے میں ایک بجھا ہوا چراغ تھا شاید..

ڈھے چکی چھتوں کی جانب اوپر دیکھنے سے وہ چٹانیں نظر آ رہی تھیں جو ابھی تک آخری کرنوں کی بجھی بجھی زردی کی بیمار ادا میں مبتلا تھیں

سلجوق پہلے بھی یہاں آ چکا تھا

"یہی وہ مقام ہے.. جہاں ہم ہیں.. جہاں اہل طائف نے حضورؐ پر پتھر برسائے تھے، انہیں لہولہان کر دیا تھا.. اس دیوانے کو پتھر مارتے تھے.. حضورؐ اس بارش سنگ سے بچنے کی خاطر بیٹھ جاتے تو طائف کے باسی انہیں زبردستی کھڑا کر کے پھر سے پتھر مارنے لگتے.. اسی جگہ پر.. اسی مقام پر.."

"اسی مقام پر.." میرا حال کچھ اچھا نہ ہوا۔

میں نے اپنے پاؤں کی جگہ سراسیمگی میں بدل لی کہ کہیں یہ وہی مقام نہ ہو.. ابھی تک میں ایسے "اسی مقام پر" نہ ہوا تھا..

اگرچہ وہ ہر جگہ موجود ہے.. لیکن یہ اس کا گھر ہے اور وہ اسی مقام پر ہے..

جبل رحمت کے سائے میں جہاں قصوی بیٹھی تھی اور وہ اترے تھے تو اُس مقام کو بھی میں نے دور سے دیکھا تھا.. سعی کرتے ہوئے بھی میں نے دور سے اُس مقام کو دیکھا تھا جہاں وہ پیدا ہوئے تھے.. میں کبھی ایسے مقام پر نہ ہوا تھا جہاں ان کے نقش پا تھے.. اب ہوا تھا تو ان پر پاؤں رکھنا نہ چاہتا تھا..

حج تو میں نے پورے ہوش و حواس میں کر لیا تھا لیکن "اسی مقام پر" جب کھڑا ہوا ہوں تو حواس کھو بیٹھا.. یہ بابا سے میری پہلی ملاقات تھی اور مجھے اپنا حج دھندلاتا ہوا نظر آیا.. مجھے یہاں آنا چاہیے تھا، وہاں کیا کرتا رہا..

''اس مقام کی نشاندہی کر کے.. اور آپ جانتے ہیں کہ ترکوں نے حضورؐ کی حیات کے ہر لمحے کو کھوج کر.. تحقیق کر کے.. ہر اس مقام پر ایک مسجد تعمیر کروائی جہاں وہ کبھی موجود ہوئے تو انہوں نے یہاں بھی یہ مختصر سی مسجد بنائی..'' پراچہ صاحب بتا رہے تھے ''لیکن آل سعود نے اپنے عقیدے کی رو سے اسے شرک جانا کہ یہاں زائرین آتے تھے، گریہ زاری کرتے تھے اور نوافل ادا کرتے تھے تو انہوں نے اسے بھی آہستہ آہستہ مسمار کر دیا..''

''ابو پچھلے برس جب میں بابا ہندی کے ہمراہ یہاں آیا تھا تو مسجد کی ایک کوٹھڑی کی چھت قائم تھی.. لگتا تھا کہ اسے بھی مسمار کرنے کی خاطر.. مٹانے کے لیے آگ لگا دی گئی..''

میرے وطن میں جو تنگ نظر اور جابر قوانین اسلام کے نام پر رائج ہیں.. اگر ایک ہوش و حواس سے عاری دیوانہ قرآن کے اوراق جلا دیتا ہے.. یا کوئی ہوش و حواس والا ان اوراق کو بے حرمتی سے بچانے کی خاطر آگ میں ڈال دیتا ہے تو خلقِ خدا اس کو سنگسار کر کے اس کی نعش گلیوں میں گھسیٹتی ہے.. اور جہاں سے ہم یہ اسلام امپورٹ کرتے ہیں وہاں بابا کے مقام کے ساتھ قرآن کے اوراق بھی نذرِ آتش کر دیے جاتے ہیں تو ہم چپ رہتے ہیں، شاہوں کے سامنے گدا کیسے بول سکتے ہیں..

''آپ جلدی سے یہاں نفل ادا کر لیں'' پراچہ صاحب نے وارننگ دی ''اگر کسی نے دیکھ لیا تو مصیبت آ جائے گی.. جلدی کیجیے..''

چوروں کی طرح.. جیسے ہم کسی بہت ہی بڑے جرم کے مرتکب ہو رہے ہوں.. ان بوسیدہ مصلوں کو نیم سوختہ اینٹوں اور جلتے ہوئے اوراق پر بچھا کر شتابی سے ڈرتے ڈرتے کہ ابھی ہماری پشت پر شرک کے دڑے کا ایک وار ہوگا، ہم نے دو نفل ادا کیے..

منبر ابھی موجود تھا..

جلا ہوا.. راکھ ہونے کو.. مگر موجود تھا..

شاید ہمارا ہی منتظر تھا کہ وہ آئیں آخری سجدے کریں تو پھر میں ڈھے جاؤں..

ترکوں نے، بے شک وہ ایک جابر اور قابض قوت تھے لیکن انہوں نے تحقیق اور جستجو سے حیاتِ محمدؐ کی نشاندہی کی.. تا کہ تاریخ محفوظ ہو جائے یہ ان کا دستور تھا.. اور آل سعود کا دستور یہ ہے کہ وہ ہر ایسے عمل کو بدعت اور شرک گردانتے ہیں.. تاریخ کو محفوظ کرنے کو وہ کفر سمجھتے ہیں، اس لیے جو کچھ ترکوں نے تعمیر کیا، انہوں نے ڈھا دیا.. مٹا دیا.. ان کے نزدیک خانہ کعبہ کے سوا ہر عمارت شرک اور بدعت ہے اور میں نہیں جانتا کہ اس میں کہاں تک سچائی ہے کہ وہ روضۂ رسولؐ کو بھی برداشت نہ کرتے تھے اور اسے مسمار کرنے کے بھی درپے تھے.. شاید یہ افواہ ہو، مخالف عقیدے کے لوگوں کا الزام ہو.. میں نہیں جانتا..

ہم جیسے لوگ جو برصغیر سے آتے ہیں، ہم نہ اختلاف کر سکتے ہیں اور نہ اتفاق کہ ہماری کوئی حیثیت

نہیں.. کوئی اوقات نہیں.. ہم تو گداگر لوگ ہوتے ہیں... بھیک مانگنے آتے ہیں.. ایک گداگر نہ اختلاف کر سکتا ہے، نہ سوال و جواب... وہ تو صرف جھولی پھیلائے مُہر بلب مسکین حالت میں کھڑا رہتا ہے..

ہم تو صرف سر جھکا سکتے ہیں..

اس ایک مقام پر.. اور وہ بھی ایک مجرم کی مانند.. جہاں میدان جنگ کے علاوہ بابا کا خون بہا تھا. ایڑھیوں تک.. پاؤں پر سُرخی کا پوچا کرتا اور پھر زمین میں جذب ہوا تھا..

اسی مقام پر..

ان کی چپلیں بھی خون سے بھر گئی تھیں..

کوئی ویرانی سی ویرانی تھی..

شاید یہ ویرانی اور بے چارگی کا احساس اس لیے ہم پر سایہ کرتا تھا کہ چٹانوں پر سے دھوپ اب اُٹھ گئی تھی.. سورج کہیں ڈوب رہا تھا اور اس کے سائے طویل ہوتے ہوتے سیاہی میں بدلنے کو تھے.. شاید اس لیے..

ہم تیز دھوپ میں.. دن کے وقت یہاں آتے تو شاید اتنی ویرانی محسوس نہ ہوتی.. اگرچہ میں بھی ایسی یادگاروں کو مناسب نہیں سمجھتا جہاں لوگ سجدے کرنے لگیں.. وہ بے شک داتا صاحب ہوں.. اجمیر والے ہوں یا بی بی زینب کا مزار.. جہاں لوگ مرادیں مانگنے لگیں.. اپنے اللہ کو فراموش کر کے اس کے بندوں سے رجوع کرنے لگیں اور وہ مقام مندر بن جائیں.. معبدوں کی شکل اختیار کر جائیں.. چڑھاوے چڑھنے لگیں.. بہشتی دروازوں کا کھیل شروع ہو جائے.. اور ان مندروں میں گھنٹیاں بجانے والے.. رب کو پکارنے کی بجائے اُسے آوازیں دینے لگیں جسے یہ تشویش تھی کہ وہ بخشا جائے گا یا نہیں تو وہ کیسے دوسروں کی بخشش کا سامان کر سکتا ہے..

رب کے سوا بخشش تو بس بابا کے بس میں ہے یا پھر "کشف المحجوب" کے مطابق تابعین میں سے حضرت اویس قرنی کے بس میں کہ اس جنگل میں رہنے والے دیوانے نے جو اونٹوں کو چراتے والے نے اپنی بوڑھی ماں کی خاطر بابا کے حضور کبھی حاضری نہ دی جو کبھی ان کا چہرہ نہ دیکھا اور پھر بھی اپنے محبوب کے حسن میں ایسے فنا تھے کہ جب یہ سنا کہ جنگ اُحد میں ان کے دانت شہید ہو گئے ہیں تو ایک ایک کر کے اپنے سب دانت توڑ ڈالے کہ نہیں جانتے تھے کہ ان کے کون سے دانت شہید ہوئے ہیں.. تو اسی اویس کے بارے میں بابا نے حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ میں نے اسے نہیں دیکھا، تم دونوں اسے دیکھو گے، وہ ایک میانہ قد، لمبے لمبے بالوں والا آدمی ہے.. جب تم اسے ملو تو میرا اسلام کہنا اور اس سے کہنا کہ میری اُمت کے حق میں دعا کرے..

وہ کیسا قرنی تھا جسے بابا درخواست کر رہے ہیں..

تو اسی قرنی کے بارے میں انہوں نے کہا "قرن میں اویس نام کا ایک شخص ہے جسے قیامت کے روز

قبیلہ ربیعہ اور مضر کی بھیڑوں کے بالوں کی تعداد کے برابر میری امت کے لوگوں کی شفاعت کا حق حاصل ہو گا''

یہ علی ہجویری کا ''کشف المحجوب'' میں بیان ہے۔۔

تو بابا کے سوا اور قرنی کے سوا کسی اور کے پاس کوئی پروانہ نہیں تو ہم ان کی قبروں پر کیوں طالب ہوتے ہیں کیوں انہیں عرق گلاب سے غسل دے کر پریشان کرتے ہیں۔۔

یہاں تک تو میں سعودیوں سے اتفاق کرتا ہوں۔۔

لیکن تاریخ کو محفوظ رکھنا۔۔اسے سنبھال کر رکھنا تو اس کی سچائی کی تصدیق کرنا ہے کہ ہاں۔۔یہ آثار دیکھو۔۔یہ مقام دیکھو۔۔مستند ہے۔۔معتبر ہے۔۔ایسا ہوا تھا۔۔یہ کوئی فرضی داستان نہیں ہے۔۔عقیدت بے شک ہو، تاریخ تو شرک نہیں۔۔

مجھے واپسی پر کسی نے خبر کی ہے کہ حکومت نے اس مقام کے گرد اب ایک آہنی جنگلا لگا دیا ہے تاکہ کوئی شرک کا مرتکب نہ ہو۔۔

ہم نفل ادا کر کے اس کھنڈر سے باہر آئے۔۔

نیچے فٹ پاتھ کے برابر پارک شدہ ہماری کار بھی مجرم سی محسوس کر رہی تھی کہ صرف وہ تنہا کھڑی تھی اور دوسری کاریں رُکے بغیر شائیں شائیں کرتی گزرتی جاتی تھیں۔۔

آخری کرنیں کب کی چٹانوں پر سرکتی سرکتی رخصت ہو چکی تھیں۔۔

اس مقام کا ہول اب بھی میرے دل میں موجود ہے وہ رخصت نہیں ہوا

سلجوق نے اس روایت کا تذکرہ کیا جس کے مطابق ہم جس چٹان کے نیچے کھڑے تھے وہاں اوپر سے کسی نے ایک بڑا پتھر لڑھکایا تھا اور حضورؐ نے اسی مقام پر اپنی کہنی کا رُخ اس کی جانب کیا تو وہیں تھم گیا۔ اسی لیے اس مسجد کا نام بھی عربی میں کہنی کی مسجد ہے۔ یعنی یہاں جو مسجد بھی تھی اور اب جلی ہوئی ہے۔ سلجوق نے بتایا کہ پچھلی بار وہ پتھر چٹان پر اٹکا ہوا دکھائی دیتا تھا لیکن اب وہ وہاں نہیں تھا۔ اسے نہایت مشقت سے ہٹا دیا گیا ہے۔۔

جہاں ہم کھڑے تھے وہاں سے چٹان کے دامن میں دس بارہ میٹر کی ڈھلوان بلندی پر ایک سیاہ کھوہ نظر آ رہی تھی۔۔اس کے بارے میں بھی سلجوق معلومات رکھتا تھا۔۔''اس کھوہ میں ایک بابا جی رہا کرتے تھے۔۔ جانے کون تھے۔۔کہاں سے آئے تھے لیکن وہ یہاں آ کر بس گئے تھے۔۔کہیں آتے جاتے نہ تھے اس کھوہ میں دنیا جہان سے الگ عبادت اور تلاوت میں مگن رہتے تھے۔۔کسی سے کوئی سروکار نہ رکھتے تھے۔۔یہیں ان کا بسیرا تھا اور یہیں دن رات کرتے تھے اور کہتے ہیں گریہ کرتے رہتے تھے کہ یہاں میرے آقا پر پتھر برسائے گئے تھے، انہیں لہو سے تر کر دیا گیا تھا۔۔پھر وہ بابا جی جانے فوت ہو گئے یا انہیں یہاں سے جبری طور پر رخصت کر دیا گیا، یہ میں نہیں جانتا۔۔''

کھوہ تک پہنچنا دشوار نہ تھا۔۔

دس بیس قدم کی چڑھائی تھی..

دو چار قدم چڑھنے کے بعد.. میرے پاؤں تلے کچھ منتشر اوراق.. کچھ خستہ کتابیں..ان کی اُدھڑی ہوئی جلدیں.. ٹین کے خالی ڈبے.. ایک چٹائی.. ایک کمبل نما کپڑا اور کچھ دھجیاں سی آنے لگیں.. میں رک گیا.. غالباً یہ بابا جی کا اثاثہ تھا.. اس کے سوا اور کوئی توجیہہ نہ تھی.. کہ اس خستہ ملبے اور کتابوں کے آثار کھوہ سے شروع ہو کر نیچے آ رہے تھے..

میں رُک گیا..

یہاں سے کھوہ ابھی چار پانچ قدم اوپر تھی لیکن اُس کے اندرون میں دیکھا جا سکتا تھا اور اُس میں قیام کے آثار تھے/.. یہ عین ممکن ہے کہ اس کھوہ میں قیام پذیر بابا جی پہلے شخص نہ تھے.. ماضی میں لوگ یہاں آتے ہوں اور عبادت کرتے ہوں.. اس میں رہتے ہوں.. چلّے کاٹتے ہوں.. جو مدینے سے واپس آئے لوگ تو اس کے چہرے کو بھی دیکھنا سعادت سمجھتے ہیں تو جس مقام پر مدینے والے موجود تھے وہاں رہنا اور عبادت کرنا بھی تو احساس کی اور عقیدت کی ایک نئی منزل ہے..

غاریں.. پتھر چٹانیں.. ہزاروں برس گزر جائیں تب بھی وہیں رہتے ہیں.. ان کی ہیئت اور موجودگی میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوتی.. وہ جوں کے توں اپنی قدرت میں محفوظ رہتے ہیں اور گزشتہ ادوار کی تصدیق کرتے ہیں.. سوائے تغیر کے کسی شے کو اثبات نہیں.. لیکن غاریں پتھر اور چٹانیں اس تغیر کی زد میں کم ہی آتی ہیں، اسی لیے کسی بھی تاریخی مقام یا مسجد کی زیارت سے بڑھ کر میری ایک انتہائی بے صبر خواہش تھی کہ میں غار حرا تک پہنچ جاؤں اور جہاں بابا سانس لیتے تھے اس ہوا میں دو چار سانس لے لوں.. غار ثور کے علاوہ صرف غار حرا ہے جو اُسی حالت اور کیفیت اور شکل میں جوں کی توں موجود ہے جب حضوؐر وہاں قیام فرماتے تھے.. باقی سب کچھ مٹ چکا تھا.. بدل چکا تھا کہ اینٹ روڑے کی عمارتوں کی عمر مختصر ہوتی ہے..

تو یہ کھوہ.. میرے ساتھی ذرا نیچے تھے اور میں اُن سے اوپر.. کھوہ کے قریب تھا تو یہ کھوہ بھی یقیناً تب بھی موجود تھی جب حضوؐر یہیں کہیں کھڑے ہو کر کہتے تھے کہ اے لوگو سنو.. اور لوگ سنتے نہ تھے.. ٹھٹھہ مخول کرتے تھے انہیں پتھر مارتے تھے..

تو کیا یہ ممکن ہے.. کہ حضوؐر نے ان سے بچنے کی خاطر اس کھوہ میں پناہ لی ہو.. یہ کافی حد تک ممکن نظر آتا تھا.. پناہ نہ بھی لی ہو تو ان کی نظر اس کھوہ تک گئی تو ہو گی.. جیسے میری نظر اس کھوہ تک جاتی تھی.. اس کے اندر تاریکی تھی..

وہ بابا جی جو جانے کہاں سے آئے تھے.. اور پھر کہاں چلے گئے تھے شاید اسی امکان کے سحر میں جتنا یہاں مقیم ہوئے تھے کہ شاید حضوؐر چند لمحوں کے لیے اس میں داخل ہوئے ہوں..

کھوہ کے دہانے تک جانے کے لیے مجھے ان خستہ اوراق اور آثار پر پاؤں رکھ کر جانا تھا.. یہ مجھے

قبول نہ تھا.. میں لوٹ آیا..

نیچے آیا تو پراچہ صاحب نے ایک عجیب کہانی سنائی.. ''جس چٹان سے آپ اترے ہیں.. جس میں وہ تاریک کھوہ ہے تو اس کے عقب میں ایک عمارت کا ڈھانچہ آپ کو دکھائی دے رہا ہے ناں.. یہ زیر تعمیر نہیں ہے.. ایک مدت سے اسی حالت میں ویران کھڑی ہے.. کہا جاتا ہے کہ کسی متمول شخص نے اس مقام کی قربت میں جہاں حضورؐ پر سنگ برسے تھے، اس چٹان کے برابر میں ایک عالی شان محل نما گھر تعمیر کیا لیکن اسے یہاں رہنا نصیب نہ ہوا.. اس کی اولاد میں سے بھی کسی کو ہمت نہ ہوئی یہاں آباد ہونے کی.. تب سے یہ ڈھانچہ یونہی ویران اور بے آباد کھڑا ہے..''

جیسے چنیوٹ کا منقش.. عالی شان چوبی محل ہے، جس کی تعمیر مکمل ہوئی تو اس کے مکین موت سے دوچار ہو گئے اور وہ ویران ہو گیا ہمیشہ کے لیے..

ایسے یہ گھر تھا جو آباد نہ ہو سکا..

اس کا ویران ڈھانچہ چٹان کے پس منظر میں دکھائی دے رہا تھا..

اس اداس مقام سے جدا ہونے کو جی نہ چاہتا تھا.. بے شک یہ پُر ہول تھا، پر اس کے ہول سے بچھڑنے کو جی نہ چاہتا تھا..

وہ سوختہ اینٹیں.. قرآن کے جلے ہوئے اوراق.. ڈھے چکی کوٹھڑیاں اور منبر.. ان کی چھتوں میں سے نظر آنے والی سورج کی آخری شعاعوں میں چٹانیں اور وہ کھوہ.. اور ان سب کی اداسی آج بھی میرے دل پہ نقش ہے.. حضورؐ اس مقام سے.. طائف کے سنگ دلوں سے بچاؤ کے لیے اپنے بدن کو سنگ خشت کی بارش سے بچاتے کہ ان کی چپلیں لہو سے بھری تھیں وہ اس مقام سے کدھر گئے تھے، انہیں کہاں پناہ ملی تھی؟

تو جدھر وہ گئے تھے میرے بابا ہم بھی اُدھر گئے..

''انگور کی بیلوں تلے.. جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں... مسجدِ عداسؓ''

سیڑھیاں اتر کر فٹ پاتھ کے برابر میں پارک کی گئی تنہا کار میں سوار ہو کر.. ہم چٹانوں کے سائے میں سوختہ مسجد سے الگ ہو کر.. بیک گیئر لگا کر ذرا پیچھے آئے اور پھر چٹان کے پہلو میں سے گزرتے.. اُس ویران ڈھانچے کے قریب سے ہوتے ہوئے ہم ایک ذیلی سڑک پر اترتے نشیب میں آئے.. ہم تو کار میں آئے لیکن فاصلہ اتنا تھا کہ کوئی شخص یہاں تک پانچ سات منٹ میں پیدل پہنچ سکتا تھا.. بابا زخمی تھے تو وہ جانے کیسے اور کتنی دیر میں پہنچے..

ہم کار سے نکلے اور ذیلی سڑک کے کناروں پر جو حفاظتی جنگلا تھا اسے تھام کر پہلے نیچے.. کوئی پندرہ بیس میٹر نیچے اور پھر سامنے نگاہ کی..

اور نگاہ میں ایسی گھنی تراوٹ اور شادابی آئی کہ حیران کر گئی..

طائف کی آبادیوں.. گھروں اور گھنی عمارتوں کے درمیان میں ذرا نشیب میں ایک وسیع چاردیواری میں گھرا ایک قطعۂ زمین تھا.. اور وہاں پنجاب کی مانند سرسبز و شاداب کھیت تھے جن کی قطار اندر قطار مینڈھوں پر بند گوبھی کے پھول ہرے ہو رہے تھے اور اُن کی سبز باس ہمارے نتھنوں میں دھوم مچاتی تھیں اور ان کھیتوں میں بنگلہ دیشی مزدور جھکے ہوئے گوڈی کر رہے تھے اور گوبر کی کھاد سے بھری ریڑھیاں اُلٹ رہے تھے..

تازہ سبزی اور کھاد کی ملی جلی جو نم مہک ہوتی ہے.. وہ شہر کے باسیوں کو ناگوار لگتی ہے.. جیسے اُپلوں کا دھواں یا کچی لسّی کی مہک ناگوار لگتی ہے لیکن شہری ہونے کے باوجود میں ان سے آشنا تھا کہ یہ میرے دیہاتی خون میں رچی ہوئی تھیں.. میرے آبا کی خوشبوئیں تھیں تو میں اپنے گھر کے قریب ہوا، اپنے آبا کی قربت میں ہوا..

محض کھیت ہرے بھرے نگاہ میں نہ آئے بلکہ ان کے درمیان میں ایک کچا راستہ قطعے کی چار دیواری تک جا رہا تھا اور وہاں کھیتوں کے آخر میں آلوچے اور آلو بخارے کے بوٹوں کی ابھی پتوں اور پھولوں سے ناآشنا ٹہنیاں بھی دکھائی دیتی تھیں، ان درختوں کو لگائے ہوئے زیادہ مدت نہ ہوئی ہوگی، شاید وہاں انگور

کی کوئی بیل بھی تھی..

اور بالکل آخر میں قطعے کے دائیں کونے میں ایک مسجد بھی تھی. مختصر کیفیت کی!

ہم نے کچھ دیر اس منظر کو اپنی آنکھوں میں سمویا.

طائف کی بھیڑ سے الگ. سرسبز.. بوٹوں. سبزیوں. کھاد اور نمی کی مہک والا یہ عجیب انوکھا جزیرہ تھا..

ہم اس جزیرے میں اُترنے لگے کہ یہ نشیب میں تھا..

پھر اُس پگڈنڈی پر چلنے لگے.. کچے راستے پر جو مسجد کی جانب رہا تھا تو بائیں ہاتھ پر بند گوبھی کے کھیتوں میں مشقت کرتے ہوئے بنگلہ دیش جھکے ہوئے.. اسی جھکی ہوئی حالت میں ہمیں سلام کرتے تھے.. ذرا شک میں مبتلا ہوتے کہ جانے کون ہیں، کہیں ہمارے رزق کے بیری اہلکار تو نہیں ہیں..

اس کچے راستے پر چلتے ہوئے ایک بانکا "متکبر اصیل مرغ جس کے پروں کے گرد جھالریں تھیں، اکڑا ہوا رقص کرتا آیا.. اور ہمیں دیکھ کر بنگلہ دیشی مزدوروں کی مانند تشویش میں مبتلا ہوا اور پھڑ پھڑاتا ہوا برابر کے کھیت میں اُتر گیا..

مسجد کے قریب کچھ خستہ سے کمرے نظر آرہے تھے جہاں بنگلہ دیشی ٹھکانہ کرتے تھے اور ان میں سے ایک کمرے کی دیوار میں ایک زنگ آلود ایئر کنڈیشنر نصب تھا.

ہم ان کمروں کے برابر میں ہو کر ایک دروازے کو دھکیل کر اس چھوٹی سی مسجد کے چھوٹے سے صحن میں داخل ہو گئے..

یہ مسجد عداس تھی..

یہ صحن کوئی بیس پچیس فٹ لمبا ہوگا.. سات آٹھ فٹ چوڑا ہوگا.. اور ایک کونے میں تھا چنانچہ یہ اس ہریاول کے قطعے کی آخری حد تھی..

پراچہ صاحب ذرا آگے گئے ہوئے.. اور میں ان کے برابر میں تھا جب انہوں نے کھڑے ہو کر مجھ سے کہا "تارڑ صاحب.. آپ جہاں کھڑے ہیں بس اسی مقام پر حضور کھڑے ہوئے تھے.. اہل طائف کی سنگساری سے خون آلود ہو کر ان چٹانوں سے نیچے آکر انہوں نے یہیں پناہ لی تھی اور یہیں وہ انگور کی بیل تھی جس کے سائے میں وہ بیٹھ گئے تھے.."

"یہیں.."

"ہاں یہیں.."

دھوپ ڈھل چکی تھی اور ہم چھاؤں میں تھے.. وہ مختصر صحن بھی چھاؤں میں آچکا تھا.. تب یہ کھلی جگہ ہوگی اور یہاں انگور کی ایک بیل ہوگی..

"یعنی.. یہیں"

''جی..یہی وہ مقام ہے..یہیں..''

مسجدِ عداس کا وہ حصہ جو ''یہیں'' کی ذیل میں آتا تھا، صحن کے فرش کے اُس حصے پر میری نگاہیں پتھرا گئیں. لیکن میں نے ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میں بے جان ہو چکا ہوں.. پتھر ہو گیا ہوں.. پراچہ صاحب ظاہر ہے مجھ ایسے درجنوں زائرین کو یہاں تک لا چکے تھے اور ہر ایک کو اسی انداز میں اسی روٹین میں ''یہیں'' کہتے آئے تھے..اور وہ قطعی طور پر یہ نہیں جانتے تھے کہ یہ بندہ آسانی سے ماننے والا نہیں.. حاجی ہونے کے باوجود شک سے بھرا ہے لیکن بابا کے بارے میں کچھ کمزور دل ہے..اس کمزور دل پر اس ایک ''یہیں'' کا ایسا اثر ہوا کہ وہ بمشکل اپنے آپ کو سنبھالتا تھا کہ نہیں نہیں. مسجد عداس کے صحن کے اس حصے پر جہاں ''یہیں'' ہے. یہاں گرنا نہیں..ماتھا نہیں ٹیکنا.. جبیں کو اس ''یہیں'' سے نہیں چھونا، کہ لوگ کیا کہیں گے کہ مکر کرتا ہے..نمائش کرتا ہے..شرک کرتا ہے..روکو اپنے آپ کو روکو..تماشا نہ ہو..اگرچہ بے جان اور پتھر ہو چکے ہو.. پر اظہار نہ کرو..کوئی یقین نہ کرے گا.

اس ''یہیں'' پر محمدؐ ٹھہرے تھے..

اگرچہ اب یہاں سنگِ مرمر کی سلیں تھیں، پر ان کے تلے وہ مٹی تھی جس نے بابا کے خون کو جذب کیا تھا اور یہیں کہیں انگور کی ایک بیل تھی..

''لوگوں نے آپ کو پتھر مارنے شروع کر دیئے..

جب آپ کسی دیوار کی اوٹ بیٹھنا چاہتے تاکہ پتھروں سے بچ سکیں تو وہ ظالم آپ کو بازوؤں سے پکڑ کر کھڑا کر دیتے اور لڑکے آپ کے پاؤں اور ٹانگوں پر پتھر مارنے لگتے. اس سے آپ کے پاؤں زخمی ہو گئے اور خون سے بھر گئے. حضرت زید کو بھی سر میں زخم آئے. شہر سے باہر انگور کا ایک باغ تھا جس کے گرد دیوار بنی تھی..اس دیوار کے اوپر سے انگور کی بیل لٹک رہی تھی آپ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیل کی چھاؤں میں بیٹھ گئے. یہیں آپ نے دعائے طائف پڑھی.

یہ باغ مکّہ کے ایک قریشی سردار ربیعہ کے دو بیٹوں عتبہ اور شیبہ کا تھا. حضورؐ کو دیکھ کر انہوں نے اپنے غلام سے کہا ''طباق میں انگور لے جاؤ اور اس شخص کو پیش کرو جو بیل کے سایہ میں بیٹھا ہے.'' (الامین)

شہر سے باہر انگور کا ایک باغ تھا تو..یہی باغ تھا..اور یہی دیوار تھی اور ''یہیں''..

انگور کی بیل لٹک رہی تھی..آپ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیل کی چھاؤں میں بیٹھ گئے..

بس ''یہیں''

''نڈھال ہو کر ایک باغ میں انگور کی بیل کے سائے میں آ بیٹھے..
عتبہ اور شیبہ طائف میں موجود تھے..انہوں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور انکار اسلام کے باوجود ان کے دل بھر آئے..اپنے غلام عداس نصرانی کے ہاتھوں انگور کا خوشہ رسول اللہؐ کو بھیجا..آنحضرتؐ نے اسے قبول فرمایا اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہہ کر تناول کے لیے ہاتھ بڑھایا..
''اے صاحب..یہ کیسا کلمہ ہے؟اس بستی کے رہنے والوں کی زبان پر تو کبھی یہ حرف نہیں آیا..''
رسول اللہؐ نے عداس سے اس کا وطن اور دین دریافت فرمایا..
''میں نینوا کا رہنے والا ہوں اور عیسائی ہوں..''
فرمایا:''وہی نینوا جہاں مرد نکوکار یونس بن متی پیدا ہوئے تھے؟''
عداس:''آپ نے انہیں کیسے پہچانا؟''
فرمایا:''یونس میرے بھائی ہیں وہ بھی نبی تھے اور میں بھی نبی ہوں..''
عداس:''بشارت (نبوت) سن کر مسرت سے وارفتہ ہو گئے..جھک کر آپ کا سر اور پاؤں چومے..'' (حیاتِ محمد۔ہیکل)

شاید کبھی کسی کو خیال آ جائے..کہ''یہیں'' کے اس مقام پر انگور کی ایک بیل لگا دی جائے..اسی زمین میں جس میں وہ انگور کی بیل تھی جس کے سائے میں حضورؐ نے پناہ لی تھی..

''انہیں مجبوراً ایک باغ میں پناہ لینی پڑی..انہوں نے کھجور کے ایک درخت کے تنے سے اپنے اونٹ کو باندھا اور انگور کی ایک بیل کی جانب بڑھے اور اس کے سائے میں جا بیٹھے..
عتبہ اور شیبہ انگور کی بیل کے برابر میں باغ کے ایک کونے میں بیٹھے تھے..
انہوں نے آخری بار محمدؐ کو ابوطالب کے بستر مرگ کے قریب دیکھا تھا اور اب ان کا بچاؤ کرنے والا کوئی نہ تھا اور وہ مصیبت میں تھے..انہوں نے اپنے نوجوان عیسائی غلام عداس کو بلایا اور کہا''انگوروں کا ایک گچھا لو اور اسے اس طشتری میں رکھو اور اس شخص کو دے آؤ..اور اسے کہو کہ انہیں کھا لے..'' (محمدؐ۔مارٹن لنگز)..

تو یہاں پاس ہی کھجور کا ایک درخت بھی تھا..جس کے تنے کے ساتھ حضورؐ نے اپنے اونٹ کو باندھا تھا..
شہادت کی جس انگلی سے پراچہ صاحب نے اشارہ کر کے''یہیں'' کہا تھا میری نظریں اس انگلی کی سیدھ میں سفر کرتی سنگ مرمر کے فرش سے جا ٹکرائیں تھیں کہ یہیں..؟ان کی انگلی منظر سے ہٹ گئی لیکن میری نظر نہ ہٹی..

میں بے خبری میں مارا گیا تھا.. مجھے خبر ہی نہ تھی کہ یہیں. خبر ہوتی تو ذہنی طور پر تیار ہوتا یکدم یوں پتھر نہ ہو جاتا.. سنبھل جاتا..

مسجد کا اندرون ویران پڑا تھا..

مسجد جو عداس غلام کے نام کی تھی.. جو طائف میں رہتا تھا جہاں الّ.. لات کا عالی شان مندر تھا اور لات کو "خاتونِ کائنات" کہا جاتا تھا.. اور پورے طائف میں بس وہ ایک ہی شخص تھا جس نے بابا کو انگور پیش کیے.. ان کو پہچان لیا اور ان کا غلام ہو گیا..

اس ایک غلام کے صدقے طائف مکمل بدبختی سے بچ گیا ورنہ ہم یہاں کہاں آتے.. جہاں بابا کے ساتھ ایسا سلوک ہوا تھا' وہاں کہاں آتے.. مجھے ایک دوست کے عزیز کی خبر ہے کہ انہیں سعودی عرب میں ایک بہت اہم اور لحوں میں شمول کر دینے والی ملازمت کی پیشکش ہوئی اور جب انہیں معلوم ہوا کہ یہ طائف میں ہے تو انکار کر دیا.. ایک اور صاحب بیس برس سعودی عرب میں مقیم رہے لیکن طائف کیا طائف جانے والے راستوں پر بھی قدم رکھنا گوارا نہ کیا.. اسی طور ایک صاحب طائف کو جا رہے تھے اور راستے میں حضورؐ کے ساتھ اہل طائف کا سلوک ایسا یاد آیا کہ وہیں سے کار موڑ کر واپس آ گئے..

ہم میں اتنی عقیدت اور محبت کی گنجائش نہ تھی سو ہم آ گئے..

طے یہ پایا کہ مسجد عداس میں مغرب کی نماز پڑھ کر واپسی کی جائے.. اور سر دست کچھ وقت تھا.. کچھ ٹائم تھا اور یہ ٹی ٹائم تھا..

جب ہم مسجد سے نکل کر واپس اسی کچے راستے پر چلتے ہوئے کھیتوں کے پار جا رہے تھے تو سامنے سے ایک مختصر قد کا فرنچ کٹ داڑھی والا نوخیز اگرچہ فربہ لڑکا چلا آ رہا تھا.. ہم ایک دوسرے کے قریب ہو کر گزرے تو سلام دعا ہوئی اور ہم اس لمحے آگاہ نہیں تھے کہ یہ مسجد عداس کا امام ہے اور مغرب کی اذان دینے کے لیے اُدھر جا رہا ہے.. بلکہ دیسی مزدور راستے جھک جھک کر سلام کر رہے تھے اور وہ جواب نہیں دے رہا تھا..

میں نے عرض کیا تھا کہ ابھی مغرب میں کچھ ٹائم تھا.. اور یہ ٹی ٹائم تھا..

پراچہ صاحب کے ایک قریبی دوست زاہد چودھری صاحب نے ہمارے لیے ایک اوپن ایئر ہائی ٹی کا بندوبست کچھ یوں کیا کہ ابھی ہم بند گوبھی کے کھلے کھلے سبز پیراہنوں والے پھولوں کی قربت میں ایک ہموار کچا قطعہ زمین دیکھتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اس زمین کو پہلے چینی "چٹائیاں" ڈھکتی ہیں پھر ایک قالین بچھ جاتا ہے اور اس قالین پر طرح طرح کے سینڈوچ.. پنیر. سموسے. نمکین سویاں.. مدینے کی کھجوروں سے تیار کردہ بسکٹ اور چائے آن سیٹ.. یعنی گرم پانی الگ' دودھ.. جدا اور پھر ان میں سنہری رنگت بکھیرتے ٹی بیگز.. اور پھر اس چائے کی مہک.. بند گوبھی کی سبزمی میں شامل ہو کر وہ مہک کچھ سے کچھ اور کی اور ہوتی جاتی تھی..

واقعی پلک جھپکنے کے دوران چودھری صاحب نے اپنی کار میں سے یہ چھوٹا سا ریستوران برآمد

کر کے باغ عداس میں سجا دیا تھا..

''تارڑ صاحب.. آپ ذرا کھلی فضاؤں کے شیدائی ہیں تو میں نے سوچا آپ کو گھر میں مدعو کرنے کی بجائے یہ اوپن ایئر پکنک ہو جائے''.. وہ کہنے لگے..

ہم گرم چائے اور اس کی مہک کو اپنے تھکے ہوئے پژمردہ بدنوں میں اتارنے لگے.. یہ نہیں کہ ہم نے دن بھر کوہ نوردی کی مشقت کی تھی جس کے نتیجے میں یہ تھکاوٹ تھی بلکہ ہم میں اُس سوختہ مسجد.. اُس ویران کھوہ اور اُس پر جھکی ہوئی چٹان اور جلے ہوئے اوراق کی ویرانی اور اداسی در آئی تھی.. ڈاچی والے.. جس نے اسی باغ کے ایک درخت سے اسے باندھا تھا.. اُس سوار کے بدن پر جو پتھر پھینکے گئے تھے ان میں سے کوئی ایک پتھر ہمیں بھی آ لگا تھا اور اس کی اذیت ہمارے بدنوں میں بھی سرایت کر گئی تھی..

''میں اپنے سعودی عرب کے قیام کے دوران پہلی بار یوں کسی سرسبز کھیت کے کنارے.. آبادی سے الگ.. کھلی فضا میں ایک قالین پر بیٹھا چائے پی رہا ہوں'' سلجوق نے کہا..

''اور میں بھی..'' سمیر نے فوراً کہا..

''اور میں بھی..'' میں نے فوراً ان کی ہاں میں ہاں ملائی..

ہم اس پکنک کو پسند کر رہے تھے..

میں جان بوجھ کر حساب لگا کر قالین پر ایک ایسی جگہ بیٹھا تھا جہاں سے نظر اٹھانے سے.. دائیں جانب اس نظر کو ستر کے زاویے تک اٹھانے سے اس ویران ڈھابے کے پس منظر میں اس چٹان کا کچھ حصہ نظر آتا تھا جس کے دامن میں سوختہ اینٹیں اور اوراق تھے جہاں حضورؐ پر پتھر پھینکے گئے تھے.. اور جب میں اس نظر کو اُس ویران گھر اور چٹان سے نیچے اتار کر ذرا بائیں جانب اس سطح پر لے آتا جہاں ہم بیٹھے تھے اور برابر میں بند گوبھی کے کھیت تھے تو یہ نظر ان کی نم ہریاول پر تیرتی اس چار دیواری کے کونے میں واقع مسجد عداس پر جا رکتی جہاں حضورؐ جا رکے تھے.. میں اندازے لگا رہا تھا.. ان زمانوں میں یہ مقام طائف کی آبادی سے باہر ویرانے میں ہوگا.. تب حضورؐ اُس چٹان کے سائے میں سے نکل کر.. لوگوں کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے پتھروں سے اپنے آپ کو بچاتے اسی راستے سے نیچے اترے ہوں گے جس راستے پر میری نظر نے سفر کیا تھا.. یہ مسافت پانچ سات منٹوں میں طے ہوگئی ہوگی اور حضورؐ وہاں سے یہاں تک آسانی سے اس لیے بھی اترے ہوں گے کہ ان کے خصائل میں یہ بھی شامل ہے کہ جب وہ ہموار زمین پر چلتے تھے تو رفتار سے لگتا تھا کہ ڈھلوان پر اتر رہے ہیں اور یہ تو تھی ہی ڈھلوان.. جہاں اسی کچے راستے پر.. تقریباً وہیں جہاں آج یہ کچا راستہ ہے چلے ہوں گے.. وہ بائیں ہاتھ نہیں چلے ہوں گے کیونکہ وہ کونہ جہاں مسجد عداس واقع ہے دائیں جانب پڑتا ہے اور وہاں انگور کی بیلوں کے سائے نظر آتے ہوں گے.. ایک بھوکے پیاسے اور لہولہان شخص کے لیے پناہ بھی اور سایہ بھی..

کیا وہ بالکل تنہا تھے؟

کیا زید بن حارث ان کے ہمراہ تھے؟

اگر تنہا تھے تو کیا پیدل اس چٹان سے یہاں تک آئے تھے؟

یا اونٹ پر سوار تھے..

یا یہ کہ اونٹ کی باگ پکڑے نیچے اترے تھے..

سیرت النبیؐ کی کتابوں میں یہ تمام امکان موجود ہیں..

باغ عداس میں آمد کے حوالوں میں کہیں بھی زید بن حارث کی موجودگی کا تذکرہ نہیں ملتا. دعائے طائف میں بھی تنہائی کی کیفیت ہے. جب حضورؐ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے رقت و دل سوزی کے انداز میں پکارتے ہیں: "اے رب! میں اپنی بے بسی اور تدبیر کی ناکامی اور اپنی توہین کا شکوہ تیرے ہی حضور کرتا ہوں.. اے ارحم الراحمین تو کمزوروں کا رب ہے اور میرا بھی! اے پروردگار تو مجھے چھوڑ کر کسے سونپ رہا ہے جو مجھے اور بھی کمزور بنا دے یا مجھے میرے دشمن کے حوالے ہی کر دیا.. یا اللہ اگر تو میری اس حالت میں مجھ سے خفا نہیں تو میں مطمئن ہوں..!"

تو توی امکان یہی ہے کہ حضورؐ تنہا تھے..

چونکہ اسی مقام سے ان کی مکہ واپسی ہوتی ہے اس لیے یہ بھی امکان ہے کہ ان کا اونٹ ان کے ساتھ تھا.. جسے انہوں نے باغ عداس کے ایک کھجور کے درخت کے ساتھ باندھا تھا..

ایک اور حوالے میں درج ہے کہ آنحضرتؐ پر پتھر طائف کے شہر میں پھینکے گئے تھے اور وہ وہاں سے نکل کر یہاں تک آئے تھے.. یہ بھی بعید از قیاس ہے کہ ایک زخمی اور نڈھال شخص اتنا فاصلہ طے نہیں کر سکتا.. اگر موجودہ مقامات کی نشاندہی درست ہے اور درست ہے کہ ترکوں نے بصد تحقیق اس مقام کا تعین کیا تھا تو حضورؐ اسی چٹان سے نیچے یہاں تک آئے تھے کہ باغ عداس کا اسی مقام پر واقع ہونا تو طے ہے..

پراچہ صاحب اور زاہد چودھری صاحب جو گفتگو کر رہے تھے وہ میں آداب مہمانی کے طور پر بظاہر سن تو رہا تھا سمجھ نہیں رہا تھا کہ میرا دھیان کسی اور طرف تھا..

اور یہ دھیان بھٹکتا تھا کھوج کرتا تھا اس زمین کی جانب جس پر قالین بچھائے ہم بیٹھے تھے تو یہ ممکن ہے بلکہ کافی حد تک یقیناً یہیں سے رسول پاکؐ گزر کر انگور کی بیل کی جانب بڑھے ہوں گے.. کیسے آزار میں چلتے ہوں گے کہ خون آلود پاؤں چپلوں میں نمی کے باعث کھسکتے تکلیف دیتے ہوں گے اور شاید اسی مقام کی مٹی میں خون کی کچھ بوندیں جذب ہو گئی ہوں..

عجیب جگہ بٹھا دیا ہے رب نے..

قدموں میں جگہ دے دی ہے..

بلکہ قدموں کے اوپر بٹھا دیا ہے.. تو ہم کیا گفتگو کریں کیسے کلام کریں.. چائے کیا پئیں اور دوست

جو کہہ رہے ہیں وہ کیونکر سنیں.. اُن سے یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ یہ قالین اور چٹائیاں سمیت لیں ہم اس مٹی پر بیٹھنا چاہتے ہیں جس پر ڈاچی والے کے نقشِ پا ہونے کا احتمال ہے..

بے شک یہ محض خدشہ ہو.. ایک موہوم امکان ہو.. حضور ہم سے بہت پرے ہو کر انگوروں کی بیل کی جانب گئے ہوں لیکن ایسے خدشے بھی ہمیں سجدہ ریز ہونے کی دعوت دیتے تھے..

''جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں
خراماں خراماں ارم دیکھتے ہیں''

اتنی دیر میں مسجد عداس سے مغرب کی اذان بلند ہوئی.. فلاح کی جانب بلانے والی پکار میں بھی ہریاولی کی نمی اور انگور کی مہک چلی آتی تھی..

زاہد چوہدری نے جس شتابی سے ان اوپن ایئر ریستوران کو سجا دیا تھا اسی آنکھ جھپکنے کی مدت میں اسے سمیٹ کر اپنی کار میں رکھا اور ہم اٹھ کر اسی راستے پر چلنے لگے.. مسجد عداس کی جانب.. جی ہاں ''اُسی'' سے مراد ''اُسی'' ہے.. جس راستے پر وہ چلے تھے..

مسجد کے مختصر صحن میں داخل ہوئے تو میری نگاہیں پھر اس ''یہیں'' پر بچھ گئیں.. تمنا کے باوجود تادیر نہ بچھی رہ سکیں کہ ہم نے وضو کرنا تھا..

اور جب میں وضو کر رہا تھا تو وہ مقام میری پشت پر تھا اور میں اس کی موجودگی سے آگاہ بے ادبی کا مرتکب ہوتا محسوس کر رہا تھا..

ہم تو محض پانچ لوگ تھے لیکن آس پاس سے جانے کہاں سے بہت سے لوگ نماز میں شریک ہو گئے اور ان میں بنگلہ دیشی کھیت مزدور بھی شامل تھے..

نوخیز فرنچ کٹ داڑھی والا فربہ سا لڑکا امام تھا..

سجدے میں جاتے ہوئے مسجد کا قالین نہ دکھائی دیتا.. وہ مقام میرے تصور میں آ جاتا جو میری پشت پر چند میٹر کے فاصلے پر مسجد کے صحن میں تھا.. اور میں وہاں سجدہ کرتا..

نماز میں مگن ہو چکے تھے.. چھوٹی سی مسجد میں مگن تھے جب یکدم ایک بھونچال سا آ گیا.. بھگدڑ سی مچ گئی.. جیسے کوئی سانحہ ہو گیا ہو.. مسجد گرنے والی ہو.. آس پاس کے لوگ نماز ترک کر کے ایک ایسی زبان میں جو شناسا سی لگتی تھی، شور مچاتے.. چلاتے چیختے باہر بھاگنے لگے.. نماز بھول کر ایک دوسرے کو دھکیلتے، پھلانگتے، ٹکراتے اور بھڑتے خوفزدہ بھیڑوں کی مانند اندھا دھند باہر نکلنے لگے..

یا اللہ یہ کیا آفت آ گئی ہے..

کیا اہل طائف آج پھر سنگ ہاتھوں میں لیے حملہ آور ہو گئے ہیں..

کچھ نہ کچھ تو ہوا ہے لیکن کیا ہوا ہے..

اندر سے لرز تو ہم بھی گئے.. پڑھتے پڑھتے رک تو ہم بھی گئے لیکن نیت توڑنے کا حوصلہ نہ ہوا.. کچھ دیر تو دل جمعی کے ساتھ مگن رہنے کی کوشش تو کرتے رہے لیکن پھر ہم بھی دائیں بائیں دیکھنے لگے کہ کیا ہوا ہے..

مسجد تقریباً خالی ہو چکی تھی اور محراب کی جانب پشت کیے موٹے امام صاحب ایک نروان شدہ مہاتما بدھ کی مانند آلتی پالتی مارے نہایت اطمینان سے بیٹھے تھے جیسے یہ بھگدڑ روزمرہ کا معمول ہو..

میں نے دیکھا کہ سُمیر اور سلجوق بھی غائب ہیں..وہ صحن میں پہنچ چکے تھے..کیا ہوا ہے؟ میں نے پوچھا..کسی کو کچھ خبر نہ تھی..صحن میں فرار ہونے والوں کے جوتے اور چپلیں بکھری ہوئی تھیں جن میں سے چند ایک میرے سامنے صحن کی دیوار پھلانگ کر نیم تاریکی میں غائب ہو گئے تھے..پھر کھلا کہ یہ لوگ ان کھیتوں میں غیر قانونی طور پر محنت مزدوری کرتے ہیں..اپنے بال بچوں کو فاقوں سے بچانے کی خاطر یہ خطرہ مول لیتے ہیں..ان میں سے بیشتر نہ عداس نامی غلام کو جانتے ہیں اور نہ انگور کی کسی بیل کو..ان کے لیے یہ مقام محض رزق کمانے کا ایک مقام ہے..اگر وہ اس مقام کی اہمیت سے آگاہ بھی ہوں تو رزق کی مشقت اور وہ بھی غیر قانونی' عقیدت کو بھلا دیتی ہے..مقامی لوگ ان کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر نہایت واجبی ادائیگی کرتے ہیں اور سعودی پولیس اس تاک میں رہتی ہے کہ انہیں اپنی گرفت میں لے کر ملک بدر کر دے..اور انہیں گرفتار کرنے کا سب سے نادر موقع نماز کی ادائیگی کے دوران ہے..وہ جانتے ہیں کہ یہ بھولے لوگ پکڑے جانے کے خدشے کو بالائے طاق رکھتے ہوئے باقاعدہ نماز پڑھنے سے باز نہیں آئیں گے..تو یہاں ایسا ہوا کہ کسی بنگلہ دیشی مزدور کو شک ہوا..کانوں میں کچھ ایسی آواز آئی جیسے صحن میں کوئی داخل ہو رہا ہے تو اس نے شور مچا کر سب کو خبردار کر دیا کہ شاید پولیس آ گئی ہے تو وہ سب کے سب ننگے پاؤں بھاگتے دیوار پھلانگتے نیم تاریکی میں غائب ہو گئے..

انہیں اس ''یہیں'' سے کیا' جہاں حضورؐ نے اسی مقام پر جو دیوار تھی اس سے ٹیک لگا کر اپنے زخم سہلائے تھے..یہ ''وہاں'' کا قصہ تھا چودہ سو برس پیشتر کا اور وہ ''یہاں'' اس زمانے میں رزق کے لیے فاقوں سے بچنے کے لیے اس نامہرباں بستی میں تھے..

میں نے ان ذلتوں کے مارے لوگوں کے لیے ایک گہری اور اذیت ناک ٹیس اپنے سینے سے اٹھتی اسے چیرتی محسوس کی..

ہم چند لوگوں نے دوبارہ نماز کی نیت کی..
مسجد خالی ہو جانے کے باعث وسیع ہو گئی تھی..
یہ بستی اب بھی نامہربان تھی..
طائف میں ابھی سنگدلی کا خاتمہ نہیں ہوا تھا..

''رنج سفر کی کوئی نشانی تو پاس ہو''

پراچہ صاحب کے ہاں رات کے کھانے کا وسیع اہتمام تھا اور طائف میں مقیم پاکستانیوں سے ایک پاکستانی ماحول میں ملاقات کا اہتمام تھا۔

وطن سے دوری سیاست اور نظریات میں شدت پیدا کر دیتی ہے۔۔ یہ اپنی زمین سے جڑے رہنے کا ایک بہانہ ہوتا ہے تو یہ پاکستانی بھی ایسے ہی جڑے ہوئے تھے۔۔ الگ الگ سیاسی وابستگیوں کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔۔ چونکہ میں ایک عرصے سے کلائی پر گھڑی کا بوجھ باندھنے کے آزار سے آزاد ہو چکا تھا۔۔ اس لیے بار بار وقت پوچھ رہا تھا۔ کہ سلجوق پچھلے کئی روز سے مسلسل ڈرائیونگ کر رہا تھا۔۔ مسلسل اپنے دو مہمانوں کی۔۔ میری اور تمیسر کی دیکھ بھال کر رہا تھا تو میں دیکھ سکتا تھا کہ ان کا بدن تھکن سے بھرا ہوا ہے اور ابھی ہم نے رات کی تاریکی میں ایک پہاڑی راستے کی خطرناکیوں میں اترتے۔۔ موڑ کاٹتے کہیں نیچے صحرا میں اترنا تھا اور آج ہی کی شب میں جدہ پہنچنا تھا۔

مرغن پاکستانی خوراک شکم میں اتار کر کبھی بستر کبھی کمرے کا خیال آتا ہے۔۔ اور وہ بستر اور وہ کمرہ بہت دور۔۔ ایک طویل مسافت کے بعد آتا تھا۔۔

''اتنی جلدی بھی کیا ہے تارڑ صاحب۔'' پراچہ حیران ہوئے۔۔

''مجھے تو کوئی خاص جلدی نہیں۔۔ بس یہ بچہ تھک گیا ہوگا اس کے بارے میں فکر مند ہوں۔''

''بچہ؟''

انہیں وہ ایک حال ہی میں گالوں میں سے پھوٹنے والی داڑھی کا حامل لشکتی ڈکی ٹنڈ والا سفارتکار دکھائی دے رہا تھا اور اگر وہ مجھے ''بچہ'' دکھائی دے رہا تھا تو اس میں میرا کوئی دوش نہ تھا۔۔

طائف کی شب میں نکلے تو اترائی سے پیشتر سڑک کے کنارے روشنیوں کی چکا چوند میں ایک فروٹ مارکیٹ کے سٹال قطار اندر قطار دکھائی دیئے۔۔ وہاں طائف کے خوش رنگ اور خوش ذائقہ پھل سجے تھے۔۔ انار۔۔ سیب اور آلو بخارے ایسے کہ جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی۔۔۔ اگر ان میں کسی انگور کی بیل سے اترے

ہوئے کچھ خوشے بھی تھے.. تو وہ نظر نہ آئے..

اترائی کا آغاز ہوا تو سمیر نے بھائی کی ٹنڈ پر ایک دھپ جما کر کہا اور وہ پچھلی نشست پر براجمان تھا' بھائی جان اس موڑ کے بعد بندر آئیں گے.. وہاں رکنا ہے.. میرے پاس کچھ مونگ پھلیاں ہیں..''

لیکن طائف کے بندر جا چکے تھے..

آس پاس کی چٹانیں اندھیرے میں گم تھیں اور حفاظتی دیوار خالی پڑی تھی..

میں آسانی سے ان بندروں کو اپنے عقیدے کی زد میں لا کر بیان کر سکتا تھا کہ ایک زمانے میں وہ انسان تھے.. اور جب انہوں نے میرے رسولؐ پر پتھر برسائے تو ارتقاء کی سیڑھی سے پھسل کر پھر سے بندر ہو گئے.. لیکن میرے عقیدے میں اتنی بنیاد پرستی نہ تھی.. اس کا جواز ہرگز یہ نہیں کہ میں ایک زمانے میں ہنومان مہاراج کا پجاری تھا اور ایک ایسا ایمان دینے سے جھجکتا تھا..

بہر حال بندر وہاں سے رخصت ہو چکے تھے اور ہم ان کے دیدار سے محروم ہو گئے.. طائف سے اترتی پہاڑیوں میں ہزاروں نہیں لاکھوں روشنیاں آنکھوں کو چندھیاتی تھیں.. جگنوؤں کی مانند ٹمٹماتی نہ تھیں برہنہ بدنوں کی مانند عیاں ہوتی تھیں اور ٹریفک بھی اسی طور مسلسل اور بھرپور تھی..

نیچے وادی کی تاریکی میں کیبل کارز ڈولتی ٹوکریوں کی مانند اترتی جاتی تھیں.. اور میں.. میں سوئے طائف آیا تو میرے کاندھے کے تھیلے میں کچھ نہ تھا.. کوئی سامان نہ تھا.. سوائے اس خبر کے کہ وہاں موسم خوشگوار ہوگا.. جنگل ہوں گے اور ڈہلیا کے پھول ہوں گے.. اب واپس جاتا تھا تو میرے تھیلے میں بہت سامان تھا.. کچھ نیم سوختہ اینٹیں تھیں.. جلے ہوئے قرآن کے اوراق تھے.. ایک کھوہ میں گریہ کرتے ہوئے بابا جی تھے اور ایک چٹان کے سائے تھے.. جہاں میں نے سوچا کہ..

''رنج سفر کی کوئی نشانی تو پاس ہو
آئے ہیں اس گلی میں تو کچھ پتھر ہی لے چلیں''

طائف کا سفر.. ایک رنج سفر تھا..

میں اس گلی میں گیا.. جہاں بابا پر پتھر برسائے گئے تو میں نے چٹان کے سائے میں کچھ سنگریزے اور پتھر اپنے قدموں میں دیکھے.. میں جھکا بھی اس رنج سفر کی ایک نشانی.. ایک پتھر اٹھا لوں.. سنبھال لوں.. ایک نشانی کے طور پر.. پھر اجتناب کیا کہ کیا پتہ جو پتھر میں اٹھاؤں وہی ہو جس نے بابا کے منور مہکتے بدن کو گھائل کیا.. کیا پتہ.. تو میں نے اجتناب کیا..

اس رنج سفر کے سامان میں اور بہت کچھ تھا اور اس کے سوا انگوروں کی ایک بیل بھی تھی..

جب ہم پہاڑی سلسلے کی رات میں گھومتے ہوئے ہموار ہو کر صحرا میں آئے تو سمیر نے کار رکوا کر مجھے پچھلی نشست پر بٹھا دیا اور خود فرنٹ سیٹ پر براجمان ہو گیا محض اس لیے کہ یہ بابا حاجی خواہ مخواہ بھائی حاجی کو ٹوکتا رہتا ہے کہ بیٹا ذرا احتیاط سے.. رفتار کم کر دو.. اور موسیقی ذرا مدھم کر دو کہ ابھی ابھی حاجی ہوئے ہیں تو فی الحال سفر میں موسیقی سننا اور وہ بھی اتنی بلند آواز میں سننا قطعی طور پر منع ہے اور بیٹا ذرا لائٹس ڈپ کر کے دیکھ اندھیرے میں کچھ ہے.. چنانچہ اس نے نشست بدل لی..

لیکن سمیر کی یہ احتیاط کچھ کام نہ آئی کہ بابا حاجی پچھلی نشست پر بیٹھا ہوا بھی ڈرائیور کی نشست کے برابر ٹھوڑی جمائے پُر تشویش ہدایات دیتا گزارشیں کرتا جاتا تھا کہ بیٹا آہستہ... میرے پاس رنج سفر کا کچھ سامان ہے..

"بچہ بھاگ لگے رہیں' حاجی بابا کے دل کی مراد پوری کر دے"

"ابا" سمیر نے یکدم مڑ کر مجھے دیکھا۔

"یا حاجی۔"

"آپ نے حج کا سفر نامہ لکھنا ہے؟"

قطعی غیر متوقع سوال تھا "نہیں۔۔ پتہ نہیں۔۔ کچھ سوچا نہیں ہے اس کے بارے میں۔۔ حج کے دوران نوٹس وغیرہ بھی نہیں لیے کہ دھیان بٹ جائے گا۔ شاید۔ لیکن تم کیوں پوچھتے ہو؟"

"ویسے ابا آپ نے لکھنا ہی لکھنا ہے۔۔ آپ باز نہیں آئیں گے۔"

"تو کوئی حرج ہے؟" میں نے ہنس کر کہا۔

"نہیں۔۔ بس ایک ریکوئسٹ ہے۔۔ حج کے سفرنامے میں آپ نے تتلیاں نہیں ڈالنی۔۔ پلیز۔"

"اوئے کون سی تتلیاں؟"

"وہی جو "سنولیک" میں اڑتی پھرتی ہیں۔ "تتلی پیکنگ کی" میں پرواز کرتی ہیں۔۔ آپ ہر سفرنامے میں کہیں نہ کہیں تتلیاں ڈال دیتے ہیں۔"

"ڈال دیتے ہیں۔۔ سے کیا مراد ہے بچے۔۔ ہوتی ہیں تو ڈال دیتا ہوں میرا مطلب ہے ان کو بیان کرتا ہوں۔ "سنولیک" سے واپسی پر میں کچھ حنوط شدہ تتلیاں اپنی نوٹ بک میں محفوظ کر کے نہیں لایا تھا؟ وہاں تتلیاں تھیں۔"

"پر اتنی تو نہیں تھیں جتنی آپ نے ڈال دی تھیں۔"

"شاید اتنی نہ تھیں" میں نے اقرار کیا "لیکن جتنی بھی تھیں وہ مجھے اتنی ہی دکھائی دیں جتنی میں نے بیان کی ہیں۔۔ چلو یہ وعدہ رہا کہ اگر میں نے حج کا سفرنامہ لکھا تو اس میں دور دور تک ایک بھی تتلی نہیں ہوگی۔"

"تھینک یو۔" وہ منہ موڑ کر بھائی کے ساتھ گپیں لگانے لگا۔

مکہ کے مضافات کا آغاز ہو رہا تھا.. وہ موڑ آیا ہی چاہتا تھا جہاں سے ہم نے جدہ جانے کے لیے اپنا رخ تبدیل کر لینا تھا.. وہ مقام آیا ہی چاہتا تھا جہاں تک گرداب کی لہریں مار کرتی تھیں اور اپنی زد میں آنے والی ہر شے کو واپس بہا لے جاتی تھیں اور اپنے مرکز تک لے جا کر اس کے گرد گھومنے پر بے اختیار کر دیتی تھیں.. گرداب کی آبی رسیاں بدن کو جکڑ کر خانہ کعبہ تک لے جاتی تھیں اور اس کے کنارے لگا دیتی تھیں..

آج سویرے طائف جاتے ہوئے یہاں سے گزرتے یونہی سرسری طور پر کوئی بات تو ہوئی تھی کہ واپسی پر اگر وقت ہوا تو.. ہم زیادہ تھک نہ گئے تو شاید..

وقت تو نہ تھا.. رات کے بارہ بجنے کو تھے..

اور زیادہ نہیں ہم بہت ہی تھکے ہوئے تھے..

لیکن ہوس نہ وقت دیکھتی ہے نہ تھکاوٹ کو خاطر میں لاتی ہے.. ایک بار دیکھا تو دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے.. اور دوسری بار.. یعنی ہوس کی اس زنجیر کا سلسلہ ٹوٹتا نہیں.. ہوس در ہوس جڑتا چلا جاتا ہے.. اور مجھے کچوکے دیتا تھا کہ چلو چلو.. یوں اتنے قریب ہو کر دور نہ ہو جاؤ.. پاس سے گزر نہ جاؤ چلو..

لیکن میں بولا نہیں چپ رہا.. اپنی غرض کے منہ میں رومال ٹھونسے اسے بولنے سے باز رکھا صرف اس لیے کہ سلجوق کا خیال تھا.. مسلسل کئی روز سے ڈرائیونگ.. دیوانہ وار.. طائف کے پہاڑی سلسلے پھر تاریکی میں واپسی اور اب اتنا خود غرض ہو جاؤں کہ اسے کہوں بیٹے اس موڑ کو بھول کر سیدھے اُدھر چلے جاؤ.. کیسے کہوں.. اگر کہہ دیتا تو برخوردار نے انکار تو نہ کرنا تھا.. "اچھا ابو" کہہ کر سیدھے چلا جانا تھا اس لیے چپ رہا..

وہ موڑ قریب آ گیا.. ہم سب چپ بیٹھے تھے اور پھر یکدم سلجوق نے کہا "جی ابو؟"

"جی بیٹا.."

"آپ کچھ کہہ رہے تھے؟"

"نہیں.. میں نے تو کچھ نہیں کہا.."

"نہیں.. آپ نے کچھ کہا.."

"نہیں جوقی.."

"مکہ چلیں؟"

"نہیں نہیں اب گھر چلتے ہیں.. تم نے اتنی لمبی ڈرائیو کی ہے.. جی بھی نہیں چاہ رہا تھکاوٹ کے باعث.. گھر چل کر آرام کرتے ہیں.." پہلی بار جان بوجھ کر اس سرزمین پر جھوٹ بولتے ہوئے ندامت تو بہرحال ہوئی..

"بھائی آپ سیدھے جدہ چلو.. بس میں کہتا ہوں.. آپ بہت تھکے ہوئے ہو.." بے بی حاجی نے حکم دیا "کل آ جائیں گے.."

''ہاں.. کل آ جائیں گے..'' میں نے بھی تائید کی..

در کعبہ تو وا تھا.. آنکھوں میں تو دم تھا لیکن ساغر و مینا کو میرے سامنے رہنے دیا جاتا تب تھا..

مجھے پیاس نے ستایا اور میں نے منرل واٹر کی بوتل منہ سے لگا کر ایک طویل گھونٹ بھرا اور سگریٹ سلگا کر باہر دیکھنے لگا..

آبادیاں جن میں روشنیاں جلتی بجھتی ٹمٹماتی تھیں گزرتی گئیں..

رات کے اس پہر بھی باہر گہما گہمی کے آثار تھے..

پھر ایک شاہراہ کچھ شناسا سی لگی.. کچھ مکان دیکھے ہوئے لگے.. پام کے چند درخت ایسے کہ اجنبی نہ تھے.. اور پھر ہماری کار ایک چوک کی جانب بڑھنے لگی جسے اسلامی مجسموں یعنی بڑی بڑی صراحیوں سے سجایا گیا تھا اور یہ چوک تو یقیناً میرا دیکھا ہوا تھا.. یہ تو وہی جگہ ہے گزر رہے تھے ہم جہاں ہے.. یہ دیار اجنبی تو ہرگز نہیں ہے..

''وہ سلجوق..''

''جی ابو..'' وہ شرارت سے مسکرا دیا..

''اوئے ہم تو مکہ میں ہیں..''

''جی ابو...''

طائف کے اُس کھیت میں جس کی قربت میں انگور کی ایک بیل تھی.. اس کھیت میں جو ہزاروں بند گوبھی کے پھول تھے ان کے ہرے کچور پات بھی کیا کھلے ہوں گے جیسے میں کھل گیا.. میں چپ رہا تھا کہ اس مقام پر اپنے بیٹے کی تھکاوٹ کو کیسے نہ مدنظر رکھوں.. کہ اُدھر نہیں اِدھر چلو.. ورنہ میں تو ہوس اور اضطراب کا ایسا مارا ہوا تھا کہ اس کی منتیں کرنے پر آمادہ تھا.. اسے آمادہ کرنے کی خاطر دریا پار رانجھن کے ڈیرے پر لے جانے کی خاطر صدق دل سے اسے خوب خوب دعائیں دینا چاہتا تھا کہ بچہ بھاگ لگے رہیں.. تیرے بہت سے بچے ہوں اور ان کے بھی بے شمار بچے ہوں اور وہ سب کے سب تمہاری طرح پھلیں پھولیں.. تجھے خوشی اور خوشحالی نصیب ہو بچہ.. بس اس حاجی بابا کے دل کی مراد پوری کر دے.. اُدھر جدہ نہ جا.. اِدھر سٹیرنگ موڑ دے اور اس بابا کو جواب بھی شکوک سے بھرا ہے سات نہ سہی ایک ہی پھیرا لگوا دے بچہ.. پلیز..

اور بچے نے اپنے بابا کے دل کی آواز سن لی تھی..

اس نے ایک نہیں سات کے سات پھیرے لگوا دیئے.. ارے سے گسار و سویرے سویرے خرابات کے گرد پھیرے پہ پھیرے..

چونکہ رات کے اس پہر ہجوم نسبتاً کم تھا.. اس لیے مجھے رومی ستونوں کی حفاظت کی حاجت نہ تھی..

میں پہلی بار اس گرداب میں اپنی من مرضی سے بہتا تھا.. اپنی ہوس پوری کرتا تھا..

بچہ لوگ نوخیز اونٹوں کی مانند گردنیں اٹھائے لمبے لمبے ڈگ بھرتے ابا اونٹ سے مطمئن تھکاوٹ بھولے نہایت تروتازہ.. پھیرے پہ پھیرے لگارہے تھے.. کبھی نظر آجاتے اور کبھی دیر تک روپوش رہتے..

بہاؤ میں شامل ہونے سے پیشتر طے ہوا تھا کہ ہم سب خود مختار ہیں اپنے اپنے پھیرے لگائیں گے اور فارغ ہو کر حرم کعبہ کی جس محراب پر سبز رنگ کا ایک بورڈ آویزاں ہے اور سیڑھیاں صحن کعبہ میں اترتی ہیں وہاں ملیں گے..

میں فارغ ہو کر وہاں جا پہنچا تو بچگان وہاں نہیں تھے.. طواف سے تو مجھ سے پہلے فارغ ہو چکے ہوں گے اور یا تو حطیم میں سجدے کرتے ہوں گے یا کعبہ کی دیوار سے لپٹ کر ابا کو یکسر فراموش کر چکے ہوں گے..

تو میں سبز بورڈ تلے کعبہ کے صحن میں اترتی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا اور ان کا انتظار کرنے لگا..

بہت سے لہجے اور زبانیں.. اور ان کی سرگوشیاں آس پاس اور میں ان میں چپ بیٹھا انتظار کرتا تھا.. اور آپ حرم میں کہیں بھی ہوں.. بیٹھے ہوں.. چلتے ہوں کسی سے بات کرتے ہوں تو نہ آپ اپنے آگے دیکھتے ہیں کہ دیکھ کر چلیں اور نہ مخاطب کے چہرے کو دیکھتے ہیں صرف سیاہ پوش گھر پر نظر رکھتے ہیں تو آج بھی.. رات کے اس پہر میری نظر کے سامنے ابابیلوں کا ایک سیاہ غول مکہ کی تاریک پہاڑیوں میں سے اترا اور خانہ کعبہ کے آس پاس پرواز کرتا.. بلند ہو گیا..

پرندے یقیناً دیکھتے ہیں.. ان کی آنکھیں ہوتی ہیں.. وہ ہماری آنکھوں سے دیکھے گئے منظر کو الگ زاویوں اور مختلف رنگوں میں دیکھتے ہوں گے لیکن کیا دیکھتے ہوں گے تو اس غول میں شامل ایک ابابیل جب مکہ کی پہاڑیوں میں پوشیدہ اپنے گھونسلے سے نکل کر خانہ کعبہ پر جھکے آسمان پر اترتی نیچے دیکھتی ہے تو کیا دیکھتی ہے..

ہمیشہ سے ایک ہی منظر دیکھتی ہے..

ہزاروں برسوں سے ایک ہی منظر دیکھتی ہے..

سیاہ گھر کے گرد خلق خدا ایک بہاؤ میں ہے..

تو وہ ابابیل بھی اس منظر سے متاثر ہوتی ہے اور آسمان سے اتر کر نیچے آتی ہے تو بہاؤ کے ساتھ بہتی ہوئی ایک پھیرا بے اختیاری میں لگاتی پھر سے بلند ہو جاتی ہے..

آس پاس کی گہما گہمی میں.. جب کہ میں اس سیاہ سحر کے دام میں آیا ہوا ایک پرندہ تھا مجھے ایک مدھر گیت نے ایک سریلے سنگیت نے اپنی گرفت میں لے لیا.. اجنبی زبانوں کی بھنبھناہٹ میں.. نامانوس لہجوں کی سرسراہٹ میں وہ گیت میرے کانوں میں اترنے لگا کہ یہ قرآن پاک کے حرف تھے.. وہ ایسے اترے جیسے مجھ پر ہی پہلی بار اترتے ہوں.. اگرچہ میں ناواقف اور شناسا نہ تھا عربی زبان کا پھر بھی وہ حرف اور ان کا مترنم لہجہ میرے بدن میں اترتا جڑیں پکڑنے لگا..

از کجا ے آید ایں آواز دوست..

مجھ سے کچھ دور سیڑھیوں پر ایک دراز قامت قدرے صحت مند نوجوان ایک ڈھیلے چوغے میں ملبوس سر جھکائے اپنے آپ میں گم ایسے قرأت کر رہا تھا جیسے صرف اپنے آپ کو سنا رہا ہو..

میں اپنی نشست سے اٹھا اور اس کی قربت میں نہایت آہستگی سے ایسے کہ وہ محسوس نہ کرے کہ کوئی آ بیٹھا ہے.. میں اس کے قریب ہو بیٹھا..

سر جھکائے وہ ایک ایسی دھیمی رس بھری آواز میں.. کہ وہ نہ کسی کو سنانا چاہتا تھا اور نہ کسی داد کا تمنائی تھا.. وہ ایک داؤدی لحن میں تلاوت کر رہا تھا.. پڑھتا ہوا.. یاد کرتا ایک سبق کی طرح دوہراتا ہوا نہیں.. بلکہ باتیں کرتا ہوا.. نہ وہ ہمارے بیشتر قاریوں کی مانند زور لگا تا حلق میں خراشیں ڈالتا تھا.. نہ ان کی مانند اس کے چہرے پر مشقت کے کچھ آثار تھے اور نہ وہ داد طلب نگاہوں سے آس پاس دیکھتا تھا.. جب کبھی سر اٹھا کر دیکھتا تھا تو سامنے اپنے دوست کی جانب دیکھتا تھا اور اس سے باتیں کرتا تھا.. دوست نے اسے جو محبت کے خط لکھے تھے انہیں پڑھتا.. اسی کو سناتا تھا..

اس لمحے بہت سے حرف آشنا لگے.. اور میں نے انہیں اپنی یادداشت میں محفوظ کرنے کی سعی کی کہ بعد میں یہ آئتیں تلاش کر کے ان کا حوالہ دوں گا لیکن اب وہ سب حرف بھول گیا ہوں کہ وہ نوجوان کن آیات کی تلاوت کر رہا تھا..

البتہ میں یہ نہیں بھولا کہ کبھی کبھار اس کا جھکا ہوا سر اٹھتا.. اور اس کے ساتھ اس کا دایاں ہاتھ بلند ہو کر کعبہ کی جانب یوں اٹھتا جیسے وہ براہ راست اس سے مخاطب ہو.. قرأت میں کوئی ایسا مقام آتا جہاں اس کے جلال و جمال کا تذکرہ ہوتا تب اس کا ہاتھ ایک داد طلب شاعر کی مانند اٹھتا کہ ذرا دیکھ تو سہی کہ میں تیرے ہی بھیجے ہوئے کلام کو کیسے ادا کر رہا ہوں.. میں نے کیسے اسے ازبر کر رکھا ہے.. کوئی زیر زبر پیش کی غلطی ہے؟ میں نے کیسے چودہ سو برس گزرنے کے باوجود اسے جوں کا توں.. یاد رکھا ہے جیسے تو نے اسے میرے محمدؐ پر اتارا تھا..

کہیں تو "واہ" کہہ کر داد دے..
کہیں تو "مکرر" کی فرمائش کر..
تیرا ہی کلام ہے..
تجھے ہی سناتا ہوں.. تو داد کیوں نہیں دیتا..

وہ تادیر سر سینے میں لگائے جھکائے جھومے بغیر ایک استغراق میں تلاوت کرتا رہتا اور جب کبھی وہ سر اٹھا کر خانہ کعبہ سے مخاطب ہو جاتا تو گویا میں بھی مخاطب ہو جاتا کہ میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے..

مجھ سے ہم کلام ہوئے بغیر سلجوق اور سمیر کب کے آ چکے تھے اور اس کی قرأت سے مسحور ہو کر برابر کی

سیڑھیوں میں سر جھکائے بیٹھے تھے..

میں ایک ایسا سادہ اور ان پڑھ جاٹ تھا جس کے نام ایک خط آ گیا تھا اور وہ اسے پڑھ نہ سکتا تھا..اور آس پاس کوئی بھی پڑھا لکھا نہ تھا جس سے وہ یہ خط پڑھوا سکے..

تو اس خط کو جو میرے نام بھی آیا تھا یہ دراز قامت نوجوان حرم کعبہ کی ایک سیڑھی پر براجمان پڑھ رہا تھا..

اگرچہ وہ میری موجودگی سے غافل تھا..

اور پھر وہ خاموش ہو گیا..

خاموش ہوا اور خانہ کعبہ کے سیاہ ملبوس کو تکنے لگا..

وہ یونہی خاموش نہیں ہوا تھا مجھے یقین ہے کہ اسے داد مل گئی ہو گی..اُدھر سے ''واہ'' کی صدا آئی ہو گی..

میں نے اس کے پہلو سے اٹھتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ''شکریہ'' کہا..

لیکن اس نے سر نہیں اٹھایا کہ کون ہے جو شکر گزار ہو رہا ہے..

اسے کیا پروا تھی ایک ایسے شخص کے شکریے کی جو عربی زبان سے بھی واقف نہ تھا..عقیدت کے ان پڑھ سحر میں آ گیا تھا کہ اسے تو براہ راست..داد مل گئی تھی..''واہ'' کی آواز آ چکی تھی..

"آؤ مدینے چلیں... جس کے راستے میں تتلیاں ستاتی ہیں"

تتلیاں...

سفید رنگ کی تھیں..

پہلے دو چار نمودار ہوئیں اور پیچھے رہ گئیں..

یکدم دکھائی دیں.. تتلیاں لگیں، جتنی دیر میں ان کی شباہت پوری طرح نقش ہو کر ان کا تتلی ہونا ثابت کرتی وہ کار کی رفتار کا ساتھ نہ دے سکیں اور پیچھے رہ گئیں..

پروانے یا پتنگے وغیرہ بھی ہو سکتے تھے..

کچھ دیر بعد ایک اور غول دس بارہ کا ظاہر ہوا.. اور ساتھ دینے لگا..

تتلیاں ہی تھیں..

اُن کا سائز اگرچہ قدرے مختصر تھا.. پروں کا پھیلاؤ اتنا نہ تھا جتنا پاکستانی تتلیوں کا ہوتا ہے اور نہ ہی پروں کے نقش رنگا رنگ تھے.. بس سفید رنگ کی تھیں لیکن.. ایسے مقام پر تھیں کہ دنیا کی کوئی بھی تتلی ان کی مختصر حیات پر رشک کرتی ان کی جگہ پر پھڑ پھڑانے کی خواہش کرتی کہ وہ مدینہ منورہ جانے والے راستے پر ہماری کار کی ونڈ شیلڈ میں سے دکھائی دے رہی تھیں..

مدینے کے راستوں کی تتلیاں تھیں..

سلجوق نے کار ذرا آہستہ کر دی تاکہ وہ ونڈ سکرین سے ٹکرا کر اپنی حیات کو مزید مختصر نہ کر لیں..

وہ تب نمودار ہوئی تھیں جب باہر گزرتے صحراؤں میں ہولے سے کوئی بادِ نسیم چلنے لگی تھی اور گرمی زائل ہوتی ہلکی ٹھنڈک میں بدلنے لگی تھی..

وہ ہر دو چار منٹ بعد ونڈ شیلڈ کے آگے نمودار ہوتیں.. اور پرواز کرتی جاتیں پھر یکدم پیچھے رہ جاتیں..

طائف سے واپسی پر سمیر نے مجھے خبردار کیا تھا کہ ابا اس سفرنامے میں تتلیاں نہ ڈالنا اور میں نے صدقِ دل سے وعدہ کیا تھا کہ اگر میں نے حج کا سفرنامہ لکھا تو اس میں دور دور تک ایک تتلی بھی نہیں ہوگی..

اب میں کیا کرتا وہ دُور دُور تو کیا میرے نزدیک نزدیک اڑانیں کر رہی تھیں.. اللہ تعالیٰ انہیں میرے سامنے مدینہ کے راستے میں پھڑ پھڑا رہا تھا. شاید صرف میرے لیے کسی خصوصی بندوبست کے تحت انہیں بھیج رہا تھا.. روڈ ٹو مدینہ پر میرے استقبال کے لیے بھیج رہا تھا تو میں کیا کرتا.. ان کے وجود سے انکار کر دیتا. آنکھیں بند کر کے مکر جاتا کہ وہ وہاں نہیں تھیں..

تب میں نے پچھلی نشست پر براجمان سمیر کی جانب مڑ کر دیکھا تو اس کے لبوں پر ایک شرارت بھری مسکراہٹ پھڑ پھڑا رہی تھی کہ سوری ابا یہاں تو واقعی تتلیاں ہیں آپ انہیں اپنے سفرنامے میں ڈال سکتے ہیں. لیکن جتنی ہیں اتنی ہی لکھنا. متخیلہ کو بے قابو کر کے ان کے غول کے غول اور انبار کے انبار نہ بنا لینا. جتنی تخلیق کی گئی ہیں اتنی ہی بیان کرنا خود سے تخلیق نہ کرنا..

وہ کبھی سات آٹھ سے زیادہ نہ ہوتیں..

کبھی دو چار کی صورت ونڈ سکرین پر آ لگتیں..

کیا یہ وہی تتلیاں تو نہیں جو دنیا کے طویل ترین برفانی راستے کی مسافت کے دوران سنو لیک پر میرے رخساروں سے چھوتی ہوئی نکل جاتی تھیں. رنگ بھی اس لیے سفید ہے کہ برف کی دنیا سے آئی ہیں.. یا پھر سینئر میڈ تارڑ نے جونیئر میڈ تارڑ کو بہلانے اور خوش کرنے کے لیے جو دو گھڑوں میں مولی کے پتوں پر رینگتی سنڈیاں ڈال کر ململ سے ان کے منہ ڈھک کر انہیں روزانہ شہتوت کے پتے کھلا کر ان کو یہ البنظر سنڈیوں کو خوش نظر تتلیاں بن جانے میں مدد دی تھی.. اور ایک گھڑا تب کھولا تھا نصف صدی سے بھی پہلے اور دوسرے گھڑے کے منہ سے ململ کا کپڑا اب اتارا تھا جب میں سنو لیک پر تھا اور وہ میرے آس پاس ایک برفانی انجماد میں ٹھٹھرتی ہواؤں میں اٹکھیلیاں کرتی اڑانیں کرتی تھیں..

تو کیا دوسرا گھڑا سنو لیک پر بالکل خالی ہو گیا تھا.

نہیں..

اس گھڑے میں کچھ تتلیاں باقی تھیں جنہیں میرے ابا جی نے آج کے دن کے لیے سنبھال لیا تھا اور انہیں اب آزاد کیا تھا. میرے لیے.. اپنے پوتوں کے لیے.. کہ جاؤ مدینے کے راستے پر ان تینوں کے لیے میری دعاؤں کی صورت جاؤ تاکہ وہ جان جائیں کہ میں انہیں اس جہان میں بھی یاد کرتا ہوں.. بے شک میری نیلی آنکھیں مٹی ہو چکیں لیکن میں انہیں دیکھ سکتا ہوں کہ وہ میری ذات کا تسلسل ہیں ان کے اندر میری نیلی آنکھیں کھلی ہیں جو میری دعاؤں کی تتلیوں کو دیکھتی ہیں..

آج سویرے جدہ میں سلجوق نے مجھ سے کہا تھا ''ابا آؤ مدینے چلیں''

''چلو پتر..'' میں نے کہا تھا..

اور ہم مدینے جا رہے تھے..

گو میں رہینِ ستم ہائے حج رہا لیکن اُس کے خیال سے غافل تو نہیں رہا..

البتہ یہ غفلت تو ہوتی جاتی تھی کہ جس نے بلایا تھا اس سے غافل ہو جاتے تھے اور اُس کے خیال میں چلے جاتے تھے جو بلانے والے کا محبوب تھا. شاہراہ جدا ہو کر مدینے کو جاتی اور ہم مکہ روڈ پر سفر جاری رکھتے لیکن بہت صبر کر کے.. اپنے آپ کو تلقین کر کے کہ نہیں.. پہلے اس کے گھر حاضری دینی ہے.. پھر بھی کار تو مکہ کی جانب چلی جاتی اور ہم مدینہ کی طرف چلے جاتے..

دیگر با قاعدہ حاجی لوگ تو حج سے پیشتر ہی مدینے میں قیام کر آتے ہیں لیکن ہم چونکہ قدرے بے قاعدہ تھے اس لیے پہلے حاجی ہو کر اب مدینے کو جاتے تھے.. اللہ کی مرضی کے تابع ہو کر فرض ادا کر لیا تو اب اپنی مرضی کرتے جاتے تھے. حج کے دوران غافل کیسے ہوتے کہ جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں.. کون سا ایسا مقام تھا جہاں ہم ہوئے اور وہ نہ تھے.. ہر سو انہی کے نقش قدم تھے جن کی پیروی کرتے تھے.. منیٰ ہو یا عرفات.. جبل رحمت کے دامن میں سیاہ خیمے کے قریب جب قصویٰ بیٹھتی تھی تو سوار ایسا تھا کہ ہم غافل ہو سکتے تھے؟ مزدلفہ کی رات میں وہ تھے اور خانہ کعبہ کے گرد پھیرے لگاتے ہوئے بھی ان کی موجودگی ساتھ ساتھ چلتی تھی تو غافل کیسے ہو جاتے.. بلکہ اکثر اوقات رب سے بہت عاجزی اور لاچاری سے معذرت کرتے کہ کیا کریں تیرے محبوب کا خیالِ دل سے لحہ بھر کے لیے بھی رخصت نہیں ہوتا. کبھی تیرے خیال کے برابر میں اور کبھی آگے نکل جاتا ہے تو یہ کوتاہی معاف فرما دے.. ہم لاچار ہو گئے ہیں..

یہی بات ہے حج کے دوران ہم دیگر حاجیوں سے اپنے آپ کو ذرا برتر سمجھتے تھے کہ یہ بے چارے تو ہو آئے ہیں.. ہم نے ابھی جانا ہے.. یہ جو نقش وہاں سے لے کر آئے ہیں ان پر منیٰ، مزدلفہ، عرفات اور کعبہ کے رنگ چڑھ جائیں گے ڈھول جم جائے گی اور ہم اِدھر سے فارغ ہو کر جب اُدھر جائیں گے تو بدن پر وہی آخری نقش ہو گا جسے لے کر گھر جائیں گے..

تو آج سویرے جب سلجوق نے کہا تھا کہ ابا آؤ مدینے چلیں اور میں نے کہا تھا کہ چلو پتر، تو یہ اتنا سادہ سا مکالمہ بھی نہ تھا.. یہ تو نہیں کہ میں نے جواب میں کہنا تھا کہ نہیں پتر.. وہ بھی جانتا تھا کہ.. جدہ میں ابا کو چین نہیں آ رہا.. بے ہوش سے پھرتے ہیں جب تک انہیں مدینے کی ہوا نہ لگوائی ہوش میں نہیں آئیں گے.. تو وہ انتظامات مسلسل کرتا جاتا تھا اور تب جا کر اس نے کہا تھا کہ ابا آؤ مدینے چلیں..

چنانچہ ہم مدینے جا رہے تھے..

جدہ سے نکل تو گئے لیکن جدہ ساتھ ساتھ چلا آیا. ختم ہونے میں نہ آتا تھا..

ہم اس کی شکل سے بیزار ہو چکے تھے...

اس کی منت کرتے تھے کہ ہمارا پیچھا چھوڑ دے تُو ختم نہیں ہو گا تو مدینہ کیسے آئے گا..

بالآخر وہ ہم سے بیزار ہوا اور پیچھے رہ گیا..

اور ویرانی اور بیابانی کا آغاز ہو گیا..

اب وہ ختم ہونے میں نہ آتی تھی..

دراصل اللہ تعالیٰ نے ہمیں چوڑ کر دیا تھا.. ہماری عادتیں بگاڑ دی تھیں.. ہم جدہ سے نکلتے تھے اور دس بیس بار لبیک لبیک پکارتے تھے تو اُس کا گھر آ جاتا تھا..

اور یہاں سفر کرتے ہی چلے جاتے تھے.. کبھی اونگھ جاتے تھے کبھی تیز دُھنوں کے مغربی گانے سنتے سر ہلاتے تھے اور کبھی طویل عرصے تک ایک دوسرے سے کلام نہ کرتے تھے اور پھر بھی اُس کا گھر.. اُس کا حجرہ دکھائی نہ دیتا تھا.. جہاں وہ رہتا تھا اس کی سبز قیام گاہ کے کچھ آثار نظر نہ آتے تھے..

یاروں نے کتنی دُور بسائی ہیں بستیاں..

اللہ کی بستی تک پہنچنا کتنا آسان اور مختصر تھا.. اور یاروں کی بستی تک پہنچنے کے لیے کیسی لمبی مسافتیں درپیش تھیں..

یار ایسے ہی ہوتے ہیں..

آس پاس جس زمینی منظر کے درمیان میں سے ہماری کار فراٹے بھرتی ہوئی گزرتی جاتی تھی اس میں بھی کچھ کشش نہ تھی..

کوئی خوش شکلی نہ تھی..

صحرا بھی جو گزرتا تھا دل نشیں نہ تھا..

کہ یہ.. اس تصور سے کچھ مطابقت نہ رکھتا تھا جو "صحرا" کا لفظ ادا کرتے ہی ذہن میں یوں پھیلتا ہے کہ افریقہ کا صحرائے اعظم ہے اور کوئی کوئی ہے جو ٹمبکٹو کے شہر تک پہنچتا ہے.. ایران کا دشت مرگ ہے.. اُردن کے گلابی شہر پیٹرا کے ارد گرد جو ریت ہی ریت ہے.. جس میں گھوڑوں کے پاؤں دھنستے ہیں اور جا تو راس میں دفن ہو جاتے ہیں.. پیلی ریت کے سمندر ہیں جو ہواؤں کی زد میں آ کر حرکت میں آتے ہیں..

یہ ایسا صحرا نہ تھا..

بس بے آب و گیاہ ویرانے تھے.. آنکھوں میں خراشیں ڈالنے والی بے روح بے آبادی تھی..

یاروں نے کیوں اتنی دُور بسائی تھیں بستیاں..

یار ایسے ہی ہوتے ہیں..

یہاں تو ثریا کی گائی ہوئی میری دل پسند نعت ہی دل میں اترتی تھی کہ

بیچ بھنور میں آن پھنسا ہے دل کا سفینہ.. شاہِ مدینہ!

ہم ویران اور لامتناہی اجاڑ کے بھنور میں پھنسے سفر کرتے جاتے تھے.. شاہِ مدینہ کے دربار میں حاضر

ہونے کے لالچ میں..

شاہ نے بھی کیسی جگہ جا کر اپنا دربار لگایا ہے..

مجھے بہت شکایت تھی اُن زمانوں کے اہل مکہ سے..اگر ان کی عقل پر پتھر نہ پڑ جاتے..وہ اتنے شقی القلب اور سنگدل نہ ہو جاتے..ان کے دلوں پر قفل نہ پڑ جاتے..اقرأ کہنے کے باوجود وہ پڑھ نہ سکتے..اتنے پر تکبر نہ ہوتے تو ہمیں حاضری لگوانے کے لیے اتنی دُور نہ جانا پڑتا..

حضوؐر ان سے تنگ آ کر ہجرت نہ کرتے..

ہمارا کام آسان ہو جاتا..

لیکن یہ بھی مصلحت تھی..اچھا ہوا کہ حضوؐر ہجرت کر گئے ورنہ بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتیں..اگر مکہ میں ہی رہتے تو ہم جیسوں کے لیے بڑی مشکل ہوتی کہ مکہ میں ہیں تو اب کہاں جائیں..اللہ کے گھر کو جائیں یا حضوؐر کے دربار میں حاضری دیں..کہاں جائیں..جدھر بھی جائیں مجرم محسوس کریں..اگر پہلے منہ وَل کعبہ شریف کرتے ہیں تو اُدھر سے آواز آتی ہے کہ تیرا دل تو ہے صنم آشنا..اور اگر اپنے صنم اور محسن کے ہاں پہلے حاضری لگواتے ہیں تو وہاں بھی ڈانٹ پڑتی ہے کہ یہاں کیا لینے آئے ہو..جس نے مجھے بھیجا تھا پہلے اس کے پاس کیوں نہیں گئے..

چنانچہ ان درباروں اور دیاروں کے الگ الگ ہونے سے اور فاصلوں پر ہونے سے ہم جیسے آزمائش سے بچ گئے...وہ بھی خوش جس کے آگے ہم گڑگڑاتے آہ وزاری کرتے تھے کہ بخش دے اور وہ بھی خوش جس کے ساتھ ہم لاڈ پیار کرتے تھے کھلنڈرے ہوتے تھے اس یقین کے ساتھ کہ یہ سفارش کر دے گا..

جدہ اور مدینہ کی طویل مسافت کے درمیان صرف ایک ہی آباد مقام آتا ہے..اگرچہ صحرائیں کہیں کہیں کچھ گھروندے نظر آتے ہیں لیکن شاہراہ کے کنارے ایک ہی آبادی راستے میں پڑتی ہے اور یہاں صحرا سے بلند کچھ اونچائی ہے..ٹھنڈک ہے..ہوا خوشگوار ہے اور بدن کی ٹھنڈی بلائیں لیتی ہے اور اس مقام کو جانے کیوں ''ساسکو'' کہتے ہیں..

ہم کار سے باہر آئے تو ہوا تیز تھی..اس میں کچھ ریت کی آمیزش تھی لیکن ٹھنڈک تھی..

مدینہ سے آنے والی سبھی کوچیں اور بسیں یہاں بیتابی سے رکتی تھیں اور جدہ سے مدینہ جانے والی کاریں اور کوسٹر اپنی تھکن اتارنے کے لیے اور بھوک مٹانے کے لیے یہاں ٹھہرتے تھے..

دو بڑے ریستوران..ایک سپر سٹور..ایک مسجد..نشیب میں کچھ گھر..اور ٹھنڈک سے لبریز ہوا..یہ ساسکو کا کل سرمایہ تھا..

اور ریستوران میں ہر کوئی حسب معمول چکن کھا رہا تھا..

کچھ خاندان.. جن میں ایک افریقی تھا اور دو سعودی پورے کا پورا پولٹری فارم نوش کر رہے تھے..
اور ہمراہ اس چکن کے.. پورے مریدکے میں اتنے باسمتی چاول پیدا نہیں ہوتے جتنے وہ سب کے سب شکم میں اتار رہے تھے..
خدا جانے یہ لوگ ہر وقت ہر کھانے پر ایک ہی قسم کا چکن اور ایک ہی نوعیت کا پھیکا پلاؤ کیسے اتنی رغبت سے کھاتے ہی چلے جاتے ہیں..
اور چونکہ سب لوگ یہی کھاتے ہیں تو ان کے تتبع میں ہم بھی یہی خوراک کھاتے چلے جاتے ہیں کہ شاید ثواب ہوگا..

ریستوران کی ایک میز سے کھانے سے فارغ ہو کر چند مسافر اٹھے اور ان کی میز پر روسٹ چکن کے کچھ حصے ان چھوئے جوں کے توں پڑے تھے تو میں نے ایک سعودی کو دیکھا.. اس نے کسی قسم کی عجلت یا شرمندگی کے بغیر اس میز پر چھوڑے گئے کچھ چاول پھانکے.. چکن کا ایک پیس جو نصف کھایا ہوا تھا اس کا بقیہ نصف نہایت اطمینان سے نوش کیا اور پھر ایک پُرذائقہ سیٹی بجاتا ہوا باتھ روم کی جانب چلا گیا..

ساسکو سے چلے تو پھر چلتے ہی گئے..
زمینی منظر اکتاہٹ بھرا تھا اور نظر بیزار ہو رہا تھا..
سلجوق نے خبر کی کہ سفر کا اختتام ہونے کو ہے..
تقریباً چار سو کلومیٹر کا فاصلہ طے ہونے کو تھا..

دائیں جانب ریگستان کی بے رنگی میں عجیب بے ڈھب کوئلہ سیاہ پتھروں کے ڈھیروں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا.. وہ صحرا میں یوں پڑے ہوئے تھے جیسے اُس کا حصہ نہ ہوں بلکہ انہیں وہاں گرایا گیا ہو.. جلے ہوئے.. سیاہ.. نگاہوں میں ویرانی بھرنے والے سوختہ ڈھیر.. بہت بعد میں جب رچرڈ برٹن کا سفرنامہ "اَل مدینہ اور مکہ" پڑھنے کا اتفاق ہوا تو معلوم ہوا کہ سینکڑوں برس پیشتر مدینہ کے نواح میں ایک آتش فشاں کے پھٹنے سے پورا علاقہ پگھلے ہوئے لاوے کی زد میں آ گیا تھا یہاں تک کہ شہر کا بیشتر حصہ اس سیال آگ کی لپیٹ میں آ گیا لیکن مسجد نبوی تک پہنچتے پہنچتے لاوا ٹھنڈا ہو گیا.. کچھ اہل مدینہ نے کہا کہ اس کی حدت میلوں تک محسوس ہوتی تھی اور کچھ کا بیان تھا کہ اس کے قریب ہو جانے پر بھی گرمی کا احساس نہ ہوتا تھا.. مدینے کی قدیم ترین تاریخوں میں اس کے حوالے ملتے ہیں لیکن آج کے تاریخ دان اس آتش فشاں کے پھٹنے کا ذکر کم ہی کرتے ہیں..
یہ سوختہ سیاہ پتھر جو مدینے کے نواح میں دُور دُور تک بکھرے ہوئے تھے دراصل سرد ہو چکے لاوے کی شکلیں تھیں..

سوختہ پتھروں کا سلسلہ ختم ہوا تو صحرا کی بیابانی میں جگہ بناتے کھجوروں کے چند جھنڈ دکھائی دیئے جن کے درمیان میں کسی اہل ثروت کا گھر تھا۔۔

ایسے متعدد باغات نظر آنے لگے۔۔بے شک یہ یثرب ایسی ستور بستی کے نواح میں نظر آ رہے تھے لیکن کھجوروں کے دھول آلود چیدہ پتے بے جان اور بے روح نظر آئے۔ محض عقیدت ہی کھجور کے ان خشک اور خوشنمائی سے محروم درختوں میں زیبائی اور خوش شکلی دیکھ سکتی تھی۔۔۔

ہم مدینہ کے نواح میں سے گزرتے ہوئے شہر کی پہلی آبادیوں میں داخل ہو رہے تھے۔۔

سینکڑوں کاروں کے ہجوم میں ایک نہایت مصروف شاہراہ پر ہماری کار ایک متعینہ رفتار سے چلی جا رہی تھی۔۔

اس شہر کی ظاہری شباہت بھی کسی طور دوسرے شہروں سے جدا نہ تھی۔۔ وہی شاپنگ مالز۔۔جدید عمارتیں جو جتنی بلند ہوتی چلی جاتی تھیں اتنی بے روح ہوتی چلی جاتی تھیں۔۔فلیٹوں کے تہہ در تہہ انبار۔۔جدید بستیاں جو مدینے کے نواح میں بلند ہونے والی قدیم پہاڑیوں کی شکلیں بدل رہی تھیں۔۔انہیں مجروح کرتی ان پر جنگلی کھمبوں کی مانند اُگ رہی تھیں۔۔

میں ایک عجیب۔۔نہ چاہتے ہوئے بھی ایک غیر جانبدار کیفیت میں آس پاس کے منظر کو دیکھ رہا تھا۔اس نے مجھ میں کوئی ہیجان پیدا نہ کیا۔۔نہ اقبال کی مانند جو یہاں کبھی نہ آئے تھے اپنی اونٹنی کے پاؤں میں ریشم کے راستے محسوس کیے۔۔نہ یہ جی چاہا کہ خاک مدینہ ہے تو اسے ذرا اتر کر ٹھہر کر چوموں۔۔آنکھوں میں ڈالوں۔۔دل ایک لمحہ کے لیے بھی نہ رُکا یہ جان کر کہ میں مدینے میں ہوں۔۔یہ جان جس کے جاننے کی لوگ مدینے میں خواہش کرتے ہیں۔۔۔یہ جان یہ جان کر بھی کہ میں مدینے میں ہوں۔۔بے جان ہی رہی۔۔کہیں نہ گئی۔۔

پھر میں حسب عادت دکانوں سٹوروں اور تجارتی اداروں کے بورڈ پڑھنے کی کوشش کرنے لگا اور ایک ایسا سائن بورڈ دکھائی دیا جس پر سٹور کا نام درج تھا اور نیچے "مدینہ" لکھا تھا۔تب مجھے کچھ ہوش آیا کہ میں کہاں ہوں۔۔

جیسے قرطبہ پہنچنے پر بھی جب مجھے ایک بورڈ پر "قرطبہ" لکھا دکھائی دیا تو میں نے جانا کہ میں کہاں ہوں۔۔

دراصل شہر کوئی بھی ہو۔۔اس کے گھروندوں' عمارتوں' شاہراہوں' کاروں اور سپر سٹوروں میں کسی بھی دل کو دھڑکنے اور اسے بے اختیار دھڑکنے پر مجبور کر دینے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔۔کہ یہ سب عارضی اور جعلی مناظر ہوتے ہیں۔۔محض دکھاوا ہوتے ہیں۔۔یہ صلاحیت صرف ان حوالوں میں ہوتی ہے جن کی نسبت کوئی بستی۔۔ بلکہ یہ بستی جس میں سے ہم گزرتے تھے۔۔یہ بستی۔۔کل عالم میں۔۔یہاں تک کہ شہروں کی ماں مکہ کے مقابلے میں بھی کل عالم میں فضیلت کی معراج پر متمکن ہوتی ہے۔۔

مکہ میں خانہ کعبہ نہ ہوتا تو وہ کیا ہوتا..

اور مدینہ میں حضورؐ نہ ہوتے تو.. کچھ بھی نہ ہوتا..

تو جب تک وہ نسبت نظر نہ آ جائے.. وہ بستی.. کوئی بھی بستی ہو سکتی ہے..

اور وہ نسبت دُور دُور تک نظر نہ آتی تھی..

تو ابھی تک یہ کوئی بھی شہر تھا..

دنیا کے ہزاروں بے وقعت شہروں کی مانند.. ایک اور شہر..

بائیں ہاتھ پر.. قدرے نشیب میں جو ایک گھنی آبادی تھی اس میں سے دل کو بے پناہ راغب کرنے والی.. ایک مختصری دلکش مسجد.. پست قد میناروں اور موزوں متناسب گنبدوں والی.. راج سنگھاسن پر براجمان ایک مہارانی کی مانند نظر آئی.. اور نظر اس پر سے ہٹتی نہ تھی کہ اتنی حسین تھی.. یہ مصری آرکیٹیکٹ حسن فتحی کی تخلیق تھی جس نے جدہ میں اور اس کے سمندر کے کنارے بھی نہایت پرجمال مساجد ڈیزائن کی تھیں..

بہت کچھ پڑھنے.. تصاویر دیکھنے.. ٹیلیویژن پر مشاہدہ کرنے یا وہاں سے لوٹ کر آنے والے زائرین کی روئیداد سفر سننے یا پڑھنے کے بعد یہ احساس تو تھا.. اندازہ تھا.. یہ مجھ میں علم تھا آگاہ تھا کہ بستیاں وہ نہیں رہیں جو کبھی تھیں..

بستیاں جو ہمارے خواب و خیال ہیں.. ہمارے قیاس میں بستیاں ہیں.. چودہ سو برس سے آباد بستیاں ہیں وہ اب تو نہیں.. جو کبھی تھیں.. ہر پچاس ساٹھ برس کے بعد ہر شہر کا نقشہ یکسر بدل جاتا ہے.. عمارتیں ڈھے جاتی ہیں.. راستے بدل جاتے ہیں.. شجر بھی کچھ اور ہو جاتے ہیں.. یہاں تک کہ مکینوں کے رنگ ڈھنگ بھی تبدیلی کی زد میں آ جاتے ہیں.. اسی بستی کا کوئی باسی بھی اگر اتنے عرصے کے بعد لوٹے تو وہ بھی اپنی بستی کو پہچان نہیں پاتا.. لیکن اس کے باوجود..

اس کے باوجود تاننگ بھی رہتی ہے.. توقع یہی خیال کرتی ہے کہ یثرب کی بستی میں تو بس کچھ کچے گھروندے ہوں گے.. دو چار دھول آلود گلیاں ہوں گی جن کی دھول پر ابھی تک قصویٰ کے سموں کے نشان ثبت ہوں گے.. لوگ ان پر پاؤں نہ دھرتے ہوں گے.. اور جن جن گلیوں میں سے وہ ڈاچی بادامی رنگ کی گزری ہوگی تو وہاں اس کے پاؤں میں بندھی جھانجھروں کی چھن چھن ابھی تک فضا میں ٹھہری ہوئی ہوگی.. اور وہ تو کھلی چھوڑ دی گئی تھی کہ جہاں اللہ نے چاہنا تھا اس نے تو اس کی مرضی سے وہیں رُکنا تھا.. اور رُکی تھی تو اپنی اگلی ٹانگیں سمیٹتی ہوئی آہستگی سے بیٹھتی تھی اور تب اس پر سوار جن اترا ہوگا اور جہاں اترا ہوگا تو اس کے پاؤں تلے آنے والی مٹی پر اس کے نقش پا موجود تو ہوں گے..

توقع تو یہی خواہش کرتی ہے..

اگرچہ یہ توقع کیسی احمقانہ ہے مگر پھر بھی ایسی توقع کی خاطر احمق ہو جانا چنداں خسارے کا سودا نہیں...

اور یہ گمان بھی ساتھ ساتھ چلا آتا ہے کہ وہاں ابھی تک ڈاچی والے کے ہاتھوں کی تعمیر کردہ مسجد جوں کی توں ہوگی.. ایک جھونپڑا نما. کھجور کے تنوں کی چھت والی. جس کی کچی اینٹوں میں سے کچھ ایسی ہیں جنہیں یار کے ہاتھوں نے خود جمایا تھا اور وہ اس کے لمس سے بقیہ تمام اینٹوں میں سے الگ دکھائی یوں دیتی ہوں گی کہ وہ تو اس کے لمس سے سنہری ہوگئی ہوں گی.. دُور سے پہچانی جاتی ہوں گی کہ بس یہ.. اور یہ.. اینٹوں کی تیسری تہہ میں جو پانچویں اور چھٹی اینٹ ہے.. اسے ڈاچی والے نے جمایا تھا..

بے شک تب نہ تھا. لیکن اب ایک سبز گنبد ہوگا..

دیکھنے میں نہایت معمولی.. نہ اس کی بناوٹ میں کوئی خاص بات اور اس پر پینٹ کیا ہوا سبز رنگ بھی ایسا جیسا شہر لاہور کے قدیم دروازوں اور کھڑکیوں پر تہہ در تہہ تھوپا جاتا ہے.. نہ اس میں اصفہان کے شاندار نیلے گنبدوں ایسی آرائش اور نہ نیلی مسجد کے گنبدوں ایسی نزاکت.. اور نہ ہی تاج محل کی سفید الوہی بے مثال بناوٹ..

دیکھنے میں.. بناوٹ اور سجاوٹ میں نہایت معمولی سبز رنگ کا ایک گنبد.. پر ایسا گنبد.. کہ اس کے آگے کوئی اور نہ ٹھہرتا تھا.. اس کی نقل میں تعمیر کردہ دنیا کے ہر شہر میں جو گنبد تھے اگرچہ بظاہر اس سے کہیں شاندار اور شوکت والے تھے پر اس کے سامنے سر جھکاتے تھے.. کہاں ٹھہرتے تھے..

ایسا گنبد.. جو فاصلوں اور نظر کی قید میں نہ تھا.

کسی حدِ نظر کا پابند نہ تھا..

مالی' مراکو' سوڈان سے بھی اُفق پر سبز ہوتا نظر آتا تھا..

ہندوستان' پاکستان' انڈونیشیا اور ملائیشیا میں بھی سب کو دکھائی دیتا تھا..

یہاں تک کہ بوسنیا' چیچنیا' داغستان اور کاشغر میں بھی جو دیکھنے والے تھے انہیں دکھائی دیتا تھا..

تو یہ کیا سانحہ ہے کہ جو دنیا کے ہر خطے سے آسانی سے نظر آ جانے والا تھا.. وہ مجھے جو محض دس بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر اس کی جانب سفر کرتا تھا.. مجھے نظر نہ آتا تھا.. اس میں میری نظر کا کچھ قصور تھا..

مدینہ شہر کے درمیان میں ہماری کار اوپر اٹھی ایک فلائی اوور پر اٹھتی شاہراہ پر فراٹے بھرتی چلی جا رہی تھی... باہر فٹ پاتھوں پر بیزار سے تھکے ہوئے کچھ زائر چلتے تھے.. ریستوران اور سٹور تھے.. دکانیں تھیں جن کے باہر چینی سوٹ کیسوں اور بریف کیسوں کے ڈھیر نمائش پر تھے..

ہم مدینہ کے مرکز میں پہنچ کر دائیں جانب ہوگئے..

اودھر دائیں جانب مڑتے ہیں تو فلک پر ایک مینار بلند نظر آتا ہے

پل بھر کے لیے..

اور پھر اگلے لمحے کسی شیرٹن.. کانٹی نینٹل یا اوبرائے ہوٹل کی بلند و بالا عمارت کی اوٹ میں چلا جاتا

ہے..ان کی بلندی کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے..

مجھے کچھ قلق نہ ہوا کہ وہ روپوش ہو گیا ہے..

اس مینار میں کوئی بُلاوا نہ تھا..

یہ ایک جدید طرز کا ثروت کے مظاہر کا نمائندہ ایک مینار تھا..

اس میں کچھ کشش نہ تھی..

اگرچہ یہ کوئی مینار نہ تھا.. مسجد نبوی کا ایک مینار تھا..

لیکن اس میں کچھ کشش نہ تھی..

''وہ کیسے اپنے فرش سے نیچے سبز گنبد کے عرش کو دیکھتے ہیں''

''پاکستان ہاؤس'' کی چھٹی منزل پر واقع جہاں تک ایک مخدوش کھڑکھڑاتی ہوئی لفٹ آپ کو پہنچاتی تھی.. کمرہ نمبر 208 میں واحد خصوصیت یہ تھی کہ یہ ایک ''روم وِدا ے ویو'' تھا.. ایک ایسا کمرہ جہاں سے ایک منظر نظر آتا تھا..

اور اس بستی میں مسجد نبویؐ اور روضۂ رسولؐ کے سوا اور کوئی منظر کیا ہوگا..

کمرہ نمبر 208 کے آگے کھلے آسمان تلے ایک مختصر بالکونی بھی تھی.. نیچے چھ منزلیں نیچے ایک شاہراہ تھی' اس میں سے نکلتے کچھ راستے تھے کاریں بہت تھیں اور زائرین کی بسیں اور کوچز تھیں اور ہجوم تھا.. اور یہاں سے منظر کیا تھا جو دکھائی دیتا تھا؟ مسجد نبویؐ کا صرف ایک مینار.. کھلے میدان ایسے صحن کا کچھ حصہ اور عمارت کا ڈھکا ہوا ایک مختصر علاقہ.. ہجوم ادھر کو رواں تھا.. اس کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا..

جو میں دیکھنا چاہتا تھا وہ دکھائی نہ دیتا تھا.. وہ روپوش تھا جھگتے اور جدید ترین ہوٹلوں کی بلند دیواروں کے پیچھے.. اگر وہ نہ ہوتے تو میری نظر اس تک بلا روک ٹوک اور بغیر کسی جھجک کے سفر کرتی چلی جاتی جسے میں دیکھنا چاہتا تھا..

میں نے اپنے بدن کو ذرا آگے کر کے.. بالکونی کی ریلنگ تھام کر اپنے بدن کو ذرا کھینچ کر کہ شاید دو چار انچ بڑھ جائے تو شاید کچھ نظر آ جائے.. ہوٹلوں کے دھا نچے اور بلند فصیلیں تھیں جن کے پار رانجھن کا ڈیرا تھا.. نظر ان کے پار نہ جا سکی ان سے ٹکرا کر وہیں کہیں گر گئی..

یہ تنہا مینار جو مدینے کے شفاف آسمان میں پینٹ کیا ہوا تھا.. خانہ کعبہ کے میناروں کی مانند نیا نکور چمکتا دمکتا تھا.. شاندار اور سر بلند عہد حاضر کی متمول تہذیب کا مظہر جس میں حسن جمال کی گنجائش کم تھی.. میں بالکونی میں کھڑا دانت بھینچے آنکھوں کو کم سے کم جھپکتا اسے مسلسل تکتا رہا.. اپنے آپ کو ایک اضطرابی کیفیت کے لیے تیار کرتا اپنے آپ کو پر جوش کرنے کی سعی کرتا رہا کہ دیکھو.. تمہارے نصیب میں حیات میں پہلی بار نبیؐ کی مسجد کا مینار تمہارے سامنے ہے.. رشک کرو اپنی بینائی پر.. صدقے وان دو آنکھوں کا جو اسے دیکھتی ہیں' شکر ادا کرو اس تندرستی کا جو تمہیں یہاں تک لے آئی ہے اور قسمت کیسی خوش ہے تمہاری کہ تمہارے رسولؐ کے

ہاتھوں کی تعمیر کردہ مسجد کا ایک مینار تمہارے سامنے ہے..

لیکن یہ سعی لا حاصل تھی..

نہ کوئی اضطراب بدن میں تیرا.. نہ کوئی ہیجان لہو میں رواں ہوا اور نہ کوئی جوش لاوے کی مانند آگ ہوا..

کچھ بھی نہ ہوا..

میں جوں کا توں کھڑا رہا. جیسے کسی بھی مسجد کے مینار کو تکتا ہوں..

خانہ کعبہ کے میناروں کو پہلی بار دیکھ کر بھی مجھے کچھ نہ ہوا تھا..

اور یہاں.. جہاں ہر ذی رُوح کو جس کے اندر ذرّہ بھر بھی حُبِ رسول ہو.. وہ کچھ ہوتا ہے جو زندگی میں کبھی بھی نہیں ہوتا.

ایک گھراؤ میری رگوں اور شریانوں میں رواں خون میں شامل ہو کر اسے سیاہ کرنے لگا..

ایک بڑے خوف نے مجھے اپاہج سا کر دیا..

ایک خاک کر دینے والی مایوسی میرے رگ و پے میں سرایت کرنے لگی..

یعنی.. میرے اندر.. کہیں ایسا تو نہیں کہ میرے اندر حُبِ رسول کا ایک ذرّہ بھی نہ ہو..

اگر ہوتا تو میں اس مینار کو دیکھ کر یوں.. ایک گلیشیر کی مانند منجمد کیوں رہ جاتا.. وہ گرم ابلتے پانی جو بلندیوں پر کہیں کہیں چٹانوں میں سے پھوٹتے ہیں اور چشموں کی صورت اختیار کرتے ہیں اور ان پر گرم بھاپ معلق ہوتی ہے میں ویسا کیوں نہ ہوا. میرے بدن کے گلیشیر میں سے گرم پانی کیوں نہ رواں ہوئے..

کیسا برا خوف تھا ایک سیاہ اژدھا تھا جو میرے گرد لپٹتا چلا جاتا تھا..

ایک ذرّہ بھی نہ تھا؟

''پاکستان ہاؤس'' کی چھٹی منزل پر کمرہ نمبر 208 میں داخل ہوتے ہوئے ہمیں تھوڑی سی شرمندگی تو ہوئی تھی کہ ہم نے اپنی آسائش کو ترجیح دی تھی..

مدینے آئے تھے تو پہلے مدینے والے کے در پر حاضری دینے جاتے.. سفر کی دھول سر میں ہوتی مسافتوں کی تھکن چہرے پر ہوتی.. ساندھنی کو بھی تیز سے تیز تر چلنے پر مجبور کیا تھا وہ بھی پسینے سے تر ہانپتی ہوتی.. انہیں سلام کرتے اُدھر سے الفت بھرا جواب آتا تو پھر تازہ دم ہونے کی خاطر کارواں سرائے کا رُخ کرتے..

یہ کیا کہ سواری کو بھگاتے بھگاتے مدینے پہنچے ہیں تو ایسے بے دید ہوئے ہیں کہ اُس کی دید ملتوی کر کے سیدھے کارواں سرائے کی بہترین کوٹھڑی کی آسائش میں آ گئے ہیں..

اب آ گئے ہیں تو مجرم محسوس کر رہے ہیں..

کمرے میں داخل ہوتے ہی جرم کا احساس ہوا ہے تو اب جلد از جلد یہاں سے فرار ہو جانا چاہتے ہیں..

سلجوق اور تمیر غسل خانے میں تازگی حاصل کر رہے ہیں تو میں بالکونی میں جا کھڑا ہوتا ہوں..

اور اس منظر کو دیکھتا ہوں.. اور مجھ میں خوف اور مایوسی بھر جاتی ہے کہ کیا ایک ذرہ بھی نہیں؟.. لیکن ایک ڈھارس بہر طور تھی.. اگرچہ امید کی ایک ہی کرن تھی پر تھی بہت چمکیلی اور آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی اور پیاسا تن بدن کو تھامتی سہارا دیتی تھی کہ صرف یہ ایک مینار جو دکھائی دے رہا ہے اُس خاک کا نمائندہ نہیں جہاں ڈاچی والے کا قیام ہے.. اس کی قیام گاہ کے اوپر تو ایک سبز گنبد ہے جو یہاں سے دکھائی ہی نہیں دے رہا.. اُس کے سوا باقی سب تو سنگ و خشت کے معجزے ہیں.. زرد جواہر کی رونمائیاں ہیں اور ہیچ ہیں اس کے آگے.. حقیر ہیں اس کے سامنے تو ان پر انحصار نہ کر دو دل میلا نہ کرو.. یہ فیصلہ تو سبز گنبد کے نظر آنے کے بعد ہوگا کہ تم میں حب رسول کا ایک ذرہ ہے یا نہیں یا پورا صحرا ہے۔

میں کمرے میں واپس آتا ہوں.. بالکونی سے واپس آتا ہوں تو بچہ لوگ تازہ دم ہو کر ایک عجب بھگدڑ میں مبتلا ہیں.. بولائے پھرتے ہیں.. ابا جلدی کرو.. بالکونی میں اتنی دیر کیا کر رہے تھے.. مغرب کا وقت ہوا چاہتا ہے.. چلو چلو.. کہاں جا رہے ہو وضو تو کر لو.. ترکیب بھول تو نہیں گئی..

وہ ایسے بدحواس ہو رہے تھے جیسے انہوں نے اُس گاڑی کو پکڑنا ہے جو زندگی کے پلیٹ فارم پر لمحہ بھر کے لیے رُکی ہے اور اگر شتابی سے وہاں نہ پہنچے تو چھوٹ جائے گی.. اور وہ پلیٹ فارم پر کھڑے رہ جائیں گے ہمیشہ کے لیے..

یہ آخری گاڑی ہے۔

مغرب کی اذان بلند ہوتی ہے..

اور وہ بہاؤ کا رُخ بدل دیتی ہے..

مدینے کی گلیوں بازاروں میں سیر کرتا.. ٹہلتا بے پروا ہجوم.. شاپنگ کرتا.. پاکستانی ہوٹلوں میں پلاؤ نوش کرتا.. ترک ریستورانوں میں کافی پیتا.. سوٹ کیس خریدتا.. شفون اور سلک کے تھان ملاحظہ کرتا.. سونے سے لبریز سنیاروں کی دکانوں میں زیورات زیب تن کر کے دیکھتا.. عود اور عنبر کی دکانوں میں ان کے دھوئیں سونگھتا.. کیا مرد اور کیا وجودِ زن.. یہاں تک کہ پبلک ٹرانسپورٹ میں سوار مسافر بھی.. اترتے ہیں.. اور یہ سب ایک ہی بہاؤ میں بہنے لگتے ہیں.. جیسے کسی سپیرے نے ایسی بین بجائی ہے کہ وہ سب اس کی دُھن سے مست ہو کر.. بے اختیار اُدھر کا رُخ کر لیتے ہیں سب کچھ بھول بھال کر.. بے خود اور مخمور چلے جاتے ہیں..

اور سارے راستے ڈاچی والے کی مسجد کو جاتے ہیں..

اور ہم بھی جاتے ہیں..

اور اُدھر سے جاتے ہیں جہاں مسجد کی چار دیواری سے باہر.. شاہراہوں اور فٹ پاتھوں میں گھرا ایک مختصر باغ ہے.. چند درخت ہیں اور کچھ بیلیں ہیں اور اسی مقام پر حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہاتھوں پر بیعت کی گئی تھی..

رسولؐ نے فرمایا کہ دو شخص ہیں جن کا احسان میں زندگی بھر نہیں اتار سکتا.. ایک حضرت خدیجہ الکبریٰ اور دوسرے.. ابوبکر صدیق..

ہم آج کی مسجد نبویؐ کے ایک مختصر صحرا ایسی وسعت والے صحن میں داخل ہوتے ہیں تو گویا چودہ سو برس پیشتر جو مدینہ تھا اس میں داخل ہوتے ہیں.. کیونکہ موجودہ عمارت رسول کے وقتوں میں یثرب کی جو بستی تھی.. اس میں جو چند گلی کوچے.. کچے مکان اور دھول آلود راستے تھے.. جتنے بھی تھے وہ سب کے سب.. اس عمارت نے اپنے اندر سمو لیے ہیں.. یعنی قدیم مدینہ جتنا بھی تھا آج مسجد نبویؐ کی فراخدلی اس مدینے کو اپنی آغوش میں پناہ دے چکی ہے..

چنانچہ ہم اس کے صحن میں داخل ہوتے ہیں تو پہلی بار رسول کے زمانوں کے مدینے میں داخل ہوتے ہیں..

مختصر صحرا ایسے پھیلے صحن کے آخر میں مسجد نبویؐ کے بلند اور سجے ہوئے جو سنہری دروازے نظر آتے ہیں تو ان تک پہنچتے پہنچتے انسان ہانپ جاتا ہے.. وہ اتنی دور ہیں..

اور ہاں اس صحن میں چلتے ہوئے آپ محسوس کر سکتے ہیں کہ چار دیواری کے باہر کاندھے سے کاندھا ملائے درجنوں عالی شان ہوٹلوں کی جو عمارتیں ایک دیوار کی صورت مدینے کے آسمان تک جاتی ہیں وہ آپ کی محویت اور عقیدت میں مخل ہوتی ہیں.. آپ پیچھے مڑ کر ان کی جانب دیکھتے ہیں تو وہ جاسوسی کرتی نظر آتی ہیں اور ایک بلندی سے آپ کو چشم حقارت سے دیکھتی ہیں..

انہیں پہلی بار مسجد نبوی کو گھیرے میں لیے ہوئے.. سنگ و خشت اور شیشے کے حصار میں لیے ہوئے.. جدید فن تعمیر کی جادوگری کی پھونکیں مسجد کے صحن پر بلندی سے پھونکتے ہوئے.. میں نے جب پہلی بار انہیں دیکھا تو ایک ہی سوال ذہن میں ابھرا..

ان کی بالائی منزلیں روضۂ رسولؐ سے کہیں بلندی پر ہیں.. تو کیوں ہیں..

اور ان ہوٹلوں میں رہائش پذیر لوگ جب اپنے بلند پُرآسائش کمروں کی کھڑکیوں میں سے جھانکتے ہوں گے تو مسجد نبویؐ قدموں میں بچھی نظر آتی ہوگی.. روضۂ رسول کا گنبد نشیب میں نظر آتا ہوگا تو کیا یہ برداشت ہو سکتا ہے.. دم نہیں رُک جاتا سبز گنبد کو اپنے نیچے.. قدموں تلے دیکھ کر..

حاضری دینے والے تو فرش سے آنکھیں نہیں اٹھاتے.. عرش کی جانب ایک نگاہ کرنے کی بھی

جسارت نہیں کرتے..ان میں حوصلہ ہی نہیں ہوتا آنکھیں اٹھانے کا.. چہ جائیکہ عرش سے بھی اوپر ایک بلندی پر مکان بنالیں اور وہاں سے نیچے عرش پر نگاہ کریں..

رسولؐ جس خاک میں محوخواب ہیں اور آپ سلام کرتے ہیں تو وہ جواب دیتے ہیں آپ سے کلام کرتے ہیں تو اس خاک کے اوپر ایک سبز گنبد نشاندہی کرتا ہے کہ ہمیں است وہمیں است.. جو انڈونیشیا سے بوسنیا تک اس یار کے قتیل لوگوں کو کسی دوربین یا کسی سیارے کی آنکھ کے بغیر سوتے جاگتے نظر آتا رہتا ہے تو اس گنبد سے اوپر عرش سے بالا آپ کیسے اسے اپنے قدموں میں دیکھ سکتے ہیں یا اس کمرے میں سو سکتے ہیں..

بے شک میرا یہ سوال فقیر ے احساس محرومی کا شاخسانہ بھی ہوسکتا ہے کہ میں ''پاکستان ہاؤس'' ایسی صرف بنیادی سہولتوں کی حامل آماجگاہ میں قیام پذیر تھا اور مسجد نبوی کے گرد احاطہ کیے ہوئے شاندار پانچ سات ستاروں والے ہوٹلوں میں فروکش زائرین سے حسد کرتا تھا..

میں نے یہی سوال اپنے سمدھی جنرل اسرار سے بھی کیا جن کا مدینے میں آنا جانا لگا رہتا ہے اور وہ انہی ہوٹلوں میں سے کسی ایک میں قیام کرتے ہیں.. انہوں نے کچھ جواب نہ دیا بس مسکراتے رہے.. البتہ سلجوق نے بتایا کہ انکل کوشش کرتے ہیں کہ انہیں روضۂ رسولؐ سے بلند کوئی کمرہ نہ ملے.. اور ابا میں یہ جانتا ہوں کہ وہ آج تک جتنی بار بھی مدینہ آئے ہیں.. بستر پر نہیں ہمیشہ فرش پر سوئے ہیں..

بالآخر صحرا صحن عبور کرکے ہم مسجد نبوی کے بلند دروازوں تک پہنچتے ہیں..

یہ اونچے سنہری منقش اور شاندار دروازے ہیں.. نہیں دروازے نہیں کسی جادوئی قلعے کے پھاٹک ہیں کہ اوپر نگاہ کیجیے تو بلند ہوتے ہی چلے جاتے ہیں..

''ابا جی..'' سمیر نے ابھی تک میرے بازو کو اپنی گرفت سے آزاد نہیں کیا تھا کہ کہیں والد صاحب اس بڑے ہجوم میں کھو نہ جائیں.. ایسے گرفت میں لے رکھا تھا جیسے ایک حواس کی گمشدگی والے دیوانے کو قابو میں رکھتے ہیں کہ اس کا کیا پتہ.. کدھر کا کدھر نکل جائے..

''جی بے بی..''

''ابا جی ان دروازوں کو ملاحظہ فرمائیں.. یہ اتنے بھاری وزنی اور ٹھوس ہیں.. چٹانوں کے حجم کے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے جوڑ.. یعنی چولیں جن سے یہ دروازے چوکھٹ میں جڑے ہوئے ہیں.. یہ جوڑ اتنے کومل اور نازک ہیں کہ اگر یہ دروازے بند ہوں تو آپ صرف ایک انگلی ان پر رکھ کر دھکیلیں تو یہ بے آواز نزاکت سے کھل جاتے ہیں.. ملاحظہ فرمایئے..''

سمیر بھی سلجوق کی مانند آرکیٹکچر میں ایک ڈگری رکھتا تھا.. ایسا زرخیز ذہن رکھتا تھا کہ ممتاز ماہر تعمیرات اپنے نقشوں میں رنگ بھروانے کے لیے اس سے رجوع کرتے تھے.. وہ اس شعبے میں بہت نام کما سکتا

تھا. سول سروس میں صرف اس لیے آ گیا کہ اگر بھائی بیوروکریٹ ہو سکتا ہے تو میں کیوں نہیں ہو سکتا. تو مسجد نبویؐ کے شاندار دروازوں کے بارے میں جو کچھ اس نے بیان کیا اس پر یقین کرنا پڑا..

لیکن اس کے بیان کو پرکھنے کی حاجت نہ ہوئی کہ مسجد نبویؐ کے بلند دروازے بند نہ تھے.. چوپٹ کھلے ہمارے منتظر استقبال میں تھے..

ہم اندر داخل ہو گئے..

تنہا تو نہیں.. زائرین کے ایک بہاؤ میں بہتے اندر چلے گئے..

اندر ایک اور جہان تھا. اس جہان سے الگ جو باہر رہ گیا تھا..

ایک اور ہی دنیا تھی.. اس دنیا سے جدا جسے ہم چھوڑ آئے تھے

یہ دنیا میرے اندازے.. میرے قیاس اور ذہنی تصویر سے کہیں بڑھ کر وسیع اور بے انت تھی..

ظاہر ہے میرے اندازے اور قیاس خیالوں اور تاریخوں میں قید تھے..

شام کے صحراؤں میں جیسے اک ہجوم نخیل..

مجھے ایک نہایت مختصر لمحے کے لیے یہ محسوس ہوا کہ میں مسجد قرطبہ میں ہوں.

وہی محرابوں اور ستونوں کا ایک ہجوم نخیل.. وہی طرز تعمیر اور قوس دار محرابیں جو دھاری دار تھیں.. یہ طے ہے کہ مسجد نبویؐ کا آرکیٹیکٹ مسجد قرطبہ سے متاثر تھا اور اس نے وہی انداز اور بناوٹ یعنی محرابوں اور ستونوں کی یہاں منتقل کر دی تھی..

لیکن وہ مختصر لمحہ جس میں مجھے محسوس ہوا کہ میں مسجد قرطبہ میں ہوں محض ایک جھماکا تھا. فلیش تھا..

اس فلیش کی روشنی فوراً بجھ گئی.

یہاں ستون نئے اور شاندار تھے بہت بلند تھے اور ان پر آرام کرتی محرابوں کے نیم دائرے بھی بلندی پر تھے.. اور وہ مسجد قرطبہ کی مانند ڈھیرے سے آپ کے بدن کا ایک حصہ نہیں بنتے تھے بلکہ آپ کو اپنی وسعت میں سمو لیتے تھے..

مسجد قرطبہ ایک قدیم سادگی.. دھیمے ذوق جمال اور خاموشی کا ایک معبد تھی جہاں ایک سرگوشی بھی گراں گزرتی تھی.. نیم تاریکی میں اس کے ستون کبھی دکھائی دے جاتے تھے اور کبھی جہاں تاریکی بڑھتی تھی وہاں گم ہو جاتے تھے.. اور قدامت اور زمانوں کی ایک مہک تھی جس میں تازگی نہ تھی لیکن اس کے باوجود اس میں سانس لیتے ہوئے انسان اسی قدامت کا ایک حصہ بن کر اس جہان سے الگ کسی ایسی بستی میں چلا جاتا تھا.. جہاں وہ لوگ رہتے تھے جنہوں نے اس مسجد کو تعمیر کیا تھا. موزیک کے ٹکڑوں سے تخلیق کردہ وہ منبر بنایا تھا جس کے حسن کا معجزہ بے مثال تھا. جہاں ایک دیا سلائی کے جلانے سے موزیک کے ہزاروں ٹکڑے رنگین پھول جھڑیوں کی طرح چھوٹنے لگتے تھے اور آپ ان کے شرارے اپنے بدن پر گرتے محسوس

کرتے تھے اور وہ ٹھنڈک دیتے تھے۔ صحن نارنجستان کے نارنگیوں کے بوٹے اور کھجور کے درخت بھی انہی لوگوں نے لگائے تھے جن کی بستی میں آپ پہنچ جاتے تھے..

یہ مماثلت نہایت عارضی تھی.. مسجد قرطبہ کی قدیم تصویر کا جو شعلہ مجھ کا تھا وہ فوری طور پر بجھ کر راکھ ہو گیا کہ یہاں صورت حال مختلف تھی..

وہ دنیا کی ویران ترین مسجد تھی اور یہ دنیا کی آبادترین..

یہ اُس مسجد کی ماں تھی جو وادی الکبیر کے کنارے ماضی کے ویران صحرا میں گم تھی..

وہاں ایک سرگوشی بھی گراں گزرتی تھی اور یہاں اس کی بے انت وسعت میں بے انت سرگوشیاں گونجتی تھیں اور ایسی بھلی لگتی تھیں.. اپنی کم مائیگی کا احساس شدید ہو جاتا تھا اور جی چاہتا تھا کہ میری ایک سرگوشی بھی ان میں شامل ہو جائے.. یہ جو قرآن پڑھتے ہوئے مسجد میں جاتے ہوئے.. دعائیں کرتے ہزاروں لوگ ہیں ان کی مدھم آوازوں کی شگفتی میں میری بے سری بانسری کی لے بھی شامل ہو جائے.. کہیں دیر نہ ہو جائے..

وہاں اگر ایک خاموش نیم اندھیرا تھا تو یہاں جگمگاہٹ اور روشنی کی چکاچوند ایسی تھی کہ فرش پر بچھے قالینوں کا ایک ایک پتہ اور بوٹا نمایاں ہوتا تھا..

چھت سے سینکڑوں فانوس روشن حالت میں معلق تھے..

جہاں کہیں قالین نہ تھے وہاں سنگ مرمر کی سفیدی رونما ہوتی تھی..

پوری مسجد کا اندرون ہزاروں روشنیوں سے منور مکمل طور پر ظاہر ہو رہا تھا..

جہاں تک نظر کام کرتی تھی مسجد قرطبہ کی شکلوں والے قوس دار.. دھاری دار ستون زرافوں کی مانند گردنیں اٹھائے کھڑے تھے..

فرش سے عرش تک عبادت گزاروں کے لبوں کے ہلنے کی سرسراہٹ کی ہلکی گونج تھی..

مسجد قرطبہ کا منبر دو چار قدم چلنے سے سامنے آ جاتا ہے..

مسجد نبوی کا منبر اس صحرائی وسعت کے آخر میں جانے کہاں تھا..

اس کی وسعت اور پھیلاؤ میں کوئی ایک بے دھیان شخص آسانی سے گم ہو سکتا تھا..

اور مجھ ایسا بے دھیان شخص کوئی اور کیا ہو سکتا ہے.. اس لیے میں اپنے بیٹوں کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا تھا انہیں نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیتا تھا..

راستہ تھا تو نہیں.. لیکن ہم قدرے بدتمیز ہوتے اپنے آپ میں گم عبادت میں محو لوگوں میں راستہ بناتے.. جہاں انہوں نے سجدے میں جانا ہوتا تھا وہاں پاؤں رکھتے.. ان کے سروں پر ہاتھ رکھ کر ''سوری'' کہتے.. قرآن پر جھکے نوافل ادا کرتے لوگوں کی عبادت میں واضح طور پر مخل ہوتے آگے بڑھتے جاتے تھے..

مسجد قرطبہ کے ستون اگرچہ دل کش تھے پرانے رومی معبدوں کے کھنڈروں میں سے لا کر وہاں نصب کیے گئے تھے مگر سادہ تھے.. یہاں جو ستون تھے وہ صرف اسی معبد کے لیے تراشے گئے تھے.. سونے کے پانی سے مزین دمکتے تھے اور ان کی آب و تاب سے آنکھیں چندھیاتی تھیں..

وہاں طرز تعمیر میں آواز کی گونج کا ایک ایسا تعمیراتی نظام تھا کہ اذان کا یا خطبے کا ایک ایک حرف مسجد کے آخری کونوں میں بیٹھے ہوئے نمازیوں کو صاف سنائی دیتا تھا.. یہاں جدید ترین ساؤنڈ سسٹم کے کمالات نصب تھے.. ایئر کنڈیشننگ کا نظام عمارت کے طول و عرض کو ایک ہی خوشگوار موسم میں رکھتا تھا. آسائش بے پناہ تھی.. اگر یہ سب کچھ نہ ہوتا تو لوگوں کا دم رک کر رہ جاتا.. اتنا اژدھام تھا..

چونکہ بیان وہی کرنا ہے جو محسوس کرنا ہے. متاثر کرنے کے لیے عقیدت کی آمیزش نہیں کرنی.. اس لیے ایک اور اقرار کرتا ہوں کہ مسجد نبویؐ کی اس وسعت میں چلتے.. اس نے میرے بدن پر سوائے شاندار اور عالی شان ہونے کے اور کچھ اثر نہ کیا..

اس میں میرا قصور بہت تھا..

میرا دھیان بٹا ہوا تھا..

جیسے محبوب کے انتظار میں فٹ پاتھ پر کھڑا ایک شخص یہ جانتا ہی نہیں کہ اس کے آس پاس کتنی ٹریفک گزر رہی ہے.. کیسے کیسے لوگ گزرتے جاتے ہیں نیون سائن جو بجھتے بجھتے ہیں ان پر کیا عبارتیں درج ہیں.. یہاں تک کہ وہ موسم کی شدت یا خوشگواری سے بھی بے حس رہتا ہے کہ برف گرتی ہے یا گرمی کی آگ جلاتی ہے.. اس کا دھیان بٹا ہوا ہے.. وہ ایک ہی چہرے کو دیکھنے کا متمنی ہے اور اسی کا منتظر ہے..

تو میں بھی اُس ایک چہرے کو دیکھنے کے اضطراب میں مبتلا تھا.. مجھ پر آس پاس کی یہ شانداری.. چمک دمک اور آسائشوں میں کچھ کشش نہ تھی.. بلکہ یہ ایک رکاوٹ تھی..

تو اس میں میرا بھی قصور بہت تھا.

کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹتا ہی نہ تھا.. کہ مجھ میں ناامیدی نہ تھی..

تھوڑی دور اور چلے ہیں.. بلکہ عبادت گزاروں کے سروں پر ہاتھ رکھتے "سوری یا حاجی" اور "یا حاجی طریق" پکارتے راستہ بناتے چلے ہیں تو دائیں جانب پر ایک ایسا مقام نظر آیا جس پر چھت نہ تھی.. ایک صحن تھا اور اس پر مدینے کا آسمان تھا.. اور میرے دیکھتے دیکھتے اس پر معلق سفید رنگ کی جہازی چھتریاں جو کئی ہوئی تھیں نہایت آہستگی سے کھلتی گئیں اور مدینے کے آسمان کو روپوش کر کے فرش پر بیٹھے عبادت گزاروں پر سایہ کر دیا.. اور عبادت گزار منہ کھولے اس جدید معجزے سے متاثر ہوتے ان چھتریوں کو تکتے تھے.. خودکار انجینئرنگ کا سفید رنگ لیے یہ بڑی بڑی چھتریاں آہستگی سے عمارت کو ڈھکتیں یقیناً ایک متاثر کن منظر تھیں.. یہ ایک جدید سائنسی شعبدہ تھا جس کی میں تحسین نہ کر سکا.. یورپ کی انتظار گاہوں میں بسوں کا انتظار کرتے لوگوں

کو بارش سے محفوظ رکھنے کے لیے اسی قسم کے انتظامات ہوتے ہیں..

نہ صرف یہ کہ میں ان کی تحسین نہ کر سکا بلکہ میں نے انہیں ناپسند کیا..

کیوں؟

میں جو آس پاس سے بیگانہ منتظر تھا تو مجھے فٹ پاتھ پر اپنی جانب آتے ہوئے اس محبوب کی ایک جھلک نظر آئی تھی..اور اسی لمحے میرے اور اس کے درمیان ایک سفید دیوار حائل ہو گئی تھی..

ایک لمحے میں نے دیکھا کہ صحن کے اوپر مدینے کا کھلا آسمان ہے..اسی لمحے میرے دیکھتے دیکھتے سفید رنگ کی چھتریاں نہایت آہستگی سے کھلنے لگیں..اور اسی لمحے کے ایک پلک جھپکنے جتنے زمانے میں مدینے کے کھلے آسمان میں مجھے وہ سبز گنبد نظر آ گیا..

ابھی نظر اس تک پہنچی بھی نہ تھی کہ سفید چھتری نے اسے اوجھل کر دیا..

اس کی سبز رنگت اگرچہ دو چار بار آنکھیں جھپکنے کے دوران ہی روپوش ہو گئی تھی..لیکن میری نظر تو ان چھتریوں کے کھلتے کھلتے ان کے پار جا چکی تھی..وہ سبز گنبد تک پہنچ گئی تھی اور اپنی پلکوں سے اس پر دستک دے رہی تھی..

چنانچہ میں یہاں تھا..چھتریوں سے ڈھکے ہوئے صحن کے دائیں جانب..

اور نظر وہاں تھی در یار پر پلکیں جھپکاتی..

اور وہ نظر مجھے خبر کرتی تھی..آنکھوں دیکھا حال بیان کرتی تھی..کہ میں تو ان کبوتروں کے ہمراہ پرواز کرتی ہوں جو تمہارے بابا کے ڈیرے کے گرد چکر کاٹتے ہیں..اور کبھی ان کی پیروی کرتی سبز گنبد کے قریب ہو بیٹھتی ہوں..تم کیا جانو کہ اس کا رنگ کیسا سبز ہے..جیسے ایک برگد کا ہوتا ہے..ایسے برگد کا ہوتا ہے جس کے نیچے مہاتما بدھ ایسے کئی عبادت گزاروں نے دھونی رمائی..ایسا برگد جو جتنا قدیم ہوتا ہے اتنا ہی ہرا ہوتا جاتا ہے..اپنی داڑھیاں بڑھاتا..آس پاس کی زمین میں اپنی شاخیں پیوست کرتا پھیلتا جاتا ہے..یہاں تک کہ وہ کل کائنات میں اپنی جڑیں پھیلا دیتا ہے تو اس کے اندرون میں..اس کے تنے کے قریب جتنے پتے سورج کی روشنی سے دور ہوتے ہیں وہ ایسے ہی سبز ہوتے ہیں جیسے کہ اس گنبد کا رنگ..تم کیا جانو..

میں چونک کر تھم گیا تھا..

رک گیا تھا..

یار کی ایک جھلک نے مجھے پتھر کر دیا تھا..

تو سلجوق نے پیچھے مڑ کر مجھے اس ساکت حالت میں دیکھا تو بے صبری سے اشارہ کیا کہ ابا رک کیوں گئے ہو..وہاں بت بنے کیوں کھڑے ہو..آؤ..

میرا سانس پھولنے لگا تھا..اس ہریاول کی ایک جھلک دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوہ نوردی کی

کسی شام میں تھکاوٹ مجھ میں بسیرا کرتی ہے.. اب ایک اور قدم اٹھانا بھی دشوار ہے.. پنڈلیوں کی رگیں طویل کوہستانی مسافت سے اکڑ گئی ہیں.. میں شاید مزید چل سکتا تھا لیکن میں نے ہریاول کی ایک سحر طراز وادی دیکھ لی تھی اور میں یہ شب اسی میں گزارنا چاہتا تھا.. چل نہ سکتا تھا..

لاچارگی میں.. میں نے سلجوق کو پکارا..

وہ میری آواز سن کر ایک بلیک بک ہرن کی مانند نمازیوں عبادت گزاروں کو پھلانگتا میرے پاس آ گیا..

''یار ہمیں کچھ دکھائی دے جائے گا؟''

''کیا ابا؟''

''جو ہم دیکھنے آئے ہیں..''

''دیکھتے ہیں..'' یہ اس کا تکیہ کلام تھا..

''ہم وہاں پہنچ جائیں گے؟''

''دیکھتے ہیں..''

میں اگرچہ پہلے ہی بے اثر تھا لیکن ہر بار دل سے نُور کھجور اس برگد کی ایک جھلک دیکھنے کے بعد دیکھنے سے بھی عاری ہو گیا کہ نظر وہیں رہ گئی تھی..

نظر اس راہ نجھن کے ڈیرے کے نواح میں پرواز کرتی تھی جہاں اس نے پہلا قیام کیا تھا..

''یہ فیصلہ کرنا میرے اللہ کے بس میں ہے کہ مجھے کہاں ٹھہرنا ہے.. اور میری اونٹنی اللہ کے حکم کی پابند ہے.. آپ اس کا راستہ چھوڑ دیں..''

اونٹنی کا راستہ چھوڑ دو یہ اللہ کی جانب سے مامور ہے..

قصویٰ چلتی جا رہی تھی..

یارِ غار سے خریدی ہوئی قصویٰ بے پروا چلتی جا رہی تھی.. گلی میں سے چھن چھن کرتی گزرتی جا رہی تھی..

یثرب کا ہر فرد فریاد کرتا تھا کہ مہار موڑ لو.. میرے مہمان ہو جاؤ لیکن ڈاچی پابند تھی اسے وہیں رکنا تھا جہاں اسے رک جانے کا اذن ملنا تھا..

''وداع کی پہاڑیوں کے پیچھے سے..

ہمارے لیے چودھویں کا چاند نکل آیا ہے..

''اونٹنی کو جانے دو.. یہ اللہ کی طرف سے مامور ہے..''
''ہم بنی نجار کی بیٹیاں ہیں..
محمدؐ کیسا ہی اچھا ہمسایہ ہے..''

آپ نے بچوں سے پوچھا ''کیا تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟''
بچوں نے جواب دیا ''ہاں رسول اللہؐ..''
آپؐ نے فرمایا ''خدا کی قسم میں بھی تم لوگوں (انصار) سے محبت رکھتا ہوں..''

بنو مالک بن نجار کا محلہ قریب آیا تو قصویٰ اس جانب مڑ گئی.. ایک کھلے احاطے میں جہاں کچھ گڑھے تھے.. پرانی قبریں تھیں.. کھجور کے دو چار شجر تھے.. قصویٰ وہاں پہنچ کر بیٹھ گئی..
آپؐ نے اونٹنی کی مہار کھلی چھوڑ دی..
پھر جانے اس کے جی میں کیا آئی وہ پھر اٹھی اور احاطے کا ایک چکر لگا کر واپس اسی مقام پر پہنچ کر پھر بیٹھ گئی.. چھاتی زمین سے لگا کر گردن ڈال دی..
حضورؐ قصویٰ سے اترآئے.. ''اللہ نے چاہا تو یہی میری جائے قیام ہے..''
حضرت ایوب انصاریؓ نے عرض کیا ''اجازت ہو تو سامان اتار لوں؟''
وہ اونٹنی کا کجاوا اور مختصر سامان اٹھا کر اپنے گھر لے گئے جو دیگر گھروں سے اس احاطے کے قریب تر تھا..
حضورؐ نے کہا ''انسان اپنے کجاوے کے ساتھ ہوتا ہے..''
اور وہاں گئے جہاں ان کا کجاوا تھا.. ایوب کے گھر!

ہم بھی اسی گھر کی قربت کے تمنائی تھے اور چلتے جاتے تھے..
نمازیوں میں سے گزرتے.. اٹکتے.. ٹھوکریں کھاتے آگے بڑھتے گئے..
صرف ہم نہ تھے جو یہ بدتمیزی کر رہے تھے.. اور بھی بہت سے لوگ تھے..
اور سب ریاض الجنۃ کی جانب بڑھ رہے تھے جہاں ایک سفید قالین بقیہ مسجد کے سرخ اور نارنجی قالینوں میں سے جدا اور ممتاز نظر آتا ہے.. اور نشاندہی کرتا ہے کہ مسجد نبویؐ نے جب جنم لیا تو بس یہ جگہ ہے.. اتنی ہی جگہ ہے جسے اس نے اپنے احاطے میں لیا..
اس سفید قالین کی جھلک بھی کبھی کبھار ہی دکھائی دیتی ہے کہ وہاں نوافل ادا کرنے کی بے چینی میں

لوگ کبھی تو اتنے منظم ہو جاتے ہیں کہ نفل ادا کرنے کا اپنا حق کسی بوڑھے کو دے دیتے اور کبھی اتنے ہراساں ہو جاتے کہ جانے یہاں جگہ نصیب ہوتی ہے یا نہیں اور دھکم پیل شروع ہو جاتی.. وہاں جگہ ملنا محال تھا. صرف کھڑے ہونے کے لیے کچھ گنجائش درکار ہوتی تھی سجدہ کہاں کرنا ہے اس کی پروا نہیں کی جاتی تھی.. اور سجدہ اکثر کسی کی پشت پر یا پھر پاؤں کے درمیان میں..

روایت یہ بھی ہے کہ ریاض الجنہ کا صرف یہ ٹکڑا ہو گا جو قیامت کے کام نہیں آئے گا' سلامت رہے گا کل دنیاؤں کے معدوم ہو جانے کے بعد بھی اسے اسی حالت میں اٹھا لیا جائے گا اور یہ جنت کا ایک حصہ بنا دیا جائے گا.. یہ روایت نہ بھی ہو تو بھی زمین کے اس ٹکڑے کے ایک ذرّے کو بھی روزِ قیامت زوال نہ آ سکے گا. کیسے آ سکتا ہے جہاں حضورؐ امامت فرماتے رہے ہوں' اور جہاں کیسے کیسے ان کے ساتھیوں اور پیاروں نے سجدے کیے ہوں.. کوئی ایک شخص جو ریاض الجنہ میں ہاتھ باندھے کھڑا ہو وہ کیسے اس حقیقت سے غافل ہو سکتا ہے کہ اس مقام پر جو قالین ہے اس کے تلے سنگ مرمر کا جو فرش ہے اس کے نیچے وہ مٹی ہے جس پر حضرت ابوبکرؓ، حضرت عثمانؓ.. حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کی جبینوں کے نشان روشن سے ہیں.. وہ تو اس خیال سے سنانے میں آ جاتا ہے کہ شاید جہاں میں ہوں وہاں علیؓ تھے.. ابوبکرؓ تھے..

ریاض الجنہ کے سفید قالین کے ماتھے پر منبر رسول کا جھومر لشکارے مارتا ہے.. یہ وہ منبر تو نہیں تھا جس پر ہاتھ رکھ کر اور کبھی تشریف رکھ کر حضورؐ خطبہ عطا کرتے تھے، البتہ مقام وہی تھا.. وہ منبر تو نہایت سادہ عام سی لکڑی کا تراشا ہوا تھا اور موجودہ منبر اسی کا ایک تسلسل تھا.. یہاں بھی منبر رسولؐ کے سامنے بس اتنی سی جگہ تھی کہ بمشکل دو یا تین لوگ نفل ادا کر سکتے تھے اور بقیہ انہیں حسرت سے دیکھتے تھے کہ شاید کبھی ہم بھی اس مقام پر کھڑے ہوں جہاں یہ کھڑے ہیں اور جب سجدے میں جائیں گے تو ان کے ماتھے اس مقام کو چھوئیں گے جہاں رسولؐ کھڑے ہوا کرتے تھے..

حضورؐ کی زندگی میں صرف ابوبکرؓ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ وہ اس مقام پر رسولؐ کی جگہ امامت کے لیے کھڑے ہوئے..

لیکن یہ سب مقام ہمارے پاؤں کی زنجیریں نہ بن سکے.. کہ یہ محض کڑیاں تھیں اور ہم سورج کو سلام کرنے کے تمنائی تھے.. جس کے باعث زمین کا یہ ٹکڑا کل کائناتوں میں افضل ہوا اور جو اس منبر پر بیٹھا کرتا تھا ہم تو اس کے اسیر تھے.. اور اس کے اسیروں کے پاؤں میں زنجیریں پڑ بھی جائیں تو موم ہو جاتی ہیں..

"مستنصر تم نے آج کچھ کھایا پیا ہے یا بھوکے بیٹھے ہو... آؤ میرے حُجرے میں دودھ کا ایک پیالہ اور چند کھجوریں تمہارے لیے ہیں"

البتہ ایک زنجیر ایسی تھی جس کی موجودگی سے میں بے خبر رہا..

اگر خبر ہو جاتی تو شاید یہ زنجیر اتنی آسانی سے موم نہ ہوتی

میرے بائیں ہاتھ پر ایک حجرا تھا..

میں بے خبر رہا کہ میرے بائیں ہاتھ مسجد نبوی میں ابھرا ہوا جو چوکور سا چبوترا ہے اور جس پر درجنوں لوگ بیٹھے ہیں اور اترنے کا نام نہیں لیتے.. جانے کب سے بیٹھے ہیں.. یہ اصحاب صفہ کا چبوترہ ہے..

اگر میں آگاہ ہو جاتا کہ وہ چبوترہ اب بھی موجود ہے تو روضہ رسولؐ کی جانب بڑھتے ہوئے میرے قدم ایک لمحے کے لیے ٹھٹک ضرور جاتے.. وہ قدم جو ریاض الجنۃ اور منبر کے لیے نہیں رکے تھے رک جاتے کہ تمنا کا پہلا قدم تو ہر زائر کے لیے خانہ کعبہ اور روضہ رسولؐ ہوتا ہے لیکن تمنا کا دوسرا قدم کہاں دھرنا ہے یہ ہر زائر کی اپنی ہوس اپنی ترجیح ہوتی ہے.. میرے لیے اس دوسرے قدم کے لیے دشت امکاں میں بس دو نخلستان تھے جہاں تک میں پہنچنا چاہتا تھا..

ترجیح اول.. غار حرا.. اور اس کے بعد اصحاب صفہ کا چبوترا..

"کھلے صحن میں مشرق کی جانب ایک چبوترہ بنا کر اس پر چھپر ڈال دیا گیا.. جن مہاجرین کا کوئی روزگار کوئی ٹھکانہ نہ تھا وہ یہاں پڑے رہتے تھے.. عربی زبان میں چبوترے کو صفہ کہتے ہیں.."

البتہ مارٹن لنگز کی روایت قدرے مختلف ہے.. وہ کہتے ہیں کہ مسجد نبویؐ کے ستونوں کی ایک قطار

ایسے لوگوں کے لیے مختص کر دی گئی جو بے گھر اور بے کار تھے۔ انہیں "بنچ پر بیٹھنے والے" اہل صفہ کہا گیا۔ کیونکہ وہاں ایک پتھر کی بنی ہوئی نشست رکھ دی گئی۔ یا ایک بنچ جس پر وہ بیٹھتے تھے۔ رسولؐ اور ان کا گھرانہ ان بے آسرا لوگوں کے لیے ذمہ دار محسوس کرتا تھا اور ان کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔

یہ لوگ اکثر بھوکے رہتے۔

لاچار، غریب۔ بے کار۔ دنیا بھر کے دھتکارے ہوئے وہ لوگ جن پر رسولؐ نے اپنا سایہ کیا۔ اس چبوترے پر کھڑے ہو کر خود انہیں درس دیتے۔ اور آپ سیکھنے والوں کی ذہنی صلاحیت اور مزاج کو سامنے رکھ کر درس دیتے اور دوسرے معلموں کو کہتے "تم لوگوں سے ان کی عقل (ذہنیت) کے مطابق گفتگو کیا کرو۔"

یہ وہ اہل صفہ تھے جن کے متعلق اعرابی کہتے تھے کہ یہ مجنون ہیں۔ رسولؐ نماز پڑھاتے تو ان میں سے کئی ایک کمزوری، تنگی اور بھوک کی وجہ سے قیام میں کھڑے نہیں ہو سکتے تھے اور گر پڑتے تھے۔ ایک ہی کپڑے میں لپٹے ہوتے تھے۔ حضرت واثلہ کہتے ہیں ہم اہل صفہ میں سے کسی کے پاس پورا لباس نہیں ہوتا تھا۔ پسینے کی وجہ سے ہمارے لباس میل اور مٹی سے اٹے ہوتے تھے۔ کیونکہ صفہ کی دیواریں نہیں تھیں گرمی میں رہنے سے پسینہ آتا تھا اور ہوا سے گرد و غبار اڑ کر آتا تھا۔

یہ نہیں کہ اصحاب صفہ بیکار اور بد دلی کی آس میں بیٹھے رہتے تھے۔ وہ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے تھے اور بازار میں فروخت کرتے تھے۔ رسول اللہؐ کے گھریلو کاموں میں ہاتھ بٹاتے تھے اور تعلیم حاصل کرتے تھے۔ حضورؐ سے اور ان کے مقرر کردہ اساتذہ سے۔ یہاں تک کہ یہ چبوترہ ایک درس گاہ کی حیثیت اختیار کر گیا۔

اہل صفہ کے نام تاریخ میں محفوظ ہیں اور وہ سینکڑوں کی تعداد میں ہیں۔

ان میں حضرت عمرؓ کے فرزند عبداللہ بن عمرؓ بھی تھے۔ حضرت بلالؓ، ابوذر غفاریؓ، ابو ایوب انصاریؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، عمار بن یاسرؓ، ابو عبیدہؓ بن الجراح۔ ایسے لوگ تھے اور ان میں سے کوئی ایک بھی ہے جو کسی طور خلفائے راشدین سے کم رہنے والا ہے۔

تاریخ نے بھی شان و شوکت اور اہل اقتدار کو ہی ترجیح دی لیکن میں تو تاریخ نہیں ہوں میرے محبوب تو یہی دھتکارے ہوئے لوگ رہے۔ انہی لوگوں نے مجھے اسلام کے قریب کیا اور میں نے بلالؓ اور ابوذرؓ کو ہی اپنا مرشد مانا۔

اور ان میں ایک ابوہریرہؓ بھی تھے۔

میرے بہت ہی پسندیدہ۔

اُن دنوں تو جانوروں سے پیار کرنے والا اور ان کی حیات کی رکھوالی کرنے والا کوئی ادارہ نہ تھا۔ کوئی تصور نہ تھا۔ تو وہ اپنی بلیوں کی محبت میں اتنے مست تھے کہ ان کا خاندانی نام لوگوں نے فراموش کر دیا اور انہیں بلیوں کے باپ کا لقب حضورؐ نے عنایت کیا۔

وہ اسی چبوترے پر..

جس کے قریب سے میں اس کے وجود سے بے خبر گزرتا جاتا تھا اسی چبوترے پر بیٹھے رہتے تھے تو ان کی لاڈلی بلیاں میاؤں میاؤں کرتی ان کے گرد مستی سے ٹہلتی رہتی تھیں. یعنی نبیؐ کی مسجد کے صحن میں..اور ظاہر ہے حضورؐ کچھ اعتراض نہ کرتے ہوں گے بلکہ خوش ہوتے ہوں گے..ان کی پشت سہلاتے ہوں گے..

ہم نے تو نہیں..کہ ہم تو پڑھے لکھے نہیں..اُمی ہیں..جو پڑھے لکھے علماء اور فضلاء ہیں انہوں نے اسلام کو دہشت..خوف..سزا..جہنم اور کوڑوں کا مذہب ثابت کیا ہے اور وہ بلیوں کو بھول جاتے ہیں..

.اس کتیا کو بھول جاتے ہیں جس نے پلّے جنے تو حضورؐ نے وہ راستہ بدل لیا:.

دیر سے اپنے دربار میں پہنچے کہ ان کے گزرنے سے کتیا اپنے بچوں کے لیے خائف ہوتی تھی..

ایک صحابی اپنی چادر میں پرندوں کے بچے چھپا کر لاتے ہیں تو حضورؐ خفا ہو جاتے ہیں انہیں واپس ان کے گھونسلے میں چھوڑ کر آؤ:.

اور حج کے دوران عرفات کی جانب بڑھتے ہوئے بے چین لوگوں سے کہتے ہیں انہیں سرزنش کرتے ہیں کہ لوگو اپنی اونٹنیوں کو چابک مار کر تیز چلنے پر مجبور نہ کرو..جانوروں پر رحم کرو..اللہ کے حضورؐ میں حاضر ہونے کے لیے بھی ایک جانور کو اذیت نہ دو..

تو نہ صرف یہ پڑھے لکھے..دین کے رکھوالے لوگ بلیوں کو بھول جاتے ہیں بلکہ ایک کتیا..پرندوں کے بچوں اور اونٹنیوں کو بھی فراموش کر دیتے ہیں..

بلیوں کے باپ..ابو ہریرہؓ کہتے ہیں"میں کئی روز سے بھوکا تھا..مدینہ کی ایک گلی میں سر جھکائے بیٹھا تھا کہ شاید کوئی میری حالت جان لے اور کچھ خیرات کر دے..تو پہلے حضرت عمرؓ گزرے اور مجھ سے سلام دعا کر کے میرا حال دریافت کر کے چلے گئے..پھر حضرت عثمانؓ کا گزر ہوا تو انہوں نے بھی شفقت کا اظہار کیا اور چلے گئے..اور میں چپ بیٹھا رہا، ہاتھ پھیلانے سے گریز کرتا رہا، پھر رسولؐ آئے اور مجھے دیکھ کر میری حالت جان گئے اور مسکرا کر کہنے لگے"آؤ ابو ہریرہ..میرے حجرے میں تمہارے لیے کچھ کھجوریں اور دودھ کا ایک پیالہ ہے.."اور مجھے ساتھ لے گئے..

عہدِ رسالتؐ میں سانس لینے والے خوش بختوں میں جو میرے قریب آتے جاتے ہیں جن کی رفاقت میں میں اپنائیت محسوس کرتا ہوں ان کی محبت میں بے اختیار گرفتار ہوتا ہوں..یہ وہ نہ تھے جو صاحبِ اقتدار ہوئے..ان سے مجھے بہت کم انسیت ہوئی..ان کے دبدبے اور جلال سے میں متاثر تو ہوا لیکن ان کے قریب نہ آ سکا..

میرے دل میں اتر جانے والے اور تھے..

یہی..ابو ہریرہؓ..بلالؓ..ابوذرؓ..الجراح جیسے اُس عہد کے معمولی لوگ..کسی نے رسولؐ کے وصال

کے بعد ابو ہریرہؓ سے دریافت کیا کہ اے بلیوں کے باپ تم تو پڑھے لکھے بھی نہیں تھے.. خیرات اور صدقات پہ گزر اوقات کرتے تھے.. تو پھر یہ کیا ہے کہ بیشتر احادیث کے راوی تم ہو.. خلفائے راشدین میں سے کوئی ایک نہیں..

تو ابو ہریرہؓ نے فرمایا.. چونکہ میں ان کے فرمائے ہوئے کا حوالہ دیتا ہوں اس لیے اس میں کوئی خدشہ نہیں تو انہوں نے کہا ''وہ تو مدینے میں آ کر اپنے اپنے کاروبار میں مصروف ہو گئے.. دنیا کے دھندوں میں الجھ گئے.. لیکن یہ صرف میں تھا جو چوبیس گھنٹے اس چبوترے پر بیٹھا رہتا تھا.. بیکار تھا.. مجھے اور کوئی کام نہ تھا.. سوائے اس کے کہ کب فجر کے لیے رسولؐ اپنے حجرے کا ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر مسجد میں داخل ہوتے ہیں.. اور کب وہ باتیں کرتے.. درس دیتے.. سوالوں کے جواب دیتے.. واپس اپنے حجرے میں جاتے ہیں.. تو صرف میں ہی شاہد تھا ان کے شب و روز کا.. اور کوئی نہ تھا.. تو میں ہی راوی ہو سکتا ہوں۔''

اصحاب صفہ میں حضرت ایوب انصاریؓ بھی شامل تھے..

اگرچہ مدینے میں گھر رکھتے تھے.. ایسا گھر جس میں رسولؐ نے قیام کیا.. لیکن ان کی حیثیت بھی ایسی نہ تھی کہ ایک چادر خرید سکتے.. دو وقت کی روٹی کے لیے پلے میں کچھ ہوتا.. تو وہ بھی اس تھڑے پر بیٹھنے والوں میں سے تھے..

حضرت ایوب انصاریؓ جو عالم پیری میں اُس مہم کے ہمراہ زرہ بکتر پہن کر اور اپنی کمان اور تیر کاندھے پر سجا کر.. اس مہم میں شامل ہو جاتے ہیں جو رومی دارالسلطنت قسطنطنیہ کو زیر کرنے کے لیے مدینے سے نکلتی ہے اور اس مہم کا سالار یزید بن معاویہ ہے..

قسطنطنیہ کے محاصرے کے دوران ایک وبا کا شکار ہو کر فوت ہو جاتے ہیں تو رومیوں سے درخواست کی جاتی ہے کہ یہ ہمارے بزرگ تھے ہمارے رسولؐ کے میزبان تھے اور ان کی خواہش تھی کہ اگر میں مر جاؤں.. شہید ہو جاؤں تو مجھے اس شہر کی فصیل کے سائے میں دفن کرنا.. اگر آپ اجازت دیں تو ہم اپنے بزرگ کو اس کی وصیت کے مطابق دفن کر دیں..

رومیوں نے فراخ دلی کا مظاہرہ کیا.. نہ صرف فصیل کے دامن میں انہیں دفن کرنے کی اجازت دے دی بلکہ ان کے سالار ایوب انصاریؓ کے جنازے میں شامل ہوئے..

پھر زمانے گزرے اور وقت نے ان کی قبر کے نشان مٹا دیے..

سینکڑوں برس بعد جب عثمانی ترک سلطان محمد فاتح نے بالآخر قسطنطنیہ کو استنبول یا اسلامبول میں بدلا اسے زیر کیا تو روایت کے مطابق ایک خواب میں حضرت ایوب انصاریؓ نے اپنے گم شدہ مرقد کی نشاندہی کی..

ترکوں کے لیے.. حضرت ایوب انصاری.. حضورؐ کی ایک شکل تھے..

آج بھی.. پورے ترکی میں.. کوئی اور مقام اتنا مقدس اور محبت کرنے والا نہیں جتنا کہ حضرت ایوب

انصاریؓ کا سادہ اور پرسکون مقبرہ..

آج بھی وہ ترکوں کے "ایوب" ہیں..

ان کے مزار پر ایک میلے کا سماں ہوتا ہے..نہ کوئی ان سے مرادیں مانگتا ہے..نہ ان کی جالی سے لگ کر کوئی گریہ کرتا ہے..اور ماتھا ٹیکنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا.."ایوب" ایک ایسے دوست ہیں کہ آپ نے اپنے بچے کا ختنہ کیا تو اسے گود میں لے کر ان کے پاس حاضری دیتے ہیں..شادی شدہ جوڑے زرق برق لباس میں قہقہے لگاتے "ایوب" کو سلام کرنے آتے ہیں..

نیا سلطان..حضورؐ کا لبادہ مبارک اوڑھ کر "ایوب" کے مزار پر آ کر اپنی سلطانی کو سنبھالتا تھا۔

ایوب انصاریؓ..ایک گھر ہے پردیسی کا آسرا اور بھوکے کے بیٹھنے والے۔

ابو ہریرہؓ..ایوب انصاریؓ اور اپنے بلالؓ بھی..اصحابِ صفہ میں سے تھے..ان کا مالک ان کے فراخ سیاہ سینے پر پتھر رکھ کر انہیں زدوکوب کرتا تھا..تپتی دھوپ میں..کہ باز آ جاؤ..اس جادوگر کی سحر طرازیوں میں سے نکل آؤ..اور نہ وہ باز آتے تھے اور نہ اُس سحر سے توبہ کرتے تھے..اَحد اَحد پکارتے تھے۔

پھر یارِ غار انہیں خرید تے ہیں اور آزاد کر دیتے ہیں۔

فتح مکہ کے بعد یہی بلالؓ حضورؐ کی خواہش کے احترام میں خانہ کعبہ کی چھت پر کھڑے ہو کر اللہ کی عظمت کا اعلان کرتے ہیں..حق آ گیا ہے اور کفر چلا گیا ہے..اور جب حضورؐ بتانِ قریش کو پاش پاش کرنے کے خاطر خانہ کعبہ کے اندر داخل ہوتے ہیں تو بلالؓ کو ہمراہ لے کر جاتے ہیں۔

اور جب حضرت عمر..حضرت خالد بن ولید کو محاصرۂ دمشق کے دوران..خلافت سنبھالنے پر پہلا فرمان اُن کی معزولی کا جاری کرتے ہیں تو خالد تک بھی معزولی کا یہ پروانہ لے جانے کے لیے بلالؓ سے ہی درخواست کرتے ہیں یہ جانتے ہوئے کہ صرف بلالؓ ہیں جن کے سامنے خالد بن ولید بھی سر جھکا دیں گے۔

دمشق کی فصیلوں تلے خلیفۂ وقت کے حکم کے مطابق بلالؓ نے خالد کی پگڑی اُتار کر اُن کی مشکیں اُس سے کسیں اور پوری اسلامی فوج کے سامنے معزولی کا فرمان پڑھ کر سنایا..خالد جو بڑی آسانی سے دمشق کا محاصرہ ترک کر کے مدینے کا رُخ کر سکتے تھے اور خلافت پر قابض ہو سکتے تھے صرف بلالؓ کے احترام میں سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں..

اور جب بلالؓ یہ فرمان پڑھ چکے تو فرمایا "میں نے اب تک جو کیا وہ امیر المومنین کے حکم کے تابع کیا کہ اُن کی اطاعت ہر مسلمان پر فرض ہے اور اب جو کچھ میں کروں گا وہ میرے دل کی آرزو ہے"..انہوں نے خالد بن ولید کی مشکیں کھولیں اور وہی پگڑی اپنے ہاتھوں سے اُن کے سر پر باندھی اور اُن کے لیے دُعا کی..

روایت ہے کہ رسولؐ کے وصال کے بعد بلالؓ نے کبھی اذان نہ دی کہ وہ برداشت نہیں کر سکتے تھے

کہ وہ اذان دے رہے ہوں اور رسولؐ سن نہ رہے ہوں۔ یہاں تک کہ اُس یار کے بغیر مدینے میں رہنا بھی گوارہ نہ کیا..

حضرت بلالؓ دمشق کے باب الصغیر قبرستان میں دفن ہیں اور مجھے اُن کی آخری آرام گاہ پہ حاضری کی سعادت حاصل ہوئی..قریب ہی امیر معاویہ کی قبر ایک کچی کوٹھڑی میں روپوش ہے جس کا احوال میں نے ''خانہ بدوش'' میں قلمبند کر دیا تھا. اُدھر کوئی نہیں جاتا.. بلالؓ کی جانب سب آتے ہیں..

اصحاب صفہ کا تذکرہ تو بہت طویل ہے لیکن حضرت ابوعبیدہ بن جراح کے بغیر نامکمل ہے..

ابوعبیدہ... جنگ اُحد کے دوران حضورؐ کے خود کے دندانے رخساروں میں دھنس جاتے ہیں اور وہ شدید زخمی ہو جاتے ہیں..ابوعبیدہ اپنے دانتوں سے حضورؐ کے رخساروں میں پیوست دندانے کھینچ کر نکالتے ہیں تو اس تردد میں اُن کے اگلے دو دانت ٹوٹ جاتے ہیں اور ایک خلاء پیدا ہو جاتا ہے..اس لیے جراح..خلاء والا..

خالد بن ولید کی جگہ دمشق میں ابوعبیدہ بن جراح کو کمانڈر نامزد کیا گیا..جب وہ بوڑھے ہو گئے اور رسول کے وصال کو ایک عرصہ بیت گیا تو لوگ اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے..التجا کرتے کہ اے ابوعبیدہ ہمارے لیے ذرا مسکرائیے..وہ مسکراتے تو اُن کے دانتوں کے درمیان کا خلاء دکھائی دیتا..اور لوگ اسے اپنی خوش بختی جانتے آبدیدہ ہو کر اُسے دیکھتے رہتے کہ اس خلاء میں پیغمبر کے رخساروں کے نشان ہے تھے..

تو میرے پسندیدہ یہی..اسی نوعیت کے معتوبی لوگ ہیں تھڑے پر بیٹھنے والے..ہم میں سے ایسا تو کوئی نہ ہوگا جس کے ذہن میں یہ تمنا کبھی نہ کبھی ایک کونپل کی مانند نہ پھوٹی ہو کہ کاش میں حضورؐ کے زمانوں میں ہوتا..اُن کے آس پاس بھٹکتا..اُن کے لبادے کو چھوتا..مہر نبوت پر آنکھیں رکھتا چومتا..اُن کے سانسوں اور پسینے کی مہک میں سانس لیتا..اس تصور نے جب کبھی میرا دامن تمنا کھینچا تو میں نے اپنے آپ کو ایک ہی مقام پر پایا..اصحاب صفہ کے ہمراہ اُن کے تھڑے پر بیٹھے ہوئے..بے آسرا اور بھوکا..نہ سوتا نہ آرام کرتا بس اُدھر اُس ٹاٹ کے پردے کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہتا کہ کب اس میں خفیف سی لرزش ہوتی ہے اور حضورؐ اپنے حجرے میں سے باہر آتے ہیں.. پہلے کسے دیکھتے ہیں' کیا مجھے دیکھتے ہیں؟ کون سا لبادہ پہنا ہوا ہے.. پاؤں میں کیا ہے.. بالوں میں کون سی خوشبو رچائی ہوئی ہے..اور کب مجھے حضرت ابوہریرہ کے پہلو میں بیٹھا دیکھ لیتے ہیں اور کہتے ہیں ''مستنصر! تم نے آج بھی کچھ کھایا ہے یا یونہی بھوکے بیٹھے ہو..آؤ میرے ساتھ..میرے حجرے میں.. میرے پاس دودھ کا ایک پیالہ اور کچھ کھجوریں ہیں تمہارے لیے''..

”نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے .. کہ میری کاپی کوری تھی“

ہمیں مجبوراً مسجد نبویؐ سے باہر صحن میں آنا پڑا..

اور یہ مجبوری دل کو بھاتی تھی کہ روضۂ رسول تک پہنچنے کے لیے مسجد سے باہر آنا پڑتا ہے اور باہر آ کر باب السلام سے داخل ہونا ہوتا ہے..

یہ سلام کرنے والوں کا دروازہ ہے،

بس خدشہ سا تھا کہ کہیں یہ بند نہ ہو

کیسا پُرشکوہ مرصع اور عالی شان بلند دروازہ بھا یہ کون دیکھتا تھا..

اس کی جگہ اگر ایک بوسیدہ شکستہ در ہوتا.. ایک معمولی.. چنیوٹ یا سوات کے کاریگروں کا تراشا.. پھول بوٹوں والا.. آہنی کوکوں سے مزین ایک دروازہ ہوتا اور ایک زنگ آلود کنڈی ہوتی اور ہم وہ پہلے مسافر ہوتے جو اس کنڈی کو کھول کر اس کے کواڑ کھولتے اور اندر داخل ہوتے.. تو ہمیں اچھا لگتا..

ویسے حاضری کے شیدائی نہ اس شاندار دروازے کو دیکھتے ہیں اور نہ کسی بوسیدہ سواتی دروازے پر نظر کرتے ہیں کہ اُن کی آنکھیں بالکل ہموار سطح پر سفر کرتی.. زائرین کے ہزاروں سروں پر سے گزرتی آخر اس مقام پر جا ٹھہرتی تھیں جہاں ایک جالی تھی.. یہاں سے کہاں دِکھتی تھی.. پر تھی..

لوگ ہیجان میں ہوتے ہیں.. گھبراہٹ میں ہوتے ہیں اُن کے اعصاب جواب دے رہے ہوتے ہیں جب وہ باب السلام کی جانب جا رہے ہوتے ہیں لیکن جونہی اندر قدم رکھتے ہیں تو یکدم چپ ہو جاتے ہیں.. شانت ہو جاتے ہیں.. ایک گہرے امن میں چلے جاتے ہیں.. کہ اب باری آ جائے گی.. دھیمے ہو جاتے ہیں..

جو کچھ کہتے ہیں زیرِ لب کہتے ہیں.. آواز بلند نہیں کرتے..

خانہ کعبہ کے گرد طواف کرتے جو پکارتے ہیں فریاد کرتے ہیں دوہائی دیتے ہیں وہ یہاں مدھم اور

بے آواز ہو جاتے ہیں.. درود شریف جو مدینہ میں داخل ہوتے ہی سانس کے آنے جانے کی لے میں شامل ہو جاتا ہے یہاں اُس کی گونج میں اضافہ ہو جاتا ہے لیکن اندر ہی اندر.. بدن کے اندر.. برابر میں چلنے والے کو بھی خبر نہیں ہوتی.. یوں بھی ہر کوئی بے خبر ہو چکا ہوتا ہے اگر کوئی ایک فریاد کی لے بلند بھی کر دے.. تو بھی خبر نہ ہو.. ہرگز نہ ہو..

ایک طویل راہداری ہے جس میں پہلو سے پہلو ملائے پانچ سات لوگ چل سکتے ہیں بلکہ رُکتے تھمتے پاؤں گھسیٹتے چل سکتے ہیں.. نہ آپ آگے چلنے والوں کو دیکھتے ہیں اور نہ جو آپ کے پیچھے ہیں وہ کسی مضطرب کیفیت سے لاچار ہوتے ہیں.. بائیں ہاتھ پر مسجد نبوی کی محرابیں قطار اندر قطار تاحد نظر چلی جاتی ہیں.. قرآن پاک کے شیلفوں کی ایک قطار اور کچھ جالیاں چند ستون آپ کو اس وسعت سے الگ کرتے ہیں.. ان شیلفوں کے برابر میں ریاض الجنتہ کا سفید قالین بچھا ہے.. منبر رسول ہے جہاں ابھی ہم تھے اور وہاں سے باہر نکل کر باب السلام میں داخل ہو کر پھر اُس کے پہلو میں آ گئے تھے..

اور دائیں ہاتھ پر مسجد نبوی کی آخری دیوار ہے..

چنانچہ قرآن کے شیلفوں اور جالیوں کی دیواریں ایک جانب اور دوسری طرف مسجد نبوی کی دیوار اور ان کے بیچ یہ راہداری جس میں ہجوم میں بھنچے ہوئے آپ سرکتے جاتے آگے ہوتے جاتے ہیں..

مسجد کی آخری دیوار ترکوں کی مزین کردہ گل بوٹوں اور مختصر آرائشی محرابوں والی ہے اور چھت سے عثمانی طرز کے فانوس لٹکتے ہیں جن کی روشنی چکاچوند والی نہیں دھیمی اور اثر انگیز ہے..

جیسے سلام کرنے والے اس راہداری میں داخل ہو کر دھیمے اور اثر انگیز ہو جاتے ہیں.. یہ سجاوٹ اور فانوس اُسی بناوٹ میں ہیں جس سے استنبول کی مسجدیں مزین ہیں.. مسجد نبوی کا یہ حصہ ترکوں کا تعمیر کردہ ہے اور اُن کے ذوق جمال کے دھیمے لیکن اثر انگیز ہونے کی گواہی دیتا ہے..

سلجوق مجھے بار بار سہارا دیتا تھا کہ میں لاچار سا ہو گیا تھا.. یکدم بوڑھا ہو گیا تھا.. میں ایک مرتبہ پھر پوچھنا چاہتا تھا کہ یار ہمیں کچھ دکھائی دے جائے گا.. جو ہم دیکھنے آئے ہیں وہ دکھائی دے جائے گا.. ہم وہاں پہنچ جائیں گے..

''مسجد کے پاس ہی رسول اللہ نے دو حجرے تعمیر کروائے.. ایک ام المومنین حضرت سودہؓ کے لیے اور ایک حضرت عائشہ صدیقہؓ کے لیے.. ہر حجرہ دس فٹ چوڑا اور پندرہ فٹ لمبا تھا اور دیواریں کچی اینٹوں سے چنی گئی تھیں.. اور اُن پر کھجور کے پتوں کی چھتیں ڈالی گئی تھیں.. دروازوں کی بجائے کمبل کے پردے لٹکائے گئے تھے..''

بس اُنہی میں سے ایک حجرے کی جانب ہم سرکتے.. درود بھیجتے بڑھتے تھے. اگرچہ مجھے روضۂ رسولؐ کی جالی کی ایک ایک تفصیل یاد تھی.. اُس کی پُر پیچ بناوٹ اور وہ بوند نما شگاف جو نشاندہی کرتے تھے کہ ان کے پیچھے جو خلاء ہے اُس میں آپ کا کون دفن ہے.. اس کے باوجود اب کچھ یاد نہ آتا تھا کہ آگے کیا ہے.. جس منزل کی جانب ہم بڑھ رہے ہیں اُس کی شکل کیسی ہے.. اُس کی بناوٹ کے کیا رنگ ہیں.. بس یہی خدشہ تھا کہ پتہ نہیں وہاں تک پہنچ بھی پاتے ہیں کہ نہیں.. جس گاڑی میں سوار ہونا ہے اُس کا گارڈ اعلان کر دیتا ہے کہ بس اب مزید مسافروں کی گنجائش نہیں.. اور گاڑی بھی ایسی کہ دوبارہ نہیں آنے والی.. اور اگر پہنچ جاتے ہیں تو کچھ دکھائی بھی دیتا ہے کہ نہیں.. یونہی بے مراد.. جس منظر کو دیکھنے کے لیے آنکھیں تخلیق ہوئی تھیں اُسے دیکھے بغیر دوسرے دروازے سے.. باب جبریل سے باہر دھکیل دیئے جاتے ہیں.. یہاں خانہ کعبہ کی مانند مدافعت تو نہیں کی جاسکتی تھی کہ نہیں میں نہیں دھکیلا جاؤں گا.. مزاحمت کروں گا اور دیکھ کر جاؤں گا.. دھکیلے جاتے ہیں تو بس چپ چاپ دھکیلے جاتے ہیں.

میرے ساتھ ایک شدید گڑبڑ ہو گئی تھی..

جو ہوتا چلا آیا تھا وہ نہیں ہو رہا تھا.. کچھ اور ہو رہا تھا..

جو طے شدہ ردِعمل ہے اُس کے برعکس سب کچھ ہو رہا تھا..

طے شدہ ردِعمل.. جس سے انحراف شاید کفر کے دائرے میں آ جاتا ہے.. یہی ہے کہ خانہ کعبہ میں داخل ہوتے ہی ایک ہیبت، رُعب، ڈر اور جلال کا احساس ہوتا ہے جب کہ مدینہ میں روضۂ رسولؐ کے سامنے کچھ اور ہی موسم ہیں.. خوشگوار، پُرسکون اور ٹھہراؤ والے.. جمال والے.. بے ڈر..

لیکن یہاں تو معاملہ اُلٹ ہو رہا تھا..

میں وہاں بے خطر اور نڈر رہا.. جلال تو تھا لیکن کسی دہشت کا احساس نہ ہوا.. بلکہ تمام تر دعائیں مانگنے کے بعد خانہ کعبہ سے باہر آتا ہوں تو یاد آتا ہے کہ میں نے تو دشمنوں کے لیے بھی کچھ نہ کچھ مانگا ہے لیکن اپنے گناہوں کا نہ اقرار کیا ہے اور نہ انہیں بخش دینے کی کوئی التجا کی ہے تو بے خطر اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہو کر میں نے کہا.. اب میں نے اتنے بھی گناہ نہیں کیے کہ تیرے سامنے گڑگڑاؤں.. معافیاں مانگوں.. بلایا ہے تو بخشش کے لیے ہی تو بلایا ہے تو معاف کر دے..

لیکن جب میں باب السلام میں داخل ہو کر پہلا قدم رکھتا ہوں.. اُس ہجوم کا ایک ذرہ بن جاتا ہوں جو روضۂ رسولؐ کی جانب سرک رہا ہے تو میں ایک شدید خوف کی لپیٹ میں آ جاتا ہوں.. نہ ٹھہراؤ ہے.. نہ خوشگواری ہے اور نہ سکون ہے.. ڈر جاتا ہوں.. جیسے ایک بچہ پہلے دن سکول جانے سے خوفزدہ ہو جاتا ہے کہ پتہ نہیں وہاں کیا ہو گا.. امی تو نہیں ہوں گی تو کیا ہو گا.. میں نے سکول نہیں جانا' وہ دوہائی مچا دیتا ہے..

میں ایسے ڈر جاتا ہوں..

روضہ رسولؐ پہلے دن کا سکول ہے اور میں نے وہاں نہیں جانا..

میں فرار ہو جانا چاہتا ہوں..لوگوں کو دھکیلتا یہاں سے بھاگ جانا چاہتا ہوں..لیکن فرار کی تمام راہیں مسدود ہو چکی ہیں..

نہ بھاگا جائے ہے، مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے..

آگے تو جانا ہی نہیں چاہتا..اور پیچھے زائرین کی ایک دیوار دھیرے دھیرے سرکتی چلی آ رہی ہے..

کوئی ایک اینٹ سرکے تو میں اُس میں سے راستہ بنا کر نکل جاؤں..

کوئی ایک اینٹ کیسے سرکے تو میں مجبوری کی حالت میں ہوں اور آگے سرکتا جاتا ہوں..

میری ٹانگوں میں جان نہیں رہتی..

میرے حواس جواب دے چکے ہیں..

لیکن کیا کروں..مجبور ہوں..

ایک عجیب سی گھبراہٹ میرا دم گھونٹتی ہے..

میرے بھی..اور ہر شخص کے لب ہل رہے ہیں..مدینہ منورہ کے نواح میں کھجوروں کے کسی جھنڈ پر نظر پڑتے ہی جونہی یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم اُس کی بستی میں داخل ہو رہے ہیں تو چاہنے نہ چاہنے کا اختیار ختم ہو جاتا ہے اور لب حرکت میں آ جاتے ہیں..درود و سلام کا ورد شروع ہو جاتا ہے..اور ایسا مسلسل رہتا ہے کہ اس کے بعد..اٹھتے بیٹھتے..چلتے پھرتے..کھاتے پیتے..سوتے جاگتے..غسل خانے میں چہرے پر چھینٹے مارتے..باتیں کرتے..یہاں تک کہ دکانداروں سے بھاؤ تاؤ کرتے بھی..بے آواز لب ہلتے چلے جاتے ہیں..

یہ دستور ہے..

نہیں دستور میں تو کسی حد تک پابندی کا شائبہ ہوتا ہے..

یہ بس کی بات نہیں..بے اختیاری کی مجبوری ہے..

مجھ سے چلا نہیں جا رہا..

میرے پاؤں ایک بوڑھے خچر کی مانند بوجھل ہو رہے ہیں..

اتنے بھاری ہو رہے ہیں جیسے اُن کے گرد لوہے کے من من کے باٹ بندھے ہوں..

لیکن فرار کا کوئی راستہ نہیں..

کوئی صورت نظر نہیں آتی..

اگر زائرین کو دھکیلتا چیرتا آگے چلا جاؤں تو وہاں ایک چیک پوسٹ ہے..جس میں سے میں گزرنا نہیں چاہتا کہ پکڑا جاؤں گا..

پیچھے چلا جانا بھی امکان سے باہر ہے..

تو محض مجبور ہو کر آگے بڑھتا جا رہا ہوں۔۔

لیکن میرے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔۔

میں ایسا دہشت زدہ ہوں کہ حُب رسول کی سرشاری بھی معدوم ہو رہی ہے۔۔نہ دیوانہ وار آگے بڑھتا ہوں اور نہ اپنی خوش بختی پر نازاں ہوں اور آنکھیں بھی صحرائی لکڑی کی طرح خشک اور سوکھی ہیں۔کہاں ہیں اشکوں کے وہ دھارے جو بدن کو بھگو کر راحت عطا کرتے ہیں۔سکون کسے کہتے ہیں اور حاضری کا سودا جو بسا ہوا تھا کہاں ہے۔۔

تو ایسا کیوں ہو رہا ہے؟

میرے لیے تو یہاں کچھ قرار نہیں۔گھبراہٹ ہی گھبراہٹ ہے جو مجھے مفلوج کیے جاتی ہے۔۔ابھی کچھ دیر پہلے جب سفید چھتریاں صحن مسجد کو ایک مصنوعی شہر کی طرح ڈھک رہی تھیں تو روپوش ہوتے سبز گنبد پر میری جو نظر گئی تھی واپس نہ آئی تھی وہیں ٹھہر گئی تھی تو اس لمحے تو مجھ میں خوف کا کچھ شائبہ نہ تھا۔گھبراہٹ تھی تو صرف اس خدشے سے کہ کہیں میں وہاں تک پہنچ نہ پاؤں۔دیکھ نہ سکوں۔سلام نہ کر سکوں۔۔چاؤ تھا اشتیاق تھا۔ تو پھر یہ پل بھر میں کیا سے کیا ماجرا ہو گیا ہے۔۔اور ماجرا میری سمجھ میں آنے لگا۔۔

میرے بدن کی کھڈی جو حاضری کے چاؤ میں کھٹ کھٹ چلتی جاتی تھی یار کی چاہت کا رانگلا کھیس بُنتی جاتی تھی یکدم جو اٹک رہی ہے تو ایسا کیوں ہو رہا ہے۔۔کرتا پے پیٹے کے دھاگے ایک دوسرے میں الجھ گئے ہیں تو یہ کیا معاملہ ہے۔۔

ماجرا بھی سمجھ میں آ گیا اور معاملہ بھی۔۔

یہ تو کوئی اور ہی معاملہ تھا۔

قابل گردن زدنی معاملہ تھا لیکن سمجھ میں آ گیا۔۔

کہیں سے کوئی اشارہ تو ہوا تھا۔کوئی امداد تو پہنچی ہو گی ورنہ میں کہاں کا دانا تھا۔۔

اللہ تعالیٰ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

اُس کی کوئی تصویر نہیں بنتی۔۔

یہ ایک موہوم موجودگی ہے جسے ہاتھ تو نہیں لگایا جا سکتا۔چھو کر تو نہیں دیکھا جا سکتا کہ یہ ہے کہ نہیں ہے۔۔بتا دیا جاتا ہے کہ ہے۔۔اور ہم سر تسلیم خم کر دیتے ہیں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ہے۔۔میدان عرفات میں وہ محسوس ہوتا ہے۔۔کہیں آس پاس ہے۔۔اُس کی موجودگی میں کچھ شبہ نہیں رہتا۔۔آپ اُس سے ہم کلام ہوتے ہیں۔۔اور وہ سنتا ہے آپ کو یقین ہوتا ہے۔۔نہ ہو تو آپ کا ہے کو اتنی گریہ زاری کریں۔۔ایک کرن آپ کی سرخ آنکھوں میں بھرے پانی کے پردے میں سرایت کر کے اُس کے اپنے جدا اور انوکھے رنگ کیسے بکھیر دے۔۔اس کے باوجود یہ خیال تو آتا ہے کہ کہیں یہ پچیس لاکھ لوگ تو نہیں جو اس کی موجودگی کو تخلیق کر رہے

ہیں.. آپ اُسے مانتے ہیں تبھی تو اتنے دُور کے شہروں سے آئے ہیں.. اور اس کے باوجود.. گنجائش رہتی ہے..

اور یہاں..

باب السلام میں داخل ہوتے ہی ایک تضاد ایک فرق سامنے آنے لگتا ہے.. اُس کی موجودگی برحق لیکن موہوم ہے.. نہ ہاتھ لگا کر اطمینان کر سکتے ہیں نہ ذہن میں اُس کی کچھ شباہت بنتی ہے.. اُس کی پورٹریٹ کی ایک لکیر بھی انسانی تصور سے ماورا ہے.. کچھ سجھائی نہیں دیتا کہ کیسا ہے.. کوئی تصویر نہیں بنتی لیکن... چند قدم کے فاصلے پر جو شخص محو خواب ہے وہ موجود تھا.. ہزاروں نے اُس کے انسانی بدن کو جو ہم جیسا تھا اُسے چھوا تھا.. ابوعبیدہ کی مانند اُس کے رخساروں پر اپنے لب رکھے تھے.. اُن کا پیٹ چوما تھا.. سلمان فارسی نے مہر رسالت کو بوسہ دیا تھا اور کس کس نے اُن کی انگلیاں اپنے لبوں سے نہیں لگائی تھیں.. سب نے اطمینان کر لیا تھا کہ وہ تب ہم جیسا ہے.. اور اُس نے خود کہا تھا کہ میں بھی تم جیسا ہوں اس فرق کے ساتھ کہ مجھ پر وحی اترتی ہے..

اُس کی مکمل پورٹریٹ آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے.. تصویر بن جاتی ہے.. آنکھیں کیسی گھنیری سیاہ ہیں.. زلفیں کندھوں تک.. کہاں تک آتی ہیں.. بالوں کی ایک لکیر ناف تک جاتی ہے.. شانے کیسے چوڑے اور شاندار ہیں.. کسی نے کہا کہ جب وہ اونٹنی پر سوار ہونے لگے تو چادر اُن کے پیٹ سے ذرا کھسک گئی اور وہ ریشم ایسا ملائم اور خوش نظر تھا.. چلتے تھے تو ایسے جیسے اُترائی کے اُتر رہے ہوں.. بیٹھتے کس انداز سے تھے.. قد درمیانہ تھا.. سیاہ کمبل میں لپٹے کیسے لگتے تھے.. اُن کی حیات کا ایک ایک لمحہ.. ہر مسکراہٹ.. ہر زخم ہر اداسی.. ہر پژمردگی اور ہر مسرت درج تھی.. وہ تھے.. موجود تھے..

اُن کے وجود میں کوئی ابہام نہ تھا.. وہ جتنے برس جیئے جتنے سانس لیے وہ سب کے سب درج تھے.. یہاں تک کہ گرمی کی حدت کم کرنے کے لیے مدینے کے جس کنوئیں میں پاؤں لٹکا کر بیٹھتے تھے تو یہ بھی درج ہے کہ پانی اُن کی پنڈلی پر کہاں تک آتا تھا..

چنانچہ اُن کی تو مکمل تصویر سامنے آتی ہے..

آپ انہیں دیکھ سکتے ہیں..

جیسے میں.. میرے جیسا بھی.. انہیں دیکھ سکتا تھا کہ وہ اپنے حجرے کے دروازے پر پڑا کمبل ہٹا کر اصحاب صفہ کے چبوترے کی جانب آکر مجھ سے پوچھتے ہیں کہ اے مستنصر.. مجھ سے بھی پوچھتے ہیں..

تو بس یہی ماجرا تھا..

دراصل موہوم اور موجود کا معاملہ تھا..

تو پھر؟

موہوم کے ساتھ آپ کچھ فریب کر سکتے ہیں کہ وہ تو دکھائی نہیں دے رہا.. جانے ہے کہ نہیں.. یعنی فریب کرتے ہوئے آپ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ آپ کے فریب کو نہیں سمجھتا.. جب کہ جو بھی چال آپ چلتے ہیں وہ

آپ سے بڑھ کر چالباز ہے کہ قرآن یہی کہتا ہے.. بے شک آپ کو بتایا جاتا ہے کہ وہ شہ رگ سے زیادہ قریب ہے اور وہ ہے لیکن اس کے باوجود چونکہ اُس کی تصویر نہیں بنتی وہ تصور میں نہیں آتا آپ اُس سے لاپروائی برت جاتے ہیں..

لیکن وہ تو موجود تھا..

موجود کے ساتھ آپ کیسے فریب کر سکتے ہیں.. کہ وہ تو دکھائی دیتا ہے..

آپ اُس کے ساتھ تو چالیں نہیں چل سکتے جس کی مکمل تصویر آپ کے سامنے ہے..

چنانچہ جو موجود تھا.. ایک شباہت ایک تصویر والا تھا اُس کے سامنے حاضر ہوتے ہوئے بس وہی کچھ ہوتا ہے جو میرے ساتھ ہو رہا تھا..

میں اسی لیے فرار ہو جانا چاہتا تھا.. پلٹ جانا چاہتا تھا کہ وہ تو ہے

اور اُس نے میرے لیے کچھ حدود متعین کی تھیں کہ دیکھو حیات کو اس طور بسر کرنا ہے.. اپنے شب و روز یوں گزارنے ہیں.. جہاں بے انت آزادیاں عطا کی تھیں وہاں کچھ پابندیاں بھی عائد کی تھیں..

اور میں نے حیات کو اس کے کہنے کے مطابق بسر نہیں کیا تھا..

اُس کی پابندیوں پر عمل نہیں کیا تھا..

اپنے شب و روز ویسے نہیں گزارے تھے جیسے اُس نے ہدایت کی تھی..

اور آج پیشی ہو گئی تھی..

اُس کے ہاں تو روزِ حشر پیش ہونا تھا اور اس کے ہاں اسی دنیا میں پیشی ہو گئی تھی..

تو کیا جواب دوں گا؟

بے شک وہاں تو میرے ہاتھ میری آنکھیں بدن کے سب حصے گواہی دیں گے لیکن یہاں تو میری خاموشی سب سے بڑی گواہی ہو گی..

اسی پیشی کا ڈر میری گھبراہٹ کا منبع تھا.

جو جانتا ہو کہ میں نے جرم کیا ہے وہی کچہری میں داخل ہوتے ہوئے وہاں سے فرار ہو جانے کے منصوبے بناتا ہے..

بچپن میں.. چوتھی یا پانچویں جماعت میں ماسٹر صاحب گھر کا کام دیا کرتے تھے کہ یہ سوال نکالنے ہیں، یہ جواب مضمون کل لکھ کر لانا ہے.. اور میں اکثر کھیل تماشے میں محو ہو کر گھر کا کام بھول جاتا تھا.. اور اگلے روز سزا کے ڈر سے اپنی کلاس کے سب سے پچھلے بنچ پر سر جھکائے کبڑا سا ہو کر یوں بیٹھ جاتا تھا کہ شاید ماسٹر صاحب کی نظر مجھ پر نہ پڑے اور اُن کی نظر ہمیشہ مجھی پر پڑتی تھی اور وہ کہتے تھے "آ جاناں مستنصر اور دکھا مجھے گھر کے کام کی کاپی..."

اور میری کاپی کوری ہوتی تھی..

اور میں اس کوری کاپی کو سنبھالتا تھا..ایک ہاتھ سے گرتی ہوئی نکر کو اڑستا..زرد خوف سے نچڑتے چہرے کے ساتھ پچھلی نشست سے اٹھ کر تخت پوش پر کھڑے ماسٹر صاحب کی جانب جاتا تھا تو میرے پاؤں کن من کے ہو جاتے تھے..چلنے سے انکاری ہو جاتے تھے اور میں وہاں سے فرار ہو جانا چاہتا تھا..

یہاں بھی وہی ماجرا تھا..معاملہ وہی تھا..

میری ٹانگوں میں جان نہ رہی تھی کہ آگے چیکنگ ہوتی تھی اور میں نے گھر کا کام نہیں کیا تھا..

میری کاپی کوری تھی..

"کیسا دُکھی انسان وہاں سویا ہوا ہے..دُکھ سہجائے جگ"

کیسا دُکھی اِنسان وہاں سویا ہوا ہے..

وہاں..

جہاں میں پاؤں گھسیٹتا بھاری قدموں سے ڈرتا ڈرتا جاتا ہوں.

اُس کے دُکھ کا اندازہ کیوں کسی نے نہیں کیا؟

جیسے ابن مریم کے پیروکار.. اگرچہ ہم بھی اُن کے پیروکار ہیں لیکن صرف اُن تک محدود رہ جانے والے پیروکار یہ ایمان رکھتے ہیں کہ عیسیٰ ہمارے گناہوں کی پاداش میں مصلوب ہوئے..

تو ایسے میں بھی ایمان رکھتا ہوں کہ میرے محمدؐ نے وہ تمام تر دُکھ سہے جو ہم جیسا ایک انسان حیات کے نشیب وفراز میں سہتا ہے..

اُنہوں نے ہمارے دُکھ ہمارے لیے سہے..

بلکہ ان سے کہیں بڑھ کر..

ہمارے تو روزمرہ کے معمولی دُکھ ہیں..ان کو سہا جا سکتا ہے لیکن اُنہوں نے وہ دُکھ بھی سہے جو سہے نہ جا سکتے تھے..

میں اُنہیں ایک دُکھی انسان کیوں کہہ رہا ہوں..

میں نے اپنے نبیؐ کی حیات کا جو بھی مطالعہ کیا.. چاہے وہ ہیکل ہو مارٹن لنگز یا ہشام یا اسحاق.. مجھے تو وہاں دُکھ ہی دُکھ نظر آئے..

جس کا باپ..خوبصورت شکل والا عبداللہ..اُس کی پیدائش سے پیشتر ہی دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے..

پھر ماں..آمنہ بھی عدم کی مسافرت اختیار کر لیتی ہیں..تب وہ چھ برس کے تھے..ان کے ابھی کھیلنے کے دن ہیں..باپ سے لاڈ کرنے اور ماں کی گود میں پناہ لینے کے دن ہیں اور وہ دونوں ان کو نظر نہیں آتے..

ایک ایسے معاشرے میں جہاں ایک یتیم کی کچھ قدر و منزلت نہیں ہوتی..جہاں باپ کے حوالے سے ہی انسان

سر اُٹھا کر چلنا ہے..

وہ بے سہارا دوسروں کی بھیڑ بکریاں چرا کر گزر اوقات کرتے ہیں.. مسجد میں اُن سے دریافت کیا گیا کہ کیا سبھی پیغمبروں نے بھیڑ بکریاں چرائیں.. تو انہوں نے جواب دیا "ہاں".. پوچھا گیا کہ کیا آپ نے بھی؟ تو انہوں نے فرمایا "ہاں میں نے بھی"

وہ ایسے گڈریے تھے..

پھر اُن کے دادا عبدالمطلب بن ہاشم نے اُنہیں سنبھالا..

عبدالمطلب جب فرش پر بیٹھتے تو اُن کے بیٹوں میں سے کوئی بھی یہ جسارت نہ کرتا کہ اُن کے برابر میں بیٹھ جائے.. محمد آتے تو اُن کے پاس فرش پر بیٹھ جاتے اور اُن کے چچا اُن کا ہاتھ پکڑ کر اُنہیں وہاں سے اُٹھانے لگتے تو دادا کہتے "میرے بچے کو چھوڑ دو.. اس کی تو بہت بڑی شان ہے" اور آپ کی پشت پر محبت سے ہاتھ پھیرنے لگتے..

آٹھویں سال میں قدم رکھا تو دادا بھی رحلت کر گئے..

یہ حادثہ واقعہ فیل سے.. ابابیلوں کے کنکریاں گرانے سے.. آٹھ سال بعد پیش آیا..

کہتے ہیں کہ جب حضوؐر کے دادا پر رحلت کا وقت آیا تو اُنہیں اپنی موت کا یقین ہو گیا تو اپنی چھ بیٹیوں سے.. حضوؐر کی پھوپھیوں سے یہ کہا کہ تم سب مجھ پر گریہ زاری کرو تا کہ میں اپنے مرنے سے پہلے سُن لوں کہ تم کیا کہو گی..

اور اُن سب نے ماتم کے شعروں میں اپنے جذبات کو بیان کیا..

اور اُن سب کے یہ اشعار تاریخ کا ایک حصہ ہیں..

عاتکہ نے کہا..

"اے میری آنکھو.. خوب تیزی سے جھڑی لگا دو اور بہہ جاؤ.. اور رونے کے ساتھ رُخساروں پر طمانچے مارو..

اے میری آنکھو.. خوب جم کر رو لو.. اور ایسے شخص پر آنسو بہاؤ جو نہ پیچھے رہ جانے والا تھا اور نہ کمزور.."

پھر اُن کے چچا نے.. نہ ابولہب نے.. اور نہ ابوجہل نے.. کہ وہ بھی چچا تھے بلکہ ابوطالب نے اُن کے سر پر ہاتھ رکھا..

یہ محمد کیسا دربدر ہوا جاتا تھا..

کیسا دُکھی انسان تھا جو وہاں.. جدھر میں بڑھتا تھا وہاں سوتا تھا..

اُس کے دکھ کا کوئی بیان نہیں ہو سکتا..

جسے اپنے قبیلے والے.. سگے.. خاندان والے ترک کر دیں..

پورا معاشرہ ترک کر دے..

حرم میں داخل ہو تو اُس پر غلاظت ڈھیر کر دی جائے.. اور راہ چلے تو اُس کے سر پر خاک ڈالی جائے..

اُس کی بیٹیوں کو ابولہب کے بیٹے الگ کر دیں.. عقد کے بعد یا شاید اُس سے پیشتر.. کہ یہ تمہارا باپ ہمیں کس الگ راہ پر لگاتا ہے.. ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہتا ہے..

اور وہ چھپ چھپ کر اپنے رب کے سامنے سجدہ ریز ہوتا ہے..

اُس کے چاہنے والے.. اُس کی باتوں پر یقین کرنے والے مکہ چھوڑنے پر اور حبشہ میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں جن میں حضرت عثمانؓ بھی شامل ہیں.. اور بالآخر اسے وہ شہر بھی چھوڑنا پڑتا ہے جو اُسے دنیا بھر میں سب سے عزیز ہے..

غارِ حرا میں اُس پر جو گزری سو گزری..

ایک چادر میں لپٹا.. جو چادر اُس کی شریکِ حیات خدیجہ اُس کے کپکپاتے بدن پر پھیلاتی ہے اُس میں لپٹا ہوا اپنے اوپر نازل کیے گئے کلام کی دہشت اور ناسمجھی میں آیا ہوا.. بے یقینی میں کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے.. وہ جو اُس غار میں ایک خواب میں آیا تھا اور مجھے پڑھنے کو کہتا تھا.. ایک انسان کے رُوپ میں تھا تو وہ کون ہے.. اور جب میں جدھر دیکھتا تھا.. ہر سُو کبھی حرا کے پہاڑ کے پار اُس بلندی پر اور کبھی اُس چوٹی پر اُسے دیکھتا تھا تو وہ کون ہے تو خدیجہ کے رشتے کے بھائی ورقہ بن نوفل خبر کرتے ہیں کہ وہ جبرائیل تھے..

ورقہ بن نوفل.. ماں خدیجہ کی قبر کے قریب قبرستان معلّٰی میں دفن ہیں..

تو وہ دکھ کا مارا ہوا انسان دنیا بھر میں سب سے عزیز شہر کو چھوڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور یثرب کی اُس دُور افتادہ بستی میں پناہ لیتا ہے جہاں کبھی اُس کا باپ آیا کرتا تھا..

اپنے یارِ غار کے ساتھ غارِ ثور میں پوشیدہ.. نہیں جانتا کہ قریش کے جن پیچھا کرنے والوں کے قدموں کی آہٹیں سنائی دے رہی ہیں وہ دہانے پر تنے مکڑی کے جالے کو کبوتروں کے ایک گھونسلے کو دیکھ کر لوٹ جائیں گے یا اندر داخل ہو کر اس کی حیات منقطع کر دیں گے.. وہ غار میں پناہ لینے والا شخص اپنے وطن کو ترک کرتے ہوئے عزیز ترین شہر اور عزیز و اقارب یہاں تک کہ بیٹیوں سے بچھڑتا اپنے بیٹوں کی قبروں سے دُور ہوتا.. کتنا دکھی ہوگا..

اُس کے بیٹے مر جاتے ہیں..

اللہ نہ کرے کے کسی کے.. دشمن کے بھی بیٹے مر جائیں.. چند ماہ باپ کی نسل آگے بڑھانے والے ہوں اور پھر مر جائیں..

انہیں.. اُس شخص کو کچھ عرصے کے لیے.. ابو قاسم پکارا جائے. اُس کی بیوی فخر سے اُسے اے قاسم کے باپ کہہ کر بلائے اور پھر یہ لقب بھی چھن جائے.. پہلے فرزند قاسم.. پھر طیب اور اُن کے بعد طاہر.. بیٹیوں میں سے سب سے بڑی رقیہ.. ان کے بعد زینب پھر کلثوم اور سب سے چھوٹی فاطمہ.. ابو قاسم کے بعد ابو طیب اور ابو طاہر کے القاب بھی قصہ پارینہ ہو جائیں تو دل پہ کیا گزرے..

اور آخری عمر میں پھر ایک عارضی مسرت نصیب میں آئے. حضرت ماریہ قبطیہ کے بطن سے حضرت ابراہیم کی ولادت ہو اور یہ بیٹا ہو بہو اپنے باپ کی شباہت کا ہو.. اُسے گود میں لے کر پہروں کھلائیں.. دیکھنے والے دیکھیں کہ رسول بچپن میں بس ایسے ہوتے ہوں گے اور ابراہیم جب رسول کی اس عمر تک پہنچیں گے تو بالکل اُن جیسے ہوں گے.. اس پر حسد بھی ہو اور شک کا اظہار بھی کیا جائے.. اور پھر یہ آخری متاع بھی ہاتھ سے نکل جائے. تو اس کے دُکھ کا کوئی حساب کرنے والا ہے؟

ابراہیم کی قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر کہے کہ اس کی قبر سیدھی اور مناسب رکھنا. تدفین کے روز سورج گرہن کے آثار ہویدا ہونے لگیں تو اُس کے ماننے والے.. جس کی رحمت کے چھینٹوں سے وہ خشک بدنوں والے ہرے بھرے ہو جاتے تھے.. ایسے لوگوں نے کہا کہ یہ سورج گرہن تو پیغمبر کے بیٹے کی موت کے سوگ میں ظاہر ہوا ہے تو وہ شخص اپنے غم و اندوہ میں سے فوراً نکل آئے آنسو پونچھ ڈالے اور کہے 'تم جان لو کہ یہ سورج چاند ستارے سب کے سب اللہ کے تابع ہیں. اُس کے قائم کردہ نظام کے تحت اپنے اپنے مدار میں ہیں اور ان پر کسی انسان کی موت کا بے شک وہ میرا بیٹا ہی کیوں نہ ہو' کچھ اثر نہیں ہوتا. کچھ نے اُن سے کہا کہ اے رسول آپ نے تو آہ و بکا کرنے سے منع فرمایا تھا اور اب آپ ہی سسکیاں بھرتے روتے چلے جاتے ہیں تو فرمایا 'میرے غم و اندوہ کی شکایت کرتے ہو تو جان لو کہ میں نے شور کرنے اور بلند آواز میں ماتم کرنے سے منع کیا تھا. آنسو بہانے سے نہیں. میرا بیٹا مر گیا ہے میں کیسے نہ روؤں..

اُس کے دُکھ کا کچھ شمار نہیں.. کوئی ایک داستان ہے.. ان سب کو بیان نہیں کیا جا سکتا..

اور ان کی عائلی زندگی بھی اتنی پر سکون یا خوشگوار نہیں تھی. یہاں بھی دُکھ تھے. لیکن وہ اپنی شگفتگی برقرار رکھتے ہیں.. ایک روز حضرت صفیہؓ نے رنجیدہ ہو کر شکایت کی 'دیکھیں میری سوکنیں مجھے طعنے دیتی ہیں.. حفصہؓ کہتی ہیں کہ میں تو عمر فاروقؓ کی بیٹی ہوں اور عائشہؓ مجھے تنگ کرنے کی غرض سے کہتی ہیں کہ میں تو حضرت ابوبکر صدیق کی بیٹی ہوں.. جب کہ تم ایک یہودی کی بیٹی ہو. تو حضورؐ اس رقابت سے لطف اندوز ہو کر کہتے ہیں. صفیہ تم ان سے کہو کہ میرا باپ ایک پیغمبر تھا جس کا نام موسیٰ تھا اور میرا چچا بھی ایک پیغمبر تھا جو کہ ہارون تھا. اور میرا خاوند بھی ایک پیغمبر ہے جو محمدؐ ہے. تو کون افضل ہے..

جب دباؤ بہت بڑھ جاتا ہے.. برداشت سے باہر ہونے لگتا ہے..

باہر کی دنیا میں سازشیں ہیں' الزام تراشیاں اور منافقتیں ہیں اور گھر میں گلے شکوے

ناآسودگیاں.. کہ اس مالِ غنیمت میں سے ریشم اور کمخواب کے لبادے ہمارے حصے میں کیوں نہیں آئے..
گھریلو اخراجات کے لیے تنگی ہے.. محض گڑ کے شربت' ستو اور کھجوروں سے گزارا نہیں ہوتا..
تو وہ اتنے دکھی ہوئے کہ کنارہ کش ہو گئے..
ایک ایسی کوٹھڑی میں الگ ہو گئے جس تک پہنچنے کے لیے کھجور کا ایک تنا سیڑھی کے طور پر استعمال ہوتا تھا..
وہ اتنے دکھی ہوئے..
اور جب حضرت عمر فاروقؓ کو ان حالات کا علم ہوا تو انہوں نے ان تک پہنچنے کی کوشش کی تو خادم نے روک لیا کہ رسولؐ کسی سے بھی ملنا نہیں چاہتے.. حضرت عمرؓ نے التجا کی کہ دیکھ' میں تو صرف حفصہؓ کے والد کی حیثیت میں آیا ہوں اور اپنے داماد سے ملنا چاہتا ہوں مجھے اجازت دے دو..
کھجور کے تنے پر پاؤں رکھتے اوپر پہنچتے ہیں تو اللہ کے رسول کو اس حال میں دیکھتے ہیں کہ وہ بان کی ایک ننگی چارپائی پر لیٹے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے اُن کے کومل بدن پر بان کھبنے سے نشان پڑ گئے ہیں.. کندھوں کے درمیان مہرِ رسالت کے قریب بھی خراشیں تھیں.. وہ تنہا پڑے تھے.. کونے میں پانی کا ایک مشکیزہ اور کچھ ستو تھے.. وہ اپنے گھریلو حالات کے بارے میں اتنے دکھی تھے کہ خود اللہ تعالیٰ نے ان کی ڈھارس بندھائی..

"اے پیغمبر اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر دنیا کی زندگی اور اس کی زینت و آرائش کی خواستگار ہو تو آؤ میں تمہیں کچھ مال دوں اور اچھی طرح سے رخصت کر دوں اور اگر تم خدا اور اس کے پیغمبر اور عاقبت کے گھر (یعنی بہشت) کی طلب گار ہو تو تم میں جو نیکوکاری کرنے والی ہیں اُن کے لیے خدا نے اجرِ عظیم تیار کر رکھا ہے O"

(الاحزاب 28-29)

اور وہ شخص جو اشرف المخلوقات میں سے سب سے اشرف تھا. محبوب تھا اپنے تخلیق کرنے والے کا اُس نے بھی موت کی اذیت اتنی ہی سہی جتنی کوئی بھی شخص سہتا ہے.. جب اُن کے کہنے پر ان کے منہ پر چھینٹے مارے جاتے ہیں تا کہ حالتِ نزع کی گھبراہٹ کم ہو تو وہ کہتا ہے.. مجھے ایک عام انسان کی نسبت دوہری اذیت ہو رہی ہے..
وہ دوہری اذیت میں سمجھتا ہوں انہوں نے ہم سب کے لیے سہی....
موت کے بعد بھی کچھ لوگ اپنی اپنی بھاگ دوڑ میں مصروف ہو گئے اور ان کی تدفین سے غافل ہو گئے.. وہ یقیناً آگاہ ہوں گے کہ اُن کے بعد کیا ہو رہا ہے.. تو یہ بھی کیسا دکھ ہو گا..
اُس شخص نے یہ سارے کے سارے.. معاشرتی' خاندانی' قبیلے کے.. دوستوں اور عزیزوں کے.. اولاد کے.. اور بیویوں کے دکھ صرف اس لیے سہے کہ ہم جیسے شکایت نہ کر سکیں.. ہمارے لیے ہے.. دکھ

ہمارے حصے کے بھی انہوں نے قبول کیے..

اگر حضرت عیسیٰ لوگوں کے گناہوں کے لیے مصلوب ہوئے تو ہمارے پیغمبر نے بھی دکھ جو ہمارے تھے ان کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی..

کیسا دکھی انسان وہاں سویا ہوا تھا..

وہاں..

جہاں میں پاؤں گھسیٹتا بھاری قدموں سے ڈرتا ڈرتا جاتا ہوں..

اُس کے دکھ کا اندازہ کیوں کسی نے نہیں کیا؟

"روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام..

پاؤیں گا دیدار صاحب دا.."

تو میری کاپی کوری تھی..

میں نے گھر کا کام نہیں کیا تھا..

اس لیے میرے پاؤں بوجھل ہو رہے تھے..

جو اُس نے ہدایت کی تھی اس پر عمل نہیں کیا تھا اور پیشی ہونے کو تھی..

نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے.

درود شریف کی مدھم سرسراہٹ اٹھتی تھی اور عثمانی گنبدوں کی نیلاہٹ کو جا چھوتی تھی اور واپس آتی تھی اور ایک نامعلوم پھوار کی صورت سرکتے ہجوم پر گرنے لگتی تھی.. میرے پریشان چہرے پر محسوس ہوتی ٹھنڈک دیتی تھی..

جیسے درّہ دسپر کی بلندرات میں میرا سانس خیمے کی چھت سے چھو کر برف بن جاتا تھا اور ایک سفید پھوار کی صورت میرے چہرے پر گرنے لگتا تھا..

میں حسب معمول سلجوق اور نمیر کے بلند قامت رومی ستونوں کے درمیان میں.. ان کی عافیت کی گود میں آگے بڑھتا جاتا تھا.. بار بار سلجوق کے کندھے کو تھام کر.. اس کندھے کے پار دیکھنے کی سعی کرتا تھا.. "کچھ" دیکھنے کی کوشش کرتا تھا جو "کچھ" میں دیکھنے آیا تھا.. کچھ دکھائی نہ دیتا تھا "یار کتنی دور ہے؟"

اور وہ کچھ جواب نہیں دیتا.. اس کے چہرے پر جو سنجیدگی ہے میں اُس سے ڈر جاتا ہوں.. وہاں رشتوں کی کوئی پہچان نہیں ہے' وہ مجھ سے منقطع ہو چکا ہے اور کہیں اور جڑ چکا ہے..

میں پھر اُس سے مخاطب ہوتا ہوں "مجھے بتا دینا کہ کدھر دیکھنا ہے.. جالی میں کون سا روزن ہے جس کے اندر دیکھنا ہے.. یہ نہ ہو کہ ہم یونہی چلتے جائیں اور گزر جائیں.. پلیز بتا دینا"

وہ کچھ جواب نہیں دیتا.. پتہ نہیں کچھ سُن بھی رہا تھا یا نہیں..

میری گھبراہٹ میں کچھ کمی ہو رہی ہے... فرار ہو جانے کے خیال میں کچھ خلل آ رہا ہے.. ٹھیک ہے میری کاپی کوری ہے لیکن میں پیشی کے خیال سے ہراساں نہیں رہا.. زیادہ سے زیادہ ڈانٹ پڑ جائے گی.. اور کیا ہو گا..

اب میں اس وسوسے میں مبتلا ہوا کہ یونہی سرکتے سرکتے میں سنہری جالیوں کی کشیدہ کاری کے قریب سے بے خبر گزر جاؤں گا.... جتنی دیر میں سلجوق اشارہ کر کے نشاندہی کرے گا کہ ابا اُدھر دیکھیں.. بس یہی روزن ہے تو اتنی دیر میں میری آنکھیں اُسے تلاش نہ کر پائیں گی اور ہم باب جبرائیل سے باہر نکل جائیں گے..

ہم نے تقریباً نصف مسافت طے کر لی تھی کہ اب ہم منبر رسولؐ کے علاقے میں سے گزر رہے تھے..

یہ ایک بہت مختصر سفر تھا.. چند سو قدموں کا.. باب السلام میں داخل ہو کر روضہ رسولؐ تک کا.. شرمندگی، ڈر اور گھبراہٹ کا.. لیکن صرف چند سو قدموں کا.. جو اگرچہ میں نے اُس روز پہلی بار ایک ہی بار اختیار کیا..

لیکن یہ کیا ہے کہ میں نے اسے بار بار اختیار کیا..

بعد میں جو متعدد حاضریاں ہوئیں وہ کچھ یاد نہیں.. اُن کے سفر یادداشت سے اترتے جاتے ہیں لیکن یہ جو پہلا سفر تھا اسے میں اب بھی اختیار کرتا ہوں.. کہ وہ ثبت ہے میرے بدن اور احساسات پر.. اس کا ایک ٹھپہ لگ چکا ہے.. یہ پہلا رنگ ہے جو ہاتھ سے چلنے والی پرنٹنگ مشین سے میرے کورے کاغذ پر لگا.. اس کے بعد بھی بہت سے رنگ اس کے اوپر لگے لیکن یہ پہلا رنگ ہی نمایاں رہا.. یاد رہا..

یہ چند سو قدم حرفوں، عقیدت اور دانش کے احاطے میں تو آنے سے رہے..

تو پھر کیوں نہ انہیں بار بار اختیار کیا جائے..

یہ چند سو قدم کا فاصلہ ایسا تو نہیں کہ اسے بس ایک بار بیان کیا جائے..

بے شک ایک ایسا شخص، جو قادر الکلام ہو.. اپنی عقیدت اور جذبات کو بیان کرنے میں یکتا ہو.. کل کائنات کے درختوں کے قلم بنا کر.. انہیں حسب منشا تراش کر گھڑ سکے.. اور کل سمندروں کی روشنائی میں "ڈوبے" لگا کر اس چند سو قدم کے فاصلے کو ایک ہی بار لکھ دے.. تو ایک ایسا شخص تو ایسے بیان پر قادر ہو سکتا ہے..

لیکن میں تو ایسا نہیں ہوں..

نہ تو میں حرفوں سے آگاہ ہوں اور جو چند ایک میں نے اِدھر اُدھر سے مستعار لیے ہیں وہ بھی ساتھ چھوڑتے جاتے ہیں..

میں اس لائق نہیں ہوں.. اور یاد رہے نہ مجھ میں کچھ عاجزی ہے اور نہ انکساری کہ میں سب کچھ

بیان کرتے ہوئے داد کی خاطر اپنے عجز کا اظہار کرتا چلا جاؤں.. یہ مجھ میں نہیں.. میں نے درجنوں سفر نہایت تیقن سے بیان کیے ہیں اس اعتماد کے ساتھ کہ کوئی اور کیسے انہیں بیان کرنے کے لائق ہے میرے سوا..

جو کچھ میں نے دیکھا ہے وہ اور کس نے دیکھا ہے..

لیکن یہاں پر جو کچھ میں نے دیکھا تھا اسے خلق خدا نے مجھ سے بہت پہلے دیکھا تھا تو اس کا فخر بھی کیسے ہو.. یہاں تو ہر یقین ہر اعتماد ہوا ہوا جاتا تھا. ساتھ چھوڑ جاتا تھا..

اس لیے لاچار اور مجبور ہو کر تسلیم کرنے والا ہو گیا ہوں کہ باب السلام سے روضۂ رسولؐ تک کا.. چند سو قدموں کا جو سفر ہے وہ میں ایک ہی بار بیان کرنے کی تخلیقی سکت ہرگز نہیں رکھتا..

مجھے اسے بار بار بیان کر لینے دیجیے.. بے شک یہ پھر بھی بیان سے باہر رہے..

یہ ایک نہیں بہت سے سفر تھے..

وطن واپس ہوا اور جب میں اپنی نارمل حیات یا ابنارمل زندگی کے قرینوں میں پھر سے سما جانے کی سعی کر رہا تھا تو مولانا حسرت موہانی کی ایک عاشقانہ اور فاسقانہ غزل کے کچھ بول میرے کانوں میں اترنے.. یاد رہے کہ یہ وہی مارکسی مولانا ہیں جنہوں نے "ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے.. اور وہ ترا چپکے چپکے کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے" ایسی فاسقانہ غزل کہی تھی.. کاش کہ آج کے مولانا بھی ایسے مولانا ہوتے.. تو یہ غزل عابدہ پروین اپنی اکثر اکسا دینے والی ایک ہی دھن اور لے میں گائیکی سے جدا ہو کر کسی اور ہی رنگ میں گا رہی تھیں کہ..

روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام
دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام

میں اس شعر کو سنتا ہوں تو یکلخت منقطع ہو جاتا ہوں..

گلبرگ کے اپنے مختصر گھر میں دنیا سے جڑ جانے اور صلح صفائی کے عمل میں مصروف ہوں حج کے فوراً بعد تو مجھ پر یہ افتاد آن پڑتی ہے..

میں پھر سے باب السلام میں داخل ہو رہا ہوں..

روضۂ رسولؐ کی جانب بڑھ رہا ہوں..

اور جو بھی چہرے میرے آس پاس ہیں اور ان میں ایک میرا چہرہ بھی ہے تو یہ سب کے سب جمالِ یار سے روشن ہو رہے ہیں..

یہ جو انجمن ہے دھیرے دھیرے آگے بڑھتے چہروں کی.. کیسی روشن ہوتی جاتی ہے..

نہ صرف روشن ہے بلکہ سنہری جالیوں میں جو گل روپوش ہے اس کی آتش سے یہ چمن تمام دہک رہا ہے..

رخساروں پر جو آنسو گرتے جا رہے ہیں ان کو بھی چھوا نہیں جا سکتا کہ وہ اُس آتشِ گل سے دہک رہے ہیں..

میں اس لیے اخبار پڑھ رہا تھا.. اطمینان سے دنیا سے جڑا ہوا. مولانا کی غزل کا مطلع سنائی دیا تو سب خبریں اور اخبار میں چھپے ہوئے حرف بے معنی لگنے لگے..

کون سا یار..

کس کا جمال..

انجمن کون سی..

وہی یار ہے.. وہی جمال ہے.. اس کے سوا اور کچھ نہیں اور انجمن بھی وہی ہے.. میں پھر سے اس یار اس کے جمال اور اس کی انجمن میں چلا جاتا ہوں.. میں جو بمشکل دنیاوی کھڈی پر بیٹھ کر خواہش آسائش اور ہوس کے تانے بانے سے اپنے لیے ایک چادر بُن رہا تھا تو اس مطلع نے وہ تانا بانا اُلجھا دیا..

جمالِ یار کی کنڈی پانیوں میں اُتری اور میرے بدن میں کھب گئی..

میں منقطع ہوا اور اُس خانۂ جمال کی جانب بڑھتے ہوس کاروں میں ہو گیا..

آس پاس جتنے چہرے تھے.. سب کے سب جمالِ یار سے روشن ہو رہے تھے.. ایسے کہ اُن کی نسل کے نقش اور رنگ اس میں معدوم ہو رہے تھے اور وہ سب کے سب ایک ہی رنگت کے.. پیا کے رنگ میں رنگے جا رہے تھے.. اُن کے نین نقش بھی ایسے ہو گئے کہ اُن کی الگ الگ پہچان باقی نہ رہی..

یہ جمالِ یار کا کرشمہ تھا کہ ان کے نین نقش، رنگ اور چہرے ایک سے ہو گئے تھے..

ایک ہی شکل کے ہو گئے تھے..

روشن چہروں پر جو کیفیت رقم تھی وہ بھی یکساں تھی.. کوئی فرق نہ تھا..

میں باری باری ان میں سے ہر ایک کو غور سے دیکھتا تو نہ تھا اُن کا مشاہدہ تو نہ کرتا تھا بس ایک اچٹتی سی نظر ڈالتا تھا کہ نظر کہیں ٹھہرتی تو نہ تھی اُس ہجوم کے اوپر سرکتی جاتی تھی اور اس مقام تک چلی جاتی تھی جو انجمن کو روشن کرنے والے جمال کا منبع تھا.. اور اس کے باوجود جانتا تھا کہ سب ہم شکل ہو چکے ہیں..

دریا پار انجمن کا ڈیرہ تھا.. اور دل اس ڈونگھے دریا میں ڈوبتا تھا.. ایسے ڈوبتا تھا کہ سطحِ آب پر آتا تھا تو خون کی ترسیل رُک جاتی تھی کہ پتہ نہیں میں وہاں تک پہنچ پاؤں گا یا نہیں..

ایک بے یقینی تھی.. ایک گہری تشویش اور بہت ہی شک تھا کہ یہ تو محض سراب ہے ایک ایسا خواب ہے جس میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں اُس کو دکھانا ممکن نہیں.. جیسے آئینے میں پھول کھلا ہو تو اسے ہاتھ لگانا مشکل ہوتا ہے..

جمالِ یار کی یہ تجلی ایک جھاڑی کے عقب میں سے پھوٹنے والی روشنی سے کہیں بڑھ کر تابدار لگتی تھی

جس نے موسیٰ کے چہرے کو روشن کیا تھا.. کہ یہ ہزاروں چہروں کو روشن کر رہی تھی اور صرف اس وقت حاضر میں جو ہزاروں ہم شکل چہرے ہیں صرف انہیں نہیں، چودہ سو برس میں جتنے بھی چہرے اس کی زد میں آئے ہیں اور جتنے تا ابد آئیں گے یہ تجلی اُن سب کو روشن کر رہی تھی..

روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام
دہکا ہوا ہے آتشِ گُل سے چمن تمام

یہ ہم شکل چہرے نہ صرف روشن ہو رہے تھے بلکہ آتشِ گُل سے بھی دہک رہے تھے..

وہ گُل جو اقرأ کی آگ میں دہکنے لگتا ہے.. یکدم اس آتش کے آگاہ ہونے پر جان نہیں پاتا کہ یہ مجھے کیا ہو گیا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے ایک چادر اوڑھا دو.. ایک سیاہ کمبل اُس دہکتے ہوئے گُل کے گرد لپیٹا جاتا ہے لیکن وہ آتش مزید بھڑکتی ہے بجھتی نہیں.. ابھی تک نہیں بجھی..

اُسی آتشِ گُل سے وہ آنسو بھی دہک رہے تھے جو ان ہم شکل بدوائیوں کے رخساروں پر گرتے چلے جاتے تھے..

حیرت، غرور، حسن، شوخی سے اضطراب
دل نے بھی تیرے سیکھ لیے، چلن تمام

کیسے کیسے چلن حیرت کے تھے.. وہ دہکتا گُل.. کسی ایک حیرت کا بیان بھی ممکن نظر نہیں آتا.. آج تک جو لکھا گیا ہے جو لکھا جائے گا اُسے ایک اقرأ کی صدا کے بعد پڑھ لینے کی حیرت.. ہر مروّجہ اور روایت سے بغاوت کی حیرت.. اور کل تخلیق کردہ مخلوق میں سے اعلیٰ اور برتر ہونے کے باوجود سادگی، انکساری اور ڈھے جانے کی حیرت..

اور کیسا غرورِ حسن.. کہ معیار ٹھہر گیا اور کوئی بھی اُس پر پورا نہ اتر سکا کہ وہ صرف اُسے ہی عطا کیا گیا تھا..

شوخی بھی ایسی کہ.. کھجور کی گٹھلیوں کی.. بوڑھی عورتیں جنت میں نہیں جائیں گی.. اونٹ کے بچے کی بات.. اماں صفیہ کی ڈھارس کیسے مسکراتے ہوئے بندھاتے ہیں اور اماں عائشہ کیسے اپنے رخسار ان کے بدن کو چھوتے ہوئے ایک گیت سنتی ہیں..

اور اضطراب بھی کیسا کیسا!

وحی نازل ہونے پر اضطراب اور پھر ایک عرصہ نہ نازل ہونے پر اضطراب..

اپنی اُمت کے لیے.. نواسوں کے لیے اور فاطمہ کے لیے.. کیسے کیسے اضطراب..

اللہ رے جسمِ یار کی خوبی کہ خودبخود
رنگینیوں میں ڈوب گیا پیراہن تمام

جسم یار کی خوبی کیسی انوکھی ہے کہ اُس پر جو پیراہن ہے جو اُسے ڈھکتا ہے جس کے رنگ سبز بھی ہیں اور شوخ سرخ بھی ہیں.. اُس کے مرقد کو ڈھکتا ہے سنہری آیات سے کاڑھا ہوا تو کیسی عجب رنگریزی میں ڈوبا ہوا ہے وہ پیراہن تمام..

صرف اس لیے کہ اُس کے تلے جو زمین ہے جس میں جسم یار ہے اُس کی خوبی ہے کہ وہ اوچھاڑ' غلاف' چادر.. وہ پیراہن رنگینیوں میں ڈوب چلا ہے..

دیکھو تو چشم یار کی جادو نگاہیاں

بے ہوش اک نظر میں ہوئی انجمن تمام

یہ سب کے سب ہم شکل چہرے جن میں سے ایک میرا چہرہ بھی ہے تو یہ ہوش میں کب ہیں.. یہی تو اُس یار کی چشم کی جادو نگاہیاں ہیں کہ صرف ایک نگاہ اُس کے پیراہن کی جانب ڈالی ہے تو ہوش رخصت ہو گئے.. اور یہ وہ سودائی ہیں کہ اگر انہیں ہوش آ جاتا تو پکار اٹھتے کہ بے ہوش ہی اچھا تھا ناحق مجھے ہوش آیا..

چند سو قدموں کا ایک مختصر سفر میرے لیے حیات کی طویل ترین مسافتوں سے کہیں بڑھ کر طویل ہو گیا. صرف ایک فرق کے ساتھ کہ وہاں ان مسافتوں کے دوران ہر لمحے قدم گنتے تھے.. شب و روز شمار کرتے تھے اور حساب کرتے تھے کہ کب یہ سفر ختم ہوگا.. اور یہاں یہ تھا کہ کہیں یہ سفر ختم ہی نہ ہو جائے.. اس سفر نے شاید اپنے پرانے پاپی من کو تو نہیں بدلا لیکن ایک عجیب عنایت ہوئی کہ عبارتوں اور شعروں میں بظاہر جو مفاہیم نظر آتے تھے وہ بدل گئے. پہلے کچھ اور نظر آتا تھا اور اب کچھ اور ہی نظر آنے لگا.. جیسا کہ حسرت کی اس غزل کے سلسلے میں وارد ہوا..

وہ جو یک طرفہ ٹریفک تھی وہ رُک گئی..

ہر عبارت اور ہر شعر میں کچھ اور ہی پوشیدہ نظر آنے لگا.

میری حالت جواب تک رہی تھی وہ حالت بدل گئی..

میں شاید نہ بدلا لیکن مفاہیم ایک نئے پیراہن میں ملبوس نظر آنے لگے جو اب تک میری نظروں سے اوجھل تھے اور یہ سب روضہء رسولؐ کی جانب بڑھتے ہوئے بدلا..

بلھے شاہ' بھٹائی' شاہ حسین اور عثمان فقیر اُس رنگ میں نظر نہ آئے جس میں دنیا کے رنگ تھے.. ایک اور رنگ میں رنگے نظر آئے.. یہ عشق کے ستائے ہوئے لوگ تھے اور میں بھی ان کی مانند کچھ مغلوب ہو رہا تھا.. وہ معتوب لوگ تھے اور شاید میں بھی معتوب ہو جاؤں.. یہاں تک کہ عام سستے قسم کے فلمی گانے بھی کچھ اور معانی رکھنے لگے.... سیوتی میرا دلبر جانی ہائے نیں.. مکھ موڑ گیا ہے.. دل توڑ گیا ہے.. یا پھر.. گلوں میں رنگ بھرے باد نو بہار چلے.. تو وہ کون ہے جس کے بغیر گلشن کا کاروبار نہیں چل سکتا..

تو مفاہیم بدل گئے.. یک طرفہ ٹریفک رُک گئی اور سوچ کی ٹریفک کسی اور سمت چل نکلی. مقلوب ہوگئی..

شیرینیِ نسیم ہے سوز و گدازِ میر
حسرت ترے سخن پہ ہے لطفِ سخن تمام

بے شک میرے سوز و گداز میں شیرینیِ نسیم ہے لیکن..

حسرت کے سخن پہ لطفِ سخن میرے لیے یوں تمام ہوا کہ اس میں قصویٰ کے سوار یار کے روشن جمال کے تذکرے تھے.. آتشِ گل سے دہکے ہوئے چمن تھے.. اُس کی جادو نگاہیاں تھیں..

میں روضۂ رسولؐ کی جانب بڑھتے ہوئے اُن شکل روشن چہروں کے ساتھ تو نہیں چلتا تھا واپس وطن میں.. اپنے گھر میں اخبار پڑھتے اس مارکسی مولوی کی غزل سنتا تھا اور اُس کے لطفِ سخن کی اثر انگیزی سے آنکھیں بھگوتا پھر سے بابُ السلام میں داخل ہو کر جمالِ یار کی روشنی میں جا تا تھا اور میرے گھر والے ذرا تشویش سے اور حیرت میں آئے ہوئے مجھے تکتے تھے.. کہ یہ ابھی یہاں تھا اور ابھی کہاں چلا گیا ہے..

؎ روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام

''کتھے مہر علی کتھے تیری ثنا.. میں اُسے دیکھوں بھلا کب دیکھا جائے ہے مجھ سے''

ہم نے تقریباً نصف مسافت طے کر لی تھی

اور اب منبر رسول کے علاقے میں سے گزر رہے تھے

چنانچہ منزل قریب ہو رہی تھی..

اور ہم منزل نہ کر قبول والوں میں سے نہیں تھے.

لاہور سے روانگی کے وقت میمونہ کے بھائی آفتاب نے اپنی سفید ریشمی ریش سہلاتے ہوئے جو اگلے دو چار برسوں تک ان کے گھٹنوں کو چھونے والی تھی سہلاتے اُسے سنوارتے.. ہم پر رشک کرتے کہا تھا کہ بھائی جان آپ جتنی دیر مکہ میں قیام کریں تو دوسرا کلمہ لگاتار پڑھتے رہیں اور جتنا عرصہ مدینہ میں نصیب ہو تو وہاں ہر سانس کے ساتھ درود شریف کا ورد کرتے رہیں اور ہم کر رہے تھے..

درود شریف کے سوا بھی تو بہت کچھ من میں آتا ہے.. اسی من میں جو پرانا پاپی ہے.. شب بھر میں مسجد تو بنا سکتا ہے لیکن نمازی نہیں بن سکتا.. تو اس من میں بہت کچھ آتا تھا

میں نے اس من کو ڈھیل بھی بہت دے رکھی تھی.

کہ جو جی میں آئے کر..

اور اس کے جی میں پنجابی کی صوفی شاعری آتی چلی جاتی تھی..

عجیب پہلے کبھی گمان میں نہ آنے والے معنی ظاہر ہوتے چلے جاتے تھے..

اور میں درود شریف کے علاوہ حضورؐ کو مخاطب کر کے جو شعر بھی یاد آتا تھا انہیں سناتا چلا جاتا تھا..

مولانا حالی آ گئے اپنی گردن کے گرد مفلر لپیٹے..

''وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا..''

اگرچہ اس سے پرے بھی مجھے... مرادیں غریبوں کی بر لانے والا.. اپنے پرائے کا غم کھانے والا یاد تو

آ تا تھا لیکن میں اس مصرعے پر اٹک گیا. ہکلا ہو گیا.. کہ وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا..

میں اس نبیؐ کو سلام کرنے جاتا تھا. سر کتا ڈرتا.. جاتا تھا..

پھر مجھے نہیں معلوم کہ ثریا کہاں سے آ گئیں.. ایک اداکارہ ایک گلوکارہ انہیں تو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا لیکن وہ آ گئیں.. چونکہ میں گانٹھ کا پکا' ہوشیار اور کھرا عقیدت مند تو نہیں تھا کہ عوام الناس کو رُلانے کے لیے صرف وہ بیان کرتا جو وہ سننا چاہتے تھے. ثریا کو سنسر کر دیتا..

ثریا آئیں اور اپنے اونچے ڈانسوں اور پنجابی پکار میں صدائیں دینے لگیں..

''بیچ بھنور میں آن پھنسا ہے دل کا سفینہ. شاہ مدینہ''

مجھے نہیں معلوم کہ ثریا کبھی شاہ مدینہ کے دربار میں حاضر ہوئیں یا نہیں.. لیکن ان کی یہ نعت حاضری کے مترادف ہے..

میں گواہی دے سکتا تھا کہ دل کا سفینہ بھنور میں آن پھنستا ہے اور فریاد صرف شاہ مدینہ سے کی جا سکتی ہے..

پھر حفیظ میرے لبوں پر آ گیا..

نہ تو کبھی اس جالندھری کی شاعری کو پسند کیا اور نہ اس کی شخصیت کو.. لیکن اس نے روضہ رسولؐ کو میری ناپسندیدگی کو روند کر میری ترجمانی کی.

سلام اے آمنہ کے لال محبوب سبحانی.

حفیظ زیادہ دیر نہیں ٹھہرا اور اس کی جگہ ایک ایسے شخص کا شعر لبوں پر نہ جانے کہاں آیا جو شاعر نہ تھا. تنگ بند مسخرہ ایک مخبوط الحواس تھا اور اس کے باوجود اس کے نصیب میں ایک ایسا شعر آ گیا جس نے اسے باشعور عالم فاضل شعراء سے ممتاز کر دیا.. یہاں تک کہ اقبال سے بھی بڑا ہو گیا

نبی کا جس جگہ پہ آستاں ہے
زمیں کا اتنا ٹکڑا آسماں ہے

نبی کے آستاں کی جانب چلتے سرکتے اور جھجکتے استاد امام دین گجراتی کا یہ شعر کیا اور کیسے کہا جائے کہ کیسے اثر کر رہا تھا. جس جگہ پہ.. وہ جگہ قریب آ رہی تھی.. جس جگہ پہ آستاں ہے.. زمین کا جتنا ٹکڑا آسماں ہو گیا تھا میں اس کے قریب ہو رہا تھا. سلجوق کے کندھے پر ہاتھ رکھے اپنا پرانا پاپی من جانے کیا کیا الاپ رہا تھا.. قابو میں نہ تھا.. کوئی تمیز نہ تھی اسے کہ یہ کون سا مقام ہے اور یہاں کے آداب کیا کیا ہیں.. کیا کہنا ہے اور کیا کہنے سے اجتناب کرنا ہے.. اس من کے من میں جو آ رہا تھا کہے جا رہا تھا.. اور حضورؐ سے مخاطب ہو کر کہے جا رہا تھا..

میرے لب ایسے ہل رہے تھے جیسے عرضیاں ٹائپ کر رہے ہیں.. ڈیئر سر میں نے کوئی کام نہیں کیا کافی سوری ہے شفاعت کی التجا ہے.. حشر دہاڑے بے حساب لوگوں میں سے مجھے ضرور پہچان لیجیے گا میرا ہاتھ

پکڑ کر سفارش کر دیجیے گا کوری کاپی پر کہیں صفر نہ لگ جائے کچھ نمبر دلوا دیجیے گا.. بے شک تھرڈ ڈویژن میں سہی لیکن پاس کروا دیجیے گا.. میں ایسی دعائیں بھی مانگتا جو ضابطہ تحریر میں لاتے سے گریز کر رہا ہوں کہ آپس کا معاملہ تھا جس میں کسی اور کو شریک نہیں کیا جا سکتا کہ شرک بھی تو گناہ ہے..

ہم تھے تو زمین پر لیکن آسمان کے ایک ٹکڑے کے قریب ہو رہے تھے.. نبیؐ کا جس جگہ پہ آستاں ہے.. جس جگہ.. آیا ہے بلاوا مجھے..

مجھے بچپن سے ایک بلاوا آ گیا..

یادداشت میں کچھ باقی نہ بچا تھا سوائے ایک کھنکتی ہوئی پُرسوز آواز کے.. متروک آواز کے ہمراہ اتنے ہی پُرسوز رُکتے رُکتے متروک ہو چکے سازوں کی سنگت.. پیغام صبا لائی ہے گلزار نبی سے.. آیا ہے بلاوا مجھے دربار نبی سے.. دربارِ نبی سے.. نہ لفظوں میں کوئی شان و شوکت اور نہ اظہار میں کچھ شدت.. جیسے کوئی اپنی مسرت پوشیدہ کرنے کی خاطر خود سے باتیں کرتا ہو.. سرگوشیاں خود سے ہو رہی ہوں کہ کوئی اور نہ سن لے.. پیغام آ گیا ہے.. بلاوا آیا ہے تو بس چپکے سے رخت سفر باندھ لو.. جلدی کرو.. اور اس باتیں کرتی دھیمی نعت کی یاد سے جو پُر بہار اثر ہوا ایسا ہوا کہ بدن گلزار ہوا.. گلزار نبی کی قربت سے کیسا گلزار ہوا کہ سو رنگ کے گل بوٹے میرے اندر کھلے اور مہک آور ہوئے ایسے ہوئے کہ میرے پاؤں مزید الجھنے لگے.. الجھنے لگے.. جیسے جوشِ گل بہار میں اڑتے ہوئے مرغ چمن کے پاؤں الجھتے ہیں.. پیغام صبا لائی ہے گلزار نبی سے.. آیا ہے بلاوا..

لیکن یہ جو جلتے لبوں سے عرضیاں ٹپ ٹپ ہوتی چلی جا رہی تھیں.. ڈیٹر سرکی درخواستوں کے ڈھیر لگ رہے تھے ایسے کہ راستے میں حائل ہو رہے تھے.. التجائیں اور سفارشیں ناکافی تھیں.. اس کی مدح میں لکھے گئے حرف جو مجھ پر برابر اثر کرتے جا رہے تھے یہ ایسے نہ تھے کہ مجھے پار لے جاتے..

ان سے ڈھارس نہ بندھتی تھی.. دل میں خوف کم تو ہوا تھا پر سراسر زائل نہ ہوا تھا.. یہ عرضیاں اور شعروں کی یہ کشتیاں ایسی نہ تھیں کہ ان کے سہارے پار اترا جا سکتا.. دریا پار رانجھن کے ڈیرے تک جایا جا سکتا..

اور آس پاس اس آس میں نظر کرتا تھا کہ کوئی ہے جو میرے ساتھ چلے.. اپنے ساتھ مجھے بھی اس کے ڈیرے تک لے جائے.. کوئی نہ تھا.. کیسے ہو سکتا تھا کہ ہر کوئی سہارے کی تلاش میں تھا کسی اور کو سہارا کیا دے..

اور کاغذ کی یہ درخواستیں اور شعروں کی کشتیاں تو ڈوب ڈوب جاتی تھیں ان میں سے کسی میں بھی مجھے پار تک لے جانے کا نہ حوصلہ تھا اور نہ صلاحیت..

بھیڑ گھنی ہونے لگی.. لب جو جلتے تھے بسمل ہونے لگے پھڑکنے لگے اور میں محسوس کر سکتا تھا کہ پاؤں تلے جو قالین بچھا تھا اس کے گل بوٹے نمی سے نمایاں ہو رہے ہیں.. وہ رخساروں سے گرنے والے آنسوؤں کو کہاں تک جذب کر سکتا تھا.. نبی کا جس جگہ پہ آستاں تھا یہ اس کی قربت کے نم کرشمے تھے جو پاؤں تلے بچھے

جاتے تھے..

پھر جیسے غیب سے مدد آ گئی..

ایک کشتی صرف میری خاطر ساحل تمنا کے ساتھ آ گئی..

عثمانی گنبدوں کی نیلاہٹ میں ایک لمبی رنگین دُم والا غشپ پرندہ تیرا اور ایک ایسے مصرعے کی صورت میں مجھ پر وارد ہوا کہ مجھے پار لے گیا..

میری بے بسی اور بے دھیانی میں اُترا اور نہ صرف گلزار نبی میں بلکہ بدن کے گلشن میں بھی چہکنے لگا..

کتھے مہر علی' کتھے تیری ثنا..

بس یہی تو عرض کرنا چاہ رہا تھا اور عرض کے لیے ہر حرف ناکافی ہو رہا تھا، تو بس میں تو فارغ ہو گیا. اطمینان سے سکون میں ہو گیا کہ جو عاجز تھا اس نے عجز کا ایسا اظہار کیا کہ ایک لمحے کے لیے پُر تکبر ہو گیا کہ بابا جی ہم نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں. یہی ہماری اوقات ہے جو مہر علی نے بیان کر دی ہے اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے.. کہاں میں اور کہاں تیری ثنا. کیا یہ کافی نہیں ہے حضور.. کہ کتھے میں مستنصر تے کتھے تیری ثنا..

بس اس ایک مصرعے کا ورود اُس لمبی دُم والے رنگین پرندے کی چہکار مجھے پار لے گئی..

میں اس مصرعے سے آگے "گستاخ اکھیاں کتھے جا لڑیاں".. تک بھی نہیں گیا.. اس مرغ گلزار نبی کے پاؤں تو پہلے مصرعے میں ہی اُلجھ گئے.. ایسے کہ کسی اور بیان کے گلزار میں جانے جوگا ہی نہ رہا.. حاجت ہی نہ رہی.. اسی میں پاؤں الجھائے چلتا رہا..

اس ایک مصرعے کا ورود مجھے پار لے گیا..

کتھے مہر علی..

یہ "کتھے.." اشارہ کر رہا تھا اُس کہاں کی جانب جو تحت السرا میں کہیں تھا.. جہاں روگردانیاں تھیں.. اعمال کی سیاہیاں تھیں ایک اتھاہ گہرائی تھی اور کوری کایاں تھیں.. اور میں وہاں تھا..

کتھے تیری ثنا..

اور یہ دوسرا "کتھے".. یہ دوسرا "کہاں" بلند ہوتا عرش سے بھی پار ہوا جاتا تھا..

ایک "کہاں" مستنصر کو ایک کھائی کی اتھاہ گہرائی میں مقیم کرتا ہے.. اور دوسرا "کہاں" اس گہرائی سے زمین پر آتا ہے اور وہاں سے عرش منور تک جا کر اس کے دروازوں پر دستک دیئے بغیر کہ وہ بھی اس "کہاں" کی آمد کے منتظر ہیں پار چلا جاتا ہے.. پار.. جہاں فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں.. جہاں تک جانے کے لیے ایک ایسی سفید سواری مہیا ہے جو بقول نبی کے جہاں تک آخری نظر جاتی ہے اس کا ایک قدم وہاں تک

جاتا ہے.. اور اس کے باوجود واپسی پر گنڈی ابھی تک لرزش میں ہے.. تو یہ دوسرا "کہاں" وہاں تک جا رہا ہے..

تو اس سے بڑھ کر لاچارگی اور کم مائیگی کا اقرار اور کیا ہو سکتا ہے..

چنانچہ اقرار کے اس اظہار نے مجھے بے خوف اور آزاد کر دیا.. شدید ڈر اور اضطراب کو پل بھر میں رخصت کر دیا..

اس ایک مصرعے نے میری کوری کاپی کے ہر صفحے کو بھر دیا.. گھر کا کام جو میں نے نہیں کیا تھا وہ اس نے کر دیا اب بے شک چیکنگ ہو جائے میں فیل ہونے والوں میں سے نہیں تھا.. اور پہلی بار.. جو آنکھیں صحرا کی خشک لکڑی کی مانند چٹختی تھیں.. اُن میں کبھی نمی کا ایک ذرہ نمودار ہوتا بھی تھا تو سوکھ جاتا تھا ان آنکھوں نے پلکیں جھپکائے بغیر جھڑیاں لگا دیں.. اج نیناں لائیاں کیوں جھڑیاں..

نہ آہ وزاری کی.. نہ اپنے گناہوں پر شرمندگی کے باعث ایسا ہوا.. آنکھوں نے خود ہی فیصلہ کیا کہ اس بے مقصد حیات میں صاف شفاف بہت سے منظر دیکھے لیکن اب نمی سے جھلملاتا یہ منظر بھی دیکھ لو.. ایک آبشار کے پار.. ایک جھرنے کے پار بھی دیکھ لو.. ندی کے پانی اور آنکھوں کے پانی میں صرف جذبات کا فرق ہوتا ہے تو ذرا دیکھ لو کہ جذبات سے کیا فرق پڑتا ہے.. میں نے ان آنسوؤں کے لیے کچھ تگ و دو نہ کی تھی.. نہ پشیمانی کی کچوکے دے کر انہیں گرنے پر مجبور کیا تھا اور نہ نبی کی محبت کی آڑ لے کر انہیں بہایا تھا.. اور نہ عقیدت کی آہ و فغاں سے انہیں سوتے ہوئے جگایا تھا.. مجھ سے مشورہ کیے بغیر یہ آنکھوں کا اپنا فیصلہ تھا..

ان جھرنوں کے گرنے سے شاید اس گلزار نبی میں بچھے قالین کا کوئی ایک بوٹا ہرا ہو گیا ہو گا.. کسی ایک گل کا رنگ ذرا شوخ ہو گیا ہو گا..

قربت مزید ہوئی تو ایک تغیر رونما ہوا..

تبدیلی ایک عجب ہوئی..

ایک ساعت میں.. جو مجھ ایسے حاضری کے تمنائی اور آس پاس لوگ تھے اور ان میں ظاہر ہے میں بھی تھا.. وہ وہی تھے جو وہ تھے.. اگرچہ ہم شکل اور ہم شباہت ہو چکے تھے لیکن وہی تھے.. اور ایک ساعت اس مسافت میں ایسی آئی کہ وہ مختصر ہو گئے..

سمٹ گئے..

اُن کے قد مختصر ہو گئے..

چھوٹے ہو گئے..

میرا قد بھی گھٹ گیا..

سب کے قد و قامت تحلیل ہو رہے ہیں.. گھٹتے جاتے ہیں.. صرف ان کے لرزتے لب پھڑکتے جنبش کرتے اور جھکے ہوئے سر باقی ہیں..

یہ کون سا ایسا مقام آ گیا ہے..

جو پل بھر میں قد و قامت اور تفاخر گھٹا دیتا ہے..

بی بی فاطمہ کے گھر کی دیوار آ گئی تھی.. اور ان کے برابر میں رسول کے حجرے کے آثار آ گئے تھے..

جب مجھے ایسا لگتا ہے یوں محسوس ہوتا ہے کہ نہ صرف میں بلکہ آس پاس کے لوگوں کا قد بھی مختصر ہو گیا ہے تو یہ ہرگز نہیں کہ ہم سب بونے ہو گئے ہیں.. سچ مچ مختصر ہو گئے ہیں.. نہیں، ہرگز نہیں..

روضۂ رسولؐ سے وصال کی جو ساعت قریب آتی ہے.. وہاں کا موسم جو بھی ہو اسے بدن پر ہولے سے باد نسیم کے ایک جھونکے کی مانند.. اسے چھوتا ہے.. تو اس کی خوشگواری اور کیف ایسے مست کرتے ہیں کہ سر تو جھکے ہوتے ہیں، کندھے بھی جھک جاتے ہیں.. جتنا جھکا جا سکتا ہے اتنا ایک انسان جھکا جاتا ہے.. جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جاتا ہے.. لیکن یہ بیماران ایک وجہ ہوتی ہے یونہی بے وجہ قرار نہیں آتا.. انہیں اس وجہ کے طفیل جس وجہ کے لیے وہ یہاں آئے ہیں اس کی قربت انہیں قرار دیتی ہے..

سرگوشیاں مزید مدھم ہوتی جاتی ہیں..

لب ہلنا بھول جاتے ہیں..

ایسا قرار آتا ہے کہ کچھ مانگنا.. جھولی پھیلانا بھی بھول جاتا ہے..

کہ جو کہنا تھا وہ کہہ چکے.. جو مانگنا تھا وہ مانگ چکے اب صرف دیکھنا تھا اسے جس سے مانگ رہے تھے.. جس کے واسطے سے مانگ رہے تھے.. بس اسے دیکھنا ہے..

اسے.. جسے محبوب قرار دینے والا دلوں کے حال جانتا ہے.. تو وہ بھی جانتا ہو گا جو اس کا محبوب ہے کیونکہ ان کے درمیان کوئی پردہ تو تھا نہیں.. جو اس نے جانا وہ گویا اس نے بھی جانا.. تو اصل میں دونوں ایک ہیں..

ڈر میرے بدن سے کب کا رخصت ہو چکا تھا اس کی جگہ اشتیاق دھونی رمائے شانت بیٹھا تھا.. میں ایک اعتماد اور یقین کے ساتھ چلتا تھا کہ میری کاپی اب کوری نہیں رہی.. کتھے مہر علی کتھے تیری ثنا سے بھر چکی ہے..

نہ وہاں کچھ سرزنش ہو گی اور نہ کوئی پرسش.. نہ سزا ملے گی.. دس کے دس نمبر دے کر مجھے پاس کر دیا جائے گا..

البتہ اس شانتی اور سکون میں ایک گھبراہٹ ایسی تھی جو مجھے حواس باختہ کرتی تھی.. دو چار ہاتھ لب بام رہ گیا تھا.. کہیں اب میں گر نہ جاؤں.. کہیں گرایا نہ جاؤں.. وہاں تک پہنچ نہ پاؤں.. اور اگر پہنچ بھی جاؤں تو ڈاچی والا انجن چل نہ دے.. اپنے حجرے سے کوچ نہ کر جائے.. یا پہریدار اعلان کر دیں کہ بس حاضری کا وقت تمام ہوا.. جس نے سلام کرنا تھا سو کر لیا.. جو نہیں کر سکا وہ پھر کبھی قسمت آزمائے..

یہ کوئی انوکھی گھبراہٹ نہ تھی..

ہر مسافر.. ہر کوہ نورد اسی کیفیت میں سے گزرتا ہے..

لمبی اور دشوار مسافتوں کے بعد جب منزل قریب آتی ہے تو یہی کھد بد کھلبلی مچاتی ہے کہ جانے میں پہنچ پاؤں گا یا نہیں..

کہتے ہیں کہ سنولیک اس برف کے انبار کے پار ہے تو کیا میں اسے عبور کر کے اس تک پہنچ پاؤں گا یا نہیں.. راستے میں کوئی دراڑ آ گئی تو کہیں اس کی اتھاہ گہرائیوں میں گر نہ جاؤں..

ہر مسافر اسی کیفیت میں سے گزرتا ہے..

پھر وہ جھیل آ گئی جس کے نیلے پانیوں میں میرا سفید کنول تیرتا تھا..

بائیں جانب اس جھیل کی سنہری جالیاں تھیں جن پر کشیدہ کاری کے منظر دِکھتے تھے.. یہاں سے میں اس کشیدہ کاری میں کاڑھے ہوئے حروف پڑھنے سے تو قاصر تھا..

البتہ یہ تو خوب آگاہ تھا کہ آگے کچھ نہ کچھ کشید ہو رہا ہے

مے خواروں کی پیاس بجھانے کی خاطر کچھ بندوبست کیا جا رہا تھا

ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے.. بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے..

یہ شیشہ تو ہمیشہ بھرا رہتا تھا اور اس میں جو مے تھی اس کے کم ہو جانے کا امکان ہی نہ تھا کہ بہ قدر ظرف مے خوار جتنی پیتے تھے اس قدر.. اتنی ہی کشید ہو کر پھر سے اس شیشے کو بھر دیتی تھی..

تو شیشے میں مے بہت باقی تھی..

کیا میرے ایسے پیاسے مے خوار کے لیے بھی بہت باقی تھی..

اب ایک اور مسئلہ درپیش ہو گیا...

جس جھیل کے نیلگوں پانیوں میں میرا سفید کنول تیرتا تھا وہ سنہری جالیوں کے عقب میں روپوش تھا..

سنہری جالیوں میں سے جھانکنے کے یہ اندرون کے سحر کو ایک نظر دیکھنے کے لیے ایک نہیں تین چار روزن تھے.. اور وہ بھی بالشت بھر کے.. تو اس مختصر لمحے میں جب میں سامنے سے گزروں گا.. رُک نہیں سکتا.. چلتا چلتا نگاہ کروں گا تو کس روزن میں جھک کر جھانکنا ہے.. اور نہ جھانک سکا یونہی گزر گیا تو کیا ہو گا..

میں پہلا روزن آنے سے پیشتر ہی ذرا جھک گیا..

"رُکیں نہیں ابو.. چلتے جائیں.. آہستہ آہستہ"

"بیٹے کس روزن میں سے جھانکنا ہے.. کس میں.. کس میں بیٹے؟"

"پہلے کے اندر کچھ نہیں.. ستون کے بعد جالیوں میں گول دائرہ سا ہے اس میں.. وہی ہے.. پہلے دو روزن نہیں.."

اور اب اضطراب ایسا طاری ہوا.. ہاتھ پاؤں پھولنے لگے کہ سلجوق نے دھیمے لہجے میں جو کچھ کہا ہے کیا کہا ہے.. پتہ نہیں کون سا روزن ہے اور میں کیا سمجھا ہوں.. سنہری جالیوں میں جو چار روزن ہیں وہ گڈمڈ

ہو رہے ہیں، آؤٹ آف فوکس ہو کر دھندلا رہے ہیں.. آگے پیچھے ہوتے جاتے ہیں.. ایک مقام پر ٹھہرتے ہی نہیں اور سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ان میں کس کو فوکس میں رکھنا ہے...

میں نے ڈرتے ڈرتے کہ سلجوق برا نہ مان جائے کہ وہ بھی تو ایک کیفیت سے دوچار تھا اور میں اسے بار بار ڈسٹرب کر رہا تھا، پھر پوچھا "بیٹے ایک مرتبہ پھر بتا دو.. کون سا؟"

اور اس کے جواب دینے سے پیشتر میں جان گیا.. میں مزید مختصر ہو گیا.. بدن ہر گنجائش کی حد عبور کرتا اور جھکنے لگا..

سونے کی ایک گھنی بوند.. جو ٹپکنے سے پیشتر ابھی گول حالت میں ساکت ہوئی ہے سنہری جالی میں ٹھہری ہوئی ہے.. اور اس بوند کے اندر دہ تھا.. وہی تھا.

میں اُس سے آنکھیں لگا تو نہیں سکتا تھا کہ راستے میں ریلنگ تھی جو مجھے روکتی تھی.. میں ریلنگ تھام کر اپنے حواس، محبت اور اشک اور آنکھیں اس روزن کے قریب کر دیتا ہوں.. اندر نگاہ کرتا ہوں..

اندر تو ایک گھپ اندھیرا ہے.. کچھ دکھائی نہ دیتا تھا..

یہ پہلی نظر تھی جس نے سوائے تاریکی کے اپنے سامنے اور کچھ نہ پایا..

اور ایک نظر کچھ نہ دیکھنے کے بعد جب میں نے پلکیں جھپکیں تو جالیوں میں ٹھہری ہوئی گھنی بوند کے اندر.. کچھ نظر آیا.. یہ نہیں کہ صاف نظر آیا اور کوئی پہچان ہوئی نہیں.. بس تاریکی کے پردے ذرا ہلکے ہوئے تو ان میں کچھ دکھائی دیا..

جیسے رات کے وقت یکدم بجلی چلی جانے سے ہر جانب نابینائی راج کرنے لگتی ہے.. پھر آہستہ آہستہ اس کی عادت ہونے لگتی ہے.. کچھ کچھ غیر واضح اور بغیر پہچان کے سجھائی دینے لگتا ہے.. لیکن یہاں نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے کہ اشتیاق اور جذب کی لہریں مجھے پیچھے سے دھکیلتی تھیں کہ کیا بُت بنا کھڑا ہے.. چل.. راستہ دے.. اور بھی تجھ سے بڑھ کر ڈوبے ہوئے منتظر ہیں چنانچہ یہاں آہستہ آہستہ عادت ہونے کی کچھ گنجائش نہ تھی اور نظر بھی جانتی تھی اسی لیے پہلی نظر کے بعد دوسری نظر ہی گھٹاٹوپ اندھیرے میں کچھ کچھ دیکھنے لگی.. ایک نظر اس سنہری بوند کے پیچھے زمیں کا جتنا ٹکڑا آسماں تھا اس پر معلق سبز گنبد تک گئی تھی تو وہیں رہ گئی تھی.. اور یہ دوسری نظر بھی جو سنہری بوند کے اندر گئی ہے تو وہاں سے نہیں لوٹی..

اندر ایک نیم تاریک صدیوں سے ٹھہرا ہوا سکوت تھا.

میں جھکا ہوا.. اپنے بدن پر پیچھے سے دھکیلتی اشتیاق اور جذب کی لہریں سہارتا ریلنگ پر ہاتھ رکھے سنہری جالیوں کی کشیدہ کاری میں جو روزن تھا.. اک چھوٹی سی کھڑکی تھی.. واحد کھڑکی جو دو جہان پر کھلتی تھی کہ وہاں آقا کا بسرام تھا میں اُس میں سے جھانکتا تھا..

دل سے شوقِ رُخِ نکو نہ گیا — تانکنا جھانکنا کبھو نہ گیا

بس یہی وہ ہٹ کنا جھانکنا تھا.. شوق رخ نکو دل سے کیسے جاتا..

جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں..

نقش قدم تو گیا اس کے سراپے کو ہم دیکھتے ہیں..

اندر ایک نیم تاریک صدیوں سے ٹھہرا ہوا سکوت تھا..

تاریکی میں بینائی آتی جاتی تھی..

ایک سبز پیراہن واضح دکھائی دے رہا تھا جس پر آیات قرآنی کے گل بوٹے لالہ و گل کی مانند نمایاں ہو رہے تھے.. خاک میں یہ صورت تھی کہ جو پنہاں ہو گئی.. سبز پیراہن کے بالائی حصوں پر کناروں پر شوخ سرخ رنگ کی ایک پٹی.. صحرا میں غروب آفتاب کے بعد کے اُفق کی مانند سرخ اور زندہ.. جس پر کاڑھے ہوئے مقدس حرف اس نیم تاریکی میں بھی دکھتے تھے.. رنگینیوں میں ڈوب گیا پیراہن تھا..

اور ہاں یہ تانک جھانک صدیوں یا پہروں پر محیط نہ تھی..

محض دو چار ثانیے تھے..

ایسے ثانیے جو دو چار بار آنکھیں جھپکنے سے گزر جاتے ہیں..

محض ایک آدھ جھانک تھی..

صرف ایک آدھ جھات تھی.. پیر وارث شاہ کی پنجابی ''جھاتی'' تھی.. لیکن اس ایک جھاتی سے دل کے ایسے بوہے اور باریاں کھل گئے جن کے بارے میں.. جن کی موجودگی کے بارے میں میں اب تک لاعلم تھا..

یہ در اور یہ کھڑکیاں کہاں سے آ گئے.. میں تو ان کے وجود سے آگاہ نہ تھا.. میرا تو یہی گمان تھا کہ اس دل میں کوئی دروازہ نہیں کوئی کھڑکی نہیں..

یہ ایک گنبد بے در کی مانند صرف اپنی گونج سنتا ہے.. سوائے اپنے اور کسی کی نہیں سنتا اور اب یہ ہے کہ ان دروازوں اور کھڑکیوں میں سے ایک ایسی ہوا چلی ہے کہ یہ دل میری بھی نہیں سنتا.. مجھ سے ایسا باغی ہوا ہے کہ یہ پروا بھی نہیں کر رہا کہ وہ جو دھڑکنا بھول رہا ہے تو اس کے نتیجے میں میں مر جاؤں گا..

ایسی ہوا چلی کہ بہت سے تنکے شک شبہ کے یہ ہوا اڑا لے گئی..

میں جو ایک عادی کھوٹا سکہ تھا.. بہت دیر تک کھرا نہیں رہ سکتا تھا.. بے شک اس کے سیاہ پوش گھر کے گرد پھیرے لگاتے میں کھرا تو ہوا تھا لیکن خانہ کعبہ سے باہر آیا ہوں تو پھر سے زنگ چڑھنے لگا.. ایسا تہہ در تہہ زنگ چڑھا کہ کچھ پہچان نہ ہو پاتی تھی کہ یہ سکہ کون سے زمانے کا ہے.. تو ابھی میں پھر سے کھوٹا تھا اور ابھی سے پھر میں کھرا ہو گیا..

اس ایک ''جھاتی'' نے سب زنگ اتار دیا.. کہ میں ابھی تک کھرا اور نو ان نکور ہوں.. بے شک کسی بازار میں آزما لیا جائے.. کوئی دکاندار انکار نہیں کرے گا..

اس ایک "جھاتی" کے دوران جھکے ہوئے جھانکتے ہوئے پہلے تو میں نے بلند آواز میں اسے نہایت بے تکلفی سے ایسے سلام کیا جیسے یاروں کو کرتے ہیں اور پھر باب السلام سے چلتے ہوئے یہاں تک پہنچتے ہوئے جتنی بھی عرضیاں ٹائپ کی تھیں.. التجاؤں اور سفارشوں کی درخواستیں لکھی تھیں وہ سب کی سب اس لمحۂ مختصر میں اس کے سامنے ڈھیر کر دیں..

اور میں جو فیل ہونے سے ڈرتا تھا جان گیا کہ میری کوری کاپی پر انہوں نے دس کے دس پورے نمبر لگا کر مجھے امتیازی حیثیت میں پاس کر دیا ہے..

اگر وہ قبول کر لے.. وہ پاس کر دے تو اس جہان میں کیا سب جہانوں میں کون ہے جو مجھے فیل کرنے کی جسارت کر سکتا ہے..

جالیوں کی درزوں میں سے مجھے حضور کے بیراہن کی سبز اور سرخ مہک آتی تھی، مجھ تک آتی تھی ان کے اوڑھے ہوئے غلاف کی جادوگری نے مجھے اسیر کر لی اور مجھ جھاتیاں مارنے والے.. تاک جھانک کرنے والے شخص کے تن بدن میں دھوم مچاتی تھی..

کیتھے مہر علی.. کیتھے تیری ثنا..

پہرے دار مجھے.. اشارے سے.. خشونت اور برہمی سے نہیں جو کہ خانہ خدا کے رکھوالوں کی خصلت ہے بلکہ نرمی اور مسکراہٹ سے درخواست کرتے تھے کہ آپ رکو نہیں.. آگے ہوتے جاؤ.. تمہارے پیچھے آنے والے بھی تو اس جھاتی کے تمنائی ہیں اور دور کے شہروں سے اس شہر میں آئے ہیں.. تو ان کے لیے جگہ خالی کر دو..

اور میرے پیچھے آنے والے جتنے بھی تھے ان سب کی آنکھیں میری پشت پر جلتی تھیں.. کہ اور کندھوں کے درمیان چھید ڈالتی تھیں.. مسلسل یہ منتظر آنکھیں دستک دیتی تھیں کہ بس ہمیں راستہ دے دو.. ہم بھی تو بہت دور سے آئے ہیں.. کہاں کہاں سے آئے ہیں کیا بتائیں.. اس دنیا کا کون سا کونہ ہے جہاں سے ہم نہیں آئے.. تم سے کہیں بڑھ کر طویل پر مشقت اور جان لیوا مسافتیں طے کر کے آئے ہیں تو ہمیں بھی جھانک لینے دو.. تمہیں کیا خبر کہ جب کوئی چینی بی آن سے چلتا ہے تو کیسے یہاں تک پہنچتا ہے.. نہ تم یہ جانتے ہو کہ داغستان کے مسافروں پر کیا گزرتی ہے.. تم بھی آگاہ نہیں ہو سکتے کہ مالی کہاں واقع ہے.. ٹمبکٹو کے صحرائی شتر سے جو آتے ہیں تو کیسے صحراؤں کو عبور کر کے آتے ہیں.. تم تو آسائش سے لاہور سے اڑے اور جدہ سے اپنے بیٹے کے گھر پہنچ گئے اور وہاں سے یہاں پہنچ گئے.. تو ہمیں بھی جھانک لینے دو.. ہم اپنے دور کے شہروں میں جس نظارے کو ترستے تھے اسے دیکھ لینے دو.. راستے کی دیوار نہ بنو.. دیکھ لینے دو.. ہم دور کے شہروں سے آئے ہیں اور ہم بھی یہی عرض کرنے آئے ہیں کہ کیتھے مہر علی کیتھے تیری ثنا..

''بابا پہچان رہے ہیں کہ یہ مستنصر کی ہی پلکیں ہیں جو دستک دیتی ہیں''

اور وہاں سے ہٹ جانے پر کچھ قلق کچھ تاسف نہیں ہوتا.. ان کے لیے جگہ خالی کر دینے پر کچھ افسوس نہیں ہوتا.. آپ بخوشی ان کے راستے سے ہٹ جاتے ہیں جو دُور کے شہروں سے آئے ہیں..

میں ہٹ رہا تھا.. آگے بڑھنے کو تھا.. باب جبریل کا رُخ کیے وہاں سے نکل جانے کو تھا جب سلجوق نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ''باہر نہیں جانا ابو.. ادھر آ جائیں..''

''کدھر؟''

''ادھر..''

سلجوق نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے اس بہاؤ سے الگ کیا اور باب جبریل سے باہر جانے کی بجائے الٹے قدموں پیچھے ہوتا گیا.. یہاں تک کہ ہم مسجد نبوی کی دیوار کے ساتھ آن کھڑے ہوئے.. اب صورت حال کچھ یوں تھی جیسے ہم لوگوں کی بہتی ندی کے اس کنارے پر ہیں اور اُس کے پار.. ہم سے چند قدم کے فاصلے پر روضہ رسول کی سنہری جالی کا پورا منظر جیسے فریم میں جڑا ہوا دکھائی دے رہا ہے.. زائرین کے بہاؤ میں سے کبھی کبھار مجھے وہ خاص روزن بھی نظر آ جاتا.. یہ صرف سلجوق ایسا اکثر ملاقاتیں کرنے والا زائر ہی جان سکتا تھا کہ روضہ رسول کے آگے جو روانی ہے اس میں سے نکل کر پیچھے ہٹتے ہوئے ستونوں کے پیچھے مسجد نبوی کی دیوار سے لگ کر انسان اطمینان سے کھڑا ہو سکتا ہے اور نظارہ کر سکتا ہے.. یہاں کھڑے ہونے پر کوئی پابندی نہیں.. یہ سہولت اور نصیب میرے گمان میں بھی نہ تھے کہ عین سامنے کھڑے رہو اور کوئی ہٹانے والا نہیں.. جو نہیں کہہ سکے وہ کہتے رہو.. پڑھتے رہو روتے رہو آنکھیں سرخ کر لو جو جی میں آئے کرو.. اور جی میں بس یہی کچھ آتا ہے..

ابھی چند لمحے ہی اس اطمینان اور لطف کے گزرے تھے کہ مغرب کی اذان بلند ہونے لگی.. اس کے بعد وقفہ نہیں ہوتا.. فوری طور پر نماز شروع ہو جاتی ہے.. اس حساب کتاب کا ماہر بھی سلجوق ہی تھا کہ کب اور کس وقت باب السلام میں داخل ہوا جائے کہ روضہ رسول تک پہنچتے پہنچتے مغرب کی اذان ہو جائے اور نبیؐ کے

آس پاس نماز کے لیے جگہ مل جائے۔ جہاں صرف چند لوگوں کے لیے ہی جگہ ہوتی ہے..ہم سے آگے صرف دو صفیں کھڑی تھیں اور ان کے سامنے مسجد نبویؐ کی دیوار تھی..اور ہمارے پیچھے بھی صرف دو یا تین قطاریں تھیں اور ان کے پیچھے روضہ رسولؐ کی جالی تھی.. یہاں کھڑے ہونے کے لیے بہت ہمت درکار تھی.. بدن تو پہلے ہی حضورؐ کو دیکھ لینے انہیں سلام کر لینے کے پُرمسرت اضطراب کے الاؤ میں دہک رہا ہوتا ہے اور جب ان کے آس پاس کے لوگوں میں سانس لیتے ہوئے آپ نماز کی نیت کرتے ہیں تو ٹانگوں میں سکت نہیں رہتی کہ کس مقام پر کھڑے ہیں..

لیکن خوش بختی کا یہ احساس تادیر نہ رہا، نماز ادا کرتے ہوئے میں بھٹکنے لگا.. بھولنے لگا. ابھی تو ناز تھا کہ کس مقام پر کھڑے ہیں اور ابھی افسوس نے جڑیں پکڑ لیں کہ اس مقام پر کیوں کھڑے ہیں... ڈاچی والا جہاں خواب میں تھا میں اس کی آرام گاہ سے منہ موڑے پشت کیے کھڑا تھا..

منہ تو وَل کعبے شریف تھا.. لیکن اس کی خوابگاہ سے منہ موڑے کھڑا تھا.. پشت کیے کھڑا تھا..

میں نے اتنا مجرم محسوس کیا کہ میں آسانی سے نماز منقطع کر سکتا تھا کیسی گستاخی ہو رہی تھی.. پھر میں نے نماز کے دوران ہی ان سے مخاطب ہو کر درخواست کی کہ یا رسول اللہؐ یہ آپ ہی کا فرمان ہے کہ نماز کے لیے کعبہ کا رخ کرو..تو آپ کی اطاعت میں ہی ایسا کر رہا ہوں. بس بے دھیانی میں یہاں آن کھڑا ہوا. آیندہ یہ گستاخی نہیں ہوگی. معاف کر دیجیے..

بے شک اس مقام پر نماز پڑھنے میں بہت ثواب ہوگا. مسجد نبویؐ کی اگلی صفوں میں روضہ رسولؐ کے دامن میں اتنی نزدیکی میں کہ اگر وہی زمانے ہوتے اور دن کا وقت ہوتا تو جہاں میں تھا رسولؐ کے گھر کی کچی دیوار کا سایہ یہاں تک ہوتا.. یہ تو نہ ہوتا کہ میں جس کے سائے میں ہوتا اسی سے منہ موڑ کر کھڑا ہو جاتا.. اتنا بے ادب تو نہ ہوتا.. تو میرے گھنے سایہ دار شجر مجھے معاف کر دیجیے..

میرے پرانے پاپی من میں یہ بھی خیال آتا رہا کہ اتنی وسیع مسجد ہے ان زمانوں میں جتنا مدینہ تھا آج یہ مسجد اتنی بڑی ہے اور یہ جگہ روضہ رسولؐ کے آگے باب جبریل کے پہلو میں اتنی چھوٹی سی ہے تو یہاں اگر نماز نہ بھی پڑھی جائے تو کچھ حرج ہے.. جالی کے سامنے یہ چھوٹی سی جگہ خالی چھوڑ دی جائے.. ان کے احترام میں تو کیا حرج ہے.. چھوٹے موٹے نوابوں اور عارضی بادشاہوں کی خدمت میں حاضر ہونے والے بھی سلام عرض کرنے کے بعد الٹے قدموں چلے آتے ہیں تاکہ ان کی جانب پشت نہ ہو تو... تو اس دین دنیں کے شاہ سے کیسے منہ موڑ کر بے شک وہ نماز ہی کیوں نہ ہو کیسے پڑھی جا سکتی ہے..

ان کے پاؤں کی جو خاک بھی نہیں جو بزرگ جہاں دفن ہیں ان کے مرقد سے منہ موڑتے ہوئے جھجک محسوس ہوتی ہے تو..

یہ شرک کا تو مسئلہ ہی نہیں، محض آداب محفل کا معمولی سا تقاضا ہے..

صرف ان کی آرام گاہ تو نہیں ہے' جس کی جانب پشت کیے کھڑے ہو.. ان کا گھر ہے وہ خود ہیں..
پیغمبر اسی مقام پر دفن کیا جاتا ہے جہاں وہ فوت ہوتا ہے' انہوں نے خود کہا تھا اور وہ اپنے حجرے میں اسی مقام پر.. عین اسی جگہ جہاں وہ لیٹے ہوئے تھے' وہاں دفن ہیں' اپنے گھر میں..
مجھے اندازہ تو نہیں کہ حجرہ مبارک کا دروازہ جس پر سیاہ کمبل کا پردہ پڑا ہوا تھا' اس کا رخ کدھر کو تھا..
بلکہ دروازہ تو تھا نہیں صرف چوکھٹ تھی جس کے آگے یہ سیاہ کمبل تھا.. شاید اس کا رخ ادھر ہی تھا جدھر پشت کیے میں کھڑا تھا..

وہ ابھی باہر آ گئے تو مجھے یوں منہ موڑے کھڑا دیکھ کر کیا کہیں گے.. تم بھوکے تھے' میں تمہیں صفہ کے تھڑے سے اٹھا کر اپنے ساتھ حجرے میں لے گیا تھا اور کھانے کو کھجوریں اور پینے کو دودھ کا ایک پیالہ دیا تھا اور اب منہ موڑے کھڑے ہو.. لیکن وہ تو احسان کرتے تھے' جتاتے نہ تھے.. مجھے اس بے ادبی پر کچھ نہ کہیں گے.. بس مسکرائیں گے اور معاف کر دیں گے..

اور جب وہ مسافتوں اور غزوات سے لوٹتے ہوں گے تو یقیناً قصویٰ یہیں جہاں میں کھڑا تھا شاید یہیں یا اس کے آس پاس کہیں بیٹھتی ہو گی.. اپنی اگلی ٹانگوں کو خم دے کر سکیڑ کر زمین پر بیٹھتی ہو گی اور ران پر اپنی لمبی گردن رکھ دیتی ہو گی تا کہ حضور کو اترنے میں آسانی ہو.. اگر اس اونٹنی کی مینگنیوں کے مقام پر قدم دھرتے دل شرمندہ ہوتا تھا تو..

اگرچہ نماز مغرب کی تھی.. سماں رات کا تھا.. روشنیوں کی بہتات حد سے باہر اور سنہری فانوسوں کی چکاچوند تھی' پھر بھی حضورؐ کے گھر کا سایہ مجھ تک آتا تھا.. یہ روشنیاں یہ چکاچوند نہ بھی ہوتی بلکہ نہ ہوتی تو اچھا تھا پھر بھی میں ان کے سائے میں روشن رہتا.. تو میں ان کے سائے میں آیا ہوا ان سے مسلسل معافی کا طلب گار ہوتا تھا اور بار بار اپنے آپ کو مطعون کرتا تھا کہ یہاں کیوں کھڑے ہوئے ہو اور یوں.. ان کی جانب پیٹھ کیے.. اور بار بار اپنے آپ کو روکتا تھا' اس شرک کے بوٹے کو اپنے بدن اور ارادے میں سے پھوٹنے سے روکتا تھا جو خدانخواستہ مجھ پر غالب آ جاتا تو میں کعبہ کی جانب سے رخ موڑ کر حضور کی ہری دیوار کی طرف چہرہ کر لیتا..
بس ایک لمحے کے لیے انہیں ''سوری'' کہتا اور پھر منہ وَل کعبے شریف کر لیتا.. اگرچہ انہوں نے ان قوموں پر لعنت بھیجی جنہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا.. لیکن میں تو رب کعبہ کو سجدہ کرنے کے سوا کسی اور کو سجدہ کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا.. میں پرستش کرنے کے لیے تو ہرگز اپنا کعبہ نہ بدلتا.. محض ایک ساعت کے لیے حضور کے روبرو ہونے کی خاطر.. چہرہ بہ چہرہ ہو کر صرف ''معاف کر دیں'' کہنے کی خاطر ایسا کرتا.. اور پھر اپنا قبلہ درست کر لیتا... بس یہ وعدہ کر لیتا کہ نبی سرکارؐ آیندہ کبھی ایسا نہ ہو گا اور پھر قبلہ رو ہو جاتا..
مغرب کی ادائیگی کے دوران ظاہر ہے مسجد نبویؐ میں موجود ہر نفس سکوت میں تھا.. کہیں کوئی ذرہ بھر حرکت نہ تھی.. جونہی سلام پھیرا تو روضۂ رسولؐ کے آگے بہنے والی ندی پھر سے رواں ہو گئی.. چہل پہل شروع

ہو گئی.. ہر شے تحرک میں آ گئی.. ہم نے رواں ندی کے اس کنارے پر کھڑے ہو کر بابا کو بلند آواز میں سلام کیا اور پھر باب جبریل میں سے گزر کر باہر صحن میں آ گئے..

باہر آئے ہیں تو پھر کھد بد لگ گئی.. بے چینی اور گھبراہٹ لگ گئی کہ ابھی وہ پاس تھے ابھی دوری ہو گئی ہے.. ایک بار تو دیکھا ہے لیکن دوسری بار دیکھنے کی ہوس بس سے باہر ہوئی جاتی ہے تو ہم پھر مسجد نبوی کی دیواروں کے سائے میں چلتے واپس باب السلام تک آتے ہیں اور پھر سے ہلتے لبوں اور سرگوشیوں اور نمی سے سرخ ہوتی آنکھوں والے ہجوم میں شامل ہو جاتے ہیں..

ان کی جانب بڑھتے ہوئے جی نہیں بھرتا..

عمر کا یہ واحد سفر ہے جو رائیگاں نہیں جاتا..

ان سے باتیں کرتے درود پڑھتے سلام کرتے جی نہیں بھرتا..

ہر کوئی اس دربار پر، چوکھٹ پر گرے سیاہ مخمل کے پردے پر پلکوں سے دستک دے رہا ہے..

میں نے پلکوں سے در یار پہ دستک دی ہے
میں وہ سائل ہوں جسے حرف دعا یاد نہیں

حرف دعا کہاں یاد رہتے ہیں..

عمر بن عبدالعزیز روضہ رسولؐ کے اندر گئے تو انہیں یہ بھی گوارہ نہ ہوا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے اس پر جمی ہوئی دھول کو پونچھیں.. انہوں نے سر جھکا کر اپنی سفید ریش سے رسول کے گھر کی جھاڑ پونچھ کی

اگرچہ نبیؐ کے دربار پر.. اس کے در پر.. ہزاروں لوگ دستک دے رہے تھے لیکن میں خوب جانتا تھا کہ حضورؐ ہر پلک کی دستک کو الگ الگ پہچانتے ہیں.. ان پلکوں میں اگرچہ میری پلکیں گناہوں کے بوجھ سے بھاری تھیں.. عمر رسیدہ اور جھڑنے کو تھیں اور ان میں زور سے دستک دینے کی سکت نہ تھی لیکن میں خوب جانتا تھا کہ وہ پہچان رہے ہیں کہ یہ مستنصر کی پلکیں ہی ہیں جو دستک دیتی ہیں..

دستک دینے کے لیے قربت تو ضروری نہیں..

میں لاہور میں بیٹھا اپنے گھر میں بیٹھا بھی تو دستک دے رہا تھا..

جو دور کے شہروں والے تھے.. وہ اپنی دوری میں بھی تو دستک دے سکتے تھے..

تو میں مطمئن ہو گیا کہ انہوں نے میری دستک سن لی ہے.. کہ یہ مستنصر کی دستک ہے..

قربت کی ضرورت نہیں ہے....

''سبز گنبد کے بیس کیمپ میں اور ''فن سٹی'' مدینہ میں''

دوسری حاضری کے بعد باہر آئے.. روضہ رسولؐ کی دیوار کی قربت میں مسجد نبویؐ کے کھلے صحن میں جو رات تھی اس کی ہوا میں خنکی غائب تھی اور ایک اپنائیت تھی..

ہم نے وہیں ڈیرے ڈال دیئے.. چند لمحوں کے لیے مزید ثواب کمانے کی ہوس سے آزاد ہوئے اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے..

اور یہیں پر میں نے ذرا اس دیوار سے پیچھے ہٹ کر اس پر سایہ فگن جو سبز گنبد تھا اسے کامل حالت میں دیکھا.

پہلی بار احساس ہوا کہ میری صرف ایک نگاہ تھی..

ایک تو اُسی دم اس سبز گنبد تک گئی اور وہیں قیام کر لیا جب میں نے اسے سفید چھتریوں کی اوٹ میں دیکھا تھا!

دوسری اس سنہری بُوند روزن کے اندر جو گئی تو پلٹ کر نہ آئی..

اور اب یہ تیسری تھی جو اس رات میں سبز گنبد کے پاس پہنچی تو وہیں کی ہو گئی.. شاید وہیں اس کی ملاقات پہلی اور دوسری نگاہ سے ہوئی اور وہ تینوں سہیلیاں ہو گئیں.. وہیں رہ گئیں.. انہوں نے واپس میری شک بھری اور کافر ہوتی آنکھوں میں آ کر کیا کرنا تھا.. وہیں رہ گئیں..

وہ تینوں محض اس لیے وہیں نہیں رہ گئی تھیں کہ وہ گنبد سبز رنگ کا تھا..

وہ کسی بھی رنگ کا ہوتا انہوں نے واپس نہیں آنا تھا..

یہ گنبد جب آخری بار پینٹ ہوا تھا تو ترکوں نے اسے ڈھانپنے کے لیے سبز رنگ کا چناؤ کیا تھا.. اس سے پیشتر مختلف ادوار میں یہ گنبد مختلف رنگوں کا ہوا کرتا تھا.. کہ اسلام کا کوئی ایک مخصوص پسندیدہ رنگ نہیں ہے.. اس کی رنگا رنگی میں سارے رنگ ہیں.. کسی ایک رنگ کا تعین نہیں کیا گیا.. موقع محل کی مناسبت سے رنگ بدلتے رہے.. ان میں حضورؐ کے کرتے اور تہمد کا سفید رنگ بھی تھا.. سیاہ عَلم بھی تھے اور زرد پرچم بھی تھے.. اور کبھی کسی اوڑھنی کا رنگ تھا..

تو یہ گنبد جو سبز تھا تو اس کا رنگ اہم نہیں تھا..

اہم وہ تھا جو اس گنبد تلے خاک نشیں تھا..

سبز گنبد ہموار سطح کا نہ تھا.. مستطیل ٹکڑیاں تھیں جڑی ہوئیں.. اور ان پر دھول تھی.. اور میری ایک نہیں تین نظریں اس دھول سے چھوتی تھیں اور اس کے کچھ ذرے ایسے تھے کہ نہ میری آنکھوں میں رڑکتے تھے کہ ریت کا ایک ذرہ بھی آنکھ کو جھپکنے کی راہ میں آ کر شدید اذیت کا باعث بنتا تھا' بلکہ انہیں سکھ دیتے تھے..

سبز گنبد پر دھول کی ایک دبیز تہہ تھی..

مسجد نبوی کا ہر دروازہ.. ستون.. فانوس.. قالین سب کے سب نکھرے ہوئے اور شفاف تھے لیکن جو اس مسجد والا تھا اس کے گھر کا گنبد دھول میں اٹا تھا اتنا کہ میری تینوں نگاہیں اس میں سے کچھ ذرے سمیٹ کر میری آنکھوں کے لیے بھیجتی تھیں..

یہ جو ٹکڑیاں تھیں گنبد کی.. آپس میں جڑی ہوئیں.. الگ الگ دکھائی دیتی تو ان میں ایک ایسی ٹکڑی تھی.. ایک تختہ ایسا تھا جو ان سے الگ نظر آتا تھا.. شاید اس مقام پر کوئی ایسا تختہ نصب تھا جو بوسیدہ ہو جانے کے باعث بدل دیا گیا تو یہ نیا تختہ.. یا نئی ٹکڑی واضح طور پر گنبد کی گولائی میں الگ سے نظر آ رہی تھی..

میں اس گنبد کی گولائی اور اسے ڈھانپنے والی ٹکڑیوں اور تختوں کو کیوں اتنی تفصیل سے بیان کر رہا ہوں؟.. ایک تو یہ کہ جو دیکھتے تھے وہ اسے ایک نظر سے دیکھتے تھے جب کہ میری تین نظریں وہیں رہ گئی تھیں اور دوسرے یہ کہ میرے لیے سب مدینہ سنگ و خشت تھا جو میں کہیں بھی دیکھ سکتا تھا اور میرے لیے صرف یہ سبز گنبد تھا جو میں کہیں بھی نہیں دیکھ سکتا تھا..

جہاں اس وسیع و عریض علاقے میں.. مسجد نبویؐ اور اس سے ملحقہ صحن کے میدانوں میں بھی صفائی اور ستھرائی ہے تو اس گنبد پر دھول کیوں بسیرا کرتی ہے.. شاید کسی میں اتنی ہمت ہی نہیں کہ اس کے ساتھ سیڑھی لگا کر اس کی جھاڑ پونچھ کرے.. شاید جان بوجھ کر ایسا کیا جاتا ہے کہ یہ دھول انمول ہے..

جب بھی بارش اترتی ہے تو یہ گنبد دھل جاتا ہے..

جو کوئی بھی بخت آور آس پاس ہوتے ہیں وہ جھولیاں پھیلا دیتے ہیں تا کہ بارش کے پانیوں میں گھل کر جو مٹی آ رہی ہے شاید اس کا ایک ذرہ خیرات میں مل جائے..

پانی سے چہرہ روشن کر لیا جائے.

آسمان پر کوئی بادل نہ تھا..

مینہ برسنے کا کوئی امکان نہ تھا.

اگر کہیں ایک بھی بادل ہوتا تو میں جھولی پھیلا کر کھڑا ہو جاتا..

روضۂ رسولؐ کی دیوار کے ساتھ لوگ سر جھکائے مختصر ہوتے ان سے باتیں کرتے تھے..

یہ تقریباً پچیس برس پیشتر کا قصہ ہے کہ ایک دوست انگلستان سے لوٹے' راستے میں عمرہ کیا اور پھر لوٹے.. مجھ سے کہنے لگے' تارڑ تمہارے نئے سفرنامے "خانہ بدوش" کا سرورق نہایت شاندار ہے.. میں نے مدینہ میں دیکھا تھا..

"مدینہ میں؟"

"ہاں.. وہاں مسجد نبویؐ کے سامنے کتابوں کی ایک دکان تھی اور تمہارے سفرنامے کی پانچ چھ کاپیاں شوکیس میں سجی تھیں.."

"خانہ بدوش" پر سعید اختر کی تخلیق کردہ میری پورٹریٹ چھپی تھی..

"یہ بتاؤ کہ میری پورٹریٹ کا رخ کس جانب تھا.."

"روضۂ رسولؐ کی جانب.."

اور ان پچیس برسوں میں جب بھی میرے تخیل میں یہ آیا کہ کبھی میری تصویر روضۂ رسولؐ کے سامنے آویزاں تھی تو میں نے ہمیشہ اس خیال سے فوری طور پر اجتناب کیا' دھیان کسی اور جانب لگایا کہ اس خیال کو زیادہ دیر برداشت کرنے کی مجھ میں سکت نہ تھی.. اور آج میں خود ان کے سامنے تھا.. اور میں اب بھی اپنا دھیان کسی اور طرف لگاتا تھا کہ یہ خیال بھی کہ میں خود ان کی جانب رخ کیے کھڑا ہوں.. مجھے مخبوط الحواس کر دینے کے لیے کافی تھا..

میں نے دیکھا کہ ایک بنگالی بابا سمیر کے ساتھ محو گفتگو ہے اور سمیر نہایت غور سے اس کی عجیب سی باتیں سن رہا ہے... بیٹا.. پاکستان.. پھر پاکستان.. پھر پاکستان سے بنگلہ دیش.. بنگلہ دیش سے ڈھاکہ.. ڈھاکہ سے مکہ.. مکہ سے ڈھاکہ.. ڈھاکہ اور مکہ... مکہ اور ڈھاکہ..

ایک پاکستانی نوجوان مجھے پہچان کر میرے قریب آ بیٹھا.. "تارڑ صاحب میں آپ کی خدمت میں یہاں کیا پیش کروں.. میں نے جتنا عرصہ روضۂ رسولؐ کی دیوار کے قریب بسر کیا ہے' اس تسبیح پر حضورؐ کی ثناء کرتا رہا ہوں.. میری یہ تسبیح قبول کر لیجیے.."

سفید دانوں کی یہ تسبیح کیا بے بدل اور شاندار انعام تھا..

یہیں اس دیوار کے ساتھ لگ کر وہ افغان بزرگ بیٹھا کرتا تھا جس نے ایک روز سلجوق کو پاس بلا کر کہا "میں نے دیکھا ہے کہ تو یہاں آتا رہتا ہے.. اور تیرا آنا اور طرح کا ہوتا ہے.. تو یہاں جیسے حب رسولؐ میں غرق آتا ہے' حاضری دیتے تو سنت رسولؐ پر بھی عمل پیرا ہو جا.."

سلجوق کا کہنا ہے کہ ابا مجھے یوں لگا جیسے یہ خواہش اس سبز گنبد سے اتری ہے' جس کے سائے میں وہ افغان بزرگ براجمان تھا.. کیسے انکار کرتا.. داڑھی بڑھا لی..

وہ داڑھی کتنے روز رہی اور کیسے صاف ہو گئی اس کی داستان الگ ہے..

اور یہیں پر ایک پاکستانی مجذوب بھی بیٹھتا ہے۔۔

۔۔وہ ہمیشہ سے یہاں موجود تھا۔۔

کوئی خدا ترس اور ہمدرد پاکستانی ایسا تھا جو اس کے ویزے میں توسیع کروا دیتا تھا' اس کی اقامت کا بندوبست کر دیتا تھا اور وہ یہاں بیٹھا رہتا تھا۔ بالآخر کوئی ایسی پیچیدگی درپیش ہوئی کہ ویزے میں مزید توسیع ممکن نہ رہی۔۔ وہ یہاں سے رخصت نہیں ہونا چاہتا تھا لیکن اسے رخصت ہونا پڑ رہا تھا۔ سلجوق ایک بار جب اپنے سفارتی فرائض نبھانے مدینے آیا تو اس کی درخواست سن کر قانون کی تھوڑی سی خلاف ورزی کر کے اس نے اس شخص کے ویزے میں توسیع کر دی جس کے باعث وہ یہاں قیام کر سکتا تھا۔

"آپ اتنے برسوں سے یہاں کیا کر رہے ہیں؟" سلجوق نے پوچھا تھا۔

تو اس نے کہا "کچھ بھی نہیں۔ بس آقا کے قدموں میں پڑا رہتا ہوں۔"

اس نے سلجوق کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا "بیٹا آپ نے مجھ پر بڑی مہربانی کی ہے۔۔ آقا کے قدموں میں پڑے رہنے کی اجازت دے دی ہے۔۔ میں نہ صرف آپ کے لیے بلکہ آپ کے ماں باپ کے لیے بھی ریاض الجنہ میں ہر نماز کے بعد دعا کیا کروں گا۔"

میمونہ کی حد تک تو یہ قابل فہم ہے کہ وہ ایک پارسا قسم کی خاتون ہے اور اس کی پارسائی نے مجھے ہمیشہ رسوا کیا ہے۔ لیکن میرے ایسے شخص کے لیے مسجد نبویؐ میں اور وہ بھی ریاض الجنہ میں ایک مجذوب روزانہ دعا کرتا ہے تو یہ ایک معجزے سے کم نہیں۔ اور یہ معجزہ میرے بیٹے کے عجز اور عقیدت کا کرشمہ تھا۔۔

تھکاوٹ نے میرے تن بدن میں جو بے شمار گھونسلے بنا رکھے تھے' ان میں سے ننھی منی چونچیں کھولے پرندوں کے لاتعداد بچے۔۔ بوٹ۔۔۔ بے تحاشا شور مچانے لگے کہ ہم بہت تھک گئے ہیں۔۔ آج ہی تو جدہ سے چلے تھے اور آج ہی تم ہمیں یثرب کی بستی میں لے آئے۔۔ اور جس نے یثرب کو مدینہ کر دیا' اس کے سامنے لے گئے! اس کے گھر کی دیوار کے سائے میں لے آئے تو ہم اتنا ہیجان برداشت نہیں کر سکتے۔۔ ہم میں سکت نہیں رہی۔۔ اب ہم آرام کرنا چاہتے ہیں۔۔

چنانچہ پرندوں کے بچوں کی پکار پر دھیان دینا پڑا۔۔

حضورؐ بھی ان کا دھیان کرتے تھے۔۔

ایک صحابیؓ کی چادر میں سے چوں چوں کی آوازیں آ رہی تھیں' حضورؐ کے استفسار کرنے پر بتایا کہ یارسول اللہؐ پرندوں کے بچے ہیں' گھونسلے میں سے اتار کر لایا ہوں۔ حضورؐ نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ انہیں فوراً ان کے گھونسلے میں رکھ آؤ۔۔

چنانچہ حضورؐ کے گھر کی دیوار کے سائے میں میں پرندوں کے بچوں کا دھیان کیوں نہ کرتا۔۔ ڈانٹ بھی تو پڑ سکتی تھی۔۔۔

البتہ عشاء کی نماز کی ادائیگی تک انہیں بہلاتا پھسلاتا رہا کہ پلیز شور مچانا بند کر دو.. ابھی چلتے ہیں..

ہم مسجد نبویؐ کے صحن میں تادیر مسافت کرتے باہر آ گئے..

باہر آئے ہیں تو سامنے ایک شوخ اور رنگ رنگ دمکتا دہکتا زندگی سے دھڑکتا مدینہ تھا..

ایک ''فن سٹی'' تھا..

جدہ کی مانند ایک روکھا سوکھا پھیکا شہر نہ تھا.. زندگی کی مسرتوں سے لطف اندوز ہوتا ایک زندہ شہر تھا..

کوچہ و بازار میں رونقیں تھیں..

فٹ پاتھوں پر لوگ بے پروا چلتے تھے جیسے تفریح کی خاطر نکلے ہوں.. اور ان کے چہرے سادگی کی خوبصورتی سے دمکتے تھے..

سوائے اس کے کہ موسیقی مفقود تھی باقی ہر وہ شے تھی جو زندگی کی رنگینیوں کی نمائندگی کرتی ہے..

ویسے موسیقی بھی تھی ریستورانوں اور قہوہ خانوں میں لیکن ہلکے سروں میں..

پاکستانی گانے بھی اور عربی دھنیں بھی..

حاجی لوگ... جو میری طرح کے عارضی حاجی نہ تھے کہ دو چار دن میں اس فرض سے سبکدوش ہو گئے اور گھر کی راہ لی.. بلکہ مسلسل قسم کے حاجی تھے جو پچھلے ایک ماہ سے ثواب کمانے میں مصروف تھے اور اب جا کر فارغ ہوئے تھے تو نہایت لاپروا، چلبلے اور شوخ ہو رہے تھے.. بے دریغ شاپنگ فرما رہے تھے.. بلند آہنگ میں بھاؤ تاؤ کر رہے تھے.. ریستورانوں میں براجمان مرغ روسٹ اور پلاؤ نوش کر رہے تھے. قہقہے لگا رہے تھے.. جیسے سب پابندیوں سے بے نیاز ہو گئے ہوں..

حاجی خواتین بھی کسی حد تک بنی سنوری تھیں..

مسجد نبویؐ کے سامنے درجنوں منزلوں تک بلند ہوتی جاتی درجنوں عمارتیں جگمگا رہی تھیں.. پہلی منزلوں پر جو سپر سٹور اور شاندار دکانیں تھیں.. وہ گاہکوں سے بھری پڑی تھیں..

سرخوشی کا یہ ماحول ایسا تھا کہ میں بھی.. جدہ کے جکڑ بند سوسموں.. منیٰ عرفات، مزدلفہ اور مکہ کی پابندیوں کو بھول گیا اور شاندار شاپنگ مالز اور ان کے شوکیسوں میں نہایت اشتیاق سے تانکنے جھانکنے لگا..

یہاں بہت سے روشن اور مہنگے ''عطر سٹور'' تھے اور ہم ان میں سے ایک کے اندر یونہی چلے گئے..

اندر عرب کے روایتی پرفیوم اور دھوئیں مہک پھیلاتے تھے.. یہاں جانے کون کون سی عربی خوشبوئیں دھوئیں مچاتی تھیں.. لوبان اور عود کے سرچشمے تھے.. ایک روایتی مخروطی شکل کے حقہ نما سٹینڈ میں لوبان کی لکڑی کا ایک ٹکڑا سلگا کر نہایت تمیز والے دکاندار نے مسکراتے ہوئے ہمیں اس کی خوشبو سنگھائی اور اسے خریدنے کی ترغیب دی... لیکن یہ ترغیب قدرے گراں تھی.. اگرچہ لوبان اور عود کے تذکرے مقدس صحیفوں میں ملتے ہیں.. قدیم ترین تاریخوں میں ملتے ہیں.. کسی حد تک مقدس سمجھے جاتے ہیں.. لیکن مسجد نبویؐ کے سامنے بیچ کے سوا کچھ

کہنے کی گنجائش نہیں۔۔ان کی ہمارے عطر خس، چنبیلی اور عطر گلاب کے سامنے کچھ حیثیت نہ تھی۔۔
شاہراہوں پر ٹریفک کا ہجوم تھا۔۔
کپڑے کی دکانوں کے بیشتر مالک اپنے خان صاحب تھے۔۔اپنے پٹھانی لباس میں پاکستانی، ایرانی، ترکی اور عرب خواتین کے سامنے تھان کے تھان کھول کر پشتو لہجے میں اردو، فارسی، ترکی اور عربی بولتے ہوئے انہیں خالی ہاتھ نہ جانے دیتے تھے۔۔
مذہبی کتابوں اور کیسٹوں کی دکانوں پر بھی بے حد رش تھا۔
حیرت یہ ہوئی کہ سب سے زیادہ خریداری سوٹ کیسوں اور بیگوں کی ہو رہی تھی۔۔
بچے کون آئس کریم اور فرنچ فرائز کھانے میں مگن تھے۔۔
شاہ زمان بھی پسندیدہ خوراکوں میں سے ایک تھا۔۔
یہ میرے نبی کا شہر تھا جیسا کہ وہ چاہتے تھے کہ ہر شہر ہو۔۔اطاعت کرنے والا بھی اور زندگی سے بھرپور بھی۔۔
"ایک پاکستانی سا ہوٹل ریستوران سے رات کے کھانے کے لیے پلاؤ اور تیز مرچوں والے چکن مصالحے کو پیک کروا کے ہم واپس "پاکستان ہاؤس" آئے اور اسے اتنی رغبت سے کھایا کہ کم از کم میں نے یہ فراموش کر دیا کہ گیلری میں سے مسجد نبوی کا ایک روشن مینار اب بھی دکھائی دے رہا ہے۔ پیٹ میں روٹیاں نہ ہوں تو سب باتیں کھوٹیاں لگتی ہیں۔۔
پھر ہم سو گئے۔۔
فوری طور پر نہیں، آج کا دن کیسے گزرا تھا، ہم پر کیا کیا گزرا تھا اس کی باتیں دیر تک کرتے کرتے سو گئے۔۔۔

عجیب سی غنودگی اور خواب در خواب کی سی سست کیفیت اور تھکن اور نیند تھی جس میں زمان و مکاں کبھی ڈوبتے تھے اور کبھی سطح پر آ کر جھنجھوڑتے تھے۔۔جب نہایت ہی موہوم طویل مسافتیں طے کرتی ہوئی کوئی آواز فلاح کے سندیسے بھیجتی تھی۔۔
اس بے خود فراموشی میں۔۔نیم نیند میں۔۔میں کہاں تھا۔۔اس کا کوئی ادراک نہ تھا۔۔لاہور میں اپنے بستر میں کروٹیں بدلتا آنے والے دن کے خدشوں میں مبتلا تھا یا شاہ گوری کے برفیلے دامن میں محو خواب تھا۔۔
کچھ پتہ نہ تھا اور پھر کوئی مجھے جگا رہا تھا، جھنجھوڑ رہا تھا "ابا، فجر کی اذان ہو رہی ہے۔۔چلنا نہیں۔"
"نہیں۔۔" میں ابھی خواب غفلت میں تھا اور وہیں رہنا چاہتا تھا۔۔
"ابا۔۔" یہ ایک ناراض آواز تھی۔۔۔

"نہیں.." میں نے پھر کہا..

یہ بچہ اتنا ناراض کیوں ہو رہا ہے.. میں عام طور پر اگر پڑھتا ہوں تو ایک ہی نماز پڑھتا ہوں.. فجر کی اور وہ بھی عام طور پر قضا کر کے ہی پڑھتا ہوں تو آج یہ ایمرجنسی کیوں نافذ ہو رہی ہے.. ذرا دو چار لمبے اور اونگھ لیں پھر حسب عادت قضا پڑھ لیں گے..

"ابا.." یہ ایک ناراض آواز نہ تھی ایک آخری وارننگ تھی.. اور پھر یکدم ایک خوفزدہ خرگوش کی مانند میرے کان کھڑے ہو گئے.. ایسے بیدار ہوا جیسے کبھی سویا ہی نہ تھا..

محترم تارڑ صاحب آپ نہ لاہور میں ہیں اور نہ شاہ گوری کے دامن میں استراحت فرماتے ہیں.... مدینے میں ہیں..

میں نے چند چھینٹے غسل خانے میں جا کر اپنے چہرے پر اڑائے.. وضو کیا اور بھاگم بھاگ نیچے اتر.. ہم اس ہجوم میں جا شامل ہوئے جو مسجد نبوی کی جانب رواں تھا.. اس اندیشے میں مبتلا بھی کہ ہم نے آج ہی جدہ لوٹ جانا ہے.. فجر کی ایک ہی نماز تو حصے میں آئی ہے وہ بھی مسجد نبویؐ میں ادا نہ ہو.. تو کیا ہو..

باہر سردی تھی..

ہوا چل رہی تھی..

یہ تری مری باد نسیم نہ تھی پُروا تھی.. بدن سے لپٹتی ٹھنڈک کے بوسے دیتی تھی.. مدینے کی ہوا تھی..

اور لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ اُدھر کو سیلاب کی صورت امڈے چلے جا رہے تھے..

مسجد میں جدھر جگہ ملی وہاں نماز پڑھی اور پوری توجہ سے پڑھی لیکن آخر میں ذرا بے توجگی ہونے لگی.. یعنی توجہ کاملیت کے درجوں تک پہنچتے پہنچتے رہ جاتی.. بھٹک جاتی.. کہ یہ سلام پھیرتے ہی اسے سلام کے لیے جانا ہے..

چنانچہ سلام بھی اُس کے دھیان میں ذرا عجلت سے پھیرا.. اور اسے پھیرتے ہی یوں اٹھ کھڑے ہوئے جیسے صور پھونکے جانے پر مردے اٹھ کھڑے ہوں گے.. اور پھر بے چین گھوڑوں کی مانند باقاعدہ بگٹٹ بھاگتے ہوئے مسجد سے نکل کر باب السلام تک ہانپتے ہوئے پہنچے اور وہاں ہم سے کہیں پھرتیلے اور یاران تیز گام پہلے سے پہنچ چکے تھے..

ہم ان میں شامل ہو گئے..

پیا ملن کی آس میں سر جھکائے سرکنے لگے..

لیکن اس سویر ہمارے نصیب خفتہ رہے.. اتنا ہجوم تھا کہ سنہری جالیوں کے قریب جب ہوئے تو ایک "جھاتی" بھی نہ مار سکے... پیا کا ملن نہ ہوا.. اس سنہری بوند کے روزن میں جھانک نہ سکے.. بہاؤ کے دباؤ میں ایسے آئے کہ پرے پرے ہی گزر گئے.. بلکہ دھکیلے گئے..

اور جب ہوش میں آئے تو باب جبریل میں باہر مسجد نبویؐ کے صحن میں تھے، جہاں شب کی تاریکی بہت دھیرے سے تحلیل ہوتی جا رہی تھی..

میرے سیاں جی اتریں گے پار ندیا دھیرے بہو..

زائرین کی یہ ندیا دھیرے کہاں ڈھلکیلتی ہوئی بہتی تھی.. اور بے چارے سیاں جی پار نہ اتر سکے تھے..

ان کے درشن نہ ہو سکے تھے.. درمیان میں بہت سی گوپیاں حائل تھیں..

اور میں اتنی دور سے دربار پر دستک دیتا بھی تو انہیں کہاں سنائی دیتی..

نہیں..

نہ ہو نہیں سکتا کہ میں دستک دیتا اور وہ نہ سنتے..

"روضہ رسولؐ کے اندر"

ایک سیاہ فام سوڈانی' بلند قامت' پتھر کے چہرے کا.. آس پاس سے لاپروا.. لاتعلق سر پر ایک سیاہ رنگ کی پگڑی.. کمر بند کے ساتھ ایک قدیم وضع کی چابی لٹک رہی ہے.

یہ روضہ رسولؐ کی چابی ہے..

کچھ اور حبشی' سیاہ فام' اسی لباس میں ویسے ہی پتھر چہروں کے.. پیالے یا طشتریاں اٹھائے ہوئے جن میں عود سلگ رہا ہے اور اس کی مہک چار سو ہے.. فضا میں صرف عود کی خوشبو رچ رہی ہے..

سلگتے ہوئے عود کی طشتریوں کو روضہ رسولؐ کے اندر نہیں لے جاتے.. قفل کھلنے تک وہ سیاہ فام وہاں موجود ہوتے ہیں..

یہ سیاہ فام.. ہیجڑے ہیں..

خواجہ سرا ہیں.. نہ مرد ہیں اور نہ عورت.. تاریخی طور پر افریقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ بھی ایک مخصوص قبیلے سے..

ہمیشہ سے روضہ رسولؐ کے نگہبان رہے ہیں..

اس افریقی قبیلے کے سوا آج تک کسی اور قوم کا فرد روضہ رسولؐ کا نگہبان نہیں رہا.. لیکن یہ ہمیشہ خواجہ سرا ہوتے ہیں..

روضہ رسولؐ کے اندر صفائی ستھرائی کی ذمہ داری بھی انہی سیاہ فام ہیجڑوں کے نصیب میں لکھی گئی ہے... برٹن نے بھی خاص طور پر ان کا حوالہ دیا ہے.. یہ شکل سے قطعی مہربان نہیں لگتے.. درشت لگتے ہیں.. مسکراتے نہیں.. یہ نہ بات کرتے ہیں اور نہ بات کا جواب دیتے ہیں.. چپ رہتے ہیں..

روضہ رسولؐ کا قفل عام تالوں کی شکل کا نہیں.. اس کی ہیئت جدا ہے.. یہ قفل قدرے لمبوترا ہے..

سیاہ فام سوڈانی کمر بند کے ساتھ لٹکی چابی کو تھامتا ہے..
چابی کو آہستہ سے قفل میں داخل کر کے اسے کھولتا ہے..پھر روضہ رسولؐ کے دروازے کے کواڑ وا کرتا ہے اور زائرین کو اندر آنے کا اشارہ کرتا ہے..

پہلے جھجک ہوتی ہے..روضہ رسولؐ کا دروازہ کھلا ہے اس کی جانب بڑھنے سے جھجک ہوتی ہے..
پھر ہر کوئی بیتاب ہو جاتا ہے..ہر کوئی جلد از جلد اندر داخل ہو جانا چاہتا ہے کیونکہ..سیاہ فام رکھوالا جب اس کا جی چاہے ہاتھ آگے کر کے مزید لوگوں کو اندر جانے سے روک سکتا ہے..
بے شک ایک بادشاہ کی باری ہو چوکھٹ تک قدم آ چکا ہو اور سیاہ فام نگہبان ہاتھ آگے کر دے تو وہ بھی اندر نہیں جا سکتا..اس کی بادشاہت یہاں کسی کام نہیں آ سکتی
شنید ہے کہ ایک سربراہ مملکت کے ساتھ ایسا ہوا تھا..

اس چوکھٹ کو پار کر کے دروازے کے اندر داخل ہوتے ہیں..
لیکن آپ ابھی روضہ رسولؐ کے اندر نہیں پہنچے...
ابھی آپ روضہ رسولؐ سے متصل ایک چھوٹے سے کمرے میں پہنچے ہیں..
آپ کے سامنے غالباً لکڑی کی بنی ہوئی ایک ڈولی سی رکھی ہے..
ڈولی کی چھت ہموار نہیں ڈھلوان ہے..جیسے پہاڑی گھروں کی ہوتی ہے..اصل ڈولی دکھائی نہیں دیتی کہ اس پر ایک سیاہ غلاف ہے..وہ سیاہ غلاف سے مکمل طور پر ڈھکی ہوئی ہے..
اس ڈولی کی لمبائی چوڑائی..نظروں سے اندازے سے ماپئے تو 7x5 فٹ کی ہو سکتی ہے..
اس کمرے میں صرف یہ ڈولی ہے اور ایک محراب ہے..
چند پرانے ظروف دیوار سے لٹکے ہوئے ہیں..
ان کی تاریخی حیثیت اور زمانے کے بارے میں کچھ علم نہیں..
کچھ کا کہنا ہے کہ یہ بی بی فاطمہ کے گھر کے برتن ہیں..
کہ بی بی فاطمہ کا حجرا تقریباً اسی مقام پر تھا..یہیں علیؓ کا گھر تھا..
یہ برتن صراحی نما ہیں..

بالکل سامنے اور دائیں جانب اس کمرے کی دیواریں نہیں ہیں..جالیوں کی بنت ایستادہ ہے..جن کے آر پار دیکھا جا سکتا ہے..

سامنے کی جالیوں میں سے مسجد نبوی کی جھلک دکھائی دیتی ہے..
مسجد نبویؐ کا وہ حصہ جہاں محراب اور منبر رسولؐ ہیں..تاریخی ستون ہیں..
دائیں جانب کی جالیوں کے اوپر ایک فریم شدہ خطاطی آویزاں ہے..
(مسجد نبویؐ میں سب سے زیادہ ہجوم اس دائیں جانب کی جالی کی قربت میں ہوتا ہے۔لوگ ان جالیوں کے سامنے بیٹھ کر انہیں چھوتے ہوئے قرآن پاک پڑھتے ہیں..دعائیں کرتے ہیں کہ یہ جالی دار دیوار بی بی فاطمہ اور رسول اللہؐ کے حجرے کی دیوار ہے..اس مقام پر ہے..اگرچہ اب ان جالیوں کے آگے قرآن پاک رکھنے والے شیلف رکھ دیئے گئے ہیں..میں جب اپنے تئیں اصحاب صفہ کے تھڑے پر بیٹھا ہوا تھا تو وہاں سے اس جالی دار دیوار کا فاصلہ چند قدم تھا اور میں نے نوٹ کیا تھا کہ جالی کے اندر کوئی فریم آویزاں ہے..یہ وہی خطاطی تھی جسے سلجوق نے اندر جا کر دیکھا تھا اور پھر مجھ سے بیان کیا تھا...)
اس کمرے میں آپ کو جو کچھ نظر آتا ہے..مدھم اور ہوبہو وہ سامنے اور دائیں جانب کی جالیوں میں سے اندر آنے والی ہلکی روشنی کی وجہ سے نظر آتا ہے..
کیونکہ یہاں بھی خانہ کعبہ کے اندرون کی مانند روشنی یا بجلی کا کوئی بندوبست نہیں..
خانہ کعبہ کے اندر ایک ٹیوب لائٹ لے جاتے ہیں لیکن یہاں روضہ رسولؐ کے اندر ٹیوب لائٹ بھی نہیں لے جائی جاتی..
آپ صرف اپنی آنکھوں پر اور جالیوں میں سے چھن چھن کر آنے والی مدھم روشنی پر انحصار کرتے ہیں..

اس کمرے کے بائیں جانب بھی کچھ جالیاں ہیں اور ان میں ایک دروازہ ہے جو دراصل روضہ رسولؐ کے اندر جانے کا دروازہ ہے۔

دروازے کے نیچے سطح ہموار نہیں..ایک چوکھٹ ہے' تقریباً چھ انچ اونچی..آپ قدم اٹھا کر اسے پار کرتے ہیں اور وہ قدم روضہ رسولؐ میں ہوتا ہے..یہی مقام ہے..آپ وہاں ہیں..

داخل ہوتے ہیں تو چہرے کے سامنے غلاف روضہ رسول ہے..
اور کچھ دکھائی نہیں دیتا..صرف یہ غلاف ایک خیمے کی مانند اوپر اٹھتا نظر کے سامنے آجاتا ہے..
یہ دبیز غلاف سرخ اور سبز رنگ کا ہے..
اب اوپر دیکھئے..

آپ کے عین اوپر گنبد خضریٰ ہے.. یعنی سرخ اور سبز رنگ کے غلاف کے عین اوپر سبز گنبد کا اندرونی حصہ دکھائی دے رہا ہے..

جیسے تاریخی عمارتوں کے گنبد کے عین درمیان میں سے ایک رسّی یا تار لٹکتی ہے تاکہ اس کے ساتھ کوئی فانوس وغیرہ باندھا جا سکے..

ایسے گنبد خضریٰ کے درمیان میں سے ایک رسّی یا تار لٹک رہی ہے اور اس رسّی سے روضۂ رسول کا غلاف بندھا ہوا ہے.. معلق ہے.. اسی لیے ایک خیمے کی صورت نظر آتی ہے.. اوپر جہاں غلاف رسّی سے بندھا ہے تو گویا ایک نقطہ ہے اور وہاں سے یہ غلاف پھیلتا ہوا بڑا ہوتا ہوا اس کے اندر جو تین قبریں ہیں انہیں گویا سر سے پاؤں تک ڈھانک رہا ہے.. جیسے بانس کی تیلیوں سے بنے پرندوں کے پنجروں کو غلاف سے ڈھانکا جاتا ہے تاکہ وہ آرام کر سکیں تو کچھ ایسی شباہت یہاں بھی بنتی ہے..

اس چوکھٹ کے اندر داخل ہوتے ہی سرخ اور سبز غلاف کو عین اپنی آنکھوں کے سامنے پا کر.. ایسے قریب اور سامنے کہ آنکھیں تو کیا پلکیں بھی اس سے چھونے لگتی ہیں تو کیا گزرتی ہے.. سلجوق پر گزری تھی تو وہ بیان نہیں کر سکتا تو میں جو محض ایک رپورٹر ہوں جو سنا ہے وہ تحریر کر رہا ہوں کیسے بیان کر سکتا ہوں..

اب فرش پر نظریں جھکائیے

فرش سنگ مرمر کا ہے.. سفید ہے.. لیکن قدیم.. بہت پرانا لگتا ہے.. یعنی شفاف نہیں قدامت کے رنگ میں ہے..

اب دیواروں پر نگاہ کیجیے..

ان پر سادہ سی سفیدی کی ہوئی ہے..

اور یہ تو دائیں بائیں کی دیواریں ہیں اور سامنے "وہ" سنہری جالی ہے..

وہ سنہری جالی جو باب السلام میں سے داخل ہو کر جب آپ روضۂ رسول تک آتے ہیں تو بائیں جانب نظر نواز ہوتی ہے اور اس سنہری جالی کی زریں خطاطی میں تین بوند نما سوراخ ہیں..

پہلی بوند رسول اللہؐ کے مدفن کی نشاندہی کرتی ہے..

دوسری حضرت ابوبکر صدیقؓ اور تیسری حضرت عمر فاروقؓ کی قبروں کا پتہ دیتی ہے..

اب غلاف کے ساتھ ذرا آگے بڑھتے ہیں تو یہی سنہری جالی جسے آپ نے باہر سے دیکھا تھا اب اسے روضۂ رسولؐ کے اندر سے دیکھتے ہیں..

ظاہر ہے روشنی نہیں ہے.. سنہری جالی میں سے مسجد نبوی کی جو روشنی آ رہی ہے آپ اس پر انحصار

کرتے ہیں تو منظر خاموش تو ہے لیکن مدھم ہے اور آپ کو وہ تین سوراخ یا بوندیں نظر آنے لگتی ہیں..

سنہری جالی میں جہاں جہاں ان بوندوں کے سوراخ ہیں وہاں ان کے عین نیچے سنگ مرمر کے قدیم فرش پر ویسے ہی دائرے بنے ہوئے ہیں..

فرش پر بھی تین دائرے ہیں..

پہلا دائرہ رسول اللہؐ کے مدفن کے سائے میں فرش پر.. دوسرا حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کی قبروں کے پہلو میں..

فرش پر بھی تین بوندوں کی مانند تین دائرے ہیں..

روضۂ رسولؐ کے سیاہ فام نگہبان پہلے رسول اللہؐ کے سرہانے رکتے ہیں اور سلام پڑھتے ہیں اور آپ ان کی پیروی کرتے ہیں.. پھر وہ آگے ہو کر حضرت ابوبکر صدیقؓ کی قبر کے سرہانے کھڑے ہوتے ہیں اور سلام پڑھتے ہیں اور آخر میں حضرت عمر فاروقؓ کے قریب ہو کر یہی عمل دہراتے ہیں..

اور آخر میں وہ ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے ہیں..

اس دوران نگہبان زائرین پر کڑی نظر رکھتے ہیں کہ ان میں سے کوئی غلاف کو ہاتھ نہ لگائے بوسہ نہ دے یا عقیدت کی نابینائی میں حواس کھو کر کوئی اور حرکت نہ کر بیٹھے..

لیکن اس کے باوجود لوگ باز نہیں آتے..

ان کے ہاتھ پنجرے میں بند پرندوں کی مانند بے اختیار پھڑپھڑاتے ہیں اور اس سبز شجر پر جو روضۂ رسولؐ کا غلاف ہے بیٹھ جانا چاہتے ہیں.. اسے اپنے پروں سے چھونا چاہتے ہیں..

سلجوق نے بھی کچھ خلاف ورزی کی.. چوری چھپے نگہبان کی نظر بچا کر غلاف کو چھوا.. اور اس کا کہنا ہے کہ غلاف کو مس کرتے ہوئے اس کی انگلیوں کو احساس ہوا کہ اس کے نیچے کوئی ٹھوس تعمیر ہے.. جو رسول اللہؐ کی قبر ہو سکتی ہے..

اگرچہ سبھی زائر آگاہ ہیں کہ اس غلاف کے اندر صرف تعویز ہیں.. نشانیاں ہیں جب کہ اصل قبریں ان کے عین نیچے ایک تہہ خانے میں ہیں..

جیسے مغل مقابر میں.. سطح پر خوشنما تعویز ہیں.. ممتاز محل اور شاہجہان کے تعویز ہیں لیکن ان کی قبریں عین نیچے تہہ خانے میں ہیں..

وہ تہہ خانہ جس کے اندر رسول اللہؐ اپنے ساتھیوں کے ساتھ آرام فرماتے ہیں.. جہاں ان تینوں کی

قبریں ہیں.. اس تک.. تہہ خانے تک شنید ہے کہ کچھ سیڑھیاں اترتی ہیں لیکن وہ بند ہیں.. آپ نیچے نہیں جا سکتے..

یوں ثابت ہوتا ہے کہ آج کی مسجد نبویؐ اور روضۂ رسولؐ ذرا بلند سطح پر ہیں.. اس لیے کہ اصل قبریں اور حجرے تہہ خانے کی سطح پر واقع تھے..

شنید ہے کہ عہد موجود میں شاہی خاندان کے افراد کے سوا کچھ اور لوگ بھی ہیں جو اس تہہ خانے میں گئے ہیں.. اور یہ بھی شنید ہے کہ وہ تہہ خانہ مکمل طور پر سیل بند ہے اس لیے اُس میں اُترنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اب پھر اوپر نظر اٹھائیے..

اوپر.. گنبد خضریٰ اندر سے کیسا دکھائی دیتا ہے..

اس کی بناوٹ شہد کی مکھیوں کے چھتے کی مانند ہے جسے تعمیراتی زبان میں ہنی کومب بناوٹ کہا جاتا ہے.. یہ ہنی کومب سپین کے قصر الحمرا میں بھی استعمال ہوا ہے اور سلجوق عہد کے مقابر اور مدرسوں کے گنبدوں میں بھی.. شاید یہ تعمیر ترکوں کے عہد کی ہے اس لیے

اور سلجوق وہی سوال پھر سے کہ... روضۂ رسولؐ کے اندر اپنے آپ کو پا کر محسوس کیا ہوتا ہے...

''بدن سے بے چینی رخصت ہو جاتی ہے.. ایک عجیب سا قرار آ جاتا ہے.. بندہ پرسکون ہو جاتا ہے.. گھبراہٹ بالکل نہیں ہوتی.. اس نے بتایا'' اور آنسو بہت بہتے ہیں.. وہ رنجیدگی کے نہیں ہوتے قرار اور سکون کے ہوتے ہیں.. اور آپ سب لوگوں کی موجودگی سے غافل ہو جاتے ہیں.. ایسے کہ آپ بالکل تنہا ہیں رسول اللہؐ کے حضور میں.. اور کوئی نہیں۔''

اور میں نے یہیں پر اظہار کیا تھا کہ سلجوق مجھ سے تو یہ برداشت نہ ہو سکے.. اس مقام پر.. مجھ سے تو طائف میں وہ مقام بھی برداشت نہ ہوتا تھا جہاں مسجد عداس میں انگوروں کی ایک بیل تلے رسولؐ بیٹھے تھے تو جہاں وہ دفن ہیں.. موجود ہیں.. وہ مقام تو برداشت بالکل نہ ہو سکے تو اس نے کہا تھا ''نہیں ابو وہاں قرار آ جاتا ہے..''

اور روضۂ رسولؐ کے اندر موسم کیسے ہوتے ہیں.. کیسے سانس لیتے ہیں اور ان سانسوں میں کیا ہوتا ہے؟

''ایک تو خاموشی ہوتی ہے.. سوائے آنسوؤں کے گرنے کے اور سسکیوں کے اور کوئی آواز نہیں ہوتی.. اندر داخل ہوتے ہیں تو جیسے آپ ایک عرصے سے شاید صدیوں سے بند عمارت میں داخل ہوتے ہیں.. جہاں آج تک کوئی اور داخل نہیں ہوا..''

ایک نامعلوم سی مہک قدامت کی اور خنکی ہوتی ہے اور.. زمانہ نہیں ہوتا..

زمانہ نہیں ہوتا..

ایک ماورائے زمانہ مقام..

وہاں چھونے کی.. ہاتھ لگانے کی مناہی ہے..

نہ غلاف کو.. نہ فرش کو.. نہ جالی کو اور نہ کسی دیوار کو..

کہ یہ سب شرک کے ضمن میں آتا ہے..

لیکن دیوانگی اور عشق شرک کی سرحدوں کو نہیں مانتے.. ہمیشہ ان کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور ان کے پار چلے جانے کو ہی حیات سمجھتے ہیں.. اگر کسی ہیر یا سوہنی کے لیے وہ ایسا کر گزرتے ہیں تو رسول اللہؐ کے لیے وہ کیا کیا نہ کر گزریں گے..

سلجوق جب پہلی بار روضہ رسولؐ کے اندر گیا تو ظاہر ہے اسے کچھ ہوش نہ تھا.. کچھ خبر نہ تھی.. نہ اس نے کچھ مشاہدہ کیا اور نہ آس پاس یا نظر اٹھا کر اوپر دیکھا کہ کیا ہے.. وہ چند تسبیحیں ساتھ لے کر گیا تھا انہیں ڈرتے ڈرتے غلافِ رسولؐ سے مس کر کے لے آیا..

پھر اس جیکے ماموں آفتاب نے اس کی منت کی کہ اگر دوبارہ جانا ہوا تو غلافِ رسولؐ پر جمع شدہ دھول کے چند ذرے اگر لے آؤ اور میں انہیں اپنی آنکھوں سے لگالوں تو عمر بھر تمہیں دعائیں دوں گا..

تو اس کا دوبارہ بلکہ سہ بارہ جانا بھی ہو گیا..

تو اس نے جان بوجھ کر کچھ شرک کر لیا.. کچھ خلاف ورزی کر لی.. ایک رومال اور چند سفید ٹشو پیپر ساتھ لے گیا.. انہیں نہ صرف غلافِ رسولؐ سے بلکہ غلاف کے اندر جو مدفن تھا.. غلاف کے نیچے سے ہاتھ ڈال کر اسے چھو کر اور وہاں جو کچھ دھول تھی اس کے ذرے سمیٹ کر ساتھ لے آیا!

ان میں سے ایک سفید ٹشو پیپر میرے یعنی والد صاحب کے حصے میں بھی آیا!

اس ٹشو پیپر پر دھول نہیں ہے.. بادی النظر میں سفید ہی دکھائی دیتا ہے لیکن اگر بہت غور سے دیکھیں تو چند سیاہ ذرے اس کی سفیدی پر نمایاں ہونے لگتے ہیں..

چاہتا میں یہی ہوں کہ مجھ پر مٹی ڈالنے سے پیشتر یہ ٹشو پیپر میرے لبوں کے قریب رکھ دیا جائے.. غارِ حرا میں رات بسر کرنے والے میرے جوگرز کے ساتھ!

پہلی بار جب وہ روضہ رسولؐ کے اندر ہو کر آیا تو ان کے ایک ساتھی سفارت کار نے اس سے دریافت کیا کہ سلجوق تم روضہ رسولؐ کے اندر جس لباس میں گئے تھے اس کا کیا ہوا؟ کہیں دھلوا تو نہیں لیا.. اور اس نے دھلوا لیا تھا' اسے خیال ہی نہ رہا تھا کہ اس لباس نے کن موسموں کو محسوس کیا تھا اور اس پر کچھ ذرے بھی تو ساتھ چلے آئے ہوں گے.. یہ ایک روایت ہے کہ اگر آپ کے نصیب میں روضہ رسولؐ کے سامنے ہونے اور گنبد خضریٰ تلے ہونا ہو جائے تو نہ آپ اپنا وہ لباس دھلواتے ہیں اور نہ جرابیں.. انہیں سنبھال کر رکھتے ہیں..

ہر قبر کے قریب کھڑے ہو کر سلام پڑھا جاتا ہے اور پھر سب مل کر دعا مانگتے ہیں.. اور ہاں آپ حضورؐ کے مدفن مبارک کے گرد چکر پورا نہیں کر سکتے.. تا کہ یہاں طواف کا پہلو نہ آ جائے.. جب چکر پورا ہونے کو ہو تو واپس انہی قدموں پر لوٹ آتے ہیں..

خانہ کعبہ کے اندرون کی مانند یہاں بھی آس پاس دوسروں کی موجودگی کا احساس نہیں ہوتا.. وہ معدوم ہو جاتے ہیں اور صرف آپ ہوتے ہیں اور رسولؐ کا مدفن.. یہ کہنے کی کیا حاجت ہے کہ درود شریف ہر سانس کے ساتھ رواں رہتا ہے.. روضہ رسولؐ کے اندر جانے والے لاکھ حیلے بہانے کریں' قدم گھسیٹیں کہ اٹھتے ہی نہیں کیا کریں.. کچھ بھی کریں پندرہ بیس منٹ کے اندر اندر باہر چلے جانے کا حکم مل جاتا ہے.. اور ہاں.. روضہ رسولؐ جو حجرۂ رسولؐ بھی تھا' وہاں ایک جانب سفید سنگ مرمر کا ایک نشان ہے جو اس مقام کی نشاندہی کرتا ہے جہاں حضورؐ تہجد ادا کیا کرتے تھے..

ہر کوئی کوشش کرتا ہے کہ وہ روضہ رسولؐ میں سے نکلنے والا آخری شخص ہو..

دراز قامت سوڈانی خواجہ سرا کمربند سے لٹکی چابی تھام کر روضہ رسولؐ کا در.. اس پر پڑا لمبوترا قفل پھر سے مقفل کر دیتا ہے..

ایک دو ٹشو پیپر جن پر دھول کے چند ذرے ہیں..

”خاک میں کیا صورتیں ہیں....ابراہیم فاطمہ اور مائی حلیمہ ایسی صورتیں“

جنت البقیع...دنیا کا سب سے خوش قسمت قبرستان جس کی مٹی میں کیا صورتیں پنہاں ہیں..ایسی صورتیں جنہیں لالہ و گل میں نمایاں ہونے کی ضرورت ہی نہیں بلکہ لالہ و گل ان میں نمایاں ہوتے ہیں..جس کی مٹی کا ہر ذرہ کسی نہ کسی ایسے جسد سے چھوا ہے جس نے اس ذرّے کو بھی آفتاب بنا دیا ہے..اور ہر ذرّے میں مٹی کی مقدار کم ہے اور ان ہستیوں کے بدن کا حصہ زیادہ ہے جو وہاں دفن ہیں..

فجر کے فوراً بعد اس قبرستان کے دروا کر دیئے جاتے ہیں مسجد نبویؐ کی دیوار ان ہستیوں کو اُس ہستی کے مرقد سے الگ کرتی ہے جس کے وجود کے باعث اس قبرستان میں دفن ہستیاں دنیا میں ممتاز ہوئیں..وہ نہ ہوتی تو یہ کہاں ہوتیں۔

مسجد نبویؐ کے صحن میں سے سیڑھیاں اٹھتی ہیں اور ایک آہنی پھاٹک تک جاتی ہیں..اس کے اندر قدم رکھئے تو قبرستان تاحد نظر پھیل جاتا ہے..

اس کے باوجود کہ یہ قبرستان ہے اس میں قبریں نہیں ہیں..

جلے ہوئے بے شکل پتھروں کے ڈھیر کہیں کہیں ہیں

کہیں پتھر کی ایک سل زمین میں گڑی ہے..

کہیں بالشت بھر کی مستطیل نشاندہی ہے..

قبریں نہیں ہیں..

یہاں عورتوں کا داخلہ یکسر ممنوع ہے..

اس لیے مسجد نبویؐ کے صحن میں قبرستان تک اٹھنے والی سیڑھیوں کے قریب ہزاروں سر سے پاؤں سے سیاہ چادروں میں ڈھکی ایرانی خواتین..اس پابندی سے ناخوش کہ ہم قبرستان میں کیوں نہیں جا سکتیں..جہاں رسولؐ کے جائے اور پیارے دفن ہیں..وہاں کچھ آنسو کیوں نہیں بہا سکتیں..سر جھکائے قرآن پاک کی

تلاوت میں مگن نظر آتی ہیں.. اس منظر کی سیاہ سوگواری بیان نہیں کی جاسکتی.. یوں لگتا ہے جیسے مسجد نبویؐ کے صحن میں ایک سیاہ بادل اترا ہوا ہے اور ماتم کر رہا ہے...

دنیا کے اس مقدس ترین قبرستان میں پہلا قدم رکھتے ہوئے ڈر لگتا ہے.. میں یہ قدم دھیان سے رکھتا ہوں کہ اس کے تلے پنہاں کیا صورتیں ہیں..

داخل ہوتے ہی بائیں جانب ایرانی زائرین کا ایک ہجوم تھا.. اتنے لوگ تھے کہ ان میں سے گزر کر آگے جا کر یہ دیکھنا بھی ممکن نہ تھا کہ وہاں کون ہیں جن کے لیے یہ بے چین ہوئے جاتے ہیں.. وہاں خاتونِ جنتؓ ہیں .. حضرت امام حسنؓ ہیں.. امام جعفر صادقؒ ہیں.. اور ان کی پتھریلی نشانیوں کے آگے ایک حفاظتی جالی ہے تاکہ زائرین مغلوب ہو کر ان نشانیوں سے لپٹ نہ جائیں.. ان کے قریب امہات المومنینؓ کے مرقد بتائے جاتے ہیں لیکن وہ بھی سنگریزے جلے ہوئے پتھر..

میں نے صرف حج کے دوران بلکہ مقاماتِ مقدسہ پر.. مدینہ میں حاضری کے دوران سب سے زیادہ محو اور معتبر اور عبادت گزار ایرانیوں کو پایا.. وہ جس مقام پر بھی حاضر ہوتے تھے اس مقام کے تقدس کو پلکوں پر سجاتے ہیں اپنے سیاہ پیراہنوں میں سمیٹتے آنکھیں بند کر کے غرق ہو جاتے ہیں..

دائیں ہاتھ پر تو آلِ رسولؐ کے نشان تھے اور بائیں جانب ایک چاردیواری میں سنگلاخ زمین کو مکمل طور پر ڈھانپتے گندم کے ڈھیر تھے.

زائرین دانوں کی پوٹلیاں سنبھالے یہاں تک آتے تھے تاکہ روضہ رسولؐ اور جنت البقیع پر اڑنے والے کبوتروں کو یہ دانہ ڈال سکیں..

لیکن کبوتر کم تھے..

اور جتنے تھے گندم کے دانوں سے چنداں رغبت کا مظاہرہ نہ کرتے تھے.. بلکہ ان سے دور دور ٹہلتے تھے.. آخر وہ کتنے دانے چگ سکتے تھے.

جنت البقیع میرے تصور میں ایک مختصر قبرستان تھا لیکن وہ اس تصور سے کہیں بڑھ کر وسیع دکھائی دے رہا تھا.. اس کے آخری کنارے تک نظر آسانی سے نہیں جاتی تھی.. مسجد نبویؐ جتنا وسیع.. کم از کم ایک کلومیٹر طویل تو ضرور ہوگا.. اتنا بڑا تھا کہ اسے واقعی شہر خموشاں کہا جاسکتا تھا.. بس یہ کہ یہاں ان خاموشوں کی قبریں نہ تھیں بس ان کی خاموشی تھی.

ایک مسمار شدہ شہر..

کہیں کچھ نشان..

کہیں دو چار پتھر..

کہیں بارشوں سے زمین دھنسی ہوئی اور اس میں سے جھانکتا ایک پتھر جس کے تلے کون تھا جو ہمیں پیارا تھا.

تو کس نشان پر فاتحہ پڑھیں..

کس پتھر کے سرہانے کھڑے ہو کر کس کو یاد کریں..

جنگ اُحد کے شہیدوں کا ایک گڑھا ہے..وہ کتنے ہیں کون کون ہیں.کیا پتہ..نہ کوئی بتانے والا نہ کوئی اشارہ کرنے والا..

کہاں تصور کریں کہ خاتون جنتؓ کا نشان کون سا ہے..

اگر عائشہ صدیقہؓ یہاں ہیں تو کہاں ہیں..

اور وہ کون سا مقام ہے جہاں میرے حضورؐ کے آنسو گرے تھے جہاں انہوں نے اپنے لختِ جگر ابراہیم کو اپنے ہاتھوں سے دفن کیا تھا اور قبر کو سنوارا تھا.البتہ حضرت عثمانؓ کی آرام گاہ کی نشانیاں واضح ہیں..اگر وہ اس مقام پر دفن ہیں تو یقیناً یہ جگہ ان کے گھر کا ایک حصہ تھی کہ انہیں جنت البقیع میں دفن نہیں کرنے دیا گیا تھا..

البتہ ایرانی زائرین کے ہاتھوں میں جنت البقیع کے تفصیلی نقشے تھے اور وہ کہاں تک حقیقت سے قریب تھے یہ الگ بات ہے لیکن وہ ان کی مدد سے آگاہ ہوتے تھے کہ کون کہاں ہیں..

اور میں ان کی پیروی کرتا تھا..ان کے ساتھ ساتھ چلتا تھا کہ شاید میں بھی کچھ جان سکوں..

ایک اور مقام پر بہت سے لوگ دعا کر رہے تھے..میں نے نہایت ناقص فارسی میں دریافت کیا کہ یہاں کون ہیں تو ایک ایرانی نے گریہ کرتے ہوئے کہا''فاطمہ''

میں نے حیرت سے کہا''لیکن برادر فاطمہ تو وہاں ہیں امام حسن کے پاس..''

''فاطمہ مادر علی..''اس نے بتایا..

یہاں جنت البقیع میں بھی دیگر اہم زیارات کی مانند سرکاری طور پر تعینات ایسے سعودی مولوی ملتے ہیں جو نہایت تحمل اور بردباری سے آپ کو بدعت اور شرک کے بارے میں خبردار کرتے ہیں اور ان میں سے کچھ نہایت مدلل گفتگو کرتے ہیں..ادھر ایرانی اپنے موقف کے حق میں دلائل دے رہے ہوتے ہیں.ایک ایسا ہی سعودی نوجوان مولانا جو شاید شاہی خاندان کی قربت میں رہا تھا'اس لیے خوش شکل تھا'لوگوں کو متوجہ کر کے کچھ بیان کر رہا تھا..اور پاکستانی مہاندرے کا ایک شخص نہایت بے تکلفی سے گاڑھی عربی میں اس سے گفتگو کر رہا تھا..میں بھی ٹوہ لینے کی خاطر ان کے قریب جا کھڑا ہوا..کچھ دیر سعودی لحن کی شیرینی سے لطف اندوز ہوا اور پھر اس پاکستانی سے درخواست کی..اور وہ کچھ بیزار سا درست نہ بننے والا شخص تھا کہ پلیز ہو سکے تو مجھے بھی آگاہ کرتے جایئے کہ یہ سعودی برادر کیا لیکچر دے رہے ہیں..

''یہ کہہ رہے ہیں کہ قبروں کی زیارت سے کچھ حاصل نہیں ہوتا..یہاں صرف مٹی ہے..اور مٹی سے کچھ مانگنا شرک کے زمرے میں آتا ہے..یہاں جو بھی دفن ہیں'وہ اپنے اعمال کے خود ذمہ دار ہیں..ان کے لیے دعائیں مانگنے سے انہیں چنداں فائدہ نہ ہوگا..''

''ان سے پوچھئے کہ ترکوں کے زمانے میں یہاں مقابر تھے۔ گنبد اور مزار تھے۔۔ میں نے ان کی تصویریں دیکھی ہیں تو انہیں کیوں ملیامیٹ کر دیا گیا۔ اور اس پورے قبرستان پر ہل کیوں چلا دیا گیا۔''

''اس لیے۔'' میرا سوال سعودی تک پہنچا تو اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا ''لوگ ان مقابر کو پوجنے لگے تھے۔۔ سجدے کرتے تھے اور چومتے تھے۔ ان سے مرادیں مانگتے تھے اس لیے۔ پچھلے ڈیڑھ ہزار برس میں یہ قبرستان کئی بار اجڑا۔ کچھ حصوں پر عمارتیں تعمیر ہو گئیں۔۔ اور یقیناً اس میں اوپر تلے درجنوں نہیں بلکہ سینکڑوں کے حساب سے لوگ۔۔ ڈیڑھ ہزار برس میں مرنے والے لوگ۔ دفن کیے گئے تو یہ یقین سے ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ کون کہاں دفن ہوا تھا۔ محض روایات ہیں۔۔ مثلاً قبرستان کے داخلے پر حضرت عائشہؓ حضرت سودہؓ اور دیگر ازواجِ مطہرات کی قبروں کی نشاندہی کی جاتی ہے جب کہ ان میں سے کچھ مختلف ادوار میں اور مدینہ سے دور کسی اور مقام پر فوت ہوئیں تو وہ کیسے یہاں پہلو بہ پہلو دفن ہو سکتی ہیں۔''

سعودی مولوی کی منطق کسی حد تک دل کو لگتی تھی۔

''لیکن امام حسن تو یہیں دفن ہوئے۔۔ اگرچہ یہ روایت بھی ہے کہ بی بی فاطمہ دراصل حجرۂ رسولؐ کے قریب دفن ہیں لیکن زیادہ اتفاق اسی روایت پر ہے کہ انہوں نے بستر مرگ پر اپنے بیٹے حسن کے پہلو میں دفن ہونے کی خواہش کی تھی۔ حضورؐ نے اپنے بیٹے ابراہیم کو خود اپنے ہاتھوں سے اسی قبرستان میں پیوند خاک کیا۔''

''ہاں۔۔ لیکن حتمی طور پر یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ وہیں دفن کیے گئے تھے جہاں آج ان کے نشان ہیں۔ مثلاً حضرت فاطمہؓ اور امام حسنؓ کے مرقد قبرستان کے آغاز میں ہی بتائے جاتے ہیں۔۔ جنت البقیع تو بہت پرانا قبرستان ہے۔ حضورؐ کے مدینے میں قدم رکھنے سے بہت پہلے کا۔۔ تو ان کے مقابر اس کے آغاز میں کیسے ہو سکتے ہیں۔''

''حضرت عثمانؓ کی قبر تو واضح اور الگ ہے۔''

''لیکن وہ اس قبرستان میں نہیں اپنے گھر کے احاطے میں دفن ہوئے اور بعد میں اس احاطے کو جنت البقیع میں شامل کر لیا گیا۔۔ ان زمانوں میں کوئی نقشے تو تیار نہیں کیے گئے تھے جن کی مدد سے ہم جان سکیں کہ کون کس مقام پر دفن ہے۔ تو یہ سب اندازے ہیں۔''

سعودی مولوی اور خوش شکل مولوی دین اور تاریخ سے اپنے عقیدے کی مطابقت سے آگہی رکھتا تھا۔ اس کی گفتگو میں منطق کی کمی نہ تھی لیکن وہ ایک ٹیکنیشن کی مانند جنت البقیع کا تجزیہ کر رہا تھا۔

اور عقیدت اکثر منطق سے بے نیاز ہوتی ہے۔۔

اور عقیدت کو شرک بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔

میں ایک بار بہت برسوں کے بعد اپنے آبائی گاؤں جوکالیاں گیا تو چناب کے بند کے پہلو میں جو قدیمی قبرستان ہے وہاں رشتے کے ایک چچا نے میرے دادا جان اور دادی جان کی قبروں کی نشاندہی بھی

نہایت تامل سے کی.کہ بھائی امیر بخش کوشاید یہیں دفنایا گیا تھا..اور بہن فاطمہ کی قبر یہی ہوسکتی ہے..لیکن وہ بھی میرے پردادااور پردادی کی قبر کو نہ تلاش کرسکا..نہ نشاندہی کرسکا کہ بس یہیں کہیں تھے..لیکن مجھے اس سے کوئی فرق نہ پڑا کہ کون کہاں ہے..میں جانتا تھا کہ وہ یہاں ہیں..اوراس قبرستان میں چلتے پھرتے مجھے ان کی موجودگی کا احساس ہوتا تھا..ان کی مہک آتی تھی اور میں ان کی دعاؤں کے اثر کو محسوس کر کے ان کے لیے فاتحہ پڑھتا تھا..

گلبرگ کے فردوس مارکیٹ کے قریب جس قبرستان میں میرے اباجی اور امی محوخواب ہیں میں روزانہ اس کے برابر میں جو شاہراہ ہے اس پر سے صبح سویرے سیر کے لیے جاتے ہوئے..ڈرائیو کرتے ہوئے ہر روز جتنی دیر میں میری کار اس کی چاردیواری کے قریب سے گزر جاتی ہے..شاید دس بارہ سیکنڈ میں..اتنی دیر میں میں انہیں اپنی زندگی کی رپورٹ پیش کردیتا ہوں اوران کی دعاؤں کا طالب ہوتا ہوں..اور مجھے ہمیشہ اباجی کا لرزتا نقاہت سے تھرتھراتا ہاتھ اپنی پشت پر تھپکی دیتا محسوس ہوتا ہے..امی ململ کے نرم دوپٹے سے اپنے سفید بالوں کو ڈھکتی ہوئیں مسکراتی ہیں..ان کے باریک ہونٹ جو انہوں نے مجھے بھی اپنی نشانی کے طور پر عنایت کیے مسکراتے ہوئے مجھے دعائیں دیتے ہیں..

ہر روز دس بارہ سیکنڈ میں..اس قبرستان کی دیوار کے پاس سے گزرتے ہوئے..ان کی قبروں کی نشاندہی کے بغیر..صرف اس یقین کے ساتھ کہ وہ وہاں ہیں میں انہیں اپنی زندگی کی رپورٹ روزانہ پیش کرتا ہوں..

تو جنت البقیع میں بھی جو ہستیاں دفن ہیں..کہاں ہیں..کس مقام پر ہیں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے..آپ کے تخیل میں تو وہ وہاں ہیں اور آپ ان کی موجودگی محسوس کرسکتے ہیں تو ان کے لیے دعا کیوں نہیں کرسکتے..ان کی دعاؤں کے طالب کیوں نہیں ہوسکتے..

پھر ایک ایرانی قافلہ اوران کا ایک سیاہ پوش رہنما انہیں ہر پتھر سے ہر نشان سے آگاہ کرتا ہوا پتھروں کے ایک اور ڈھیر کے قریب رکا..اس نے فارسی میں ایک مختصر تقریر کی اور زائرین نے سر جھکا لیے چند آنسو بہائے اور چلنے کو تھے تو میں نے اس سیاہ پوش شخص سے بمشکل فارسی میں ایک فقرہ ساخت کر کے پوچھا کہ برادر مجھے تو بتاتے جاؤ کہ یہاں کون ہے.

''مائی حلیمہ.'' اس نے بتایا اور قافلہ آگے بڑھ گیا.

محمد حسنین ہیکل کہتے ہیں''بنوسعد کی دایہ عورتیں اس سال شہر مکہ میں پہنچ گئیں مگر وہ یتیم بچوں کو لینے کی روادار نہ تھیں کہ ان کی بیوہ مائیں ان کا معاوضہ کہاں سے پورا کریں گی..بی بی آمنہ کے جائے کی طرف ان کے یتیم ہونے کے سبب کسی دایہ نے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا اوران میں حلیمہ سعدیہ بھی تھیں جو پہلی بار انہیں یتیم جان کر چھوڑ گئی تھیں..اور جب ان کے حصے میں کوئی اور بچہ نہ آیا تو انہوں نے اپنے شوہر حارث سے کہا..مکہ سے خالی ہاتھ جانا بے حد ندامت کا باعث ہے اگر آپ مشورہ دیں تو میں بنو ہاشم کے اس یتیم کو ہی لے لوں.''

حارث نے کہا''اس بچے کو ضرور لے لو امید ہے کہ اس میں خدا ہمارے لیے برکت دے گا.''

سیرت النبیؐ کی ایک اور کتاب میں درج ہے کہ مائی حلیمہ نے کہا کہ میں نے اس یتیم بچے کو مجبوری کے باعث لیا. کوئی اور مل جاتا تو ہرگز نہ لیتی..

حلیمہ ماں فرماتی ہیں کہ جونہی میں نے انہیں گود میں لیا برکات کا نزول ہونے لگا. میری نقاہت والی مریل سواری سب سے آگے نکلنے لگی اور گھر پہنچی تو جو بکریاں سوکھ چکی تھیں.. ان کے تھنوں میں دودھ ٹھاٹھیں مارنے لگا..

ایک مرتبہ مائی حلیمہ حضورؐ سے ملنے کے لیے آئیں تو حضورؐ انہیں دیکھ کر "میری ماں.. میری ماں" کہتے ہوئے تعظیم میں اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنی چادر فرش پر بچھا کر انہیں اس پر بٹھایا۔

مائی حلیمہ کی وفات ہوئی تو حضورؐ کے آنسو تھمنے میں نہ آتے تھے.

ان کی اپنی ماں مائی آمنہ تو ان کے ہوش سنبھالنے سے بہت پہلے ہی رخصت ہو گئیں تھیں.. یہ صرف مائی حلیمہ تھیں جنہوں نے انہیں پالا پوسا تھا..

میری ماں.. میری ماں..

غزوۂ حنین کے قیدیوں میں مائی حلیمہ کی سگی بیٹی شیما بھی شامل تھیں.. جو حضورؐ کو کھلایا کرتی تھیں.. انہوں نے مسلمانوں کو بتایا کہ کیا جانتے ہو میں تمہارے رسولؐ کی رضاعی بہن ہوں.. ہم دونوں نے ایک ہی ماں کا دودھ پیا ہے.. مدتیں گزر چکی تھیں اور حضورؐ کو یاد نہ تھا. انہوں نے فرمایا "بچپن میں شرارت سے میں نے اپنی بہن کے کندھے پر کاٹ لیا تھا. میرے دانتوں کے نشان پڑ گئے تھے.. دیکھو کہ وہ نشان اگر موجود ہیں تو وہ واقعی میری بہن ہیں.. اور وہ تھیں.. حضورؐ نے نہ صرف انہیں بلکہ ان سب قیدیوں کو رہا کر دینے کا حکم فرمایا جو ان کی بہن کے عزیز و اقارب ٹھہرتے تھے..

میرے سامنے جو گڑھا تھا اور میں اس کے سامنے تنہا تھا.. چند پتھر اس گڑھے پر ساکت تھے.. مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ مائی حلیمہ وہاں اس مقام پر دفن تھیں یا کہیں اور تھیں.. اس وسیع قبرستان میں جہاں کہیں بھی تھیں تو میں نے ان کی اسی طور تعظیم کرنی تھی جیسے اپنی ماں کی قبر کی کرتا تھا.. جیسے میں اپنی ماں کو.. امی جی.. امی جی کہتا تھا ایسے میرے حضورؐ بھی میری ماں میری ماں پکارتے تھے.. اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ وہ یہاں اگر ہیں تو کہاں ہیں..

میں نے اس قبرستان میں سب سے زیادہ وقت مائی حلیمہ کی تربت کے سرہانے گزارا.. جن کے دودھ کی تاثیر بابا کی شریانوں میں حرکت کرتی تھی.. وہ فخر کرتے تھے کہ میں بنوسعد کا پالا ہوا ہوں اور ان کی زبان میں پلا بڑھا ہوں..

تو میرے رسولؐ مائی حلیمہ کے دودھ سے رسولؐ ہوئے..

''ہر گور کے اندر خُلد کا ایک در کھلا.. صبح دم دروازۂ خاور کھلا..''

نیم تاریکی میں روشنی گھلتی جا رہی تھی..

جنت البقیع کے طول و عرض میں جو ہلکی سیاہی ٹھہری ہوئی تھی اس کی جگہ طلوع کے آثار ہر پتھر ہر نشان کو واضح کرتے تھے..

فٹ پاتھ جو اس قبرستان میں ناتواں زائروں کی مانند تھے.. مٹی اور سنگریزوں کے قطعات کے گرد گھومتے کبھی سیدھے چلے جاتے اور کبھی بل کھاتے نکل رہے تھے..

وہ نمایاں ہونے لگے..

زائرین کے انبوہ بہت پیچھے رہ گئے تھے..

حضرت عثمانؓ کے نشان کے آگے قبرستان کا جو حصہ آخری دیوار تک چلا جاتا تھا وہاں کوئی زائر دکھائی نہ دیتا تھا کہ اس حصے میں اگر کوئی ہے اور کون ہے تو اس کا ذکر نہ ملتا تھا. تو وہاں تک کوئی نہ جاتا تھا.. اور میں چلتا جاتا تھا..

اس شہرِ خموشاں میں جہاں خاموش نہ تھے ان کی خاموشی تھی.. میں اپنی تنہائی میں اس عظیم ویرانے میں گویا صبح کی سیر کر رہا تھا.. مدینے کی سویر میں مدینے والے کے دیکھنے والوں.. ان کے رُخِ انور کا دیدار کرنے والوں اور ان کے پیاروں کے ابدی گھروں میں چہل قدمی کرتا تھا..

میں کبھی کبھار مڑ کر پیچھے نظر کرتا تو قبرستان کے داخلے پر کچھ لوگ نظر آتے اور ان سے پرے سبز گنبد نیم سیاہی میں نمودار ہوتا دکھائی دیتا.. مجھے یہ خدشہ بھی دامن گیر رہتا کہ کہیں داخلے کا گیٹ بند نہ ہو جائے..

میں جب تقریباً نصف مسافت طے کر چکا تو قبرستان کے آخری کونے میں.. چار دیواری کے نزدیک ایک ہجوم جمع دیکھا..

یہ کس کا مرقد ہو سکتا ہے جہاں اتنے لوگ جمع ہیں.. اور وہ داخل بھی کسی اور راستے سے ہوئے تھے..

تھوڑی دیر بعد زائرین کو لیکچر دینے کے بعد فارغ ہو کر واپس جاتا ہوا ایک سعودی سامنے سے آیا تو میرے استفسار پر بولا ''وہاں کوئی زیارت نہیں.. کوئی تازہ میت ہے جسے لوگ دفنا رہے ہیں..''

یہ ایک عجیب غیر مرئی اور غیر حقیقی سا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ آہستگی سے حرکت کرتے ہوئے سوگوار۔۔ یہاں سے ان کے چہرے تو نظر نہ آتے تھے کہ ان پر جو سوگواری ہوگی اس کا اندازہ لگایا جا سکے۔۔ ان کی رکی رکی حرکت اور کہیں ان کا سکوت پتہ دیتا تھا کہ نہ وہ زائر ہیں اور نہ یہاں جمع ہونے میں ان کا کچھ اختیار ہے۔۔

مجھے صرف ایک قلق ہو رہا تھا کہ کسی نے بھی حضورؐ کے آخری بیٹے حضرت ابراہیم کی قبر کی نشاندہی نہیں کی تھی: حضرت ماریا قبطی کے بطن سے جنم لینے والے۔۔ ان میں حضورؐ کی سرخ و سپید رنگت میں اپنی والدہ کی دمکتی سیاہی کی آمیزش بھی ہوگی اور وہ یوں ہم جیسے ہی ہوں گے۔۔ ہماری رنگت کے ہوں گے۔۔

میرے حضورؐ ان کی وفات پر بہت ہی روئے تھے۔ جیسے کوئی بھی باپ اپنے بیٹے کی موت پر روتا ہے.... میں تمہارے ہی جیسا ایک بشر ہوں۔ نشاندہی ہو جاتی تو جہاں حضورؐ ان کے سرہانے کھڑے تھے۔ اس مقام پر بھی کچھ دیر کے لیے آنکھیں بچھا دیتے۔۔

آگے کچھ نہیں تھا۔ میت کو دفن کرنے والے آہستہ آہستہ قبرستان سے نکل رہے تھے۔ تب میں پیچھے مڑا۔ واپس ہوا تو صبح دم دروازۂ خاور کھلا۔ مہر عالم تاب کا منظر کھلا۔۔ جنت البقیع کی سرمئی ویرانی اور سیاہ پتھروں کے ڈھیروں کے پار مسجد نبویؐ کے کونے میں بسیرا کرنے والے کا سبز گنبد سورج کی اولین کرنوں کی زد میں آکر اپنی سبز رنگت فراموش کرتا سنہرا ہو رہا تھا۔

مدینہ منورہ کا شہر اور مسجد کے در و بام ابھی واضح ہو رہے تھے۔۔ روشن نہ ہوئے تھے اور ان پر ایک سبز سورج طلوع ہو چکا تھا۔

اور کچھ نمایاں نہ تھا۔ زمیں کا اتنا ٹکڑا آسمان ہو رہا تھا اور اس آسمان پر ایک سنہری گولا ٹھہرا ہوا تھا۔۔

میں جہاں تھا وہیں تھم گیا!

ایک سناٹے میں آ گیا! اور ہمیشہ کی طرح میں یہ حیرت ناک منظر بھی بیان کرنے کے قابل نہیں ہوں۔۔

میں اس دم بخود کر دینے والے۔۔ سانس روک دینے والے منظر کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ تھا۔۔ روضۂ رسولؐ کو اس زاویے سے طلوع کے رنگوں میں رنگا رنگ نہ مجھے کسی تصویر نے دکھایا تھا اور نہ کسی نے بتایا تھا: اور ایسا ہونا بھی نہیں تھا۔ کسی اور نے اسے ایسا دیکھا ہی نہ تھا تو کیا کوئی تصویر اتارتا اور کیا کوئی بیان کرتا۔۔ یہ میرا وہ انعام تھا جو اللہ تعالیٰ مجھ ایسے آوارہ گردوں کے لیے پوشیدہ رکھتا ہے اور پھر جب وہ مناسب سمجھتا ہے ان پر اتار دیتا ہے۔۔ یہ منظر مجھ پر ہی اترا تھا۔۔

کبوتروں کی ایک ٹکڑی بھی اسی طور کسی پوشیدگی سے ظاہر ہوتی اُتری سرمئی رنگ کے کبوتروں کی ایک ٹکڑی۔۔ اُتری اور گنبد کے سنہری گھیر میں داخل ہوتی سنہری ہوتی گئی۔۔ ایسی ہم رنگی ہوئی کہ وہ بھی سنہری

ہوگئی.. واہمہ ہی تھا کہ ان کی پرواز بھی گنبد کے گرد اڑان کرتے مدھم ہوگئی اور ہر پرندہ جدا جدا نظر آنے لگا.. جونہی ان میں سے ایک اس سنہرے پن کے سحر سے نکلتا تو پھر سے برسی ہو جاتا..

"صبح آیا جانب مشرق نظر
اِک نگار آتشیں کھلا

ہاں اسے وہی غالب کسی حد تک بیان کرسکتا ہے جو دلی پوشیدہ تھا اور کافر کھلا.. کیسا میرے سامنے اِک نگار آتشیں کھلا..

صبح دم دروازۂ خاور کھلا
مہر عالم تاب کا منظر کھلا

دروازۂ خاور کہیں کھل تو گیا تھا پر ابھی دکھائی نہ دیتا تھا لیکن اس کی کرنوں سے مہر عالم تاب کا جو منظر کھلا تھا' وہ میرے سامنے تھا... موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا.. اور میں جہاں تھا وہاں پر ہر گور کے اندر خُلد کا ایک در کھلا تھا..

لا کے ساقی نے صبوحی کے لیے
رکھ دیا ہے اک جامِ زر کھلا

کیسا ایک جامِ زر میرے سامنے صرف میرے لیے رکھ دیا گیا تھا.. اور اس میں کیسی مست الست سبز شراب تھی جو چھلکتی تھی اور صرف میرے لیے کشید کی گئی تھی..

ہاں ایک سنہری پیالہ تھا جو مدینے کی سویر میں ٹھہرا ہوا تھا..

اور میں جہاں تھا.. جنت البقیع میں.. جہاں جن کی بھی قبریں تھیں ان کے لیے روز حشر کا انتظار نہیں کیا گیا تھا ابھی سے خُلد کا در اُن میں کھول دیا گیا تھا.. اور یہاں کہیں میرے حضورؐ کے نقشِ پا کی صورتیں جو تھیں وہ دل فریب تھیں..

بادۂ گل رنگ کا کیسا ساغر کھلا ہوا تھا..

کوہ طور کی جھاڑی میں سے جو روشنی پھوٹتی تھی بس وہی تھی جو اس جامِ زر سے پھوٹتی تھی..

وہ کہ جس کے ناخن تاویل سے
عقدۂ احکام پیغمبرؐ کھلا..

تو مجھ پر اس سویر بابا کے گنبد کے سنہرے پن کے منظر نے.. عقدۂ احکام پیغمبر کھول دیا.. رازِ ہستی مجھ پہ سرتاسر کھلا..

اک نگار آتشیں..

میرا ناتواں اور گھستا ہوا قلم تو بس اتنا کرسکتا تھا کہ بلندیوں' برفوں' دریاؤں' محبتوں' اذیتوں اور

چہروں کو کسی حد تک بیان کر سکے.. اس کی نوک میں اس نگارِ آتشیں کو بیان کرنے والا.. کوئی ذرہ نہ تھا.. اور میں تو پوشیدہ بھی کھلا بھی کافر تھا.. ولی نہ تھا.. لیکن یہ مجھی پر کھلا کہ بس قرآن ہی قادر ہے اس لحۂ موجود میں اپنے محبوب کے گھر کے اوپر جو نگارِ آتشیں ہے اُسے بیان کرنے پر.. اسی منظر کے لیے وہ کہتا ہے..

نور علیٰ نور

اندر بھی نُور اور باہر بھی نُور..

نُور کے اوپر نُور..

؎ روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام

''بابا کھجور کے تنے کے ساتھ ٹیک لگائے باتیں کرتے ہیں..
یارکن جولاہوں نے تیرے پیراہن کے کھدّر کو بُنا تھا''

باہر مدینہ تھا اور اندر استنبول تھا.. ارض روم تھا۔
باہر عربی کی راجدھانی تھی اور اندر ترکی کی سلطنت تھی..

''پاکستان ہاؤس'' سے نکلتے.. لوٹتے.. ادھر سے بار بار گزرتے میں نے یہ ترک ریستوران سپاٹ کیا تھا کہ اس کے آس پاس کی عمارتوں کے باہر ترکی کے سرخ پرچم آویزاں تھے اور ان کے اندر ترک زائرین قیام کرتے تھے.. اور میں نے اپنے آپ میں درج کر لیا تھا کہ ایک بار اس ترک ریستوران کے اندر ضرور جانا چاہیے.. ایک بار..

وہ ایک بار آج صبح کا ناشتہ تھا..

جنت البقیع میں جس کی ہر گور میں خُلد کے در کھلتے تھے وہاں سے سامنے جو ایک جام زر کھلا تھا اس کے خمار میں مست میں اپنے بیٹوں کے ہمراہ سیڑھیاں اترا اور اس کی دیوار کے ساتھ ساتھ جو بازار کھلا تھا اور چلتا جاتا تھا' اس میں ہم چلے.. قصد یہ تھا کہ منکے' کوکے' تسبیح کے دانے' اس شہر مدینہ کی کچھ نشانیاں.. کچھ سوونیئر خریدے جائیں.. آئے ہیں اس گلی میں تو تسبیح ہی لے چلیں.. اور وہ ہم نے خریدے اور جس دکاندار سے خریدے وہ ملتان کا ایک سائیں تھا' لاہور اور گجرات کے سائیں بھی یہی کاروبار کرتے تھے.. کاروبار کرتے ہوئے یہ خیال کبھی نہیں آتا کہ ہم مدینہ میں ہیں یا لاہور کی انارکلی یا ڈبی بازار میں.. ایسے دھیان کیے جائیں تو کاروبار نہیں ہوتے.. جو خود تسبیح کرنے بیٹھ جائے اس نے تسبیحاں کیا فروخت کرنی. تو سمجھ لیجیے کہ یہ بازار مدینہ میں.. مسجد نبویؐ کے سائے میں نہیں.. ملتان' لاہور' بہاولپور یا گجرات میں ہے.. تو یہاں بھی بھاؤ تاؤ اور شور وغل کا وہی چلن تھا.. یہ تو نہیں کہ صرف دکاندار بلکہ گاہک حضرات جو ابھی ابھی روضۂ رسولؐ اور جنت البقیع میں شبنم کی مانند نیر بہاتے تھے وہ بھی سب کچھ فراموش کر کے دنیا کے دھندوں میں الجھ گئے تھے.. لیکن ملتان کے اس سائیں نے جس کی دکان پر ہم رکے نہ صرف صدق دل سے ٹھنڈے گرم کی پیشکش کی.. ناشتے کے لیے اصرار کیا

بلکہ بازار سے نصف قیمت لگائی اور مجھے ایک سیاہ منکوں کی افریقی تسبیح تحفے کے طور پر عطا کی..

ہم ان تسبیحوں سے لدے پھندے جب ''پاکستان ہاؤس'' کو لوٹتے تھے کہ وہاں پہنچ کر کچھ پیٹ پوجا کی جائے تو ترک ریستوران نظر آ گیا..

ہم نے ایک خصوصی ترک ناشتہ کیا. ترک ڈبل روٹی. مکھن.. پنیر.. زیتون اور انڈوں کا ''کچھ''. اس لیے ''کچھ'' کہ سمجھ میں نہ آ سکا کہ یہ جو کچھ بھی ہے ابلا ہوا ہے آملیٹ ہے.. فرائی ہے یا کیا ہے اور اس کے ساتھ کڑوی گرم ترک کافی.. ویٹر مسکراتے ہوئے مؤدب اور خوش لباس. شوکیسوں میں سجی خوراک اجلی اور نظر نواز اور ماحول میں خوشی اور تازگی کی مہک.. یہ سب ستھرائیاں.. مسکراہٹیں اور مسرت آمیز ماحول کسی پاکستانی یا سعودی ریستوران میں تو کم کم ہی دستیاب تھا..

ناشتے کے بعد ''پاکستان ہاؤس'' میں.. غڑاپ سے بستروں پر اور مدہوش..

کچھ دیر عالم غنودگی کی پُر لطف اونگھ اور سوچ.. اور پھر جمعہ کی اذان بالکونی کے راستے ہمارے نیم خوابیدہ کانوں میں اترنے لگی..

بالکونی سے نیچے وہی خلقت کا سیلاب شاہراہوں اور فٹ پاتھوں پر بہتا اس جانب رواں دواں تھا جدھر سے فلاح کے سندیسے آ رہے تھے.. چنانچہ شتابی سے وضو کر کے.. ایک سست لفٹ میں سوار اس کی رفتار میں قدرے تیزی کی دعائیں کرتے کہ کہیں دیر نہ ہو جائے بالآخر نیچے پہنچے اور اس سیلِ رواں کا ایک حصہ بن گئے.. اس میں بہتے بہتے صحن میں بہتے مسجد کے دروازوں میں سے داخل ہو کر بھی تھمے نہیں بہتے گئے تاکہ طویل مسافتوں پر واقع جو سفید قالین ہے ریاض الجنۃ ہے اور منبر رسولؐ ہے جس قدر ممکن ہو اس کی قربت میں نماز ادا کر کے ثواب کا کچھ بندوبست کیا جا سکے.. اور اس سعی میں اشتیاقِ ثواب میں کچھ لوگوں کی حق تلفی بھی کی.. ایک آدھ کو دھکیل کر راستہ بنایا' کسی کی عبادت میں مخل ہوئے لیکن اپنے لالچ پر قابو نہ پا سکے.. اگرچہ آگے کچھ گنجائش نہ تھی. صفیں گھنی اور ناقابلِ عبور تھیں لیکن ہم تھے کہ زائرین پر سے ٹاپتے انہیں پھلانگتے گئے.. پھر لاؤڈ سپیکروں پر ''اللہ اکبر'' کی صدا بلند ہوئی اور لوگ صف آراء ہو گئے.. اب ان دیواروں کو پھلانگنا تو مشکل تھا.. چنانچہ میں کہیں کھڑا ہو گیا اور سلجوق اور سمیر جو کہیں اور تھے جہاں تھے وہیں تھم گئے.. نماز شروع ہو گئی.. تلاوت کی آواز گونجنے لگی.. میر کے کلام میں جو شیرینیٔ نسیم اور سوز و گداز ہے وہ مسجد نبویؐ میں کی جانے والی تلاوت کے سامنے ہیچ تھا.. اور حسرت پہ جو لطفِ سخن تمام ہوتا تھا یہاں اس سے آغاز ہوتا تھا.. یہ ایسا پُر سوز اثر انگیز راگ تھا جس کے سوتے قرآن سے پھوٹتے تھے اور اس میں جو موسیقی تھی وہ دل کے تاروں سے ہم آہنگ ہوتی روح میں ایک الوہی سمفنی کی مانند گونجتی تھی..

میں نے ''پاکستان ہاؤس'' سے نکلنے سے پیشتر ایک ایسے امریکی سیاح کی مانند جو ایک ہی دن میں

پورا روم دیکھ لیتا ہے.. پیرس میں ایک بگولے کی مانند گھوم جاتا ہے اور پھر زندگی بھر دوستوں میں ڈینگیں مارتا رہتا ہے کہ ہاں میں نے روم دیکھا ہے.. پیرس کے چپے چپے سے آگاہ ہوں تو اسی طور میں نے آج کے لیے بھی ایک فہرست بنائی تھی کہ میں نے یہ اور یہ دیکھنا ہے.. اور یہ اور یہ کرنا ہے تاکہ بعد میں فخر کر سکوں کہ ہاں میں مدینے میں تھا..

یہ فہرست کچھ یوں تھی..

1- مسجد نبویؐ میں نماز جمعہ ادا کرنا..

2- اس کے فوراً بعد ریاض الجنۃ کے سفید قالین پر کھڑے ہونے کے لیے کوئی گنجائش نکالنا اور وہاں دو نفل ادا کر کے جنت میں جگہ بنانا..

3- منبر رسولؐ کے آگے دو نفل ادا کرنا۔

4- محراب رسولؐ کے آگے بھی نوافل ادا کرنا۔

5- اصحاب صفہ کے تھڑے پر بیٹھ کر ابوذر غفاریؓ، ابو ہریرہؓ اور عبیدہ بن جراحؓ کو یاد کرنا۔

6- حجرۂ رسولؐ کی دیوار کے ساتھ بیٹھ کر کچھ دیر پڑھنا.. جو جی میں آئے کرنا.. مانگنا اور مانگتے جانا۔

7- واپسی پر سولا بخش کا انتظار کرنا۔

پہلا مرحلہ تو نہایت خوش اسلوبی اور شتابی سے طے ہو گیا کہ سعودی امام ہمارے پاکستانی اماموں کی مانند آپ کے صبر کا امتحان نہیں لیتے.. خطبے کے دوران اپنی ذاتی زندگی کے پُر درد حوالے نہیں دیتے.. سیاست نہیں کرتے.. دوسروں کے عقیدوں پر حملہ آور نہیں ہوتے اور نہ ہی چندے کی بصیرت افروز اپیلیں کرتے ہیں.. ذرا تے دھمکاتے بھی ہرگز نہیں اور لمحوں میں آپ کو فارغ کر دیتے ہیں..

سلام پھیرتے ہی ہم پھر سے متحرک ہو گئے.. اب ریاض الجنۃ تک پہنچ کر اس ٹکڑے پر بچھے سفید قالین پر کچھ جگہ بنانے کا معاملہ درپیش تھا اور قالین تو کیا اس کی سفیدی بھی کہیں نظر نہ آتی تھی کہ اس پر جبینوں کے ہجوم تھے.. سجدوں کی یلغار تھی اور بے انت ماتھے بچھے ہوئے تھے.. بلکہ وہاں لوگ یوں جڑے ہوئے تھے.. ایک دوسرے میں پیوست تھے.. صفوں کے درمیان کچھ گنجائش نہ تھی کہ لوگ رکوع میں جھکتے تھے تو آگے کھڑے صاحب کی کمر پر جھکتے تھے.. سجدے میں جاتے تھے تو ان کے آگے جو صاحب ہوتے تھے اگر وہ کھڑے ہوتے تھے تو ان کے پاؤں میں سر رکھ دیتے تھے اور اگر وہ بھی حالت سجود میں ہوتے تو ان کی کمر پر ماتھا ٹیک کر اسے تھپکنے لگتے تھے..

میں نے بھی جگہ بنائی.. ذرا دھکیل کر اور زبردستی جو جگہ بنائی تو وہاں بھی اسی کیفیت اور جڑواں حالت

میں دو نفل ادا کیے..

میرے پاؤں تو سفید قالین کی حدود میں تھے لیکن میرے سجدے اس سے اوپر لوگوں کے پاؤں یا کمر پر ہی ہوئے..

شاید میرے اس بیان سے یہ شائبہ ہو کہ میں جو حقیقت بیان کر رہا ہوں تو جان بوجھ کر اس میں مزاح کا کوئی پہلو شامل کر رہا ہوں.. نہیں.. ہرگز نہیں.. تنگ و دو اسی نوعیت کی کرنی پڑتی ہے لیکن ایک بار آپ کو جگہ مل جائے جنت کے اس سفید ٹکڑے کی حدود میں آپ کے پاؤں آ جائیں تو جونہی آپ کانوں کی لویں چھو کر منہ ول کعبے شریف کی نیت کرتے ہیں تو آپ کی ٹانگوں میں ایک لرزش نمودار ہونے لگتی ہیں.. آپ اچھے بھلے ہوتے ہیں اور آپ کو لرزے کی بیماری لگ جاتی ہے.. ایک انوکھے تجربے کے لذت آپ پر حاوی ہو جاتی ہے..

اور ایک خوش بختی کا احساس جاگزیں ہوتا ہے کہ بے شک آپ لوگوں کے پاؤں میں سجدے کر رہے ہیں لیکن شکر ہے.. صد شکر ہے..

تیسرا مرحلہ البتہ کچھ دشوار نظر آتا تھا..

سفید قالین تو بہت وسیع تھا لیکن منبر رسولؐ کے آگے تو بس دو تین جبینوں کی گنجائش تھی..

جب منبر نہ تھا تو یہاں کھجور کا ایک درخت تھا..

بابا اس کے تنے کے ساتھ ٹیک لگا کر باتیں کرتے تھے.. خطبہ دیتے تھے..

اور جب اس درخت کی جگہ ایک معمولی کھردرے پن سے تراشا ہوا منبر رکھا گیا تو وہ درخت روایت ہے کہ رسولؐ سے جدا ہو جانے.. روزانہ اسے سہارا دینے کے اعزاز سے محرومی پر رویا.. ایک صحابی اس کے تنے کو محبوب جان کر گھر لے گئے اور جب تک حیات رہا اسے اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیا..

بس اسی درخت کے مقام پر ایک پرشکوہ دمکتا منبر ہے..

مختلف ادوار میں سلطانوں اور بادشاہوں نے پرانے منبر ہٹا کر ان سے کہیں شاندار منبر بنوا کر یہاں رکھے.. اس سے پیشتر جو منبر تھا وہ ان دنوں مسجد قبا کی زینت ہے.. مسئلہ یہ تھا کہ منبر رسولؐ کے آگے صرف دو تین لوگوں کے کھڑے ہونے کی بمشکل گنجائش تھی اور ان دو تین لوگوں کے نوافل سے فارغ ہونے کی منتظر ان کے پیچھے ایک خدائی تھی..

یہ مرحلہ محال نظر آتا تھا..

میں بھی اس خدائی میں شامل ہو کر صابر ہوا اور اطمینان سے اپنی باری کا منتظر ہوا..

منبر کے قریب ایک سعودی نگہبان تھا جو سجدے میں پڑے رہنے والوں کو مسلسل سرزنش کرتا تھا کہ بھائی اب سر اٹھاؤ جگہ خالی کر دو.. دوسروں کو بھی موقع دو.. وہ مہربان نہ ہوتا تو یقین کیجیے کہ منبر رسولؐ کے آگے جو سجدے میں جاتا قیامت تک سر نہ اٹھاتا..

اکثر ایسے مقامات پر ایک معجزہ سا ہو جاتا ہے..

"وہ" نمودار ہو جاتا ہے۔

خانہ کعبہ کی دیوار کے پاس..حجر اسود کے آس پاس..جس مقام تک پہنچنا محال نظر آتا ہے "وہ" آ جاتا ہے..اپنا مقام آپ کے لیے چھوڑ دیتا ہے..آپ کے لیے جگہ بنا دیتا ہے..اکثر اس کی زبان اجنبی ہوتی ہے لیکن اس کا چہرہ بولتا ہے کہ بھائی آپ میری جگہ آ جائیے..تو یہاں بھی اس کا ظہور ہو گیا..باری اس کی تھی لیکن وہ ہٹ گیا اپنی جگہ میرے لیے چھوڑ دی اور کہنے لگا "تارڑ صاحب آپ آ جائیے.."

یہاں بھی آپ منبر رسولؐ کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں تو لرزش شروع ہو جاتی ہے..رکوع میں جاتے ہیں تو ٹانگیں جواب دینے لگتی ہیں اور سجدہ ریز ہوتے ہیں تو آپ کا ماتھا کہتا ہے کہ میں نے جس مقام پر پہنچنا تھا پہنچ گیا..اب جو بقیہ تم ہو جہاں جی میں آئے جاؤ میں یہیں رہوں گا..میں تو کہیں جانے کا نہیں..رسولؐ کے پاؤں کے نشان میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں ان میں جو خون دوڑتا ہے اس کی روانی بس ٹھہر ٹھہر جاتی ہے کہ میں بھی چھو لوں..میری تو ساخت ہی اس مقام کی مناسبت سے تخلیق کی گئی تھی تو اب میں نقش پا کے سانچے میں ڈھل گیا ہوں الگ نہیں ہو سکتا۔

بابا کھجور کے تنے کے ساتھ ٹیک لگائے باتیں کر رہے ہیں..آواز دھیمی ہے اور مسکراہٹ مسلسل ہے کہ یہ جو سجدے میں پڑا ہے یہ بھی آ گیا ہے۔

منبر پر بیٹھے ہوئے ہیں کھدر کے تہبند اور کرتے کو سنبھالتے بیٹھے ہیں..اگر خنکی بڑھ گئی ہے تو ایک سیاہ کمبل میں لپٹے بیٹھے ہیں اور مخاطب کس سے ہیں؟ مجھ سے..یہ خیال آیا تو رکاوٹ پڑنے لگی..جو کچھ ذہن اور بدن میں جاری تھا اس میں خلل آنے لگا..محض یہ خیال کہ کبھی بابا اس مقام پر کھڑے ہوتے تھے..اگر بیٹھتے تھے تو ان کے پاؤں جہاں میں سجدے میں ہوں وہاں ہوتے تھے..محض یہ خیال..میں تنہا ہونے لگا..یکسر بقیہ خدائی سے جدا ہونے لگا..میرے برابر میں جو دو شخص کھڑے تھے وہ بھی وہاں نہ رہے بس میں رہا اور میرا رسولؐ رہا..جب وصل نصیب میں آوے تنہائی مل جاوے تو کیا ہوتا ہے..التجاؤں پر آ جاتے ہیں..درخواستیں کرتے ہیں..جو کچھ میرے بدن میں عربی میں جاری تھا وہ تو میرے سوچنے سمجھنے سے ماورا خود بخود گردش میں تھا تو میں نے اسے تو جاری رہنے دیا لیکن خود پنجابی میں چلا گیا..رواں ہو گیا..کتھے مہر علی..ہاں جی..سوہنے سائیں دل میں شک شبہے کے بھانبڑ جلتے ہیں مجھے راکھ کرنے والے ہیں تو انہیں بجھا دے..اُسے تو کچھ غرض نہیں وہ تو موہوم ہے..اس کو چھو نہیں سکتا..تُو تو ہے..دیکھ تیرے کھدر کے تہبند کو چھو رہا ہوں میری سفارش کر دے..مجھے راکھ ہونے سے بچا لے..جب التجائیں ختم ہو گئیں اور ذرا اطمینان ہوا تو پھر دیدار ہوا..تیرا ماتھا کیسا روشن ہے سائیں..آنکھیں کیسی سیاہ جادوگری ہیں..تیرے بال کھدر کی سفید پگڑی میں سے گھٹاؤں کی مانند اُمڈتے تیرے شانوں تک آتے ہیں..اور تیرے کندھوں کے درمیان ایک مہر ہے جو میں کیسے دیکھ سکتا ہوں..اسے تو

بی بی آمنہ دیکھتی تھیں.. ابھی تیری ماں حلیمہ کے چند پتھروں کو نظر سے چوم کر آیا ہوں وہ دیکھتی ہوں گی.. فارس کے سلمان نے دیکھا ہوگا..

میں جو تیرے کھدر کے تہبند کو چھوتا ہوں تو یہ کُھردرا نہیں لگتا.. ایک صحابیؓ نے جب تجھے اونٹ پر سوار ہوتے دیکھا تھا تو آپ کا کرتا ذرا سمٹا تو انہوں نے تیرے پیٹ کا ایک حصہ دیکھ لیا جو ریشم سے بنا ہوا لگتا تھا تو یہ کھدر شاید اس ریشم کی قربت سے خود ریشم ہو گیا ہے..

بس یہ بتلا دے کہ اسے کن جولاہوں نے بُنا ہے..

ذرا اُن کا پتہ تو بتلا دے..

دیکھوں تو سہی کہ وہ جو تیرے پیراہن بُنتے ہیں ان کی شکلیں کیسی ہوتی ہیں.. ان سے درخواست کروں کہ بھائی جولاہے اگر تیرے تانے پیٹے میں کوئی دھاگا کم ہو جائے.. ٹوٹ جائے تو غم نہ کرنا.. میں خود اُدھڑ جاتا ہوں.. بے شک اس اُدھڑنے سے جو دھاگے نکلیں گے ان پر بہت دھبے اور سیاہ نشان ہوں گے لیکن تو ان میں سے کسی ایک دھاگے کو اپنے تانے پیٹے میں تان لینا.. دور سے دکھائی دے گا کہ پیراہن کی بُنت میں صرف ایک دھاگا ہے جو سفید نہیں ہے لیکن یقین جان کے جب بابا اسے اپنا لباس کریں گے.. تیرا بنا ہوا کھدر ان کے بدن پر ہونٹ رکھے گا تو وہ ایک سیاہ دھاگا پلک جھپکتے ہی چِٹا سفید ہو جائے گا.. اور اگر اس کا امکان نہیں ہے تو دیکھوں تو سہی بھائی جولاہے کہ تیری انگلیاں کیسی ہیں جن سے تو میرے بابا کا پیراہن بُنتا ہے.. انہیں ہونٹوں سے نہ سہی آنکھوں سے ہی چھو لوں تو تیرا کیا جائے گا.. ویسے تجھے اپنے تانے پیٹے کے لیے ایک دھاگے کی حاجت ہے یا نہیں.. میں نے تو اپنے آپ کو ادھیڑ لیا ہے..

میں اسی اُدھیڑ بن میں مبتلا تھا جب مجھے سعودی نگہبان کی سرزنش کا احساس ہوا..

وہ جانے کب سے درشتی سے نہیں الفت اور مہربانی سے میرے کندھے چھو رہا تھا کہ حاجی سر اٹھا لو.. اور لوگ بھی ہیں..

اور لوگ بھی ہیں..؟

پہلے نہیں تھے اس کے کہنے سے ہو گئے اور میں تنہا نہ رہا..

سلام پھیرنے کے بعد میں اٹھا تو آسانی سے نہیں اٹھا کہ اب اعضاء میں وہ اعتدال نہ رہا تھا.. اٹھنے میں ذرا دقت ہوئی تو ہاتھ بڑھا کر جو کچھ بھی میرے سامنے مجھے سہار سکتا تھا اسے تھام کر اٹھنے لگا تو سعودی نگہبان ذرا ترش ہو گیا کہ میں منبر رسول کو تھام کر اٹھنے کی سعی کر رہا تھا.. اس نے فوراً میرا ہاتھ منبر سے الگ کر دیا کہ شرک شرک.. میں بے سہارا ہونے پر ذرا سا لڑکھڑایا اور سیدھا ہو گیا اور میں نے ایک نہایت کھسیانی سی مسکراہٹ لبوں پر سجا کر اس سے معذرت کی کہ برادر میری نیت ہرگز منبر رسول کو چھونے کی نہ تھی.. اس جگہ کوئی بھی سہارا ہوتا تو میں اسے تھام کر اٹھتا.. معاف کر دیجیے..!

میری تو بے شک نہ تھی لیکن منبر رسولؐ کی نیت تھی کہ یہ اُدھڑا ہوا شخص میرا سہارا لے لے.. اسے اور کس نے سہارنا ہے..

منبر رسولؐ کے نزدیک ہی محراب رسولؐ تھی.. اور رہی سہی کسر اس نے پوری کر دی..

تب مسجد نبویؐ یہاں تک تھی..

اور وہ محراب جہاں اللہ کا پیغام لانے والے کھڑے ہو کر نماز پڑھاتے تھے اس مقام پر تھی..

ظاہر ہے ان زمانوں میں یہ محراب گارے سے چنی ہوئی کچی اینٹوں کی تھی اور اب قدرے پرشکوہ اور شان والی تھی..

اس پکی محراب سے اس کی کچھ مناسبت نہ تھی کہ اس کی کچھ اینٹیں میرے بابا نے اپنے ہاتھوں سے استوار کی تھیں.. تبھی تو وہ دور سے اُن اینٹوں سے الگ اور ممتاز دکھتی ہوں گی جو دیگر صحابہ کے ہاتھوں نے رکھی تھیں..

تو کچھ مناسبت نہ تھی..

صرف مقام کا تعین تھا..

جیسے جنت البقیع میں کچھ سیاہ پتھر پڑے تھے ایسے یہ شاندار محراب بھی پڑی تھی..

بس یہ احتیاط کی گئی تھی.. ذراسی تبدیلی کی گئی تھی کہ حضورؐ جب سجدے میں جاتے تھے تو یہ محراب اس مقام پر.. ان کی سجدہ گاہ کو ڈھانپتی ہوئی رکھی گئی تھی تاکہ شرک سے اجتناب ہو جائے.. ہر کسی کی جبیں اُس مقام پر نہ ہو جہاں رسولؐ کے ماتھے کے نشان ہیں..

شاید یہ احتیاط بہتر ہی تھی..

حضورؐ کی جبیں سے جبیں چھونے والا کب وہاں سے اٹھتا ہے.. جب تک کہ وہ اس جہان سے نہ اٹھے..

تو اب صورت حال کچھ یوں تھی کہ محراب کی قوس میں جب آپ سجدے میں جاتے تھے تو آپ کا ماتھا اس مقام کو چھوتا تھا جہاں حضورؐ کے پاؤں ہوتے تھے.. اور یہ سودا بھی کچھ گھاٹے کا نہ تھا.. ویسے تو کل مدینے میں کہیں بھی کوئی ایک سودا نہ تھا جس میں خسارے کا ذرہ بھر امکان ہو..

یہاں بھی منبر رسولؐ کی مانند جمگھٹے تھے.. انتظار ایسے تھے کہ ابد تک چلے جاتے تھے اور اشتیاق ایسے تھے کہ ابد تک انتظار کر سکتے تھے..

وہ ابد آ ہی گیا اور میں بھی سمٹ کر.. کہ یہاں بھی دو تین افراد کی گنجائش تھی محراب رسولؐ کے روبرو ہو ہی گیا..

اگرچہ نماز پڑھتے ہوئے نوافل ادا کرتے ہوئے ہدایت تو یہی ہے کہ دھیرج سے پڑھو.. اطمینان

سے توجہ مرکوز کر کے پڑھو لیکن محراب رسولؐ کے سامنے جو بھی کھڑا ہوتا ہے وہ یہ ہدایت فراموش کر دیتا ہے اور شتابی سے تیز رفتاری سے پڑھ پڑھ کر اپنا ماتھا رسول کے پاؤں پر رکھ دیتا ہے..

دو نوافل کے کل چار سجدے..

چار سجدوں کی اتنی مختصر کائنات..

اور ہر سجدے کے بعد کیسے اٹھتے ہیں یہ تو جی جانتا ہے..

خود سے کہاں اٹھتے ہیں محبوب کے در کا دربان زبردستی اٹھا دیتا ہے..

تو تب اٹھتے ہیں..

یہاں سے اٹھائے گئے تو اس تھڑے کی جانب چلے گئے جو بے گھروں بے سہارا اور بھوکے لوگوں کا ٹھکانہ تھا. جن کے بدن پر اکثر ایک ہی کپڑا ہوتا تھا. نماز ادا کرتے تو کبھی تن کے اس حصے کو ڈھانپتے تھے اور کبھی بدن کے اُس حصے پر اسی ایک کپڑے کو پھیلاتے تھے..

جہاں سنہری جالیوں میں رخ زیبا کی ایک جھلک کے لیے تانک جھانک جاری رہتی ہے تو اس گھر کے پیچھے.. بلکہ اس حجرے کے عقب میں.. جو شاید اس گھر کا ماتھا تھا. وہاں وہ تھڑا تھا. زمین سے.. بلکہ مسجد نبویؐ کے فرش سے ایک ڈیڑھ فٹ اونچا ایک مستطیل تھڑا تھا اور وہ بھرا ہوا تھا. لبریز تھا.. اس پر براجمان لوگ.. بیشتر لوگ.. نہ بے گھر تھے اور نہ بے سہارا.. ان کے لباس پورے تھے.. اور وہاں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی اور میں بہرحال ایک تل سے زیادہ حجم والا تھا..

یاد رہے کہ یہ تھڑا حجرۂ رسولؐ کی دیوار کے عین سامنے واقع تھا.

آج جہاں جہاں بھی حاضری ہوئی تھی.. جنت البقیع میں. منبر رسولؐ کے سامنے. محراب رسولؐ کے آگے تو شوق کے سوا کچھ ہوس ثواب کی بھی تھی..

مانگنے تانگنے اور جھولی پھیلانے کی بھی تھی لیکن.. اس تھڑے پر بیٹھنے کی آرزو میں نہ ثواب کا لالچ تھا اور نہ عذاب سے بچنے کی جستجو..

یہاں میں نے کچھ بھی نہیں مانگنا تھا.

صرف بیٹھنا تھا.

صرف بے گھروں کی ہم نشینی کرنی تھی..

افتادگان خاک کا ساتھ دینا تھا..

جاہ و حشم سے بیزار ابوذر غفاریؓ کی موجودگی کو محسوس کرنا تھا..

جنہیں غزوہ ذات الرقاع اور بنی المصطلق پر جاتے ہوئے رسولؐ مدینے کا عامل مقرر کر کے جاتے ہیں..

غزوۂ تبوک کی جانب سفر کرتے ہوئے ایک شخص پیچھے پیچھے رہنے لگا۔ لوگوں نے کہا "یارسول اللہ! ابوذرؓ پیچھے ہٹ گئے ہیں اور انہوں نے اپنے اونٹ کی رفتار دھیمی کر لی ہے۔"

حضورؐ نے فرمایا "اسے جانے دو۔ اگر اس کے اندر خیر کا کوئی جذبہ ہے تو اللہ تعالیٰ اسے عنقریب لوگوں سے ملا دے گا۔ اور اگر معاملہ اس کے برخلاف ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس سے نجات دے دی ہے۔"

اونٹ تاخیر کرنے لگا تو ابوذرؓ نے اپنا سامان پشت پر اٹھایا اور رسولؐ کے نقش قدم پر پیدل چلنے لگے۔ رسول اللہؐ نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک شخص راستے پر تنہا چلا آ رہا تھا۔ تو فرمایا "ابوذر پر اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔ ابوذر تنہا چلے گا۔ تنہا مرے گا۔ اور تنہا حشر کے دن اٹھایا جائے گا۔"

عبداللہ بن مسعود نے روایت بیان کی کہ جب حضرت عثمانؓ نے ابوذر کی نکتہ چینی سے عاجز آ کر انہیں مقام ربذۃ میں جلاوطن کیا اور ان کی موت واقع ہو گئی تو ان کے آس پاس بیوی اور غلام کے سوا کوئی نہ تھا۔ انہوں نے وصیت کی "مجھے غسل دینا۔ کفنانا اور عام راستے پر رکھ دینا پھر پہلی جماعت جو تمہارے پاس سے گزرے اس سے کہنا "یہ رسول اللہ صلعم کے صحابی ابوذر پڑے ہیں۔ آپ لوگ ان کے دفن کرنے میں ہماری مدد کریں۔"

عبداللہ بن مسعود کا اہل عراق کے ساتھ اُدھر سے گزر ہوا۔ برسر راہ ایک جنازہ دیکھا۔ قریب تھا کہ اونٹ اسے روندتے گزر جاتے کہ غلام نے فریاد کی کہ یہ ابوذرؓ ہیں۔ آپ لوگ ان کے دفن کرنے میں مدد کریں۔

عبداللہ بن مسعود نے یہ سنا تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے کہ رسول اللہؐ نے سچ فرمایا تھا۔ ابوذر تم تنہا چلو گے۔ تنہا مرو گے اور حشر میں بھی تنہا اٹھائے جاؤ گے۔

تو میں نے محض اس تنہا ابوذرؓ کی تنہائی محسوس کرنی تھی۔ جو تنہا چلتا تھا جو تنہا مرا اور اسے دفن کرنے والا کوئی نہ تھا۔

میں نے اس تھڑے پر بیٹھ کر آس پاس منڈلاتی ابوہریرہؓ کی بلیوں کی میاؤں میاؤں سننی تھی۔
ابوعبیدہؓ بن الجراح کی مسکراہٹ میں ایک خلاء دیکھنا تھا۔
عبداللہ بن مسعود کی قرأت کو کانوں میں اتارنا تھا۔

کسی نے کہا۔ یارسول اللہ! ایک شخص قرآن کی قرأت ایسے کرتا ہے جیسے وہ اس پر ہی اتر رہا ہو۔ تو پوچھا۔ کون ہے؟ کہا گیا۔ عبداللہ بن مسعود۔ رسول نے فرمایا۔ ہاں وہ ایسا کر سکتا ہے۔

وہ بے گھر بے سہارا سینکڑوں تھے کس کس کی فضیلت بیان کی جائے۔

سعد بن ابی وقاص۔ عمار بن یاسر۔ خالد بن یزید (ابوایوب انصاری)۔ عبداللہ بن عمر خطاب۔ یہ سب بے سہارا لوگ تھے۔

آپ نے فرمایا "قرآن حضرت عبداللہ بن مسعود۔ معاذ بن جبل۔ ابی بن کعب اور سالم مولیٰ سے سیکھو۔"

یہ چاروں اسی تھڑے پر بیٹھنے والوں میں سے تھے..

میں اس لبریز چھلکتے تھڑے کے کنارے کھڑا ہو گیا. منتظر رہا کہ مجھ بے سہارا کو بھی بیٹھنے کی جگہ مل جائے. منڈلاتا رہا. جیسے کبوتروں والی چھتری پر بے شمار کبوتر بیٹھے ہوں. غٹرغوں غٹرغوں کرتے چلے جا رہے ہوں.. جیسے صفہ پر بیٹھے لوگ سر ہلاتے غٹرغوں غٹرغوں عبادت کر رہے تھے اور اس چھتری پر بیٹھنے کے لیے کسی ایک اور کبوتر کی گنجائش نہ ہو تو وہ ایک کبوتر کیا کرتا ہے.. آس پاس منڈلاتا ہے.. چھتری پر قابض کبوتروں کو ناراض نظروں سے دیکھتا ہے کہ اب بس بھی کرو.. کوئی تو پھڑ پھڑا کر پرواز کر جائے مجھے بھی تو اس چھتری پر بیٹھ کر کچھ غٹرغوں کرنی ہے.. بالآخر ایک کبوتر اٹھ بیٹھا اور مجھے چھتری پر جگہ مل گئی.

عین سامنے.. دس بارہ قدم کے فاصلے پر روضہ رسولؐ کی دیوار تھی.. حجرے کی دیوار تھی.. یعنی دوسری جانب سنہری جالیاں تھیں جن میں جھانکتے لوگ گزر رہے تھے اور اس جانب پچھواڑے میں ہم صفہ والے تھے..

دیوار کے اوپر خانہ کعبہ کی ایک قدیم قلمی تصویر آویزاں تھی جو ترک عہد سے متعلق تھی اور خطاطی کا ایک نمونہ تھا.. میں انہیں تو نہ دیکھتا تھا، کبھی خود کو کبھی ان کے گھر کو دیکھتا تھا..

''بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے..
گزرے وقت کی تصویریں''

''اے بنی قیلہ تمہارے سردار تشریف لے آئے'' یہ مژدہ ایک یہودی نے مدینے کے مسلمانوں کو سنایا تھا..

مکہ سے مدینہ کی مسافت کے دوران سفر کی دھول سے دونوں یار اَٹ گئے.. پیراہن میلے کچیلے ہو گئے.. ایک قافلہ سامنے سے آتا دکھائی دیا تو تشویش ہوئی کہ جانے کون ہیں.. پیچھا کرتے قریش ہیں یا ان کے حمایتی ہیں. قریب ہوئے پر کھلا وہ تو حضرت ابوبکرؓ کے ایک عزیز طلحہ ہیں جو شام میں تجارت کے بعد وہاں سے خرید کردہ سامان اونٹوں پر لادے چلے آ رہے ہیں.. ان سامان میں قریش کے متمول سرداروں کے لیے ایک نہایت نفیس سفید رنگ کا کپڑا تھا جو ان دونوں یاروں کو تحفے میں پیش کیا گیا تا کہ وہ ستھرے لباس میں ہو جائیں.. طلحہ نے یہ بھی خبر کی کہ یثرب کے نخلستان والے ان کی آمد کا بے تابی سے انتظار کر رہے ہیں..

یہ تو دل کو موہ لینے والا ایک سفید براق منظر ہوگا کہ صحرا کی دھوپ میں نئے نکور سفید لبادوں والے دو سانڈنی سوار چلے آ رہے ہیں.. کیسی دل پر اثر کرنے والی متحرک تصویر ہوگی.. اہل مدینہ جو کئی یوم سے گھروں سے باہر نکل کر آس پاس کے ٹیلوں پر چڑھ کر اللہ کے رسولؐ کی پہلی جھلک دیکھنے کو ترستے تھے.. اس روز بھی دکھائی نہ دیئے تو مایوس ہو کر گھروں کو لوٹ گئے کہ جب دھوپ جوبن پر آ جائے تو صحرا میں کوئی سفر نہیں کرتا.. لیکن رسول اللہؐ نے سوچا کہ دھوپ ڈھلنے کا انتظار کون کرے.. دو تین گھنٹے کا سفر رہ گیا ہے.. اس کی شدت برداشت کر لیں گے.. انہوں نے سفر جاری رکھا..

پُرفخر سانڈنیوں پر بستی کے قریب ہوتے سفید لبادوں والے سواروں کو سب سے پہلے اس یہودی نے اپنے گھر کی چھت سے دیکھا اور اہل مدینہ کو پکارا.. اے بنی قیلہ وہ ذی شان ہستی آ گئی.. قیلہ انصار کا ایک قبیلہ تھا اور قیلہ اس قبیلے کی دادی جان کا نام تھا..

''پھر تو ہم رسول اللہؐ کی جانب نکل کھڑے ہوئے.. آپ کھجور کے درخت کے سائے میں ٹھہرے

ہوئے تھے اور ساتھ ابوبکرؓ تھے جو آپ ہی کے ہم عمر تھے۔ ہم میں سے اکثر نے اس سے پہلے آپ کو دیکھا نہ تھا۔ آپ کے پاس بھیڑ لگ گئی۔ اگرچہ وہ آپ میں اور ابوبکر میں امتیاز نہ کر سکتے تھے۔ یہاں تک کہ جب رسول اللہؐ سے سایہ ہٹا دھوپ آ گئی تو ابوبکرؓ اٹھے اور آپ پر اپنی چادر کا سایہ کیا۔ اس وقت ہم نے آپ کو پہچانا۔'' (ابن ہشام)

قبا میں پہلا قیام ہوا تو پہلی مسجد بھی قبا میں تعمیر ہوئی۔۔
اس کے بعد مسجد نبویؐ کی تعمیر کا آغاز ہوا۔۔

''مسجد کی دیواریں کچی اینٹوں سے بنائی گئیں۔ محراب بیت المقدس کی جانب بنایا گیا۔ داخلے کے تین دروازے رکھے گئے۔۔ جو درمیان میں ستون تھے۔۔ وہ کھجور کے تھے۔ چھت کھجور کی شاخوں سے ڈالی گئی۔۔ کسی نے کہا ''چھت ایسی ہونی چاہیے'' آپ نے فرمایا ''نہیں موسیٰ کے چھپر ایسا چھپر ہی مناسب ہے۔''

فرش مٹی کا تھا۔
بارش ہوتی تو اندر کیچڑ ہو جاتا۔۔

ہیکل لکھتے ہیں ''پتھر کی سلیں گارے سے جما دی گئیں۔۔ پٹاؤ میں کھجوروں پر مشتمل حصہ دو ٹکڑیوں میں منقسم کیا گیا۔۔ ایک پر چھت پاٹ دی گئی اور دوسرے حصے کو غیر مسقف چھوڑنا پڑا۔ صحن میں بے گھر مہاجر مسلمانوں کے رہنے کے لیے ایک حصہ معین کر دیا گیا۔ کئی سال تک مسجد نبویؐ میں شب کو چراغ جلانے کی نوبت نہ آ سکی۔ صرف عشاء کی نماز کے موقع پر کھجور کی خشک پتیاں جلا کر روشنی کر لی جاتی۔''

''چوتھا گروہ عرب کے مختلف حصوں سے مسلمان ہو کر مدینہ میں پہنچنے والوں کا تھا۔ یہ حضرات ناداری میں اس طرح گھرے ہوئے تھے کہ سر چھپانے کو کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔۔ ان حضرات کے رہنے کے لیے رسول اللہ نے مسجد ہی کا ایک حصہ وقف کر دیا۔۔ چونکہ اس حصہ کا نام ہی صفہ تھا۔ اس لیے اس میں رہنے والی جماعت بھی اصحاب صفہ کے لقب سے مشہور ہوئی۔۔

''کھلے صحن میں مشرق کی جانب ایک چبوترہ بنا کر اس پر چھپر ڈال دیا گیا۔۔
عربی زبان میں چبوترے کو ''صفہ'' کہتے ہیں۔۔ (ڈوگر)

ابوبکر سراج الدین کا کہنا ہے کہ اہل صفہ۔۔ کا مطلب ہے لوگ جو ایک پتھریلی نشست پر بیٹھتے تھے

ان کے لیے وہاں پتھر سے بنی ہوئی ایک جگہ تھی..

تھڑے پر باقاعدہ بیٹھ جانے سے پیشتر میں نے ذرا دقت سے.. اپنے سجدے مختصر کر کے دو نفل پڑھ ہی لیے.. کیسے؟ منہ وَل حجرۂ رسولؐ لیکن یہ شرک نہ تھا کیونکہ خانہ کعبہ اسی جانب تھا درمیان میں رسولؐ تھے..

تاریخ میں ان تمام اصحاب کے نام اور ان کی تعداد محفوظ ہے جو اس تھڑے پر رسول کی حیات میں بیٹھا کرتے تھے.. ان کے وصال کے بعد مجھے کوشش بسیار کے باوجود اس تھڑے کا کوئی حوالہ نہیں ملا.. بے سہاروں کو سہارا دینے والے چلے گئے تو حوالہ کیسے ملے..

اصحاب صفہ کے تھڑے پر بیٹھے ہوئے کچھ کرنے کچھ پڑھنے کو جی نہیں چاہتا بس بیٹھے رہنے کو جی چاہتا ہے..

میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ معروف مقامات مقدسہ کے علاوہ میں صرف غارِ حرا میں جانے اور صفہ کے تھڑے پر بیٹھنے کا تمنائی تھا.. شدید خواہش مند تھا..

غارِ حرا میں جانے کی تمنا تو سمجھ میں آتی ہے کہ جہاں سے ابتدا ہوئی تھی.. جہاں حرف نے جنم لیا تھا.. وہاں جانا جیسے اس کنج میں جانا جہاں دنیا کی تخلیق کے بعد پہلا پرندہ بولا تھا.. جہاں زمین میں سے پہلا بیج پھوٹا تھا اس زمین کو دیکھنا.. یہ جانا تو سمجھ میں آتا ہے..

لیکن اس چبوترے پر بیٹھنے کی ایک وحشت بھری خواہش سمجھ میں نہیں آتی..

میں سر جھکائے.. کبھی سر اٹھاتا تو اپنے سامنے حجرۂ رسولؐ کی دیوار پاتا.. اگرچہ اب یہ مرصع دکھتی اور روپہلی تھی مگر مجھے وہ اب بھی ایک کچی دیوار ہی دکھائی دیتی تھی.. دیوار کے ساتھ قرآن پاک رکھنے کے لیے شیلف بنا دیے گئے تھے صرف اس لیے کہ چاہنے والے بے خود ہو کر دیوار سے لپٹ نہ جائیں.. اسے چوم چوم کر اپنے اندر نہ اتار لیں..

شیلف تقریباً کمر تک آتے تھے اور ان سے اوپر جالیاں نظر آتی تھیں اور غور کرنے سے رسولؐ کے گھر کا اندرون اگرچہ تاریکی میں ڈوبا ہوا.. ذرا دیر تک غور کرنے سے سجھائی دینے لگتا تھا.. ایک خطاطی کا فریم تھا یا کوئی نقش تھا وہ اندر دیوار پر آویزاں کچھ کچھ نظر آتا تھا.. سلجوق نے مجھے اس فریم کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ روضۂ رسولؐ کے اندر جا کر اس فریم کے عین نیچے کھڑے ہو کر اسے دیکھنے والے خوش بختوں میں تھا..

اصحاب صفہ کے تھڑے پر بیٹھے ہوئے کچھ کرنے کچھ پڑھنے کو جی نہیں چاہتا.. بس بیٹھے رہنے کو جی چاہتا ہے.. تو کچھ دیر وہاں بیٹھنے سے یہ سمجھ میں آیا کہ اس چبوترے پر بیٹھنے کی خواہش اتنی شدید کیوں تھی.. بے شک اس خواہش کو شدید کرنے میں ابوہریرہؓ کی بلیاں تھیں اور ابوذرؓ کی تنہائی بھی تھی لیکن دل میں کنڈی اٹکا کر جو خیال بے حال کرتا تھا وہ تصور کا تھا.. بیٹھے رہنے کا تھا..

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے

عبادتوں، دعاؤں، التجاؤں، زیارتوں اور تو اہوں کی بھگدڑ اور نفسانفسی میں جی انہی فرصت کے.. کچھ نہ کرنے کے.. بیٹھے رہنے کے رات دن ڈھونڈھتا تھا.. جس فرصت میں سوائے تصور جاناں کے اور کچھ وبال نہ ہو.. اور اس جی میں یہ بھی ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں.. تو بیٹھے بھی رہتے ہیں جاناں کا تصور بھی ہے اور سامنے در بھی ہے.. تو یہ بیٹھنا اب جا کر سمجھ میں آیا..

اس پناہ گاہ میں پہنچ جانے کی تمنا میں ایک اور پہلو بھی تھا..

اس حیات کی کوہ نوردی کے مشقت بھرے.. دن کے بعد جب بدن تھکاوٹ سے لاچار ہو جاتا ہے.. خواہش کرتا ہے کہ اب تو ٹھہر جائیں.. کہیں بیٹھ جائیں.. یہ شب گزارنے کو کوئی پناہ گاہ نظر میں آ جائے.. کوئی ایسی کھوہ دکھائی دے جائے جس میں یہ رات بسر ہو جائے.. اور جب مایوسی بدن کی بوسیدہ دیواروں کو ڈھانے کو ہوتی ہے تب بلندیوں پر ایک ہرا بھرا میدان.. جس کے گرد چٹانوں کے جو حصار ہیں ان میں سے خوش رنگ آبشاریں گرتی ہیں اور اس میدان میں کوری کوری دودھ رنگت ناریوں کی مانند چمکتی برفانی نالیاں بہتی ہیں اور اس پر جو ہوائیں سرد سُروں میں گنگناتی ہیں وہ ہر درد کی دوا ہیں.. اور اترتی شام کی ٹھنڈک میں وہ ہرا بھرا بلند میدان آپ ہی کا اور ازل سے منتظر ہے کہ آپ آئیں اور اپنا خیمہ نصب کر کے حیات کی شب یہاں گزاریں..

اصحاب صفہ کا مسجد نبویؐ کے فرش سے ایک ڈیڑھ فٹ بلند چبوترہ بھی ایک ایسا ہی میدان تھا جہاں ایک بے گھر بے سروسامان نادار آوارہ گرد قیام کر سکتا تھا.. وہ یہاں بیٹھ کر زندگی کی تھکن اتار سکتا تھا اور اسے کوئی اٹھا نہ سکتا تھا کیونکہ اسے بٹھانے والا وہ سامنے والے گھر میں رہتا تھا.. کسی کی جرأت تھی کہ اس کے بٹھائے ہوئے کو کوئی اٹھا سکے..

اور سامنے والے گھر میں رہنے والا خیال رکھتا تھا کہ یہ مہمان جو میرے در پر پڑے ہوئے ہیں یہ بے شک اتنے نادار ہیں کہ کبھی ایک ہی کپڑے میں نماز پڑھتے ہوئے اٹھتے ہیں تو بدن کا یہ حصہ ڈھانکتے ہیں.. سجدے میں جاتے ہیں تو احتیاط کرتے ہیں تو انہوں نے آج کچھ کھایا بھی ہے یا نہیں.. انہیں آج کوئی صحابیؓ اپنے گھر کھانے کے لیے لے کر گیا ہے یا نہیں.. کہیں سے کچھ کھجوریں آئی ہیں یا یہ یونہی میرے تصور میں بھوکے بیٹھے ہیں.. میری بیٹی نے حسینؓ کی ولادت پر مجھ سے پوچھا تھا "ابا میں اپنے بیٹے کا عقیقہ کروں؟"

تو میں نے کہا تھا "ایسا کرو کہ بچے کے سر کے بال اتروا کر ان کا وزن کرو.. اور پھر اس وزن کے برابر سونا یا چاندی اہل صفہ میں صدقہ کر دو.."

ابوذرؓ کہتے ہیں "جب رسول اللہؐ کے لیے کھانا آتا تھا تو ہم سب مل کر کھاتے تھے اور جب ہم فارغ ہو جاتے تو وہ فرماتے "مسجد میں جا کر سو جاؤ".."

ایک مرتبہ حضرت فاطمہؓ نے درخواست کی "اے میرے باپ چکی پیستے پیستے میرے ہاتھوں میں نیل پڑ گئے ہیں مجھے ایک کنیز عنایت فرما دیں.."

فرمایا "یہ نہیں ہو سکتا کہ میں تم کو دوں اور صفہ والے بھوکے رہیں.."

تو جہاں میں بیٹھتا تھا یہاں بیٹھنے والوں کا وہ اپنی لاڈلی بیٹی سے بھی زیادہ دھیان رکھتے تھے..

جیسے مجھے سامنے حجرۂ رسولؐ کی دیوار بھی نظر آتی تھی ایسے اس تھڑے کا جو سنگ مرمر تھا وہ بھی وہی فرصت کے رات دن والا اولین کچا فرش محسوس ہوتا تھا. حجرے میں جو چوکھٹ نظر آتی تھی اس پر ایک سیاہ کمبل میرے نبیؐ کی خلوتوں کو پوشیدہ کرتا تھا. کہیں کوئی چراغ نہ جلتا تھا. عشاء کا وقت ہوا ہے تو کھجور کے سوکھے پتے جلتے تھے.. بارش ہوئی ہے تو اہل صفہ بھی بھیگ رہے ہیں.. ان کے پیراہن ایسے بوسیدہ ہوئے ہیں کہ ان پر پیوند بھی نہیں ٹھہرتا اور برسوں سے بدن پر چپک رہنے سے بُو دینے لگے ہیں.. بی بی فاطمہ کے چکی پیسنے کی آواز آ رہی ہے اور ان کے کومل ہاتھوں میں جو حسنؓ اور حسینؓ کو کھلانے کے عادی ہیں نیل پڑ رہے ہیں..

بارش میں کھجور کا وہ تنا بھی بھیگ رہا ہے جس کے ساتھ ٹیک لگا کر فاطمہ کے ابو اپنے پیاروں سے باتیں کرتے تھے.. ابھی اس تنے نے رسولؐ کی فرقت میں آنسوؤں سے بھیگنا تھا..

اور حجرے کے برابر میں مسجد کی جو دیوار ہے اس میں جتنی کچی اینٹیں حضورؐ نے اپنے ہاتھوں سے رکھی ہیں.. وہ دوسری اینٹوں سے الگ دکھتی نظر آتی ہیں..

کیا حسیں گنبد و محراب ہیں لیکن میرا دل
ڈھونڈتا ہے وہی مٹی کے مکاں
چھت پہ وہی عودِ نخیل
اور دروازوں پہ حجروں کے
سیہ اون کے موٹے پردے
ڈالنا چاہتا ہوں سر پہ وہی خاکِ ریاضِ جنت
پے بہ پے جس میں وہ تابندہ قدم آتے تھے
ہائے وہ سادہ سا منبر ہے کہاں
رشک سے جس کے ہوئی گریہ کناں حنانہ
اشک بہتے ہیں تو بہنے دو کہ ان آنسوں میں
شاید اس گزرے ہوئے وقت کی تصویریں ہوں
جو مرے دل سے گزرتا ہی نہیں۔

(خورشید رضوی)

"ابو دجانہ اور حمزہ کا اُحد.. مجھے تمہاری شکست کا خطرہ ہے"

مولا بخش کی مونچھیں بڑی بڑی اور گھنی گھنی تھیں..

میں اس سے پیشتر کسی بھی مولا بخش سے نہیں ملا تھا' اس لیے نہیں جان سکتا تھا کہ ہر مولا بخش کی مونچھیں بڑی بڑی اور گھنی گھنی ہوتی ہیں یا یہ جو مولا بخش ہمارے حصے میں آیا ہے اس کو یہ امتیاز حاصل ہے..

وہ پاکستان قونصلیٹ کا دیرینہ ڈرائیور تھا.. اگرچہ ایک سندھی سائیں تھا لیکن ایک زمانے سے مدینے میں مقیم تھا.. اس زمانے میں وہ ایک ڈیوٹی سرکار کی دیتا تھا اور دوسری ڈیوٹی ذرا زیادہ تن دہی سے گھر بار کی دیتا تھا' جس کے نتیجے میں وہ ایک کم یا زیادہ درجن بھر بچوں کا باپ ہو چکا تھا.. اس طویل قیام کے دوران وہ کسی حد تک ایک عربی سائیں ہو چکا تھا کہ مدینے کے ہر بشر' ہر مکین کو اور ہر فقیر کو وہ ذاتی طور پر جانتا تھا.. ہم جدھر سے بھی گزرتے.. "مولا بخش.. مولا بخش" کی صدائیں بلند ہوتیں اور وہ اپنی ویگن اور ہمیں فراموش کر کے صدا دینے والے کے پاس جاتا.. گپیں لگاتا اور قہقہے لگاتا اور پھر لوٹ آتا اور کہتا "صاحب یہ ہمارا یار ہے"

مولا بخش جو بھی تھا جیسا بھی تھا ہم سے کہیں بلند مرتبے پر فائز تھا کہ وہ نبیؐ کے شہر کا باسی تھا.. اور آج ہمارا گائیڈ تھا.. مدینے میں گائیڈ کرنے والے کا بھی تو ایک رتبہ ہوتا ہے.. اور بلند ہوتا ہے..

"پہلے اُحد چلیں گے سائیں.."

"یار پہلے تو بدر چلنا چاہیے.."

"بدر تو تھوڑا دور ہے.." اس کی مونچھیں مسکرائیں.. "پہلے اُحد چلتے ہیں.."

مدینہ دیگر شہروں کی نسبت دھیما اور سکون والا تھا.. سیلابی ریلے اور رونقیں مسجد نبویؐ کی ہمسائیگی میں ہوتی ہیں' ذرا پاسے ہو جائیں تو زندگی آہستگی اور نرمی سے دبے پاؤں چلتی ہے.. نہ کاریں تیز چلتی ہیں' نہ لوگ اور نہ ہوائیں..

ہم ایک ایسے رہائشی علاقے میں سے گزرے جس کا بیشتر حصہ ابھی تعمیر کے مراحل میں تھا.. مکان اور فلیٹ ابھی آباد نہیں ہوئے تھے.. کھڑکیاں نصب ہو رہی تھیں.. دروازے لگ رہے تھے.. رنگ روغن ہو رہا تھا.. ایک مختصر سا خالی فلیٹ نظر آیا تو میں نے سوچا اس کا کرایہ زیادہ تو نہیں ہوگا.. انسان کچھ دنوں کے لیے یہاں

آباد ہو جائے تو کچھ حرج ہے.. اپنا کھانا پینا کرے اور مدینے کو گھر بنا لے.. یہ کیا کہ اس شہر میں جیسے ہم آئے ہیں، آئے ہیں.. بھاگ دوڑ کی اور رخصت ہو گئے.. نہ موسموں سے دوستی کی اور نہ اس کے دن رات سے.. کبھی سارا دن سوتا رہے اور بے شک نمازیں بھی قضا کر دے لیکن کیسا لطف آئے کہ اونگھتے اونگھتے خیال آئے کہ میں تو مدینے میں ہوں.. اور اس شہر کا باسی ہوں۔

اُحد کے پہاڑ پہلے مدینے سے دوری پر تھے درمیان میں قبیلے اور نخلستان پڑتے تھے.. اب وہ اس کے محافظ بن کر کھڑے تھے کہ مدینہ اُن تک پہنچ چکا تھا.. تاریخ اور تصور میں تو یہی تھا کہ صحرا میں سفر کریں گے بیابان طے کریں گے اور پھر بھوکے پیاسے اُحد کے میدان میں اتریں گے.. لیکن یہاں ابھی "پاکستان ہاؤس" سے چلے تھے اور ابھی مولا بخش کی ویگن سے اتر رہے تھے۔

جبلِ اُحد کے دامن میں نئی بستیاں اور شاہراہیں نظر آتی تھیں، ہر جانب آبادی کے آثار تھے، وہ جو میدان کا قیاس تھا.. لق و دق صحرا اور ویرانے کا تصور تھا، وہ تو دور دور تک نہ تھا.. ان آبادیوں اور بستیوں نے اسے ڈھک لیا تھا.. کیا معلوم کتنی ٹوٹی ہوئی تلواریں.. چلے چلے تیر.. زرہ بکتریں اور کیسا کیسا مقدس لہو بھی ڈھک چکا تھا..

ہماری ویگن جہاں رکی وہاں اور بھی ویگنیں رک رہی تھیں.. رخصت ہو رہی تھیں.. دائیں جانب ایک بلند ٹیلہ تھا جس پر ایرانی زائرین رینگتے ہوئے اوپر چڑھ رہے تھے اور جو اوپر پہنچ چکے تھے ان کے سیاہ لبادے ہوا میں پھڑ پھڑا رہے تھے..

بائیں جانب ایک چار دیواری نظر آ رہی تھی جس کے باہر ایک بہت بڑا بورڈ آویزاں تھا اور کسی لاؤڈ سپیکر پر عربی زبان میں کوئی اعلان بار بار نشر ہو رہا تھا اور اس سے پرے.. خاصے فاصلے پر اُحد کے پہاڑ تھے اور ان کے دامن میں بستیاں تھیں جو اہلِ نظر نے تو آباد نہیں کی تھیں.. بائیں جانب جو وسیع احاطہ اور اس کے گرد کہیں دیواریں اور کہیں آہنی جنگلے لگے تھے، ان کے قریب جو بورڈ دکھائی دیا تھا میں اشتیاق سے اس کی جانب بڑھا.. اس یقین کے ساتھ کہ اس پر جنگِ اُحد کی تاریخ درج ہوگی.. نقشے ہوں گے.. نہیں ایسا کچھ نہ تھا.. محض سرزنش تھی کہ یہ پتھر کی ڈھیریاں ہیں ان کے لیے دعا کرنے سے کچھ حاصل حصول نہیں ہوگا.. صرف ان کے اعمال ان کے کام آئیں گے اور لاؤڈ سپیکر پر گونجتی آواز بھی یہی تنبیہ کر رہی تھی کہ حضرات شرک سے اجتناب کریں..

شیشے کی ایک دیوار تھی اور لوگ اس کے ساتھ آنکھیں لگائے اندر دیکھتے تھے.. جو روتے تھے ان کے آنسو شیشے پر گر کر یوں بہتے تھے جیسے وہ شیشہ رو رہا ہے..

چار دیواری کے اندر امیر الشہداء حضرت حمزہؓ آرام فرما رہے تھے..

ان کی نشانی بھی دو چار پتھر تھے اور بس..

لوگ نہ تو لاؤڈ سپیکر پر نشر ہوتا اعلان سنتے تھے کہ وہ بہرے ہو چکے تھے اور نہ بورڈ پر درج.. منع منع اور

شرک شرک کی عبارتیں پڑھ سکتے تھے کہ نابینا ہو چکے تھے.. وہ شیشے کی دیوار کے پار صرف اس شخص کی نشانیوں کو دیکھتے تھے جس کا نام حمزہ تھا. شکاری تھے.. تیر سے شکار کرتے.. جب بھی وہ شکار سے واپس آتے تو گھر نہ جاتے جب تک کہ خانہ کعبہ کا طواف نہ کر لیتے.. وہ قریش میں اعزاز رکھنے والے جواں مرد اور سخت طبیعت کے تھے. ایک روز شکار سے واپسی پر جدعان کی لونڈی نے راستہ روک کر کہا "اے ابو عمارہ کاش آپ اس آفت کو دیکھتے جو آپ کے بھتیجے محمدؐ پر ابوالحکم بن ہشام (ابوجہل) کی جانب سے آئی. اس نے انہیں یہاں بیٹھا ہوا پایا تو ایذا پہنچائی. گالیاں دیں.. جو باتیں ناپسندیدہ تھیں ان کی انتہا کر دی. محمدؐ خاموش رہے اور چلے گئے.."

حضرت حمزہؓ طیش میں آ گئے. مسجد میں داخل ہوئے اور لوگوں میں بیٹھے ہوئے ابوجہل کے سر پر کمان اس زور سے ماری کہ اس کا سر زخمی ہو گیا. اور کہا "کیا تو انہیں گالیاں دیتا ہے.. لے میں بھی انہی کے دین پر ہوں.. میں بھی وہی کہتا ہوں جو وہ کہتے ہیں".. جب حمزہؓ نے اسلام اختیار کر لیا تو قریش کو معلوم ہو گیا کہ اب محمدؐ قوی اور محفوظ ہو گئے ہیں اور اب حمزہؓ ان کی جانب سے مدافعت کریں گے.

لوگوں کے چہرے اس شیشے کی رکاوٹ سے چپکے ہوئے تھے جس کے پار وہ شخص دفن تھا جس نے رسول اللہؐ کی مدافعت کی تھی..

وہ وہیں اسی مقام پر دفن تھے جہاں وہ وحشی کے بھالے کا شکار ہو کر گرے تھے اور شہید ہوئے تھے..

رسول اللہؐ مدینے میں قلعہ بند ہو کر مدافعت کرنے کے حامی تھے.. کھلے میدان میں جنگ کے لیے نکلنا ان کی حکمت عملی کے خلاف تھا..

لیکن بدر کے میدان میں شہید ہونے والوں کے عزیز و اقارب پر جوش ہوئے جاتے تھے کہ ہم میدان میں اتر کر بدلہ لیں گے..

مدینہ میں محصور ہو کر قریش کا مقابلہ کرنے کو بزدلی گردانتے تھے..

جنہیں معرکہ بدر میں شرکت کا موقع نہ ملا تھا وہ اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دینا چاہتے تھے.. اُدھر اُحد کے میدان میں قریش کی عورتیں بھی صف آرا تھیں اور اپنے مردوں سے کہتی تھیں "ہماری طرف دیکھو ہم زہرہ اور مشتری کی کوکھ سے پیدا ہونے والیاں ہیں. نرم قالینوں پر ناز و نزاکت سے اٹھلانے والی! آج اگر تم نے بڑھ کر دشمن سے مقابلہ کیا تو کل ہم تمہیں اپنے سینے سے لگائیں گی اور اگر تم پیچھے ہٹ گئے تو ہمارا تمہارا کوئی تعلق نہ ہو گا.."

مخلص مومنین اُحد میں سات سو سے زیادہ نہ تھے. قریش چار گنا تعداد میں اور وافر ہتھیار والے تھے..

رسول خداؐ نے اپنی رائے کو پھر دوہرایا "مجھے تمہاری شکست کا خطرہ ہے.."

اس پر بھی لوگوں کا اصرار کم نہ ہو سکا تو آنحضرتؐ نے اکثریت کی رائے پر عمل کرنا ضروری سمجھا۔۔رسول اللہؐ اپنے حجرے میں تشریف لے گئے۔.حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ نے عمامہ باندھنے میں آپؐ کی مدد کی۔زرہ پہنوائی اور تلوار حمائل کی۔.

اسید بن حضیرؓ اور سعد بن معاذ بھی قلعہ بندی کے حامی تھے۔.انہوں نے دوسرے گروہ سے کہا ''آپ لوگ دیکھ رہے ہیں کہ آنحضرتؐ قلعہ بندی چاہتے ہیں پھر بھی آپ حضرات کی طرف سے رسول اللہؐ کو میدان میں نکلنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔.ابھی وقت ہے کہ آنحضرتؐ کی رضا مقدم سمجھی جائے۔.اور جو کچھ حکم فرمائیں آپ بلا عذر اس کی اطاعت کریں۔.''

جونہی حضورؐ اپنے حجرے میں سے باہر آئے تو پشیمان لوگوں نے عرض کیا۔''یا رسول اللہ ہمارا مقصود آپ کی مخالفت کرنا نہیں ہے۔آپ قلعہ بند رہ کر مدافعت پر کار بند ہوں یا میدان میں صف آرائی کا حکم فرمائیں' ہم اطاعت کے لیے حاضر ہیں۔.''

اس پر رسول اللہؐ نے فرمایا''جب آپ لوگوں کو مشورہ دیا تو انکار کر دیا گیا۔لیکن کسی نبی کے شایاں نہیں کہ وہ زرہ پہن لینے کے بعد دشمن کا مقابلہ کیے بغیر زرہ اتار دے۔.''

لشکر کا جھنڈا رسول اللہؐ نے مصعب بن عمیر کو عطا کیا کیونکہ قریش میں دستور تھا کہ وہ اسی خاندان کے فرد کو اپنا پرچم دیتے تھے۔.

میدان اُحد میں پہنچ کر رسول اللہؐ نے اپنی تلوار نکال کر صحابہ سے کہا''کون ہے جو یہ تلوار لے کر اس کا حق ادا کرے گا۔.''

حضرت عمرؓ اور حضرت زبیرؓ کے علاوہ کچھ اور صحابہ کرامؓ کی درخواست رد کر دی گئی۔.

رسول اللہؐ نے تلوار کسی کو نہ دی اور اسے تھامے رہے۔.یہاں تک کہ ابو دجانہ نے کھڑے ہو کر دریافت کیا''یا رسول اللہؐ...اس کے حق سے کیا مراد ہے؟''

ارشاد ہوا''اس کا حق یہ ہے اس سے دشمنوں کو اتنا مارو کہ مارتے مارتے ٹیڑھی ہو جائے۔.''

ابو دجانہ نے کہا''یہ تلوار میں لوں گا۔.''

رسول اللہؐ کے دست مبارک سے ان کی ذاتی تلوار حاصل کر کے ابو دجانہ نے سرخ رنگ کی ایک پٹی سر پر باندھ لی جو اعلان تھا کہ ابو دجانہ جنگ کے لیے تیار ہے۔.اور نہایت تکبر اور اکڑتے ہوئے دونوں فریقوں کے درمیان چلنے لگے۔.

ابو دجانہ کی یہ پٹی عرب میں موت کا تسمہ کہلاتی تھی۔.

اور اس پر رسول اللہؐ نے فرمایا''اکڑنا اور یوں تن کر چلنا اللہ تعالیٰ بہت ہی ناپسند فرماتا ہے' مگر ایسے موقع پر' جیسا اس وقت ہے' ناپسند نہیں۔.''

عام خیال کے برعکس حضرت حمزہؓ کو شہید کرنے والا وحشی نام کا حبشی ابو سفیان کی بیوی ہندہ کا غلام نہ تھا' جبیر بن مُطعم کا غلام تھا.. یہ حبشیوں کے انداز میں (جیسے مسائی قبیلے کے افراد برچھا تول کر شیر کی جانب پھینکتے ہیں) اس طرح برچھا پھینکتا تھا کہ کم ہی خطا ہوتا تھا. جبیر نے اپنے غلام سے کہا'' اے وحشی تو بھی جنگ میں سب کے ساتھ چل.. اگر تو میرے چچا طعمہ کے بدلے میں محمدؐ کے چچا حمزہؓ کو قتل کر دے گا تو میری طرف سے تو آزاد ہوگا..''

ابو دجانہ کو تلوار ملنے پر بہت سے لوگ ناخوش تھے.. زبیر ابن العوام نے کہا:

''میں نے بھی حضورؐ سے تلوار مانگی تھی.. میرا خیال تھا کہ میں رسولؐ کی پھوپھی صفیہ کا بیٹا ہوں' قریش ہوں' تلوار مجھے ملے گی.. میں نے سوچا دیکھوں گا ابو دجانہ کیا کارنامہ کر کے دکھاتے ہیں اور ان کے پیچھے لگ گیا.. میں نے دیکھا کہ ابو دجانہ نے اپنی وہی سرخ پٹی نکال کر سر پر باندھ لی اور انصار نے کہا ابو دجانہ نے موت کی پٹی باندھ لی ہے اور وہ میدان جنگ میں یہ شعر پڑھتے ہوئے داخل ہو گئے..

''میں وہی ہوں جس سے میرے حبیبؐ نے کھجور کے درختوں کے قریب پہاڑوں کے دامن میں عہد و پیمان کیا تھا.. میں کھڑے ہو کر آخری صف تک مقابلہ کروں گا' اللہ اور اس کے رسولؐ کی تلوار برابر چلاتا جاؤں گا..''

ابو دجانہ نے ایسا ہی کیا.. ابو دجانہ کے مقابلے پر جو بھی آتا تھا اس کا خاتمہ ہو جاتا تھا..

ابن اسحاق روایت کرتے ہیں کہ خود ابو دجانہ نے بیان کیا کہ میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ لوگوں کو جنگ پر اکسا رہا ہے.. میں نے تلوار اس پر اٹھائی تو وہ بلبلانے لگا.. دیکھا تو وہ عورت تھی.. ابو سفیان کی بیوی ہندہ تھی.. میں نے سوچا رسول اللہ کی تلوار سے ایک عورت کو کیا ماروں.. اس سے تو ایک پروقار تلوار کو پاک رکھنا ہی بہتر ہے..''

ابو دجانہ اگر جانتے کہ ابھی کچھ دیر بعد یہی عورت حضرت حمزہؓ کا کلیجہ چبائے گی.. ان کے ناک اور کانوں کو ہار پرو کر گلے میں ڈالے گی تو شاید وہ لحاظ نہ کرتے..

ابو دجانہ کی رجز اُحد میں گونجتی تھی.. ''میں اس طرح جم کر مسلسل لڑتا رہوں گا گویا میرے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی گئی ہیں..''

ادھر حضرت حمزہؓ بھی جو وار کرتے تھے کاری کرتے تھے.. یہاں تک کہ قریش کے پرچم بردار ارطاۃ کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا.. ان کی جان لینے کو جو آتا تھا جان سے جاتا تھا..

وحشی کا بیان ہے۔"میں دیکھ رہا ہوں حمزہؓ تلوار سے لوگوں کا صفایا کرتے چلے جا رہے ہیں اور کوئی ان کی تلوار سے نہیں بچ رہا۔حمزہؓ بھورے رنگ کے اونٹ کی طرح معلوم ہو رہے ہیں۔میں نے دیکھا کہ سباع حمزہؓ کی طرف بڑھ رہا ہے۔حمزہؓ نے اسے للکار کر تلوار کا وار کیا۔عین اس وقت میں نے اپنا برچھا ہلا کر خوب نشانہ باندھ کر اس طرح پھینک مارا کہ وہ ٹھیک ان کی ناف کے اوپر کے حصے میں جا گھسا اور دونوں پیروں کے درمیان میں سے باہر نکل گیا۔اب حمزہؓ میری طرف لپکے۔لیکن وہ شکستہ ہو چکے تھے۔زمین پر گر پڑے۔میں نے انہیں اسی حالت میں چھوڑ دیا تا آنکہ وہ جاں بحق ہو گئے۔"

ابن اسحٰق نے روایت کی کہ سلیمان اور عبیداللہ۔۔معاویہ کے عہد میں شام کے شہر حمص سے گزرے جہاں وحشی رہتا تھا۔ہم نے ایک آدمی سے اس کے متعلق دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ وہ تمہیں اپنے مکان کے سامنے والے میدان میں ملے گا۔وہ ایک ایسا آدمی ہے جس پر شراب کا نشہ سوار رہتا ہے۔اگر تم دیکھو کہ وہ نشے میں نہیں تو سوال جواب کر لینا اور اگر ہوش میں نہ ہو تو اسے یونہی چھوڑ کر چلے جانا۔

ہم نے دیکھا کہ وہ اپنے مکان کے سامنے والے میدان میں ایک چٹائی پر بیٹھا تھا۔

سیاہ رنگ کے بغاث پرندے کی مانند بالکل بوڑھا ہو چکا تھا۔وہ بغیر کسی بات کی پروا کیے شور وغل کر رہا تھا۔

ہم نے حمزہؓ کے قتل کا واقعہ پوچھا تو اس نے بیان کیا۔(جیسا کہ بیان ہو چکا ہے) پھر کہنے لگا "فتح مکہ کے بعد پہلے تو میں چھپتا چھپاتا پھرا۔طائف بھاگ گیا۔شام اور یمن فرار ہونے کے بارے میں سوچتا رہا۔پھر ایک شخص نے کہا۔"تیرا برا ہو۔محمدؐ کسی ایسے شخص کو قتل نہیں کرتے جو ان کا دین قبول کر لے"۔تو میں مدینہ جا کر ان کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔آپ کو کبھی ایسا اچنبھا نہ ہوا ہو گا جیسا کہ مجھے اپنے سر پر کھڑا کلمہ شہادت پڑھتا ہوا دیکھ کر ہوا۔

پوچھا"وحشی ہو؟"

میں نے کہا"جی ہاں یارسول اللہؐ۔"

فرمایا۔"بیٹھ جاؤ اور ہمیں بتاؤ کہ تم نے میرے چچا حمزہؓ کو کس طرح قتل کیا تھا؟"

وحشی کہتا ہے۔میں نے سارا قصہ ٹھیک اسی طرح بیان کیا(روایت کے مطابق اس بیان میں ایک جذبہ تفاخر تھا) جب میں بات ختم کر چکا تو آپؐ نے فرمایا۔"تیرا برا ہو۔اپنا چہرہ میرے سامنے سے ہٹا لے۔میں تیرا چہرہ کبھی نہ دیکھوں گا۔"اس کے بعد جہاں بھی رسول اللہؐ ہوتے میں ہمیشہ ایک طرف منہ چھپا کر کھڑا ہو جاتا تا کہ آپؐ کو میری صورت نظر نہ آئے۔"

اسلام قبول کرنے کے بعد اسی وحشی نے مسیلمہ کذاب کو بھی اپنے اسی برچھے سے قتل کیا۔

کہا جاتا ہے کہ حمص میں اس کے گھر کی دیوار پر وہ برچھا سجا تھا اور وہ بڑے فخر سے کہتا تھا"جہاں

میں نے رسول اللہؐ کے بعد سب سے بہتر انسان حمزہؓ کو اس برچھے سے قتل کیا تو وہاں سب سے بدتر انسان کو بھی میں نے اسی برچھے سے موت کے گھاٹ اتارا۔'' (ہشام)

حضرت حمزہؓ کے بعد مصعب بن عمیر رسول اللہ کی مدافعت میں ابن قمہ کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔۔وہ شکل و شباہت میں رسول اللہؐ سے بہت مشابہت رکھتے تھے۔ اس لیے ابن قمہ نے قریش میں جا کر اعلان کر دیا کہ۔۔میں نے محمدؐ کو قتل کر دیا۔

قریش جو پسپا ہو رہے تھے اس خبر سے کہ محمدؐ قتل کر دیئے گئے پلٹ پڑے۔۔

اس سے پیشتر کچھ تیر اندازوں نے اپنا ٹیلا چھوڑ دیا تھا۔۔

خالد بن ولید کی حکمت عملی نے بھی رنگ دکھایا جو اُحد کے گرد گھوڑے دوڑاتے پھر سے میدان میں اتر گئے۔۔

جیتی ہوئی جنگ ہار میں بدلنے لگی۔۔

بھگدڑ مچ گئی۔۔یہاں تک کہ رسول اللہ میدان جنگ میں جمے رہنے کی تلقین کرتے تھے اور کوئی سنتا نہ تھا۔۔

رسول اللہؐ نے اتنے تیر چلائے کہ ان کی کمان ٹوٹ گئی۔

پہلے ابو طلحہ آپ کے سامنے ڈھال بنے شعر پڑھتے رہے۔۔

''میری جان آپ پر فدا ہونے کے لیے ہے۔۔

میرا چہرہ آپ کے چہرے پر ہے''

پھر ابو دجانہ جن کی تلوار نے حق ادا کر دیا تھا۔۔نیز ہی ہو چکی تھی۔۔انہوں نے اپنی پشت پر۔۔رسول اللہؐ کی جانب چہرہ کیے رکھا۔۔ان کی جانب آتے ہوئے تیروں کو سہا۔۔اس دوران امیہ بن خلف کا بیٹا اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا رسول اللہ کی جانب آ رہا تھا۔۔اس نے مکہ میں اعلان کیا تھا ''میرے پاس ایک گھوڑا ہے اور میں اس کی بہت اچھی پرورش کر رہا ہوں۔۔میں اس پر سوار ہو کر آؤں گا اور محمدؐ کو قتل کر دوں گا۔''

صحابہ کرامؓ نے اسے آتے ہوئے دیکھا تو کہا ''ہم اس سے نپٹ لیں''

رسول اللہؐ نے کہا: ''نہیں اسے آگے آنے دو۔''

رسول اللہؐ نے حارث بن صمہ سے تیز پھل والا چھوٹا نیزہ لیا اور صحابہ کے گھیرے میں سے الگ ہو کر تنہا۔۔جیسے کوئی بھی جری اور بہادر اپنے دشمن کا سامنا کرتا ہے۔۔میدان میں وہ نیزہ تھام کر کھڑے ہو گئے۔۔۔

امیہ بن خلف کے بیٹے کے بگٹٹ بھاگتے اپنی جانب بڑھتے گھوڑے کے سامنے تنہا کھڑے ہو گئے۔۔جب وہ قریب ہوا۔ تو اس کے وار کرنے سے پہلے ہی زمین پر کھڑے رسولؐ نے نیزے کی انی اس کی گردن میں اتار

دی۔۔اسے کوئی زخم نہ آیا کہ وہ سر سے پاؤں تک آہن پوش تھا لیکن چند روز بعد اس دہشت میں مر گیا کہ محمدؐ نے مجھ پر وار کیا تھا۔۔اب میں بچنے والوں میں سے نہیں ہوں۔۔

اس معرکہ اُحد کی تفصیل اور تاریخ بیان کرنے کے لیے اک عمر درکار ہے۔۔ایک زور بیاں الگ درکار ہے جو مجھ میں نہیں ہے تو اسے قدرے مختصر کرتے ہیں۔۔

حضرت اُم عمارہ کو اس روز۔۔اُحد میں لڑتے ہوئے تیرہ زخم آئے۔۔

حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں کسی مفتوحہ علاقے سے چند قیمتی اور نایاب چادریں آئیں تو انہوں نے کہا ''میں ان میں سے ایک چادر اُم عمارہ کو پیش کروں گا کہ میں نے رسول اللہؐ کی زبانی سنا تھا کہ جنگ اُحد میں جب بھی میں نے اپنے دائیں بائیں دیکھا تو اُم عمارہ کو اپنے قریب لڑتے دیکھا۔''

میرا قیاس ہے کہ اُم عمارہ نے سر سے پاؤں تک اپنے آپ کو ایک شٹل کاک برقعے میں ملفوف نہیں رکھا ہو گا۔۔حجاب میں روپوش ہو کر تو رسول اللہؐ کی مدافعت نہیں کی ہو گی۔۔اپنے بدن پر تیرہ زخم نہیں کھائے ہوں گے۔۔یہ میرا قیاس ہے۔۔وہ رسول اللہؐ کے بچاؤ کے لیے تلوار بھی چلا رہی تھیں اور جب موقع ملتا تیر بھی پھینک رہی تھیں۔۔

اچانک عتبہ بن ابو وقاص اور ابن قمیہ نمودار ہوئے۔۔ان دونوں نے رسول اللہؐ کو قتل کرنے کی قسم کھائی تھی۔۔عتبہ کے پتھر سے رسولؐ کا ہونٹ کٹ گیا اور دائیں طرف کا نیچے کا دانت ٹوٹ گیا۔۔ابن قمیہ کے وار سے خود کی کڑیاں رسولؐ کے رخسار میں دھنس گئیں۔۔آپؐ کی پیشانی مبارک کو عبداللہ بن شہاب نے زخم آلود کیا۔۔آپ ایک گڑھے میں کود گئے یا گر گئے۔۔یہ گڑھے ابو عامر نے مسلمانوں کو زک پہنچانے کے لیے کھودے تھے۔۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ رسول اللہؐ کی جانب دوڑے۔۔باقی صحابہ بھی ''چڑیوں کی مانند اڑتے'' رسول اللہؐ کے گرد جمع ہو گئے۔۔حضرت علیؓ نے جھک کر رسول اللہؐ کا ہاتھ تھاما۔طلحہ بن عبید اللہ نے سہارا دے کر آپؐ کو اٹھایا اور سیدھا کھڑا کر دیا۔۔مالک بن سنان نے چہرے سے خون چوس چوس کر نگلا۔۔ابوبکر صدیقؓ کا قول ہے کہ ''رسول اللہؐ کے رخسار میں خود کی جو دو کڑیاں گھس گئی تھیں۔۔انہیں ابو عبیدہ بن الجراح نے کھینچ کر نکالا تھا۔۔جب پہلی کڑی منہ سے نکالی گئی تو آپ کا ایک اگلا دانت گر گیا۔۔جب دوسری کڑی نکالی تو دوسرا دانت بھی ٹوٹ گیا۔''

ابو عبیدہ کے دانتوں کے درمیان وہ دانت ٹوٹ جانے سے جو خلا پیدا ہو گیا تھا۔۔وہ اس پر عمر بھر فخر کرتے رہے۔۔حضورؐ کے وصال کے بعد لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور انہیں کہتے ''اے ابو عبیدہ ذرا مسکرائیے تاکہ ہم اس خلا کی زیارت کر لیں جو ہمارے رسولؐ کے رخساروں میں سے کڑیاں نکالنے کے باعث آپ کو عطا ہوا۔۔

ابو عبیدہ رسول اللہؐ کے چلے جانے کے گہرے غم میں ڈوبے رہتے اور اس کے باوجود مسکراتے اور

لوگ اس خلاء کو دیکھ کر گریہ کرتے اور اپنے رسولؐ کو یاد کرتے..

ابو سفیان نے نعرہ لگایا.. آج بدر کا انتقام لے لیا گیا ہے..

ابن اسحٰق نے کہا.'' مجھ سے صالح بن کیسان نے بیان کیا' جنگ اُحد میں صحابہ میں جو مقتول ہوئے تھے.. ہند بن عتبہ اور ساتھی عورتیں ان کے ناک کان کاٹ کاٹ کر ان کے ہار پازیب وغیرہ بنا رہی تھیں.. حد یہ ہے کہ ہند نے خود یہ ہار پہنے اور اپنے اپنے ہار.. بندے اور آویزے جبیر بن مطعم کے غلام وحشی کو دے دیئے.. حمزہ بن عبدالمطلب کا جگر چیر پھاڑ کر چبانا چاہا' نگلنے کی کوشش کی اور جب نگل نہ پائی تو تھوک دیا.. پھر اونچی چٹان پر چڑھ گئی اور بلند آواز میں چیخ کر یہ شعر پڑھے..

''آج جنگ اُحد میں ہم نے جنگ بدر کا بدلہ اتار دیا. پہلی لڑائی کے بعد دوسری لڑائی ہوتی ہے تو وہ زیادہ جوشیلی اور شعلہ بار ہوتی ہے.. پس میں ساری عمر وحشی کی شکر گزار رہوں گی.. یہاں تک کہ میری ہڈیاں قبر میں گل نہ جائیں..''

اس پر ایک اور ہند جو مسلمان تھیں.. ہند بنت اثاثہ انہوں نے فوراً شعر کا جواب شعر میں دیا:

''اے وہ عورت! تو ایسے شخص کی بیٹی ہے جو ذلت و کمینگی کے کاموں میں پڑا رہتا تھا اور جس کا کفر بہت بڑھا ہوا تھا. تو جنگ بدر میں بھی ذلیل و رسوا ہوئی اور جنگ بدر کے بعد بھی..

خدا کرے صبح ہی صبح تکا بوٹی کر دینے والی تلواروں کے ساتھ لمبے لمبے قد والے حسین و وجیہہ ہاشمیوں سے پالا پڑ جائے.. حمزہؓ میرے شیر ہیں اور علیؓ میرے شاہین..''

ابن اسحٰق نے کہا اس موقع پر ہندہ بن عتبہ نے یہ شعر بھی پڑھے:

''میں نے اُحد میں حمزہؓ سے اپنا دل خوب ٹھنڈا کر لیا.. پیٹ چاک کر کے اس کا جگر تک نکال لیا..

یہ جنگ تمہارے اوپر طوفان ژالہ باری کی طرح امنڈ پڑی اور ایک خونخوار شیر کی طرح تمہارے اوپر چڑھتی گئی..''

عمر بن خطاب نے حسان بن ثابت سے یوں خطاب کیا ''اے ابن فریعہ کیا تم نے ہند بنت عتبہ کی باتیں سنیں.. اس کی وہ اکڑفوں دیکھی جو وہ چٹان پر کھڑی ہو کر ہم لوگوں کے خلاف اشعار پڑھ پڑھ کر اور حمزہؓ کے ساتھ اپنے کرتوت کا ذکر کر رہی تھی..

اس پر حسان بن ثابت نے یہ شعر پڑھا..

''کیسی عورت اکڑتی پھرتی' اس کی یہ فطرت انتہائی کمینگی کی تھی جب وہ

کفر کے باوجود اکڑ رہی تھی۔۔"

بقیہ شعر بقول ابن ہشام اس لیے بیان نہیں کیے گئے کہ ان میں بڑی سخت باتیں کہی گئی ہیں۔۔اور ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ کس قسم کی باتیں ہوں گی جو ضابطہ تحریر میں نہیں آسکتیں۔۔

عرب ہمیشہ اپنے جذبات کا اظہار چاہے وہ مسرت کے ہوں یا سوگواری کے شعروں میں کرتے تھے۔۔صحابہ کرامؓ میں سے بیشتر بہت قادر الکلام شاعر تھے۔۔عہد نبوت کی بیشتر جنگوں کی تفصیل ہمیں اشعار کی معرفت ہی ملتی ہے اور ان میں ہر نوعیت کے شعر ہوتے تھے۔۔

اُحد کے دامن میں جہاں اب آبادیاں تھیں تب ہر سو لاشیں بکھری پڑی تھیں۔۔

ابن اسحٰق نے کہا' جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے رسول اللہؐ حمزہؓ کو ڈھونڈنے نکلے تو انہیں بطن وادی میں پایا۔۔ان کا جگر شق تھا اور ناک کان کاٹ دیئے گئے تھے۔۔محمد بن جعفر نے مجھ سے بیان کیا کہ جب رسول اللہؐ نے یہ منظر دیکھا تو فرمایا' اگر مجھے اس بات کا خیال نہ ہوتا کہ صفیہ (حمزہؓ کی بہن اور رسول اللہ کی پھوپھی) کو صدمہ پہنچے گا اور یہ کہ میرے بعد یہ ایک سنت بن جائے گی تو میں حمزہؓ کو یونہی چھوڑ دیتا۔ تاکہ وہ درندوں کے پیٹوں اور پرندوں کے پوٹوں میں پہنچ جائیں اور اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے کبھی قریش پر غلبہ عطا فرمایا تو میں ان کے تیس آدمیوں کے ناک اور کان کاٹ کر مثلہ کروں گا۔۔"

آگے ابن ہشام نے بیان دیا" جب رسول اللہؐ حضرت حمزہؓ کے پاس جا کر ٹھہرے تو فرمایا" تمہاری وجہ سے مجھے جو مصیبت پہنچی ہے۔۔ایسی آئندہ کبھی نہ پہنچے گی۔ میں کبھی اس جگہ نہیں ٹھہرا جو اس سے زیادہ رُلانے والی ہو۔۔"

تب اوپر سے ہدایت آگئی کہ۔۔اگر تم صبر سے کام لو تو یہ صبر کرنے والوں کے لیے زیادہ بہتر ہے اور صبر سے کام لو اور تمہارا صبر اللہ کے ذریعے سے ہی ہے اور ان پر غم مت کرو اور نہ ان کے مکر و تدبیر کی وجہ سے تنگ دل ہو۔۔

تو اسی مقام پر اللہ کے رسول نے معاف فرما دیا اور آئندہ مثلہ کرنے کی ممانعت فرما دی۔۔اتنا بڑا صبر کسی اور انسان کے بس میں نہ ہو سکتا تھا۔

صفیہ اپنے حقیقی بھائی کو دیکھنے کے لیے اُحد میں پھرتی تھیں۔۔رسول اللہؐ نے صفیہ کے بیٹے زبیر سے کہا۔"صفیہ سے جا کے ملو اور انہیں واپس کر دو جو کچھ ان کے بھائی کے ساتھ گزرا ہے اسے وہ نہ دیکھیں۔۔"

زبیر نے اپنی ماں سے کہا' اماں جان رسول اللہ حکم دیتے ہیں کہ آپ واپس چلی جائیں۔۔"

صفیہ نے دریافت کیا۔"یہ کیوں؟ مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ میرے بھائی حمزہؓ کا مثلہ کیا گیا اور یہ سب کچھ اللہ کے راستے میں ہوا ہے۔۔خدا نے چاہا تو میں ضبط سے کام لوں گی اور صبر کروں گی۔۔"

آپؐ نے فرمایا۔"اچھا ان کا راستہ چھوڑ دو۔۔"

صفیہؓ حمزہ کی میت کے پاس آئیں' دیکھا' نماز جنازہ پڑھی اور دعائے مغفرت کر کے چلی گئیں۔۔

رسول اللہؐ نے حمزہؓ کو ایک چادر میں لپیٹا جو ان کی اپنی تھی. نماز جنازہ پڑھی اور پھر دوسرے شہیدوں کو لایا گیا.. یکے بعد دیگرے حمزہ کے بازو میں رکھے جاتے رہے اور رسولؐ ان کی نماز جنازہ پڑھاتے رہے.. اس طرح حمزہؓ پر بہتر نماز جنازہ پڑھی گئیں..

جب قبر تیار ہوگئی..

شیشے کی دیوار سے ناک چپکائے میں اس کے پار ایک ویران احاطے میں چند پتھر دیکھ رہا ہوں.. انہی کا قصہ بیان کر رہا ہوں.. میں نہ صرف حمزہؓ کا مدفن دیکھ رہا ہوں بلکہ رسول اللہؐ کی بہتر نماز جنازہ کی ادائیگی کو بھی محسوس کر رہا ہوں اور ان کی موجودگی بھی میرے اندر سرایت کرتی تھی کہ وہ وہاں پر شیشے کی دیوار کے پار کھڑے تھے.. اس مقام پر جہاں انہوں نے ایک اور روایت کے مطابق حمزہ کی مسخ شدہ لاش کو دیکھ کر کہا تھا..

"مجھے کبھی اتنا غم اور صدمہ نہیں پہنچے گا

جتنا تیری شہادت سے پہنچا ہے

میں کبھی اس مقام سے زیادہ غم ناک

اور دکھی جگہ پر کھڑا نہیں ہوا"

حمزہؓ کو قبر میں اتارنے کے بعد ایک سیاہ دھاری دار چادر ڈال دی گئی جو ان کے بدن پر پوری نہ آتی تھی.. اس لیے پاؤں جنگلی گھاس سے ڈھک دیے گئے.. مدینہ واپسی پر آپؐ نے عورتوں کو اپنے شہداء پر نوحہ و بکا کرتے ہوئے سنا. آپ کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے.. پھر آپؐ نے فرمایا. لیکن حمزہؓ پر رونے والی عورتیں نہیں ہیں..

انصار نے اپنی عورتوں سے کہا "جاؤ اور رسول اللہؐ کے چچا پر نوحہ کرو."

رسول اللہؐ نے حمزہ پر عورتوں کے رونے کی آواز سنی تو آپ باہر آ گئے.. وہ مسجد کے دروازے پر ہی نوحہ کر رہی تھیں. آپ نے فرمایا. "اللہ تم پر رحم فرمائے. تم واپس چلی جاؤ. تم نے اپنی طرف سے تسلی کا حق ادا کر دیا."

ابو عبیدہ نے یہ بیان کیا کہ رسول اللہؐ نے عورتوں کے رونے کی آواز سنی تو فرمایا:

"اللہ تعالیٰ انصار پر رحم کرے.. ان کی غم خواری قدیم سے چلی آ رہی ہے.. اب ان عورتوں سے کہو کہ واپس چلی جائیں."

ابن اسحٰق نے کہا کہ جب رسول اللہ احد سے واپس ہوئے اپنے گھر میں پہنچ گئے تو آپ نے اپنی تلوار فاطمہ کو دی اور فرمایا "لو بیٹی اس کا خون دھو ڈالو.. جنگ کے موقع پر یہ سچی ثابت ہوئی.."

حضرت علیؓ نے بھی اپنی تلوار فاطمہ کو دے کر کہا "اس کا خون بھی دھو ڈالو. خدا کی قسم جنگ میں یہ تلوار بڑی سچی نکلی.. اس پر رسول اللہؐ نے فوراً کہا "اگر تم جنگ میں ثابت قدم رہے تو تمہارے ساتھ سہل بن حنیف اور ابو دجانہ بھی ثابت قدم رہے."

''اگر تم نے (احد میں) زخم کھایا ہے تو قوم (قریش) کو بھی ویسے ہی زخم (بدر میں) لگ چکے ہیں.. دراصل یہ (ہار جیت) کے اوقات ہیں جنہیں ہم انسانوں میں اِدھر اُدھر پھراتے ہیں.''

ایک اور قادر الکلام صحابی کعب بن مالک نے جنگ اُحد کو بیان کیا..

''جنگ ہمارے اور ان کے درمیان پلٹے کھانے لگی.. اور موت اپنا کھیل کھیلنے لگی.. موت کے حوض کا پانی ہم انہیں بھی پلاتے تھے اور خود بھی پی رہے تھے..

اور وہ گھوڑے بھی گزر رہے تھے جو کھلی فضا میں ایسے معلوم ہوتے تھے گویا موسم سرما کی مشرقی ہوا میں ٹڈیاں ہیں جو آ جا رہی ہیں اور گر رہی ہیں..

حسان بن ثابت نے نوحہ کیا:

''تو نے اے شاعر.. مجھے رسول اللہؐ کے اس شیر کی یاد دلا دی جو ہم سب کی ہر وقت مدافعت کرنے والا تھا!

اے حمزہ! تم نے ہمیں اس شاخ کی مانند اکیلا چھوڑ دیا جسے کاٹنے والوں نے درخت سے الگ کر دیا..

حمزہ کے فقدان سے ساری زمین تاریک ہو گئی اور بادلوں سے نکلنے والی چاند کی روشنی پر سیاہی چھا گئی..

خدا کرے وحشی کے دونوں ہاتھ شل ہو جائیں جو ان کا قاتل ہے..

اور اب حمزہ کو کھو کر بالکل شکستہ اور بوڑھا ہو گیا ہوں کہ اس کے باعث میرے اعضائے باطنی قلب و جگر وغیرہ کانپنے لگے ہیں.

ہم لوگ حمزہ کو اپنے اوپر نازل ہونے والے حوادث میں تعویز کی طرح محافظ پاتے تھے..

اے ہند تو خوشی نہ منا..''

اور کعب بن مالک ان کی بہن سے مخاطب ہو کر کہتے..

''اے صفیہ اٹھ کھڑی ہو.. عاجزی اور مجبوری نہ دکھا اور حمزہ پر آہ و بکا کرنے کے لیے عورتوں کو آمادہ کر.. اگر اللہ کے اس شیر پر جو میدان جنگ میں کام آیا

طویل سے طویل مدت تک آہ و بکا کی نوبت آ جائے تو اکتا نہ جاتا۔"

اگر جنگ اُحد کو چند لفظوں میں سمیٹنا مقصود ہو تو یہ.. رسول اللہؐ.. حضرت حمزہؓ.. صفیہؓ.. ام عمارہؓ.. ابو دجانہؓ.. سہل بن حنیفؓ.. ابو عبیدہ بن الجراحؓ.. اور ہند بن عتبہ.. ابوسفیان.. خالد بن ولید.. اور تیر اندازوں کے ٹیلے میں سمٹ جاتی ہے..

اور آج یہ سب آثار سمیٹے جا رہے ہیں..

ان کے نشانیاں مٹ رہی ہیں..

اور ہم وہ نابینا پرندے تھے جو بھٹکتے پھرتے تھے..

جو کچھ بھی ہم نے پڑھا تھا یا تصور کیا تھا اس میں گم یہاں چلے آئے تھے اور یہاں کچھ بھی نہ تھا..

مجھے یقین ہے کہ آج نہیں تو سو برس بعد ایک ایسا زمانہ آنے کو ہے جب یہ سب آثار نمودار کیے جائیں گے..

اُحد میں کون کہاں تھا اس کا پھر سے تعین کیا جائے گا..

حضورؐ کس گڑھے میں گرے تھے اور کن پتھروں پر ان کا لہو گرا تھا..

ابو دجانہؓ نے کہاں موت کا سرخ فیتہ اپنے ماتھے پر باندھا تھا اور رسول کی تلوار عطا کیے جانے پر کیسے اس تلوار کا حق ادا کیا تھا..

اُم عمارہؓ نے کہاں رسول کی مدافعت میں اپنے بدن پر تیروں اور تلواروں کے زخم سہے تھے..

عبیدہ بن الجراح نے کہاں رسولؐ کے خود کی الجھی ہوئی کڑیاں ان کے رخساروں میں سے کھینچ نکالی تھیں..

ہندہ بن عتبہ نے کس چوٹی پر کھڑے ہو کر وحشت کی شاعری کی تھی..

اور خالد بن ولید کیسے اور کہاں گھات لگا کر مسلمانوں کو گھیرے میں لے آئے تھے..

اور.. حمزہ ایک بھورے اونٹ کی مانند جو مسلمانوں پر نازل ہونے والے حوادث میں ایک تعویز کی طرح محافظ ہو جاتے تھے کن گھاٹیوں سے اترے تھے.. اپنے بھتیجے کے دفاع کے لیے کہاں کہاں کبھی تیر اندازی کرتے تھے اور ایک تلوار کے وار کرتے تھے..

ایسا اگرچہ مجھے یقین ہے کہ ہوگا..

تاریخ کو پھر سے زندہ کیا جائے گا..

ورنہ.. میں تو بالکل شکستہ اور بوڑھا ہو گیا ہوں..

اور صفیہ اٹھ کھڑی ہوتی ہے.. عاجزی اور مجبوری نہیں دکھاتی.. حمزہ پر آہ و بکا کرنے کے لیے عورتوں کو آمادہ کرتی ہے اور وہ طویل سے طویل مدت گزر جانے پر بھی اکتاتی نہیں ہے.. ابھی تک اپنے بھائی کے لیے آہ و بکا کرتی ہے.. حمزہ کے لیے بین کرتی ہے.. اور ہم نہیں سنتے..

ہم تو وہ نابینا طائر ہیں جو اُحد میں بھٹکتے پھرتے ہیں..

"مسجدِ قُبا.. مسجدِ قبلتین.. عثمانؓ کا کنواں..
جنگ خندق اور ریلوے سٹیشن مدینے کا.."

اب مولابخش ہمیں قُبا کی بستی کی جانب لیے جاتا تھا..

وہ دروازہ جس کے راستے رسول اللہؐ یثرب کی بستی میں داخل ہوئے..

تب یہ مدینے سے باہر.. اس زمانے کے حساب سے ذرا فاصلے پر واقع ایک بستی تھی..

اور دنیا میں سب سے پہلی باقاعدہ مسجد اسی بستی میں تعمیر کی گئی..

رسول اللہؐ نے اپنے ہاتھوں سے تعمیر کی..

میں موجودہ مسجد قبا کے لیے تیار نہ تھا..

تقریباً چالیس برس پیشتر میرا ایک قلمی دوست آذر نام کا حال مقیم پشاور جہاں وہ ٹونی فوٹوگرافر کے نام سے کُل پشاور میں جانا جاتا ہے حج ادا کرنے کے لیے گیا اور چونکہ تصویر کشی اس کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی.. اس لیے مکہ اور مدینہ میں ٹونی وہ مومن تھا جس کی ہر لحظہ نئی آن نئی شان اس لیے تھی کہ وہ ہر لحظہ تصویریں اتارتا رہتا تھا.. واپسی پر اس نے مجھے ان بلیک اینڈ وہائٹ تصاویر کا ایک سیٹ روانہ کیا.. چالیس برس پیشتر کی ان تصویروں میں نہ حاجیوں کے ہجوم تھے اور نہ شاندار عمارتیں اور شاہراہیں.. کچی گلیاں تھیں.. کھجور کے درخت تھے اور دیہات کی سادگی تھی.. میرے ذہن میں ٹونی کی بلیک اینڈ وہائٹ تصویروں کا وہی مدینہ بس گیا تھا.. میں اکثر مقامات کو ان تصویروں کی نظر سے دیکھتا تو وہ دکھائی نہ دیتے.. یوں لگتا تھا جیسے وہ بستیاں کوئی اور تھیں.. وہ شہر بھی یہ نہ تھے.. وہ سب کی سب بستیاں زمیں بوس ہو گئیں.. خانہ کعبہ اور روضۂ رسولؐ کے علاوہ آسمان تو وہی تھا پر زمین اور تھی..

ٹونی کی تصویر میں مسجد قبا ایک دیہاتی سی سادگی اور سفیدی میں رچی ہوئی مسجد تھی.. جس میں شاید چند درجن افراد سے زیادہ نہ سما سکتے ہوں گے..

تو اس چالیس برس پیشتر کی تصویر میں سے جب موجودہ مسجد قُبا نمودار ہوئی تو میں اس کے لیے تیار نہ تھا..

باہر فٹ پاتھ پر نہایت عمدہ کاجو اور بادام فروخت ہو رہے تھے.. طائف کے خوش نظر پھل دستیاب تھے اور ظاہر ہے کھجوریں تھیں.. تسبیح کے دانے تھے.. صدر دروازے کے باہر ایک تختی نصب تھی جس پر یہ حدیث درج تھی کہ مسجد قبا میں دو نفل پڑھنے کا ثواب ایک عمرے کے برابر ہے..

میں تو اسے محض اس کی تاریخی اہمیت کے حوالے سے ایک نظر دیکھنے آیا تھا.. دیکھا تو ایک نظر لیکن یہ ایک نظر اپنے آپ کو ضرب دیتی گئی اور وسیع ہوتی گئی پر اتنی وسیع نہ ہو سکی کہ اس کے سادہ مگر پروقار آسمانی گنبد کو احاطے میں لے کر اس پر نقش آیات اور خوش نمائیوں کو آنکھوں میں سمیٹ سکے.. اس مسجد کے سارے رنگ سادہ اور صوفیانہ تھے.. نظر پر بار نہیں ہوتے تھے.. اس کا طرز تعمیر حسن جمال کو یوں چھوتا تھا جیسے جس کے موسموں میں پروا بدن کو ہرا ابھرا اور زندہ کرتی ہے.. ایسے کہ ہر موئے بدن سے سکون اور ٹھنڈک بھری مسرت کی کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں.. اس کی وسعت اور گنبد تک کے فاصلے آپ کے وجود کو حقیر نہیں کرتے.. آپ اس کی بڑائی اور شانداری کے ڈر میں آ کر مرعوب نہیں ہوتے.. اس کی عظمت آپ پر طاری نہیں ہوتی بلکہ یہ مسجد اتنی ہی ہو جاتی ہے جتنے کہ آپ ہیں.. آپ کے آس پاس ہو جاتی ہے قریب آ جاتی ہے اور یہی احساس ہوتا ہے کہ صرف میں ہوں اور یہ مسجد ہے اور کوئی نہیں ہے.. سوائے اس کے جس کا یہ گھر ہے..

یہ ایک مصری ماہر تعمیر حسن فتحی کا پاکیزہ معجزہ ہے.. سادہ پُر طلسم دنیاوی شان و شوکت کے مظاہرے سے عاری شوخ سجاوٹوں سے بے نیاز

اگر اس مسجد نے دنیا کی پہلی اینٹ گارے اور کھجور کے چھتوں والی مختصر سی مسجد کو اپنی ماں جان کر اس کے احترام میں ایک مقدس ذوق جمال کے قدموں میں بیٹھ کر اپنے آپ کو تخلیق کیا ہے تو کوئی گستاخی نہیں کی.. کوئی بڑا بول نہیں بولا کہ ماں تم کیا تھیں اور مجھے دیکھو کہ میں کیا ہوں.. بچے چاہے کتنے ہی بڑے شاندار اور قد آور ہو جائیں اپنی ماں کے سامنے اتنے ہی ہو جاتے ہیں جتنی کہ ماں کی حیثیت ہوتی ہے..

قبا کی مسجد ایسی ہی ہے جس نے اپنی ماں کی حیثیت یاد رکھی ہے..

نئی نکور ہونے کے باوجود آپ اس میں داخل ہوتے ہیں تو قدیم ہو جاتے ہیں..

دنیا کے بت کدے میں اگر خدا کا وہ پہلا گھر تھا تو اس مقام پر پہلی مسجد تھی..

یہیں کہیں وہ ایک کمرے کی اینٹ گارے کی مسجد تھی جسے موجودہ مسجد نے نہایت الفت سے اپنی آغوش میں چھپا رکھا تھا..

اُس روز بھی قبا کی بستی کے باسی لاوے کی سیاہ چٹانوں پر جا بیٹھے تھے اور دوپہر تک ان کی راہ دیکھتے رہے تھے.. پر وہ نہ آئے جن کے وہ منتظر تھے.. ہر طرف آتش فشاں لاوے کی چٹانیں اور ڈھیر تھے جو دھوپ میں لوہے کی مانند گرم ہو رہے تھے.. ابھی وہ ان کی تاب نہ لا کر گھروں کو لوٹے ہی تھے کہ وہ مسافر آ گیا جس

نے اپنی سانڈھنی سے اتر کر جب پہلا قدم رکھا تو اس پہلے قدم سے وہ بستی جو کہ یثرب تھی اس کا شہر ہو گئی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے.. وہ سات روز کے سفر کے بعد قبا پہنچے تھے اور ان کی عمر ترپن برس تھی..

ہیکل لکھتے ہیں.. قبا شہر مدینہ سے باہر (چھ میل) پر ایک علیحدہ بستی ہے.. رسول اللہؐ اپنے رفیق سفر ابوبکرؓ کی معیت میں قبا تشریف لائے اور یہاں چار روز قیام کیا. کہ اس وقفہ قیام میں یہاں ایک مسجد تعمیر فرمائی..

اور ابن ہشام بیان کرتے ہیں ''رسول اللہؐ بہ مقام قبا بنی عمرو بن عوف کے محلے میں دوشنبہ.. چہار شنبہ اور پنج شنبہ تشریف فرما رہے اور ان کی مسجد کی بنیاد ڈالی.. رسول اللہ کا جمعہ بنی سالم بن عوف میں ہوا اور جمعہ کی نماز آپ نے اس مسجد میں ادا فرمائی جو وادی رانونا کے درمیان ہے..''

یہ دونوں جید سیرت نگار کہیں یہ اشارہ نہیں کرتے کہ مسجد قبا اسلام کی پہلی مسجد تھی..

ہیکل کہتے ہیں کہ اس وقفہ قیام میں یہاں ایک مسجد تعمیر فرمائی اور ابن ہشام کا بیان ہے کہ ان کی مسجد کی بنیاد ڈالی..

اور جمعہ کی نماز آپ نے اُس مسجد میں ادا فرمائی جو وادی رانونا کے درمیان ہے تو کیا وہ مسجد پہلے سے موجود تھی؟ اس روایت سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ کی آمد سے پیشتر یہ مسجد تعمیر کی جا چکی تھی تو پھر مسجد قبا کے بارے میں کیا یقین کیا جائے.. البتہ اذان دینے کا فیصلہ بہت بعد میں ہوا.. پہلے تو رسول اللہؐ کے پاس لوگ نماز کے اوقات پر بن بلائے جمع ہو جایا کرتے تھے. پھر ان اوقات کا اعلان کرنے کے لیے کوئی تدبیر سوچی گئی.

ابن ہشام کے مطابق..'' آپؐ نے ارادہ فرمایا کہ یہود کے تُرم کی طرح کوئی تُرم بنایا جائے.. پھر آپؐ نے ناپسند فرمایا اور آپؐ نے ناقوس (گھنٹہ) بنانے کا حکم فرمایا اور ایک گھنٹہ بنایا بھی گیا تا کہ نماز کے واسطے مسلمانوں کو جمع کرنے کے لیے بجایا جائے. جب عبداللہ بن زید نے ایک خواب بیان کیا جس میں لوگوں کو نماز کی خاطر بلانے کے لیے ایک صدا تھی.. مکمل اذان جو اب تک چلی آتی ہے.. اس کی نشاندہی تھی.. رسول اللہؐ نے یہ اذان سن کر فرمایا'' اللہ نے چاہا تو یہ خواب حق ہے.. بلال کے ساتھ تم کھڑے ہو جاؤ اور یہ الفاظ انہیں بتاتے جاؤ اور وہ ان الفاظ کے ذریعے اعلان کرتے جائیں کہ وہ تم سے زیادہ بلند آواز ہے..''

روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے اذان کے کلمات عبداللہ بن ام مکتوم کو بھی سکھائے کہ کبھی بلال موجود نہ ہوں تو تم اذان دیا کرو..

اور یہ ام مکتوم بھی کیسے انوکھے اور نابینا درویش تھے کہ جن کی حمایت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو بھی سرزنش کر دی تھی کہ جب وہ رسولؐ سے کچھ رہنمائی حاصل کرنا چاہ رہے تھے اور اس لمحے حضورؐ قریش کے ایک بڑے سردار سے محو گفتگو تھے تو انہوں نے ابن مکتوم کی دخل اندازی کا برا منایا. تب اللہ تعالیٰ نے ایک آیت نازل کر کے انہیں باقاعدہ ڈانٹا.. اس لیے جب کبھی ام مکتوم سے آمنا سامنا ہوتا تو حضورؐ مسکرا کر فرماتے

کہ یہ وہ شخص ہے جس کا دل رکھنے کی خاطر اللہ تعالیٰ نے مجھے سرزنش کی تھی..

ام مکتوم بعد میں رسولؐ کی غیر حاضری کے دوران مدینہ کے گورنر بھی مقرر ہوئے.. کہتے ہیں کہ ایک زمانہ آنے کو ہے جب آج تک دنیا میں جتنے بھی بول بولے گئے ہیں.. جتنی آوازیں بلند ہوئی ہیں اور جتنے گیت گائے گئے ہیں اور وہ سب کے سب ہواؤں میں محفوظ ہوتے جاتے ہیں تو ہم سائنس کے اوج کمال کے صدقے میں انہیں سن سکیں گے.. ایسا زمانہ آئندہ حیات کے.. اگر دو چار برس ہیں تو ان میں تو آنے سے رہا اور اگر بہ فرضِ محال آ جاتا ہے تو میں کون سے بول سننا پسند کروں گا؟.. سب سے اول تو رسولؐ کے بول.. اور پھر حضرت بلالؓ کی اذان اور اس کے بعد اگر گنجائش ہوئی تو اباجی کی آواز کہ ''اوہ تیرا بھلا ہو جائے..''

مسجد قبا میں نفل پڑھتے ہوئے.. یہ خیال مسلسل ذہن میں تیرا کہ مسجد نبویؐ کی دوبارہ تعمیر میں ذوقِ جمال اور سادگی کی یہ تعبیر کیوں ملحوظ خاطر نہ رکھی گئی.. میں جانتا ہوں کہ ایسی بلندی پر گنبد نہیں اٹھائے جا سکتے تھے کہ وہ سبز گنبد سے ذرا سے بھی بلند ہو سکتے.. لیکن وہ خوش نظری جو ترک جسے میں اب تک سانس لیتی ہے اس کو تو اپنایا جا سکتا تھا.. ظاہر ہے ہم نے مسجد قبا میں نفل پڑھ پڑھ کر حشر کر دیا کہ اسی حساب سے ہمارے اعمال کی کتاب میں عمرے درج کیے جا رہے تھے..

مسجد قبلتین بھی متاثر کرنے والی تھی..

مولا بخش نے ویگن کھڑی کی اور ہمیں اندر جانے کا اشارہ کر کے خود فٹ پاتھ پر بیٹھے ایک گداگر سے ہم کلام ہو گیا.. کبھی اسے گدگدیاں کرتا اور کبھی اس کی جمع شدہ پونجی کو چھیننے کی کوشش کرتا.. گداگر نے بھی ہاتھ پھیلانا منقطع کر کے مولا بخش سے گپ شپ شروع کر دی.. جانے کون سی زبان میں..

مسجد قبلتین کے اندرون میں سلام پھیر کر سلجوق نے مجھ سے کہا ''ابا ذرا اپنے پیچھے دیکھیں وہاں بلندی پر ایک محراب نظر آتی ہے.. جب قبلہ کا رخ تبدیل کیا گیا اور اس میں حضورؐ کی خواہش اور بے چینی شامل تھی تو اس لمحے حضورؐ اس جانب، بیت المقدس کی جانب چہرہ کیے نماز پڑھ رہے تھے..''

ویسے اس دم اگر ہم بھی رسولؐ کے پیچھے صف میں کھڑے ہوتے اور وہ یکدم رخ بدل لیتے تو ہم ذرہ بھر تامل نہ کرتے کہ جس جانب یار کا چہرہ اس جانب ہمارا چہرہ بھی.. ہمارا قبلہ تو وہ تھا.. وہ جدھر مڑتا ہم بھی مڑتے چلے جاتے..

مسجد قبا اور مسجد قبلتین میں حاضری کے بعد مولا بخش کچھ زیادہ ہی اضطراب میں آ گیا.. اگر تو یہ اضطراب اس کی ذات تک ہی محدود رہتا تو خیر تھی لیکن وہ اسے اپنی ویگن کے انجن میں بھرتا یوں تیز رفتار ہوا کہ ہم پر گھبراہٹ طاری ہو گئی..

بے شک حادثہ ہو جانے پر مدینے میں مرنے کی سعادت حاصل ہو گی لیکن ہم اس سعادت سے

اجتناب ہی کرنا چاہیے تھے..

ہم امام مالک ایسے یقین محکم والے کیسے ہو سکتے تھے جو مدینے سے باہر اس خوف سے نہ جاتے تھے کہ کہیں اس کی جدائی میں میری وفات نہ ہو جائے اور میں اس خاک میں دفن ہونے سے رہ نہ جاؤں..

ہم لاہور میں ہی دفن ہونا مناسب جانتے تھے اس لیے مولا بخش کو مناسب سرزنش کی گئی اور وہ صرف اس لیے آہستہ ہو گیا کہ جدہ قونصلیٹ کے ایک نائب کونسل کا باپ یہ سرزنش کر رہا تھا.. ورنہ وہ بے پروا سا سائیں تھا..

چونکہ اس کا موڈ اس انتباہ سے آف ہو گیا تھا اس لیے میں نے اسے آن کرنے کی خاطر کہا ''مولا بخش اب ہم کدھر جاتے ہیں؟''

''بیر عثمان کی طرف سائیں.. وہ کنواں جو حضرت عثمانؓ نے یہودیوں سے خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کر دیا تھا. لیکن اس چیونٹی کی رفتار سے تو شام تک ہی شاید پہنچیں.'' میری سرزنش سے اس کی مونچھیں ذرا مرجھا گئی تھیں..

''مولا بخش..'' میں نے اس کی مونچھوں پر ترس کھا کر کہا ''تم ذرا غم نہ کرو اور ہمیں حضرت عثمانؓ کے کنویں تک شام سے پہلے پہلے پہنچا دو..''

چنانچہ اس کی مرجھائی ہوئی بڑی بڑی مونچھوں پر پھر سے بہار آ گئی اور اس نے نہ صرف شام سے پہلے پہلے بلکہ اگلے دو چار پل میں ہمیں اس کنویں تک پہنچا دیا.

کنویں تک پہنچا دیا.. سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ ہم اس قدیم کنویں میں جھانکتے ہوئے اس میں سے ڈول کے ڈول پانی کے نکال کر اپنے چہرے بھگونے لگے اور اس پانی کو غٹا غٹ پینے لگے جو چودہ سو برس پیشتر مسلمانوں کی پیاس بجھاتا تھا نہیں.. یہ ہمارے روایتی تصور والا کنواں نہ تھا.. ایک سنسان سڑک کے کنارے ایک مقفل پھاٹک کے اندر ایک سرکاری قسم کی عمارت دکھائی دے رہی تھی.. اور اس کے صحن میں ایک بھدا سا ٹیوب ویل ایستادہ تھا.. چند گرد آلود شجر تھے اور ٹیوب ویل کے نیچے بتایا گیا کہ وہ کنواں پوشیدہ ہے..

نہ ہم پھاٹک کے اندر جا کر اسے دیکھنے کی جستجو کر سکتے تھے اور نہ باہر سے اس کا کوئی سراغ نظر آتا تھا..

چند برس پیشتر تک یہ اپنی اصلی ہیئت میں موجود تھا..

زائرین اس میں سے پانی نکالتے تھے.. پیتے تھے اور تبرک کے طور پر ساتھ لے جاتے تھے.. چنانچہ شرک کی زد میں آ گیا.. اور اس پر کارپوریشن کی جانب سے ایک ٹیوب ویل نصب کر دیا گیا..

ہمارے سوا آس پاس اور کوئی نہ تھا..

اب لوگ کم ہی ادھر کا رخ کرتے تھے.. اگر پیاس بھی نہ بجھے اور کنواں بھی دکھائی نہ دے تو اتنی دور آنے سے فائدہ..

مسلمانوں کو پینے کے پانی کی کمی تھی تو حضرت عثمانؓ نے ایک یہودی سے یہ کنواں خریدا اور لوگوں کے لیے وقف کر دیا..

اگر لوگ یہاں آتے تھے اس کا پانی پیتے تھے اور خوشی حاصل کرتے تھے تو اس میں جانے کیا قباحت تھی.. پانی پینے کے لیے ہوتا ہے اس کا کوئی خاص مذہب یا فرقہ تو ہوتا نہیں..

کوئی نشان یا عبارت بھی نہ تھی جو اس کنوئیں کی تاریخی اہمیت اجاگر کر سکے..

جنت البقیع میں پتھروں کے ایک ڈھیر کے سوا حضرت عثمانؓ کی یہ واحد یادگار ہے جو دو چار برس میں نہ رہے گی..

میں نے شکر کیا کہ ابھی تک ایک اور کنوئیں کی جانب کسی کا دھیان نہیں گیا جس کا نام زمزم ہے.. لوگ اس کا پانی بھی پیتے ہیں اور گھروں کو لے جاتے ہیں..

تصور کی ایک حد تو بہرحال ہوتی ہے.. وہ ایک مقفل پھاٹک کے پار نہیں جا سکتا.. ایک ٹیوب ویل کے نیچے نہیں جھانک سکتا.. چاہے وہ خوب آگاہ ہو کہ اس کنوئیں میں ابھی تک وہ ایڑیاں موجود تھیں جو رسولؐ کے زمانوں میں پانی سے شرابور ہوتی تھیں اور یہ ہو نہیں سکتا کہ انہوں نے بھی اس کنوئیں میں ڈول ڈال کر پانی نہ نکالا ہو اور اپنی پیاس نہ بجھائی ہو..

ہم اس فراموش شدہ کنوئیں کی اداسی میں سے نکل کر ایک مرتبہ پھر شاہراہ کی رونق میں داخل ہوئے تو میں نے مولا بخش سے پوچھا کہ سائیں اب کدھر جائیں گے..

''جدھر سات مسجدیں ہیں ادھر جائیں گے..''

''اکٹھی سات مسجدیں..''

''ہاں سائیں سات ہوا کرتی تھیں پر ابھی تو دو تین ہی رہ گئی ہیں.. باقی ڈھا دی گئی ہیں..''

''تو پھر ذرا جلدی لے چلو مولا بخش کہیں ہمارے پہنچتے پہنچتے باقی بھی مسمار نہ کر دی جائیں..''

مولا بخش پُرمسرت ہوا اور مدینے کی ہوا سے باتیں کرنے لگا..

وہاں.. تین مختصر سادہ سی ایک ایک کمرے کی مساجد باقی تھیں..

ان میں سے ایک بی بی فاطمہ کے نام کی تھی.. اور ہم اس کے اندر نہ جا سکتے تھے کہ یہ مقفل تھی.. ایک اور حضرت علیؓ کے نام سے موسوم تھی.. وہ بھی پہنچ سے باہر تھی.. البتہ نیا نکور ایک پٹرول پمپ نظر آتا تھا جو شاید غیر ضروری مساجد کو ڈھا کر تعمیر کیا گیا تھا.. مساجد ایک چٹانی بلندی کے دامن میں تھیں اور ان کے برابر میں ایک نہایت عالی شان مسجد تعمیر کی جا رہی تھی جس نے ان سات مساجد کی جگہ لینی تھی..

اس لمحے تک میں ہرگز آگاہ نہ تھا کہ یہاں سات مسجدیں کیوں تعمیر کی گئی تھیں.. یعنی میں نے

مدینے کے بارے میں اپنا ہوم ورک نہیں کیا تھا..اور پھر مولا بخش بولا ''صاحب ادھر اس علاقے میں خندق کھودی گئی تھی..''

''خندق؟''

''ہاں صاحب آپ نے جنگ خندق کا نام سنا ہوگا.تو یہ ادھر لڑی گئی تھی..کافروں نے مدینے کو گھیرے میں لے لیا تو مسلمانوں نے اپنے بچاؤ کے لیے اس مقام پر خندق کھودی تھی.تو اس دوران جہاں جہاں کوئی بھی خیمہ زن ہوا.حضرت ابوبکرؓ.حضرت عمرؓ.حضرت عثمانؓ.حضرت علیؓ.سلمان فارسیؓ اور ہمارے رسولؐ..تو بس ان مقامات پر یادگار کے طور پر ایک ایک مسجد..ترکوں نے تعمیر کر دی..یوں کل سات مسجدیں تھیں..''

تو اسی لمحے میں آگاہ ہوا کہ شاہراہوں کی گہما گہمی اور رونقوں میں جو سات خاموشیاں تھیں وہ کیا کلام کرتی تھیں.

قریش میں قرار پایا کہ مدینے پر حملہ کیا جائے..اُحد کی شکست کے بعد مسلمان شکستہ ہو چکے ہیں انہیں نابود کر دیا جائے..

''ابوسفیان چار ہزار شمشیر زن لے کر نکلا جن کی سواری میں تین سو کمیت گھوڑے اور ایک ہزار بادرفتار سانڈھنیاں تھیں..ان کے سوا دیگر قبائل کے لشکر تھے..''

کل تعداد دس ہزار سے تجاوز کرتی تھی..

''مسلمان ڈر رہے تھے مبادا یہ لشکر جرار انہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دے.کبھی خیال گزرتا کہ عرب کی تاریخ میں اتنی بڑی فوج آج تک یکجا نہیں ہوئی.کبھی انہیں اُحد یاد آ جاتا کہ وہاں اس سے کم فوج نے انہیں شکست دے دی.قرار پایا کہ کھلے میدان میں نکل کر مقابلہ کرنے کی بجائے شہر میں رہ کر مدافعت کی جائے..اگرچہ مسلمانوں کو اس صورت میں بھی اپنے عہدہ برآ ہونے کا یقین نہ تھا.سلمان فارسیؓ مدینہ میں موجود تھے اور خندق کھودنے کے طریق سے واقف تھے(جس سے عرب بے خبر تھے)..ان کے نقشے کے مطابق کھدائی شروع کر دی گئی..اس میں رسول اللہؐ بھی ڈلیا سر پر اٹھائے شریک تھے..''

شہر سے باہر کے حصے میں صرف شام کا رخ کھلا ہوا تھا اور اس طرف خندق کھودی گئی..باقی تینوں سمت میں پہاڑ ہیں..

مسلمانوں کی کل تعداد محض تین ہزار تھی..

قریش جو ایک آندھی کی مانند چلے آ رہے تھے اپنے راستے میں ایک طویل خندق کی رکاوٹ پا کر سخت تلملائے اور مسلمانوں کو طعنے دیئے کہ کیا بزدلوں کی مانند چھپ کر بیٹھ گئے ہو بہادروں کی مانند میدان میں آؤ..

''قریش کے لشکر کی پیش روی میں سب سے بڑے سورما عمرو بن عبدود تھے اور ان کے پیچھے عکرمہ

بن ابوجہل اور ضرار بن الحطاب وغیرہ تھے۔۔ان سب نے مل کر خندق کے بیرونی کنارے سے اپنے گھوڑوں کو مہمیز جو دیا تو چشم زدن میں مسلمانوں کے سر پر آ پہنچے۔۔ادھر سے علی ابن ابی طالبؓ اور عمر بن الخطاب بڑھے اور حملہ آوروں کا راستہ روک لیا۔۔

یہ دیکھ کر عبدود نے دعوت مبارزت دی تو حضرت علیؓ تلوار ہاتھ میں لے کر مقابلے پر آ گئے۔۔

عمرو نے کہا ''اے عزیز من۔۔میں تجھے قتل نہیں کرنا چاہتا۔۔''

علیؓ نے جواب دیا ''مگر میں تو اپنی ذوالفقار تمہارے خون سے تر کرنا چاہتا ہوں۔۔''

حضرت علیؓ آگے بڑھے اور عبدود کو زیر کر لیا اور حسب وعدہ اپنی ذوالفقار کو اس کے خون سے تر کر لیا۔عمرو کے ساتھی اپنے سب سے بڑے پہلوان کو یوں خاک میں ایڑیاں رگڑتے دیکھ کر فرار ہو گئے۔۔

اس دوران وہ دلچسپ واقعہ بھی ہوا جس سے ثابت ہوا کہ شاعر اور ادیب ذرا کمزور دل ہوتا ہے۔شعروں کے سینکڑوں وار کر سکتا ہے لیکن تلوار کا ایک وار کرنے سے بھی اس کی جان جاتی ہے۔۔

حسان بن ثابت کی حویلی میں عورتوں اور بچوں کو یکجا کر دیا گیا تھا۔ان میں حضرت حمزہؓ کی ہمشیرہ صفیہؓ بھی تھیں۔۔انہوں نے ایک شب ایک یہودی کو حویلی کے گرد گھومتا ہوا پایا تو حسان سے کہا ''رسول اللہؐ دوسری طرف متوجہ ہیں کہیں یہ یہودی جاسوسی کر کے اس حویلی پر حملہ نہ کرا دے۔۔اے حسان جائیے اور اس کا قصہ تمام کر دیجیے۔''

حسان نے جواب میں کہا ''اے دختر عبدالمطلب میں وہ مرد نہیں جسے کسی پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت ہو۔''

حضرت صفیہؓ نے انہیں مردانگی کے کچھ طعنے ضرور دیئے اور پھر خود ایک لاٹھی اٹھا کر حویلی سے اتر کر اس شخص کا قصہ تمام کر دیا۔۔واپس آ کر حسان سے کہنے لگیں ''میں تو ایک مرد کے بدن سے اسلحہ اور پوشاک نہیں اتار سکی اب تو آپ جائیے اور یہ کام کیجیے۔''

مگر حسان میں اس کی جرأت بھی نہ تھی کہنے لگے ''مجھے تو ان چیزوں کی ضرورت ہی نہیں'' اور دبکے بیٹھے رہے۔۔

مسلسل پچیس روز محاصرہ جاری رہا۔۔

ایک ایسی رات آئی کہ شدید آندھی اپنے دامن میں موسلادھار بارش لے کر آئی۔بجلی کے کوندے اور بادلوں کی ہولناک گرج۔قریش کے خیمے زمین سے اکھڑ کر ہوا میں معلق ہو گئے۔۔سامانِ حرب بکھر گیا۔خوراک کی دیگیں اوندھی ہو کر چولہوں میں دھنس گئیں۔۔

قبیلہ اسد کے سپہ سالار طلیحہ نے بلند آواز میں کہا ''اے دوستو۔۔یہ مصیبت محمدؐ کی وجہ سے آئی ہے۔۔یہاں سے بھاگ کر نجات حاصل کرو۔۔''

ابوسفیان بھی اس ناگہانی آفت سے ہراساں ہو کر پکارنے لگا ''اے برادران قریش طوفان نے

ہماری سواری کے گدھے اور گھوڑے بھی ختم کر دیئے ہیں.. بنو قریظہ پہلے سے بد عہدی کر کے ہم سے علیحدہ ہو چکے ہیں.. اس پر یہ طوفان.. اب ہمارا ایک لمحہ بھی رکنا محال ہے..

ادھر مدینہ میں سویر ہوئی تو رسول اللہؐ نے خندق کے پار ویرانی دیکھی.. دشمن پسپا ہو چکے تھے..

''خدا نے اپنی قدرت سے کافروں کو مدینہ سے ہٹا دیا.. وہ لوٹتے وقت غصے میں بھرے ہوئے تھے اور مسلمانوں پر یہ کرم فرمایا کہ انہیں جنگ سے بچا لیا.''

ابن اسحٰق نے کہا ''اور صبح ہوئی تو رسول اللہؐ تمام مسلمانوں کو ساتھ لے کر خندق سے مدینہ واپس تشریف لے آئے اور سب نے ہتھیار اتار دیئے.''

اور آج کے مدینہ میں نہ کوئی خندق دکھائی دیتی تھی اور نہ کوئی قدیم آثار.. کوئی اشارہ نہ تھا کوئی تختی کہیں نصب نہ تھی.. یہ آگاہ کرنے کے لیے اس مقام پر جنگ خندق لڑی گئی تھی اور یہ وہ مقام ہیں جہاں صحابہ کرامؓ اور رسول اللہؐ نے قیام کیا تھا.. ان کے خیمے یہاں نصب تھے.. صرف ایک جدید پٹرول پمپ دکھائی دیتا تھا جس میں داخل ہونے والی کاریں بے چین ہوئی جاتی تھیں کہ ان کا شکم بھر دیا جائے اور وہ پھر سے فراٹے بھرتی ہوئی اس مقام سے دور ہو جائیں..

ہم بھی اس مقام سے دور ہو گئے.

ہم ماضی میں خیمہ زن لوگ اپنے خیمے اکھاڑ کر اس مقام سے دور ہو گئے جہاں رسول اللہؐ پیٹ پر دو پتھر باندھ کر بھوک پیاس سے خندق کھودتے اپنے کومل ہاتھ کھردرے کرتے تھے اور سر پر ایک دابڑہ اٹھائے رجز پڑھتے تھے..

مولا بخش اب رکا نہیں دور سے ایک مسجد کی جانب اشارہ کیا ''یہ مسجد جمعہ کہلاتی ہے جہاں حضورؐ نے پہلا جمعہ پڑھا.'' اور پھر تھوڑی دیر بعد ایک اور مسجد کی نشاندہی کی کہ یہ مسجد غمامہ ہے جہاں حضورؐ نے بارش کے لیے ہاتھ اٹھائے تھے..

ایک صحرا میں آپ کو ایک دم ایک ریلوے سٹیشن نظر آ جائے تو آپ کیا محسوس کریں گے..

ایک نخلستان میں.. ایک پلیٹ فارم دکھائی دے جائے.. کھجوروں کے جھنڈ میں ایک ریلوے لائن نظر آ جائے تو کیا آپ یقین کر سکیں گے..

میں بھی متحیر ہوا یقین نہ کر سکا..

کہ مدینے کا ریلوے سٹیشن آ گیا تھا..

جہاں ایک زمانہ میں مدینے تک ایک ٹرین آتی تھی.. ترکوں کی تعمیر کردہ.. اور پھر ترکوں کے جبر سے

نالاں عربوں کی سربراہی کرتے ہوئے لارنس آف عریبیہ نے ریل کی پٹڑیوں کو اکھاڑ کر تباہ کر دیا تھا..

یہ ریلوے سٹیشن اب دوبارہ اپنی اصلی حالت کے مطابق پھر سے تعمیر کیا جا رہا ہے.. زنگ آلود اور ناکارہ ہو چکی پٹڑیوں پر ان زمانوں کی ریل کے چند ڈبے ابھی تک کھڑے تھے..

اور مجھے اس متروک ریلوے اسٹیشن نے کیسے مسحور کیا.. اس کے ماتھے پر منزل کا اعلان کرنے والا ایک حرف اب بھی پڑھا جا سکتا تھا.. "مدینہ"..

اگر آپ ایک ٹرین میں سفر کر رہے ہوں.. اور سفر کے دوران ایک سٹیشن پر وہ ٹرین رکتی ہے اور آپ اپنے ڈبے میں سے سر نکال کر دن کی دھوپ میں یا رات کی سیاہی میں یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم کہاں رکے ہیں.. یہ کون سا سٹیشن ہے تو عمارت کے ماتھے پر لکھا "مدینہ" نظر آتا ہے تو اس کے بعد کیا کچھ اور نظر آ سکتا ہے..

مدینے کا ریلوے اسٹیشن.. جہاں اب کوئی گاڑی آتی ہے اور نہ جاتی ہے
اور ویران پلیٹ فارم پر ایک تنہا مسافر کھڑا ہے..
وہ جاتو کہیں اور رہا تھا لیکن عمارت پر "مدینہ" لکھا نظر آیا تو ٹرین سے اتر گیا..
لوگ پوچھتے ہیں کہ اے مسافر کیسے آئے ہو؟
تو وہ کہتا ہے کہ ٹرین سے

اور وہ حیرت سے اور اسے دیوانہ جانتے ہوئے کہتے ہیں.. یہ پلیٹ فارم تو ایک مدت سے ویران پڑا ہے.. نہ کوئی آیا نہ گیا.. تم کیسے آ گئے..

تو وہ جواب دیتا ہے.. مجھے تو یہ نہیں معلوم کہ میں کیسے آیا ہوں.. لیکن یہ معلوم ہے کہ آ گیا ہوں تو اب جانا نہیں چاہتا..

"روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام.."

''تارڑ دیکھ تو سہی اس کوہ نوردی کی منزل کون سی ہے.. غارِ حرا ہے''

''تُف ہے تم پہ تارڑ'' میں نے اپنے آپ کو لاکھ ملامت کی ''اوئے شرم کر.. حیا نہیں آتی تجھے''
میں نے اپنے آپ کو مطعون کیا۔'' دیکھ تو سہی منزل کس پہ پہنچنا ہے''
ہاں.. منزل تو کبھی ایسی نہ تھی..

''اپنے تئیں کتنی کوہ نوردیاں کی ہیں تو نے.. کیسی کیسی کٹھنائیاں سہہ گیا ہے.. اور تو نے پہنچنا کہاں ہوتا تھا..؟ کسی دور افتادہ وادی میں کبھی قراقرم اور کبھی ہمالیہ اور کبھی پامیر کے دامن میں کسی بلند مقام پر جہاں تمہارا خیمہ تمہاری آمد کا منتظر ہوتا تھا۔ کسی گھنے جنگل میں، کسی مرگ صفت گلیشیر پر کسی برف پوش چوٹی پر.. یہی منزلیں تھیں ناں.. وہاں پہنچ گئے تھے ناں..؟ اور اب یہ دیکھو کہ یہ کیسی منزل ہے جس تک تم پہنچنا چاہتے ہو اور یہاں جی ہار گئے ہو.. تُف ہے تم پر.. اس سے کئی گنا بلند اور جان لیوا بلندیوں تک پہنچ چکے ہو.. اور یہ دو تین ہزار فٹ کی بلندی اُن کے سامنے کچھ حیثیت رکھتی ہے.. پر اس کی جو حیثیت ہے وہ کسی اور بلندی کے نصیب میں ہو سکتی ہے.. جس منزل تک پہنچنے کے لیے آج کوہ نوردی پر آمادہ ہو تو اس کے سامنے کسی بھی اور منزل کی کچھ وقعت ہے.. تو آج حوصلہ ہارتے ہو تو لعنت ہے تم پر.. ذرا قیاس تو کرو کہ آج منزل کون سی ہے..

تمہارے جوگرز تلے جو سنگریزے آرہے ہیں وہ جانتے ہو کس کے پاؤں تلے آیا کرتے تھے..

لوگ تو ننگے پاؤں چل رہے ہیں اور انہیں یہ سنگریزے کچھ آزار نہیں دیتے اور تمہیں یہ چبھ رہے ہیں..

تمہارا سانس پھولا ہوا ہے.. نڈھال ہو گئے ہو.. ہمت ہارتے ہو.. اُس منزل کو جاتے ہوئے جس کے سامنے سب منزلیں ہیچ ہیں.. سب سفر لاحاصل ہیں.. فضول اور بیکار ہیں تو تُف ہے تم پہ تارڑ کہ غارِ حرا کو جاتے ہوئے ہمت ہارتے ہو.. لعنت ہے تمہاری پچھلی تمام تر کوہ نوردی پر اگر آج یہاں حوصلہ ہارتے ہو..''

میں حاجی ہو چکا تھا..

عرفات کا دن اور مزدلفہ کی رات گزار چکا تھا..

خانہ کعبہ کی دیوار سے لپٹ چکا تھا..

جس کے جمال سے تمام انجمن.. یہ دنیا روشن تھی.. اس کے کچے حجرے کے سامنے سر جھکا کر اقرار کر چکا تھا کہ کتھے مہر علی کتھے تیری ثناء..

لیکن ابھی تک کم از کم میرا حج مکمل نہیں ہوا تھا. خانہ کعبہ کی دیوار سے لپٹ جانے کے بعد بھی ایک خلش باقی رہ گئی تھی..

ڈاچی والے کے سراپے کو جو سرخ اور سبز چادر ڈھک رہی تھی اس پر پلکوں سے دستک دینے کے باوجود ایک کمی رہ گئی تھی..

حج تو کوئی نئی بات نہ تھی. ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا تھا. خانہ کعبہ بھی مدتوں سے موجود تھا اور یہ جن جو بادامی رنگ کی ڈاچی پر سوار ہر سو میں چھن چھن کرتا چلا جاتا تھا تو یہ کب جن ہوا یہ کہاں جن ہوا. تب تو وہ محض محمد تھا.. ایک امین تھا. تو کب وہ ایک عام انسان سے رسول اللہ میں بدلا اور کہاں بدلا..

غار حرا میں..

وہ کون سا مقام تھا جہاں پہلے تو ہر سو دھند تھی.. کچھ سجھائی نہ دیتا تھا.. ہر جانب تاریکی تھی اور پھر یکدم اذن ہوا کہ روشنی ہو جا..

اور روشنی ہو گئی..

روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام

اور جمالِ یار کہاں روشن ہوا..

غار حرا میں..

شہر مکہ سے دو میل کے فاصلے پر ایک جبل.. نہایت بلند اور دشوار چڑھائی والا.. جہاں محمدؐ سے پیشتر بھی اہل مکہ میں جو فکر کرنے والے ہوتے تھے.. جو نہیں جانتے تھے وہ جاننا چاہتے تھے اور جو مبہم سا ہو رہا ہوتا تھا اس کی قربت کی جستجو کرنے والے ہوتے تھے ایسے لوگ وہاں گوشہ نشین ہوا کرتے تھے..

ایک ایسا جبل جسے میں نے پہلی بار مکہ کی عمارتوں سے پرے بلند دیکھا تو وہ مجھے سوئٹزرلینڈ کے دانت نما پہاڑ میٹر ہارن سے مشابہ نظر آیا..

''اس دور میں رسم تھی کہ متقشف اور مرتاض اشخاص سال بھر ایک مرتبہ چلہ کشی کے لیے آبادی سے دور کسی کنج تنہائی میں جا بیٹھتے اور اپنے ڈھب پر عبادت کرتے''

حضورؐ نے بھی اسی غار کو پسند فرمایا..

آپؐ ہر برس رمضان کا پورا مہینہ اس بلند غار کی یکسر تنہائی میں بسر کرتے۔ گھر سے عام طور پر مہینہ بھر کے کھانے پینے کا سامان اپنی پشت پر بوجھ کر کے اس جبل پر چڑھتے اور اس غار میں روپوش ہو کر غور و فکر میں مستغرق ہو جاتے۔۔

ابر کیا چیز ہے۔۔ ہوا کیا ہے۔۔
اگر تجھ بن اور کوئی نہیں موجود۔۔ اگر تو موجود ہے تو کیسا ہے۔ کہاں ہے۔۔ یہ ماجرا کیا ہے۔۔ یہ بھید کیسا ہے۔۔

موسم وارد ہوتے رہتے۔۔
طلوع کی زردی روشن ہوتی اور غروب کی پرچھائیاں پھیلتیں۔
کبھی پورے چاند کی کرنیں غار کے اندر بیٹھے شخص کی پشت کو روشن کرتیں اور اگر اس کا چہرہ غار کے صحن کی جانب ہوتا تو سورج کی پہلی کرنیں اسے منور کرنے لگتیں۔۔
اور کبھی غار کی تنہائی سے اکتا کر غار کے آگے جو مختصر سی جگہ تھی ایک بلندی پر معلق وہ شخص وہاں بیٹھ جاتا۔ گہرائی میں جھانکتا اور کبھی ویران وادی میں اس جبل سے کم بلند جو پہاڑ تھے ان پر نظر کرتا۔۔
رمضان کا مہینہ اختتام کو پہنچتا تو حضورؐ اپنے گھر واپس آ جاتے لیکن وہ تصورات اور سوچیں بدستور ان کے ذہن پر چھائے رہتے۔۔
جناب خدیجہ فکر مند ہوتیں تو کہتے۔۔ ''میں خوش و خرم ہوں۔''
صرف رمضان میں ہی نہیں انہیں جب بھی موقع ملتا وہ اس غار میں جا کر پنہاں ہو جاتے۔۔
برس ہا برس تک یہی سلسلہ جاری رہا۔
غار حرا۔ حرا پہاڑ کا غار۔ بعد میں یہ پہاڑ جبل نور کہلایا اور حرا صرف اس غار کے لئے مخصوص ہو گیا۔
غار حرا اُن کا۔ سیدہ خدیجہ کے گھر کے بعد۔ دوسرا گھر بن گیا۔
سیدہ مشکیزے میں پانی بھر دیتیں۔ کھانا اور خشک ستو تیار کرتیں۔ حضورؐ انہیں اپنی پشت پر اٹھا کر اوپر چلے جاتے۔۔ جب خوراک کا ذخیرہ ختم ہو جاتا تو مکہ واپس آ کر خورد و نوش کا ایک اور بوجھ اٹھا کر پھر اوپر چلے جاتے۔ کبھی سیدہ حساب رکھتیں اور کسی خادم کے ذمے یہ کام لگا دیتیں اور وہ پانی اور خوراک حضورؐ تک پہنچا دیتا۔۔
غار حرا کا مطلب تلاش و جستجو کا غار بھی بیان کیا جاتا ہے۔۔

سلجوق کا کہنا تھا کہ اگر ہم نماز فجر کے فوراً بعد جدہ سے نکل کھڑے ہوں تو ہم جبل نور کے دامن میں تب جا پہنچیں گے جب اوپر جانے والے کم کم ہوں گے۔۔
اور جب ہم سویر کی ہلکی روشنی میں مکہ پہنچ کر پہلی بار خانہ کعبہ کی بجائے جبل نور کو جانے والا راستہ

تلاش کرتے تھے.. اور کبھی کسی روٹھے ہوئے یعنی پاکستانیوں سے عاجز آئے ہوئے سعودی سے.. اور کبھی کسی قہوہ خانہ کے جمائیاں لیتے ہوئے میزیں پونچھتے مالک سے اور کبھی کسی سٹور کے اندر جا کر دریافت کرتے تھے کہ السیدی جبل نور کو کون سا راستہ جاتا ہے.. اور جب ہم بالآخر جبل نور کے دامن تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہاں اوپر جانے والے کم نہیں زیادہ ہیں.. وہاں ہم سے بڑھ کر یار ان تیز گام موجود ہیں جو محمل کو جا لینے کی جستجو میں جُت چکے ہیں..

اور یہ دامن کوئی ایسا ہرا بھرا ٹھنڈک بھرا الپائن پھولوں سے ڈھکا دامن نہ تھا. خشک پہاڑوں کے دامن بھی خشک ہی ہوتے ہیں.. لیکن یہ ایک ایسا دامن تھا بے شک خشک تھا وہاں بھدے مکان اور دکانیں تھیں جن میں پلاسٹک کے پھول فروخت ہوتے تھے اور شاپرز اور جوس کے خالی ڈبوں اور کاٹھ کباڑ سے اٹا دامن تھا اور پھر بھی یہ ایسا دامن تھا جسے تھامے کوئی چاہتا تھا اور عمر بھر تھامے رہنے کو جی چاہتا تھا..

ایک گلی.. کہیں پختہ.. کہیں پتھریلی.. کہیں سنگریزے.. آس پاس کچھ مکان.. کچھ کھوکھے.. کچھ بند دکانیں اور یہ گلی آسمان کو اٹھ رہی ہے..

اور دامن میں متعدد کوسٹر اور بسیں رکتی جا رہی ہیں اور ان میں سے پُرشوق اور دیوانے سے زائر اُبلتے ہوئے باہر آ رہے ہیں.. غول کے غول.. یہ اپنی عمر کا کچھ لحاظ کرتے.. کہ ان میں ستر برس سے تجاوز کرتے ہوئے بابے اور بابیاں بھی کثرت میں تھے.. گورے کالے سیاہ اور زرد زرد.. بمشکل زمین سے سرکتے ہوئے گھسٹنے سے بھی اور آسمان کی قربت میں ہوتے ہوئے قدآور بھی.. کوسٹروں اور بسوں سے برآمد ہوتے اور ان کی نگاہیں آسمان پر تارا ہو جاتیں.. اپنے چاند کی جستجو میں جو غار حرا میں سے طلوع ہوا کرتا تھا..

یہ سب پہلے سے پوری طرح تیار اور کمربستہ اور پانی اور خوراک کا بندوبست کر کے آنے والے تھے اور اپنی سواری سے اترتے ہی کوہ پیمائی پر اتر آتے تھے..

اور ہم نے یہ سمجھا تھا کہ نماز فجر کے بعد ہمارے سوا وہاں اور کون ہو گا..

ہم صبح کی تنہائی میں ان پتھروں پر چلتے جو اس کے دوسرے گھر کی کہکشاں تھی اس پر چلتے اوپر پہنچ جائیں گے.. اور غار حرا کے کسی پتھر پر دستک دینے والے پہلے زائر ہوں گے..

سلجوق نے جبل نور کے اس دامن میں کار پارک کی.. ہم باہر آئے اور اس نے اوپر نگاہ کر کے پہاڑ پر چڑھتے اس ہجوم کو دیکھا جو نہایت مخمور قسم کی چیونٹیوں کی مانند اس پر رینگ رہا تھا اور پھر مسکرا کر کہا. ''ابا''..

اوپر سے ایک نہایت مطمئن اور بانکا سا پُرمسرت شخص نیچے آ رہا تھا.. اور اس کے ہاتھوں میں ایک ٹارچ تھی..

''میں تو جناب خالی منہ اندھیرے ہی ادھر آ گیا تھا.. ٹارچ کی روشنی میں اوپر گیا تھا.. وہاں نماز فجر ادا کی.. آپ کو ذرا دیر ہو گئی ہے تارڑ صاحب..''

"اوپر کتنے لوگ ہیں؟"

"بہت نہیں ہیں.."

"کیا غار حرا کے اندر دو نفل ادا کرنے کا موقع مل جائے گا؟"

"ہاں جی.. بس پندرہ بیس منٹ کا انتظار کرنا ہوگا.. آپ جایئے.. بسم اللہ کیجیے.."

وہ شخص اس آسودگی اور مسرت میں مبتلا چلا گیا.. اور اس کی ٹارچ ابھی تک روشن تھی اگرچہ صبح کا اجالا پن ہر سو پھیل چکا تھا..

جبل نور کے دامن میں بھی ہم جیسے گمراہ زائرین کے لیے ایک بورڈ پر کچھ ہدایات درج تھیں جن کا مفہوم کچھ یوں تھا کہ اوپر جانا ایک بیکار سی بات ہے؟ کیا کریں گے ایک غار کو دیکھ کر.. اور اگر آپ نے باز نہیں آنا تو براہ کرم اس جبل کا کوئی پتھر تبرک کے طور پر اٹھا کر نہ لے جائیں اور اس جھاڑی کی شاخ نہ توڑیں اور کسی سنگریزے کو جیب میں نہ ڈال لیں..

اوپر جانے کا راستہ نوکیلے اور غیر ہموار پتھروں میں سے نکلتا تھا اور نہایت دشوار اور سانس تباہ کر دینے والا لگتا تھا.. اور یہ راستہ ایک بہت بڑا ڈسٹ بن تھا.. کوڑے کرکٹ کا ایک ڈھیر تھا.. برسوں سے یہاں صفائی جان بوجھ کر نہیں کی گئی تھی.. ہر قدم کسی خالی ڈبے.. پلاسٹک کے شاپر.. کسی چیتھڑے.. کسی پھینکے ہوئے ٹین پر پڑتا تھا..

جبل نور کا یہ ڈسٹ بن شاہوں کے تیور تھے.. کہ تم اگر ہمارا کہا نہیں مانتے.. اتنے احمق اور کند ذہن ہو کہ منع کرنے پر بھی تبرک سے باز نہیں آتے تو اس ڈسٹ بن پر چلتے اوپر جہاں سوائے چند پتھروں کے اور کچھ نہیں ہے.. وہاں جاؤ.. تم صراط مستقیم پر نہیں چلنا چاہتے.. نہ چلو..

میں جدہ سے باقاعدہ اس کوہ نوردی کی مہم کے لیے تیار ہو کر آیا تھا..

کرکس کے آیا تھا اور جوگر پہن کر آیا تھا..

وہ جوگر جو مجھے پاکستانی شمال کے بلند ترین دروں اور چوٹیوں تک لے گئے تھے اور کم ہی پھسلے تھے اور یہاں ہر قدم پر پھسلتے تھے.. خالی ڈبوں.. بوتلوں اور پلاسٹک پر ٹھہرتے ہی نہ تھے..

میں نے شاید کچھ مبالغہ کیا ہے.. راستے میں کاٹھ کباڑ اتنا نہ تھا جتنا میں نے محسوس کیا.. محبوب کے گھر کے راستے میں اگر ایک روڑا بھی آ جائے تو گراں گزرتا ہے..

وہ ایک گلی.. جو جبل نور کے دامن سے اٹھتی تھی جس کے آس پاس کچھ مکان اور کھوکھے تھے.. وہ اختتام کو پہنچی اور ہم کھلی فضا میں آ گئے.. آگے چڑھائی تھی اور کچھ نہ تھا..

میں نے اس گلی میں رک کر ایک تھڑے پر بیٹھ کر بھی اپنے اکھڑتے سانسوں کو درست کیا تھا لیکن جب اس گلی سے باہر آ کر بلند ہوئے ہیں تو ہر قدم پر سانس درست کرنے کی حاجت ہونے لگی..

ہمت جواب دینے لگی..

اور یہیں پر میں نے اپنے آپ کو لاکھ ملامت کی تھی.. کہ تُف ہے تم پہ تارڑ..

او بے شرم کر.. دیکھ تو سہی منزل کس پہ پہنچنا ہے..

تمہارے جوگرز تلے جو سنگریزے آ رہے ہیں وہ جانتے ہو کس کے پاؤں تلے آیا کرتے تھے..

آج تک جتنے ان گنت سنگریزے تمہارے اس جوگر تلے آئے ہیں تو کیا وہ سب مجتمع ہو کر آج تمہارے جوگرز کے تلے آنے والے ایک سنگریزے کے پاسکو ہیں..

سمیر نے اپنے اباجی کے لیے جوس کے ڈبے.. منرل واٹر کی ایک بوتل.. چپس کے پیکٹ اٹھا رکھے تھے اور وہ نہایت آسانی سے.. بار بار پیچھے مڑ کر اطمینان کرتے کہ ابا ابھی قائم ہے.. دائم ہے.. کہیں ڈھے تو نہیں گیا.. لڑھک تو نہیں گیا.. یہ اطمینان کرتا آسانی سے پلا ہنگیں بھرتا جبل نور پر چڑھتا جا رہا تھا..

ذرا اوپر جا کر جب میں نے پلٹ کر نیچے نظر کی تو دامن میں جو گلی تھی.. ایک مسجد تھی وہ مختصر نظر آنے لگی..

تب سلجوق رک گیا.. ایک پتھر کا سہارا لے کر کہنے لگا ''ابا مجھے چکر آ رہے ہیں.. مجھ سے چلا نہیں جا رہا..''

وہ بہت راتوں سے ٹھیک طرح سویا نہ تھا.. نوجوانی کی نیند پوری نہ کر سکا تھا صرف اس لیے کہ سفارتی ذمے داریوں کے علاوہ اس پر والد صاحب کی بھی ذمہ داری تھی..

''تو ہم واپس چلتے ہیں..'' میں نے فوراً کہا..

بے شک بادلِ نخواستہ.. ایک گہرے رنج اور ملال میں مبتلا.. آپ ایک بیٹے کی طبع کی ناسازی پر اپنی اہم ترین منزل کو قربان کر سکتے ہیں..

ہم سب تو ابراہیم نہیں ہو سکتے..

''نہیں.. آپ جائیں..

''تمہارے بغیر تو نہیں جائیں گے..''

''نہیں ابا.. میں تو پہلے بھی غارِ حرا تک جا چکا ہوں.. وہاں نفل ادا کر چکا ہوں.. مجھ سے چلا نہیں جاتا.. آپ ہو آئیں.. میں نیچے جا کر آپ کا انتظار کرتا ہوں..''

اور میں نے تشویش سے دیکھا کہ وہ پتھروں کو تھامتا ڈولتا ہوا.. اوپر آنے والے زائرین میں سے راستہ بناتا نیچے جا رہا ہے..

وہ نیچے چلا گیا تو میں نے اوپر دیکھا..

اوپر ایک بلند مقام پر.. بہت اوپر ایک چھپر نظر آ رہا تھا اور جو لوگ وہاں تک پہنچ رہے تھے وہ نظروں

سے اوجھل ہو رہے تھے.. شاید یہی منزل تھی..

اگر یہی منزل تھی تو بھی بہت بلند اور دور تھی..

مجھے یہ تو بتایا گیا تھا کہ غار حرا تک پہنچنے کے لیے ذرا مشقت کرنی پڑتی ہے.. ذرا دشوار ہے.. لیکن مجھے آج تک کسی نے یہ نہیں بتایا تھا کہ غار حرا کے پتھروں تک جانے کے لیے ایک کوہ پیما کا حوصلہ اور ہمت چاہیے.. مضبوط ٹانگیں اور پکا سانس چاہیے.. جوگرز یا مضبوط شوز درکار ہوتے ہیں اور پانی.. جوس وغیرہ کا زاد راہ ساتھ ہو.. یہ باقاعدہ ایک کوہستانی مہم ہے.. جبل نور کی چوٹی تک آپ چہل قدمی کرتے ہوئے نہیں پہنچ سکتے..

کسی نے یہ نہیں بتایا تھا..

اور کسی نے یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ اس چوٹی تک پہنچنے کے لیے کوہ پیمائی کے تمام اصول باطل ہو جاتے ہیں.. زندگی بھر کا پہاڑوں پر چڑھنے کا تجربہ یہاں کچھ کام نہیں آتا.. اس پر چڑھنے کے لیے وہ سب کچھ نہیں درکار جو کسی اور چوٹی پر پہنچنے کے لیے درکار ہوتا ہے..

یہاں تو ایک والف تینوں درکار..

محبت.. لگن اور خواہش درکار.. عشق درکار باقی سب بیکار..

میں نے جوگرز پہن رکھے تھے.. وہ بھی درکار نہیں کہ ایک چینی اماں جی کو دیکھا کہ وہ اس گلی اور بازار اور آخری مکان کی حد سے نکل کر غار حرا تک پہنچنے والی بلندی کے دشوار سنگریزی راستے پر پہلا قدم رکھنے سے پیشتر اپنے بوٹ اتارتی ہیں.. جرابیں اتارتی ہیں اور اپنے ننھے منے ناتواں چینی کے پاؤں سنگریزوں پر رکھ دیتی ہیں..

اور ان کے جھریوں بھرے چہرے سے عیاں ہوتا ہے کہ ان سنگریزوں کی چبھن ان کے بوڑھے بدن میں راحت اور شادمانی کی ایسی لہریں تخلیق کرتی ہے کہ وہ پھر سے جوان ہو جاتی ہیں..

مجھ میں ان جیسی سرشاری کی نشوونما نہیں ہوئی تھی.. جوگرز کے باوجود مجھے سنگریزے چبھ رہے تھے..

ایک اور خاتون.. شاید ملائیشیا کی تھیں اور وہ نوجوان تھیں.. انہوں نے بھی یہی عمل دوہرایا.. بوٹ اور جرابیں اتار کر بیگ میں سنبھالے اور ننگے پاؤں بڑے مزے سے خوش خوش چڑھنے لگیں..

یہ جذبۂ دل کہیں ہمت بھی ہار جاتا تھا.. کچھ لوگ اس چڑھائی کو برداشت نہ کر پاتے تھے اور حسرت سے ان کو تکتے جو برداشت کی صلاحیت رکھتے تھے واپس ہو جاتے تھے..

ایک فلپینو خاتون جو میری طرح بے ڈول بدن کی تھیں میرے آگے آگے پتھروں کو تھامتے.. خالی ڈبوں اور بوتلوں پر پھسلتی.. اپنے آپ کو سنبھالنے کی بہت سعی کرتی تھیں لیکن ان سے چلا نہیں جا رہا تھا.. بار بار پھسلتی تھیں.. ایک بار گرنے کو آئیں تو بمشکل سنبھل کر سانس درست کیا اور مڑ کر کہنے لگیں "نہیں نہیں میں اوپر نہیں پہنچ سکتی.. سنگریزوں پر میرے پاؤں پھسل جاتے ہیں.. میں پھر کبھی آؤں گی.." بلکہ واپسی پر وہ اوپر

آنے والی زائر خواتین کو بھی مشورے دے رہی تھیں کہ یہیں سے لوٹ جاؤ اسی میں بھلائی ہے۔

موسم اگرچہ خوشگوار تھا لیکن چڑھائی کی مشقت بدن کو پسینے سے تر کرتی تھی۔۔

سب تو نہیں البتہ بیشتر پاکستانی زائرین بے حد کھسڈی تھے اور ان میں راقم الحروف بھی شامل تھا۔۔

یہ لوگ میرے ہم وطن آ تو گئے تھے پر ان کے حالات اچھے نہ تھے۔۔چڑھائی کے آغاز میں تو یہ آپس میں چہلیں کرتے ہنستے کھیلتے دکھائی دیتے تھے اور جہاں میں تھا یہاں تک پہنچتے پہنچتے وہ ہانپ ہانپ کر نڈھال ہو جاتے اور سنجیدہ ہو جاتے۔۔لیکن ہمت نہ ہارتے جوں توں کر کے چڑھتے چلے جاتے تھے۔۔

ایک مقام پر جہاں کچھ ہموار جگہ تھی وہاں ایک بزرگ خاتون، جن کی عمر زیادہ نہ تھی۔۔وزن البتہ بھاری بیشتر گھبرائی ہوئی تھیں کہ، منہ زیادہ تھا باقاعدہ چوروں شانے چت پڑی تھیں، ہائے ہائے کرتی اپنے سینے پر ہتھیلی رکھ کر دہائی دے رہی تھیں۔ "میرا دل ڈوب رہا ہے۔ مجھے کچھ ہو جائے گا"۔ اور ان کے آس پاس ان کی آل اولاد یا داماد وغیرہ بیٹھے بھی ان کے مشوروں کی کوشش کرتے تھے اور کبھی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر گھونٹ پانی رکھ کر دیتے تھے اور کہتے جاتے تھے۔ "بے بے جی ہم نے آپ سے کہا بھی تھا۔۔منت کی تھی کہ اوپر نہ آئیں آپ کو دل کی تکلیف ہے۔" اور بے بے جی جواب میں جو کچھ کہہ رہی تھیں ان میں ایک شکایت لاجواب تھی۔۔ہائے ہائے پتر مجھے کیا پتہ تھا۔۔کیا پتہ تھا کہ میرا سوہنا محمد آتی اونچائی پہ رہتا ہے۔۔۔

البتہ ترک خواتین اور وہ ہماری خواتین سے بھی زیادہ وزن دار تھیں اور کچھ عمر رسیدہ تھیں۔ اور ان کے ہمراہ جو بابے اور نوجوان تھے وہ سب کے سب نہایت آسانی سے روزمرہ کی گفتگو کرتے اوپر جا رہے تھے۔۔

ان میں سے بیشتر ترک۔۔شہری زندگی سے نہیں آئے تھے۔۔زیادہ تر اناطولیہ کے دہقان تھے گڈریے اور کسان تھے۔۔اپنی روزمرہ کی زندگی میں۔ مویشیوں کی دیکھ بھال کے لیے بھیڑیں چراتے۔ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں جاتے۔ لیکن چند ندیوں پر چلنے اور اونچی ٹیکریوں پر آسانی سے چڑھنے کے عادی تھے۔۔یہ چڑھائی ان کے لیے ایک معمول تھی

اور پھر سیاہ چادروں میں ماتم کی تصویریں ایرانی خواتین اور ان کے ہمراہ بے ترتیب داڑھیوں والے مرد ڈھیلی پتلونوں اور چیک شرٹس میں۔۔انہیں بھی کوئی دشواری پیش نہ آتی تھی یا وہ کسی دشواری کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔

ملائیشیا اور انڈونیشیا کے قدرے ناتواں اور مختصر لگتے۔۔مرد و زن۔۔ان کا حال بھی پتلا چپلا تھا لیکن ان میں خوبی یہ تھی کہ ہر وقت مسکراتے جاتے تھے۔۔سانس لینے کے لیے بھی رکتے تو مسکراہٹ کو رخصت نہ کرتے۔۔مسکراتے جاتے چڑھتے چلے جاتے تھے۔۔

میں نے دو افغان خواتین کو نہایت شان و شوکت سے اوپر آتے دیکھا۔ اپنے پاس سے گزر کر آگے

جاتے دیکھا۔ بڑے گھیرے کے پھولدار سرخ گھاگھروں اور سیاہ قمیضوں میں حرکت کرتی ہوئی گندھی ہوئی مینڈھیاں اور چہرے پر گودے ہوئے سیاہ نقش و نگار۔ ان کے قدم پتھروں اور سنگریزوں پر ایسے جم کر پڑتے تھے جیسے وہیں پیوست ہو جائیں گے۔ وہ اتنی لاپروائی اور آسانی سے بلندی کی جانب چڑھتی تھیں بس چلتی جاتی تھیں۔ اور لمحوں میں نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔

ایک بابا صاحب۔ شاید منگولین تھے یا قازق ان کی داڑھی کے چند سفید بال ہوا میں بکھرتے ان کی ٹھوڑی سے چپکے جاتے تھے اور وہ یوں چلے جاتے تھے جیسے کسی گھوڑے پر سوار اوپر جا رہے ہوں۔۔

کچھ نہایت گوری رنگت والے۔ شاید بوسنیا کے تھے یا ترکستان کے۔ ان کے چہرے سرخ بھبوکا ہوتے تھے اور وہ پسینہ پونچھتے بار بار اوپر دیکھتے تھے کہ کتنی چڑھائی باقی ہے۔ میں نے یہاں ایک چینی مائی جی کا تذکرہ ضرور کروں گا جن کے ہمراہ ان کا نوجوان بیٹا سر جھکائے چلتا تھا اور آپ نوجوان۔ ان کا بیٹا انہیں بار بار سہارا دینے کی سعی کرتا تھا اور وہ اس سہارے کو جھٹک کر خود چڑھنے کی کوشش کرتی تھیں۔

اکثر اوقات جب میں سانس درست کرنے کی خاطر کسی پتھر کا سہارا لے کر کھڑا ہوتا تو وہ مائی جی اپنے پیلے چہرے کے ساتھ میرے قریب سے گزرتے ہوئے مجھے ایک بے دانت مسکراہٹ سے نوازتیں۔۔۔

اور کبھی وہ رک جاتیں اور میں ان کے قریب سے گزرتا تو ہمارے درمیان مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوتا۔۔

میرے آس پاس واقعی ایک جبل نور کی چوٹی پر پہنچنے کی کاوش میں جو لوگ تھے ان کا مشاہدہ کرتے ہوئے ایک انکشاف ہوا۔ اگرچہ حج کے دوران ہر دوسرا نہیں تو تیسرا چہرہ افریقی ہوتا تھا لیکن یہاں وہ خال خال ہی نظر آتے تھے۔ ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی۔۔

ایسا کیوں تھا؟

بہت سے لوگ خانہ کعبہ میں مسلسل حاضری کو ترجیح دیتے ہیں اور اس سے جدا نہیں ہوتے۔ ان کے دھیان میں اور کچھ نہیں آتا۔ لیکن یہ صرف میرا تجزیہ ہے کہ افریقہ بلندیوں کا نہیں وسیع میدانوں صحراؤں اور جنگلوں کا خطہ ہے اور وہاں کے رہنے والے ایسی بلند کوہ پیمائی کے عادی نہیں ہیں۔ میں نے زیادہ سے زیادہ پانچ سات افریقی اس چڑھائی کے دوران دیکھے۔۔

میرے جیسے بے ڈول بابے کے لیے مجھے کچوکے دیتے اوپر جانے کی ترغیب دیتے شرم دلاتے دو عناصر تھے۔۔

ایک تو یہ کہ مجھ سے عمر میں کہیں بڑھ کر رسیدہ۔ اور ان کے مقابلے میں میں تو ابھی جوان تھا۔ ترک، ایرانی، اور چینی بوڑھے اور مائیاں نہایت بے تکلفی سے مجھ سے آگے نکلتے جاتے تھے

اور دوسرا وہی غصہ کہ۔ تف ہے تم پہ تارڑ۔۔

ذرا تصور میں تو لاؤ۔ کہ پہنچنا کہاں ہے۔

آج منزل کون سی ہے..

جس مقام سے تمہاری تمام تر منزلوں کا آغاز ہوا..

تم جو قلم سے رزق کماتے ہو..وہیں تو تمہارے قلم کی حرمت کا آغاز ہوا..

رب کعبہ نے اس قلم کی قسم کھائی..جو کچھ تم پڑھتے ہو اس پڑھائی ''اقراء'' کا آغاز بھی وہاں ہوا جہاں تم جاتے ہو..

ذرا تصور میں تو لاؤ یار..

ثمیر مجھ سے کہیں آگے نکل کر اوپر ایک بڑے پتھر کے قریب کھڑا میری بدنی حالت کو تشویش سے تکتا مجھے اوپر آتا دیکھ رہا تھا..نظر میں رکھ رہا تھا..

اور دائیں بائیں انواع و اقسام کے بابے اور مائیاں تیز رفتار کاروں کی مانند شرلاٹے بھرتے مجھ سے آگے نکل رہے تھے..جیسے دیوانے موسم کی سختیوں اور زمانے کی دشواریاں سے بے نیاز ہوتے ہیں..

میں ایک اور بیان مکمل ہوش و حواس میں دینا چاہتا ہوں..اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ اگر غار حرا محض تین ہزار فٹ کی بلندی پر نہ ہوتا..ایورسٹ کی مانند انتیس ہزار اور کے ٹو کی طرح اٹھائیس ہزار فٹ کی بلندی پر بھی واقع ہوتا تو ان مائیوں اور بابوں نے وہاں بھی بہر صورت پہنچ جانا تھا..

میں ثمیر کے قریب جا پہنچا..

''ابو جوس کے دو گھونٹ پی لیں..اور اس پتھر کے سہارے کچھ لمحے آرام کر لیں..''

اوپر..بلندی پر بے خود اور مخمور چیونٹیاں رینگتی چلی جا رہی تھیں..

دوبارہ چلا اور چند قدم چڑھا تب میں نے اُس پہلے اپاہج گداگر کی صدا سنی''اللہ بھلا کرے حاجی..صدقہ دے جا..''

یہ اپاہج اس بلندی پر کیسے پہنچ گیا..

اور مجھ سے پہلے کیسے پہنچ گیا..

یہ پہنچا نہیں تھا..پہنچایا گیا تھا..

صبح سویرے..فجر کی نماز کے فوراً بعد ٹھیکیدار حضرات ان اپاہجوں کو جنہیں منی میکنگ مشینز بھی کہا جا سکتا ہے..نیچے مکہ کی وادی سے مزدوروں سے اٹھواتے ہیں اور جبل نور کے نہایت اہم اور حساس نوعیت کے موڑوں اور مقامات پر لا کر تعینات کر دیتے ہیں..اگر ان سونے کی ڈلیاں اگلنے والے کسی مقام پر کوئی انجانا گداگر آ بیٹھے تو اسے فوراً بے دخل کر دیا جاتا ہے..زائرین ثواب کے ترسے ہوئے ان پیشہ ور گداگروں کے بڑھے ہوئے ہاتھ ریالوں سے لبریز کر دیتے ہیں..شام ہوتی ہے تو انہیں اٹھا کر پھر نیچے لے جایا جاتا ہے اور دن بھر کی کمائی کا حساب کتاب کر کے اس کا کچھ حصہ انہیں بخش دیا جاتا ہے..

یہ کہنے کی چنداں حاجت نہیں کہ تقدس اور محبت کو بلیک میل کرنے کا یہ دھندہ مملکت خداداد کے شہری اور ہندوستان کے مظلوم مسلمان کرتے ہیں..

ان گداگروں کے ہاتھوں میں.. نہ صرف ریال دیکھے بلکہ دنیا بھر کے کرنسی نوٹ جن میں ڈالر بھی شامل تھے.. دیکھے!

تھوڑی سی چڑھائی کے بعد کچھ بے ڈھب اور بے ترتیب کھردری اور چھوٹی بڑی سیڑھیوں کی آسائش آ گئی.. کچھ اطمینان ہوا.. یہاں کم از کم سنگریزوں پر پھسلنے کا خدشہ نہ تھا..

لیکن دو چار سیڑھیوں پر قدم رکھ کر آگے ہوا ہوں تو ایک اور عجوبہ میرے سامنے تھا..

ایک مسکین شکل کے پاکستانی مٹھی بھر سیمنٹ اور بوری بھر ریت گیلی کر کے اسے ایک تیسی سے تھپکتے تھے اور کسی حد تک ایک سیڑھی کی شکل دے رہے تھے اور ہر اوپر جانے والے کے سامنے اپنے بازو کو لمبا کر کے دیوار کر کے حائل کرتے کہہ رہے تھے "یا حاجی، صدقہ.. میں غارِ حرا تک جانے کے لیے یہ سیڑھیاں آپ کے لیے بلامعاوضہ تعمیر کر رہا ہوں.. دس بیس ریال عنایت کر کے اس کارِ ثواب میں شرکت فرمائیں".. اور یہ اناؤنسمنٹ وہ خلقِ خدا کی بھلائی کے لیے اردو، پنجابی، سندھی اور پشتو کے علاوہ ترکی، فارسی، انگریزی وغیرہ میں بھی کرتے.. اور کچھ حاجی تو اتنے جذباتی ہوتے کہ آبدیدہ ہو کر اپنی جیبیں خالی کر دیتے.. البتہ تشویش تب پیدا ہوتی تھی جب دو چار قدم کے بعد نہایت بے غرض، عشقِ رسولؐ میں ڈوبے ہوئے ایک اور رضاکار سے ملاقات ہو جاتی تھی جو اسی طور ایک تیسی سے گیلی ریت کو تھپک رہا ہوتا اور زائرین کے لیے بے پایاں ثواب کا فری بندوبست کر رہا ہوتا تھا..

ایسے درجنوں رضاکاروں سے آپ کی ملاقات ہوتی ہے..

لیکن سب سے زیادہ کمائی یا تو پہلا گداگر کرتا ہے یا پہلا رضاکار.. اور یقیناً یہ پہلے مقام نہایت زور آور لوگوں کے حصے میں آتے ہوں گے کہ ان کے بعد زائرین کی جیبیں نسبتاً خالی ہوتی جاتی ہیں یا وہ گیم پلین سمجھ جاتے ہیں اور مزید ثواب کمانے سے دستبردار ہو جاتے ہیں..

چوٹی تک پہنچتے پہنچتے کم از کم ایک درجن رضاکار سیڑھیاں تعمیر کرتے ہوئے ملے اور واپسی پر میں نے دیکھا کہ ان کی تعمیر اسی مرحلے میں معلق ہے.. بالشت بھر کا بھی اضافہ نہیں ہوا.. ریت کو تھپکنا البتہ جاری ہے تو ان میں سے ایک رضاکار نے جب یہ دیکھا کہ یہ والا حاجی تو انتہائی گمراہ ہے جیب میں ہاتھ ہی نہیں ڈالتا تو اس نے قدرے غصے سے کہا "یا حاجی.. ثواب نہیں کماؤ گے؟" تو میں رک گیا "دیکھو برادر.. میری جیب میں جو کچھ ہے وہ میں ابھی الٹ دیتا ہوں.. صرف یہ کہ تم میرے سامنے صرف ایک سیڑھی بنا دو.. منظور؟"

تو وہ فوراً مجھ سے غافل ہو کر دیگر دین دار خواتین و حضرات کی جانب ملتفت ہو گیا.. پاکستان میں جو معروف ترین بین الاقوامی شہرت یافتہ آرکیٹیکٹ ہیں وہ بھی کیا کماتے ہوں گے جو جبل نور پر براجمان ریت کو

تھکتے غار حرا تک جانے والی سیڑھیوں کے پیار کی تھکن کماتے ہیں..

ایک نہایت مخدوش صحت والے ہندوستانی نے اپنی گود میں برابر کی مخدوش صحت کا حامل ایک بچہ اٹھا رکھا تھا اور وہ کشاں کشاں اوپر چڑھ رہا تھا.. لوگ رکتے اس بچے کو پیار کرتے اور چومتے.. اس کے باپ کی ہمت داد کے قابل تھی..

ایک صاحب مسلسل اپنی اماں جان کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے کہ بس تھوڑی سی ہمت کرو اماں.. ذرا چوٹی کی طرف دیکھو دور نہیں ہے.. اور اماں میں اتنی سکت بھی باقی نہ تھی کہ سر اٹھا کر اوپر دیکھتیں اتنی نڈھال تھیں.. اور ان صاحب نے کسی خور مجھے پہچان لیا تو اماں جان کو دلاسہ دیا دیتے ہیں ''اماں دیکھو یہاں ٹیلی ویژن والے بھی آئے ہوئے ہیں تمہاری تصویر ٹیلی ویژن پر آئے گی اماں.. چل ہمت کر..

بالآخر وہ پہلا چھپرا آ گیا..

دامن سے اوپر چڑھتے ہوئے جب یہ چھپر دکھائی دیا تھا اور لوگ وہاں سے اوجھل ہو رہے تھے تو یہی خیال تھا کہ غار حرا اس کے قریب ہوگی.

پر نہیں تھی.

یوں سمجھئے کہ یہ کسی حد تک مڈوے تھا.. یہاں ایک مقام تھا کہ جہاں سے آپ جبل نور کے دوسری جانب جھانک سکتے تھے اور یہاں سے راستہ مڑ کر بائیں جانب بلند ہوتا ہوا چوٹی تک جاتا تھا. نسبتاً آسانی یہ تھی کہ سنگریزوں اور چٹانوں کی بجائے پتھریلی سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں.

چھپر چھاؤں میں درجنوں کے حساب سے چینی ناکوں اور ترچھی آنکھوں والے زائرین سستا رہے تھے اور جوس کے ڈبوں میں سے ظاہر ہوتی نلکیوں پر لب سکیڑتے اپنے آپ کو تازہ دم کر رہے تھے.

اور ہاں یہ ٹریفک یک طرفہ نہیں تھی بلکہ اوپر سے واپس آنے والوں کا بھی سلسلہ شروع ہو گیا تھا.. ان نیچے آنے والوں کو ہم ایسے نہایت حسرت سے تکتے تھے جیسے کچھ وہ پیاسا کنویں راستے میں ہوں اور کچھ وہ پیاسا جو چوٹی کو سر کر کے واپس اتر رہے ہوں وہ ہمیں حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہیں.. اور واپس آنے والوں کے چہرے فخر سے تمتماتے ہیں کہ ہم تو ہو آئے.

اس مڈوے چھپر کے قریب نیسر نے پھر سے جوس پلا کر تازہ دم کیا اور ہم سانس درست کرنے کی خاطر رک گیا.. نیچے نظر کی جہاں سے ہم آئے تھے.. اور ذرا حیرت ہوئی کہ اچھا ہم وہاں سے آئے ہیں.. اتنی گہرائی سے.

ہمارے محمدؐ بھی اسی راستے سے اوپر آیا کرتے تھے..

پہاڑی علاقوں میں ہمیشہ اوپر جانے کے لیے بل کھاتی پگڈنڈیاں ہوتی ہیں.. یہ نہیں کہ دامن سے چوٹی تک ناک کی سیدھ میں ایک راستہ چلا جاتا ہو.. کہ پہاڑوں پر اسی طور بل کھاتے زگ زیگ طریقے سے

چڑھنا ہی ممکن ہوتا ہے۔ اس لیے وادیٔ مکہ کی جانب سے کوئی بھی آنے والا جبلِ نور کی چوٹی پر پہنچنے کا خواہش مند تقریباً اسی راستے پر چلتے ہوئے.. بل کھاتے راستے پر.. جس پر چڑھتے ہوئے ہم یہاں تک پہنچے تھے۔

اس لیے مجھے یقین ہے کہ محمدؐ بھی اسی راستے کو اختیار کرتے ہوں گے.. بار بار اور برس ہا برس تک اختیار کرتے رہے۔ اس چڑھائی پر چڑھتے رہے جسے اب پلاسٹک کے شاپر بیگ اور دیگر کاٹھ کباڑ ڈھک رہے ہیں تو ان کے تلے ان کے قدموں کے نشان تو ہوں گے.. ذرا صفائی کرنے سے شاید دکھائی بھی دے جائیں۔ شاید کوئی شائبہ ہو کوئی نشان کوئی مہک باقی ہو کہ ہمارے محمدؐ ایک بے مثل رہنما تھے۔ ایک کوہ نورد تھے نہایت مضبوط بدن کے اور طاقت والے تھے کہ ان خوبیوں کے بغیر اس پہاڑ پر چڑھنا اور بار بار چڑھنا ممکن ہی نہیں.. اور ایک کوہ نورد کی مانند وہ بھی اکیلے ٹریک سیک اٹھائے یہ کوہ پیمائی کرتے تھے۔ اور اس ٹریک سیک میں ستو، کھجوریں اور پانی.. جب وہ اس جبل پر چڑھتے ہوں گے تو ان کے مہک والے بدن سے بھی پسینہ پھوٹتا ہوگا.. جو ان کے جسم پر سے گزرتے ہوئے گرتا ہوگا جیسے میری ہتھیلیوں میں بھی پسینے کی نمی ہے ایسے حضورؐ کی ہتھیلیوں میں بھی پسینہ آتا ہوگا اور جب کسی پتھر کا سہارا لیتے ہوں گے تو اس پتھر پر ان کے پسینے کی گیلاہٹ ایک نمی ثبت کر دیتی ہوگی۔

کیا اس پتھر پر کہ ان کے قریب سے گزرنے والا ہر شخص.. لاشعوری طور پر اس پر ہاتھ رکھتا ہے کہ یہ ایسے زاویے پر واقع ہے..

یا اس پتھر پر جہاں میں نے ہاتھ رکھا ہے تو وہاں کی ہے میرا ہاتھ تھاما گیا ہو تمہارے سہارے کی حاجت نہیں ہے تو بھی اسی پتھر پر ہاتھ رکھ دو کہ شاید انہوں نے اس پر ہاتھ رکھا ہو۔

کنکر، ریت، مٹی.. ادھر ادھر ہو جاتے ہیں

لیکن پتھر.. تو جوں کے توں پڑے رہتے ہیں چاہے چودہ سو برس گزر جائیں..

کسی ایک پتھر کو چھوئے بغیر نہ گزرو کہ شاید اسی ایک پتھر پر ایک نمی تھی جو تمہارا ہاتھ تھامنے کے لیے..

"چلیں ابو.." سمیر کچھ بے صبر ہوا.. "آپ بھول ہی گئے ہیں کہ نیچے بھائی ہمارا انتظار کر رہا ہے۔"

میں واقعی بھول گیا تھا۔ نیچے.. جبل کے دامن میں جو آبادی تھی اس کے قریب چند کاریں نظر آ رہی تھیں۔ ان میں سے کسی ایک میں سلجوق ہمارا منتظر تھا..

دھوپ تیز ہو رہی تھی۔

چھپر سے بائیں جانب اترتی ہوئی سیڑھیوں پر قدم رکھتے ہم اوپر ہونے لگے.. ان سیڑھیوں کے آس پاس بھی گداگر اور ماہر تعمیرات براجمان تھے۔ لیکن وہ نیچے سے اوپر آنے والوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے.. یہ جانتے ہوئے کہ ان حضرات کی جیبیں خالی ہو چکی ہیں بلکہ اوپر سے نیچے آنے والوں کو دیکھ کر ہاتھ

پھیلاتے تھے کہ غارِ حرا کی زیارت سے لوٹنے والے کچھ نہ کچھ تو دے کر جائیں گے..

دائیں ہاتھ پر.. ہم چوٹی کے قریب آ چکے تھے.. دائیں جانب کسی پیالہ نما عمارت کے کھنڈر تھے.. اس بلندی پر.. جبل نور کی چوٹی کے قریب یہ کس نوعیت کی عمارت ہوگی جو ڈھے چکی ہے.. اتنی بلندی پر ایک عمارت تعمیر کیسے کی گئی اور اگر کی گئی تو اس کی حاجت ہوگی.. اس کے بغیر گزارہ نہ ہوگا.. لیکن یہ ہے کیا.. بہت سوں سے دریافت کیا لیکن سب بے خبر تھے.. ایک گداگر کا خیال تھا کہ یہ کوئی ہوٹل تھا.. ہوٹل نہیں ہو سکتا تھا.. پیالہ نما شکل میں پانی ہو سکتا تھا.. لیکن اتنی بلندی پر پانی کیسے لایا جا سکتا تھا.. یہ عقدہ حل نہ ہوا اور ہم آگے بڑھ گئے..

ایک ایسا موڑ آیا جس کے فوراً بعد ہوا آئی.. اگرچہ اس میں حدت تھی لیکن اس نے بدن کو خوش کر دیا.. ہوا اس لیے آئی کہ چوٹی کے قریب ہمیشہ منظر کھلتا ہے.. رکاوٹ نہیں رہتی تو ہوا کا چلن ہو جاتا ہے.. ایک نسبتاً ہموار سطح دائیں ہاتھ پر نظر آئی جس کے پار جبل نور کے دوسری جانب جو پہاڑ تھے وہ نظر آنے لگے اور ایک وادی کا نشیب دکھائی دینے لگا..

اوپر دیکھا تو ایک اور بڑا چھپر نظر آیا..

یہ چھپر ہی ہماری منزل تھی.. جبل نور کی چوٹی تھی جس پر ایستادہ چھپر نظر کو مجروح کرتا تھا.. جیسے کے ٹو کی چوٹی پر ایک چھپر ہوٹل تعمیر کر دیا جائے.. اور چوٹی نظر نہ آئے چھپر نظر آئے.. چند سیڑھیاں طے کرنے کے بعد ہم نے جبل نور کی بلند ترین سطح پر قدم رکھا.. بلکہ بدہیئت اور بدنما چھپر کے نیچے آ گئے.. فرش پر.. یعنی چوٹی پر کچھ غلیظ سی دریاں بچھی تھیں.. چند بنچ تھے اور سامان خورد و نوش کی فروخت جاری تھی.. وہی جوس.. منرل واٹر.. بوتلیں اور چپس کے پیکٹ..

کچھ لوگ یہیں نوافل کی ادائیگی میں مگن تھے..

کچھ مزے سے سینڈوچ وغیرہ کھا رہے تھے.. سگریٹ پی رہے تھے.. گپ شپ کر رہے تھے.. ایک ایسا چھپر جو کسی بھی پاکستانی شاہراہ کے کنارے ہو سکتا تھا.. اگرچہ وہاں بہتر ہوتا تھا..

صرف یہی نہیں وہاں دو تین فوٹو گرافر حضرات کے ڈیرے بھی تھے..

ایک چٹان پر نہایت بھدے انداز میں ''غارِ حرا'' پینٹ کیا ہوا تھا اور زائرین اس کے سامنے کھڑے ہو کر نہایت عقیدت سے ہاتھ باندھ کر یا دعا کرتے ہوئے تصویریں اتروا رہے تھے.. حالانکہ ''غارِ حرا'' وہاں نہ تھی.. محض سہولت تھی کہ وطن واپسی پر یہ تصویر دکھانے پر کسی کو کیا پتہ کہ پس منظر میں جو ''غارِ حرا'' لکھا ہے اس کے آس پاس یہ غار کہیں نہیں.. محض سہولت ہے.. غارِ حرا چوٹی پر نہیں تھی.. دوسری جانب ذرا نشیب میں واقع تھی..

آج سویرے شہر مکہ میں سے گزرتے ہوئے فوٹو گرافروں کی متعدد ایسی دکانیں نظر آئیں جن

کے اندر پردے پر خانہ کعبہ پینٹ کیا گیا تھا اور آپ اس کے سامنے کھڑے ہو کر.. اور یہ عیاں تھا ان تصاویر سے جو دکان کے باہر گاہکوں کو متوجہ کرنے کی خاطر سجائی گئی تھیں. قرآن پاک پڑھتے ہوئے.. اسے سینے سے لگائے.. یا دعا کا پوز بناتے ہوئے یا نہایت پر تقدس روحانی شکل بنا کر تصویر اتروا سکتے تھے.. بلکہ سمیر نے صلاح دی تھی کہ ابا زبردست آئیڈیا ہے. سوونیئر کے طور پر ایک تصویر نہ ہو جائے.. وہ زیادہ سنجیدہ نہ تھا لیکن میں تھا ''نہیں بیٹا.. یہ تو بہت ہی چھچھلی سی بات ہے.. خانہ کعبہ کو اس طور استعمال کرنا مجھے اچھا نہیں لگ رہا.''

تو یہاں بھی یہی عمل جاری تھا..

غارِ حرا کہاں ہے؟.. ہم نے دریافت کیا..

''اس چھپر سے پرے سیڑھیاں اترتی ہیں.. ذرا نیچے ہے.''

ہم چھپر سے نکل کر پھر سے دھوپ میں آ گئے..

یہاں.. شہر مکہ کا منظر کھلتا ہے اور آپ کے سامنے.. بلکہ نشیب میں دور دور تک پھیلتا چلا جاتا ہے.. اور گھنی آبادیوں کے گھنے پن میں خانہ کعبہ کی عمارت ایک نہایت مختصر ماڈل کی مانند نظر آنے لگتی ہے..

ہم چوٹی پر تھے اور یہاں سے نیچے اترنا تھا..

اترنے کے لیے نہایت چھوٹی چھوٹی سیڑھیاں ہیں جو اترتی نہیں گرتی ہیں اور ان پر بے احتیاطی سے قدم رکھنے والا شخص بھی اترے گا نہیں گرے گا..

چنانچہ نہایت احتیاط سے سوچ سوچ کر اترنا ہے.. اگر آپ کے عقب میں امڈتا ہجوم آپ کو سوچنے کا موقع دے تو..

آپ کے حق میں یہی بہتر ہے کہ آپ جبل نور کے قدموں تلے دور دور تک بچھے مکہ کے منظر پر فدا نہ ہوں اسے دیکھنے سے گریز کریں اور فی الحال نظر نیچی رکھیں اُس ٹیڑھی سی سیڑھی پر رکھیں جہاں آپ نے اگلا قدم رکھنا ہے ورنہ آپ بہ نفس نفیس اُس منظر کا ایک حصہ بن سکتے ہیں..

درجن بھر گرتی سیڑھیوں کے بعد اُن میں ایک بل آتا ہے تو یہاں سے مڑتے ہوئے بھی احتیاط از حد لازم ہے کہ جہاں آپ اپنا قدم رکھتے ہیں.. بے شک ایک جنگلے میں ملفوف رکھتے ہیں لیکن اس کے عین نیچے ایک ایسی کھائی ہے جو نظر کو گھما کر رکھ دیتی ہے.. چکرا دیتی ہے اس لیے ذرا احتیاط سے..

اس کھائی کے آغاز میں.. جبل نور کی چوٹی سے ذرا نیچے ایک عجیب سا جانے کون سی نسل کا ایک تنہا ٹنڈ منڈ سا درخت معلق ہے..

میں نے جب دامن میں کھڑے ہو کر اوپر نگاہ کی تھی تو وہاں سے بھی اس جبل کی یکسانیت کو حسن عطا کرنے والا یہ واحد درخت مجھے نظر آیا تھا..

یہ خود رو تھا.. اور مجھے گمان ہے کہ ان زمانوں میں اگر یہ نہ تھا تو کوئی اور درخت یہیں معلق تھا جس

کے بیج سے اس کی نسل مجھ تک آ گئی تھی..

اور مجھے گمان نہیں.. یقین ہے کہ حضورؐ نے بھی اس کے تنہا حسن کو سراہا ہوگا کہ وہ ذوقِ جمال رکھنے والے رسولؐ تھے..

اس موڑ سے اترے.. احتیاط سے اترے ہیں تو آگے سیڑھیاں نہیں ہیں.. ایک ہجوم ہے.. رش ہے.. لوگ ہیں.. بھیڑ ہے.. اور اتنی بھیڑ کی گنجائش نہیں ہے کہ دائیں جانب وہی گہری کھائی وادیٔ مکہ میں گرتی ہے.. لیکن کوئی بھی احتیاط نہیں کرتا تو ہم بھی نہیں کرتے اور ہر کوئی سوال کرتا ہے کہ غارِ حرا کدھر ہے تو ہم بھی یہی سوال کرتے ہیں..

تو ایک صاحب.. بلکہ ایک بابا جی جو شکل اور لباس سے بنگالی لگتے ہیں اور ایک مختصر سے چھپر تلے تشریف رکھتے ہیں.. دن کے اس اجالے میں بھی بیٹری روشن کیے وہ اپنے سنگھاسن پر براجمان چٹانوں کے اندر ایک تاریک سرنگ کی جانب بیٹری کا رخ کر کے اشارہ کرتے ہیں کہ اس کے اندر سے.. جاؤ..

میں اس سرنگ کے دہانے پر جھک جاتا ہوں.. اس تنگ سرنگ کی تاریکی میں بھیڑ بہت ہے.. کچھ لوگ پھنسے ہوئے ہیں اور مدد کے لیے پکار رہے ہیں.. لیکن ٹریفک جاری ہے.. لوگ آ جا رہے ہیں..

یہ سرنگ غارِ حرا کے سامنے جو مختصر صحن کھلتا ہے اس میں کھلتی ہے..

لیکن میں اس سرنگ میں داخل ہونے سے گھبرا رہا ہوں.. مجھ میں ہمت نہیں ہے کہ ایک تاریک غار میں داخل ہو جاؤں.. جہاں لوگ پھنسے پڑے ہیں.. کیا پتہ یہاں ٹریفک جیم ہو جائے.. میرا دم اس خیال سے ہی رکنے لگا..

بے شک میں نے کسی بڑے ڈر کے بغیر برف کی سلطنتیں عبور کر لی تھیں.. ورگوتھ کی تند رفتار مرگ ساماں وحشی ندیاں عبور کر گیا تھا.. برالڈو کے بلند کناروں پر چلا تھا.. بیسپر گلیشیر کے اوپر.. ایک کلومیٹر کی بلندی پر ایک چٹان سے چمٹ کر پار ہو گیا تھا.. میں یہ سب کچھ کر سکتا تھا لیکن ایک لوگوں سے بھری تاریک سرنگ میں داخل نہیں ہو سکتا تھا.. بے شک چٹانوں کے اندر وہ راستہ غارِ حرا تک ہی کیوں نہ جاتا ہو..

سمیر اگر تنہا ہوتا تو کچھ تامل نہ کرتا.. بے خطر چہل قدمی کرتا اس سرنگ میں چلا جاتا لیکن اس نے اپنے ابا کا زرد اور خوفزدہ چہرہ دیکھا تو جان گیا کہ بابا جی اندر گئے تو ان کا دم نکل جائے گا..

چنانچہ ہم نے سرنگ کے اندر جانے کا ارادہ فی الحال ترک کر دیا اور بنگالی بابا کے جھونپڑے سے آگے جو چٹان تھی اس پر رینگتے ہوئے بلند ہو گئے..

بلند ہوئے تو نیچے جبلِ نور کی دوسری جانب ایک وادی نظر آنے لگی.. جس میں قیاس ہے کہ ہماری ماں خدیجہ خیمہ زن ہوا کرتی تھیں اس لیے کہ ان کا لاڈلا خاوند اوپر ایک غار میں مقیم ہے اور اس تک کھانے پینے کی اشیاء پہنچانا ہے اور اسے ڈھارس دینا ہے کہ ڈرو نہیں میں یہاں ہوں..

یہاں اس بلندی پر.. جہاں سے بائیں ہاتھ پر آبادیوں کی گھناوٹ میں خانہ کعبہ کا مختصر بالائی منظر نواز ہوتا تھا... بے شک دھوپ تیز تھی لیکن ہوا بھی تھی جو اس کی حدت کو کم کرتی تھی..

اس چٹان کے دائیں جانب ہوئے تو وہاں جا براجمان ہوئے جہاں غار حرا کی چھت تھی..

اگرچہ سخت بے ادبی تھی لیکن کیا کرتے..

سُرنگ میں جا نہیں سکتے تھے تو اور کیا کرتے..

اور جا براجمان کہاں ہوئے..

یعنی اگر غار حرا تعمیر کی جاتی اور اس پر ایک چھت ڈالی جاتی.. ایک لینٹر ڈالا جاتا تو ہم اس پر جا براجمان ہوئے..

اس چھت پر بیٹھ کر.. بلکہ لب بام بیٹھ کر نیچے دیکھتے ہیں..

تو کیا دیکھتے ہیں..

نیچے..

جہاں ہم براجمان ہیں وہاں سے نیچے نظر کرتے ہیں.. تو دس بارہ فٹ نیچے غار حرا کا صحن ہے.. جہاں ہمارے رسول آفتاب کے ابھرنے اور ماہتاب کی کرنوں کو طلوع ہوتے دیکھتے تھے اور اس مختصر صحن میں زیادہ سے زیادہ پانچ دس لوگوں کی گنجائش ہوگی.. وہاں کم از کم چالیس پچاس مرد و زن سائرین مچھلیوں کی مانند پیک شدہ حالت میں اپنی باری کے منتظر ہیں..

اور باری بہت دیر سے آتی ہے..

جس چھت پر ہم بیٹھے ہیں اس کے عین نیچے جو غار ہے اس میں جو کوئی بھی جاتا ہے تو دیر سے باہر آتا ہے.. بعض اوقات آتا ہی نہیں اور اس کے کندھے جھنجھوڑ کر زبردستی باہر لایا جاتا ہے..

صحن میں پیک شدہ لوگ منتظر اور بے چین ہیں.. کروٹ بھی بدل نہیں سکتے کہ اتنی گنجائش ہی نہیں..

جہاں ہم تھے.. وہاں سے ہم ذرا آگے ہو کر نیچے جھانکتے تھے تو غار حرا کا دہانہ نظر آ جاتا تھا اور اس کے اندر کوئی ایک شخص ہاتھ باندھے نفل ادا کر رہا ہوتا تھا تو ہم جل بھن کر خاک ہو جاتے تھے کہ ہم تو یہاں چھت پر ٹانگیں پسارے بیٹھے ہیں اور یہ شخص..

لیکن ہم یونہی بیکار نہیں بیٹھے رہے... بہت کارآمد ہوئے..

امدادی سرگرمیوں میں مشغول ہوگئے..

یعنی جب وہ ایک شخص جسے غار حرا کے دہانے میں نفل ادا کرتے دیکھ کر ہم جل بھن کر خاک ہوتے تھے تو جب وہ شخص یہ فرض ادا کر کے غار سے نکلنے کے لیے مڑتا تھا تو مڑ نہیں سکتا تھا کہ سامنے منتظر زائرین کی دیواریں تھیں جو اُمڈتی چلی آتی تھیں اور ان میں کوئی راستہ نکلنے کا تب ہے اگر وہاں ذرہ بھر گنجائش ہو تو.. اور پھر

اُس کو دھکیلتا ہوا دباؤ اور اشارے کہ نکلو نکلو.. تو وہ کیسے نکلے.. لاچار اور بے بس ہو کر وہ یونہی اوپر نگاہ کرتا اور اوپر ہم تھے.. میں اور سمیر.. پر کٹے ناکارہ فرشتوں کی مانند منڈلاتے ہوئے.. سچ مچ کے فرشتے دستیاب نہ ہوں تو کبھی کبھی ہم جیسے بہروپیے فرشتے بھی کام آ جاتے ہیں.. چنانچہ وہ شخص ہم سے مدد کا خواستگار ہوتے ہوئے بے بسی سے دونوں ہاتھ بلند کر دیتا اور ہم اُس منڈیر پر سے ذرا لٹک کر اُس کا ایک ہاتھ تھام لیتے.. لیکن اس سے پیشتر وہ شخص ہمیں اپنے جوتے تھماتا تھا اور پھر ہاتھ تھماتا تھا..

ہم کہاں تعینات ہیں ذرا اس مقام کا حدود اربعہ قدرے تفصیل سے عرض کرتا ہوں..

جبل نُور کی چوٹی سے بیس تیس فٹ نیچے.. اور یہاں سے وہ چھپر بھی دکھائی دے رہا تھا اور وہاں سے اُترتی چند سیڑھیاں بھی جو زائرین سے بھری ہوئی تھیں.. ہم غار حرا کی چھت پر بیٹھے تھے اور ہمارے عین نیچے اس کا مختصر صحن زائرین سے پیک شدہ تھا.. صحن کے برابر میں ایک گہری کھائی تھی جس کے نشیب میں ایک وادی دکھائی دے رہی تھی جس میں کہیں کہیں آبادی کے آثار تھے.. صحن کے کناروں پر کچھ چٹانیں اُبھری ہوئی تھیں اور چٹانوں سے پھسلنے والا کوئی بھی شخص با قاعدہ سکائی ڈائیونگ کرتا.. ہوا میں گرتا سیدھا ہزاروں فٹ کی گہرائی میں گرتا ہوا وادی کے فرش پر لینڈ کر سکتا تھا.. لینڈ کرنے کے بعد اُسے یکجا کرنے میں البتہ دشواری ہوتی اور اس کے باوجود ایک ایسی ہی گہرائی کے اوپر معلق چٹان پر ایک صاحب نہایت اطمینان سے کھڑے نفل ادا کر رہے تھے.. اُن کے برابر میں اُسی نوعیت کے ایک اور پتھر پر وادی کی جانب پشت کیے دو نہایت فربہ ترک مائیاں براجمان تھیں اور وہ جانے وہاں کیسے پہنچ گئی تھیں اور منڈلا رہی تھیں.. اُن کے عین نیچے دو چار فٹ نیچے غار حرا کا صحن خواتین و حضرات سے ٹھنسا پڑا تھا اور ان کی نیت یہی تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح اس میں کود پڑیں.. بے شک اس کود کے نتیجے میں دو چار زائرین ان کے بھاری تن و توش کے کام آ جائیں..

وہاں تو تل دھرنے کو جگہ نہ تھی اگر ہوتی تو یقیناً میں وہ تل ہوتا جو خود کو وہاں دھر لیتا.. اور اس کے باوجود وہ مائیاں ایک خطرناک چٹان پر اس اژدہام میں کود جانے کے لیے یوں منڈلا رہی تھیں.. جیسے جاپانی سومو پہلوان رانوں پر ہتھیلیاں جما کر مد مقابل کے سامنے دھیرے دھیرے دائیں بائیں حرکت کرتے ہیں..

وہ منتظر تھیں کہ جونہی خلق خدا کے بیچ ذرہ برابر رخنہ نمودار ہو تو وہ دھم سے کود جائیں..

اور یہ واقعی ہماری خوش بختی تھی زبردست اتفاق تھا کہ غار حرا کی منڈیر پر جہاں صرف دو شخص ہی بیٹھ سکتے تھے ہم دونوں بیٹھے ہوئے تھے اور ظاہر ہے اٹھنے کا نام نہیں لے رہے تھے..

ایک تو مقام ایسا تھا کہ جی نہ چاہتا تھا اور اس لیے بھی کہ ہم ثواب کما رہے تھے..

چلیے سرنگ کے راستے اس صحن میں پہنچنا ہمارے لیے ممکن نہ تھا اور یہاں اوپر سے اس صحن میں لینڈ کر جانا بھی دشوار تھا.. بہ فرض محال ایسا ہو بھی جاتا تو شام تک غار حرا کے اندر جانے کا موقع نہ ملتا.. چنانچہ وہاں نفل ادا کرنا ہماری قسمت میں نہ سہی لیکن ہم اُن خوش نصیبوں کی جوتیاں تو وصول کر رہے تھے جو غار کے اندر

سانس لے کر آئے تھے اور ان کی جوتیوں کے بعد انہیں کھینچ کھانچ کر اوپر لا رہے تھے..

ہماری وہاں موجودگی ایسی نہ تھی کہ اس کی اہمیت سے انکار کیا جا سکتا.. ذرا سوچئے کہ اگر ہم اُس حساس مقام پر موجود نہ ہوتے تو یہ لوگ کیسے اُس صحن میں سے نکلتے.. کیسے اوپر آتے.. وہیں پھنسے رہتے اور صحن میں ٹریفک جیم ایسی صورت حال ظہور پذیر ہو جاتی..

تو غار حرا نہ سہی وہ جوتیاں ہی سہی جو اُس کے اندر ہو کر آئی تھیں..

کہیں نہ کہیں تو درج ہو گا کہ یہ بھی ثواب کا کام ہے..

تو ہم دھڑا دھڑ ثواب کما رہے تھے..

دونوں ہاتھوں سے کما رہے تھے.. ایک ہاتھ میں جوتیاں اور دوسرے میں اُس شخص کا ہاتھ..

لیکن اس کمائی کے دوران کچھ پرلطف وقوعہ جات بھی ہو رہے تھے.

مثلاً ایک پٹھان اماں جان جو غار میں سے برآمد ہوتی ہیں تو ان کے ایک ہاتھ میں تو جوتے ہیں اور دوسرے میں ایک موٹی سی گٹھڑی ہے.. میں ہاتھ بڑھاتا ہے تو وہ اُسے جوتے عنایت کر دیتی ہیں پھر میں ذرا جھک کر اُن سے گٹھڑی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو وہ اسے میرے حوالے کرنے سے انکاری ہو جاتی ہیں اور سینے سے لگا لیتی ہیں.. انہیں میرا کچھ اعتبار نہ تھا.. انہیں یقین تھا کہ یہ شخص غار حرا کی چھت پر صرف اس لیے آن بیٹھا ہے کہ میری گٹھڑی لے کر چمپت ہو جائے.. انہیں بڑی مشکل سے اوپر گھسیٹا سینے کے ساتھ لگی گٹھڑی سمیت!

ایک اور خاتون کی جانب ہاتھ بڑھایا اور وہ افغانی تھیں اور بہت بوڑھی تھیں تو انہوں نے ہمارا سہارا لینے سے انکار کر دیا کہ ہم نامحرم تھے اور ہمارے ہاتھ غیر مردوں کے ہاتھ تھے.. اور جب مسکرا مسکرا کر مسکینوں کی طرح ہم ان سے التجا کر رہے تھے کہ آ جاؤ اماں جی ہم آپ کے بھائی ہیں بیٹے ہیں تو وہ ٹس سے مس نہ ہوتی تھیں.. وہیں کھڑی انکار میں سر ہلاتی جاتی تھیں اور اس دوران وہ شخص جس کی باری تھی غار میں داخل ہونے کی اور بقیہ ہجوم انہیں برا بھلا کہہ رہا تھا انہیں اُٹھا کر اوپر پھینک دینا چاہتا ہے تو وہ مجبور ہو کر ہم نامحرموں کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیتی ہیں..

یہاں وہ سرخ گھا گھرے والی جن کے چہرے پر سیاہ نقش و نگار گوندے ہوئے تھے وہ دو افغان خواتین بھی نظر آئیں.. ان دونوں کو صحن میں سے اوپر آنے کے لیے ہماری چنداں ضرورت نہ تھی.. وہ غار میں سے نکلیں اور برابر کی چٹانوں پر پہاڑی بکریوں کی مانند چڑھتی چوٹی کی جانب اوجھل ہو گئیں..

میں جب کبھی سماجی بہبود کے کاموں سے فارغ ہوتا تو منڈیر سے آگے ہو ہو کر.. گردن میں جتنا بھی خم ڈال سکتا تھا اس سے سوا ڈال کر غار حرا میں جھانکنے کی سعی کرتا.. نفل ادا کرتا کوئی مرد یا خاتون.. اس کے قدموں میں معمولی سنگ مرمر کا ایک فرش جو ظاہر ہے بعد میں بچھایا گیا تھا اس کے سوا اور کچھ نظر نہ آتا..

یہ غار تو نہ تھی ایک کھوہ تھی..

آڑی ترچھی چٹانوں کے ایک ڈھیر میں.. ایک کھوہ..

پتھر وہی تھے.. وہیں اُس مقام پر قائم تھے.. اُن کے کنگرے‘ جو نچیں‘ زاویے‘ اُن کا جھکاؤ اور اُن کی شکل اور رنگت بھی وہی تھی جو تب تھی. چھت جس پر ہم بیٹھے تھے اُس کی اونچائی بھی جوں کی توں تھی جب.

میں کیوں خانہ کعبہ اور روضۂ رسولؐ کے بعد جم گیا ہوں‘ ٹھہر گیا ہوں‘ قائم ہو گیا ہوں غارِ حرا پر.. یہ میں بیان کر چکا ہوں.. آج وہ سب نشانیاں مٹ چکی ہیں یا مٹا دی گئی ہیں جو میرے حضورؐ کی ذات سے متعلق تھیں.. اِن چودہ سو برسوں میں ہر وہ شے ڈھے گئی ہے جس نے حضورؐ کا لمس محسوس کیا تھا.. دوبارہ نہیں درجنوں بار ایسے مقام ازسرِنو تعمیر ہوئے ہیں.. بلکہ مقام تک بدل گئے ہیں.. وہ حجرے ڈھے چکے.. وہ کنواں اوجھل ہو چکا جس کے شیریں پانی حضورؐ کو پسندیدہ تھے اور اب مسجد نبویؐ کے فرش پر ایک دائرہ اُس کی نشاندہی کرتا ہے.. کعبہ کے جس دروازے سے وہ حجرِاسود نصب کرنے کے لیے داخل ہوئے تھے.. مدینہ میں جہاں قصویٰ بیٹھی تھی اگلی دو ٹانگیں سکیڑ کر گردن اُن پر ڈال کر.. نہ اُن کا مولد رہا اور نہ اماں خدیجہ کا گھر جس میں حضورؐ نے کہا کہ مجھے کمبل اوڑھا دو.. نہ وہ کھجور کا تنا رہا جس کا سہارا لے کر حضورؐ خطاب فرماتے تھے.. اور نہ کوئی کھجور کے سوختہ پتے.. جنہیں عشاء کی نماز کے لیے جلا کر روشنی کی جاتی تھی اور نہ وہ پہلا چراغ جو مسجد نبویؐ کے طاق دان میں رکھا گیا. غرض کہ کوئی بھی ایسا مقام نہیں رہا.. ایسی ایک اینٹ نہیں بچی جس کی قربت میں حضورؐ نے عطربار سانس لیے ہوں.. اور پورے کا پورا غارِ حرا.. ایک ایک پتھر اور ایک ایک چٹان یہ باقی ہے.. بچ گیا ہے.. غارِ ثور کے علاوہ بس یہی ایک مقام ہے جو نہ دوبارہ تعمیر ہوا ہے نہ کوئی تبدیلی ہوئی.. اپنی اصل شکل میں.. جو شکل حضورؐ دیکھتے تھے اُس شکل میں قائم ہے.. یہی جواز ہے میرے ٹھہر جانے کا.. اس مقام کے لیے قائم ہو جانے کا..

بس اس مقام پر اُن سے ملاقات ہو سکتی تھی.. اس لیے میں ٹھہر گیا تھا..

غارِ حرا.. جس کے اندر جانا میرے نصیب میں نہ تھا.. وہاں بے شک پچھلے چودہ سو برسوں میں اربوں لوگوں نے حاضری دی ہو گی سانس لیے ہوں گے لیکن میرے تصور میں وہاں.. یعنی اس چھت کے نیچے اب بھی حضورؐ کے سانس موجود ہیں.. جن پتھروں کو انہوں نے چھوا تو اُن کا لمس اِن پتھروں نے جذب کر لیا ہو گا‘ موجود ہے.. وہ اس کے اندر داخل ہوتے ہوئے ذرا جھک کر جس پتھر کا سہارا لیتے تھے وہ بھی موجود ہے..

وہ پتھر سارے کے سارے گواہ ہیں..

کہ ہم نے اُسے دیکھا تھا..

ہم اُس کا دوسرا گھر تھے..

وہ برسوں ہم میں رہا تھا..

ہم نے اُس کے بدن کی مہک سونگھی تھی اس لیے ہم کائنات کے کل پتھروں سے ممتاز ہو گئے.. ہم وہی پتھر ہیں..

اور صرف ہم گواہ ہیں.. اور کوئی نہیں.. جب اُسے پڑھنے کے لیے کہا گیا.. اور اُس نے کہا میں پڑھ نہیں سکتا.. آس پاس اور کوئی نہ تھا..

میں اب سماجی بھلائی کے کاموں سے تنگ آنے لگا تھا.. بازو دُکھنے لگا تھا لوگوں کو سہارا دے کر صحن میں سے اوپر تک لاتے.. میں کچھ اپنی بھلائی کے لیے سوچنے لگا.. میں بھی صحن میں پیک شدہ خواتین و حضرات پر کود جانا چاہتا تھا..

اور یہ ممکن نظر نہ آتا تھا..

عقل ابھی لب بام محو تماشا تھی کہ کودوں یا نہ کودوں اور اُدھر عشق.. یعنی اِن دو فربہ صحن پر جھکی خطرناک چٹان پر منڈلاتی ترک مائیوں میں سے ایک بالآخر بے خطر پیچھے جو ہجوم تھا اُس پر کود گئی.. اور ہجوم اس آسمانی آفت کے یکدم نازل ہونے پر پہلے تو سناٹے میں آ گیا اور پھر بڑا بڑاتے لعن طعن کرنے لگا.. وہ مائی تا دیر ہجوم کے سروں پر پھسکڑا مارے بیٹھی رہی اپنے گھاگھرے کو سنبھالتی رہی جو ذرا کھسک گیا تھا اور اُس کی پلنگ کے پائیوں ایسی موٹی ٹانگوں کو عیاں کرتا تھا.. کہ اُس کے اس ہجوم میں سما جانے کی کچھ گنجائش نہ تھی.. اور پھر جانے کیسے وہ اُس میں دھیرے دھیرے گھل مل گئی.. یعنی میں بھی یہی کرتب دکھا سکتا تھا اور گھل مل سکتا تھا.. لب بام تماشائی ہونے کی بجائے اگر میں عشق کو بروئے کار لے آتا.. تو میں نے بھی اُس مائی کی طرح منڈیر پر منڈلاتے ہوئے سمیر سے کہا ”پھر سمیر؟“

”پھر کیا ابو؟“

”پھر یہی یار“

”نہیں ابو“

”کوشش کر دیکھنے میں کیا حرج ہے“

”خبردار ابو“

”پر کیوں نہیں“

”آپ باز آ جائیں ابو.. آپ یہاں سے کودیں گے تو ان پر گریں گے.. دو چار گردنوں کے منکے توڑ دیں گے اور اگر آپ ان میں فٹ ہو بھی گئے تو آپ کا دم گھٹ جائے گا.. بیہوش ہو جائیں گے تو یہاں میں کیا کروں گا.. اور اگر نہ ہوئے تو بھی شام تک باری نہیں آئے گی اور آپ پھر بھول گئے ہیں کہ سلجوق بھائی نیچے ہمارا انتظار کر رہے ہیں.. آرام سے بیٹھے رہیں..“

دو چار لمحے اس سرزنش کے زیر اثر گزر جاتے اور میں پھر بے چین ہو جاتا.. ”کیوں بھئی سمیر..“

اور وہ جواب دینے کی بجائے مجھے گھورتا.. اُسے اپنے باپ کی جذباتی خصلت کا علم تھا..

اور اُس لمحے اور اُس مقام پر مجھے ایک بادہ خوار غالب کا کہا یاد آیا..

ہے تمنا کا دوسرا قدم کہاں یارب..

کیسا دشت امکاں تھا.. کہ تمنا کا دوسرا قدم میرے عین نیچے تھا.. اور میں وہ دوسرا قدم رکھ دینے سے قاصر تھا.. آواز دے کر دیکھنا تو چاہیے کہ شائید وہ مل ہی جائے.. ورنہ عمر بھر کا یہ سفر رائیگاں تو ہے تو میں نے پھر کہا

''ہاں بے بی..''

''ابو بیٹھے رہیں'' اُس نے بدتمیزی سے مجھے ڈانٹ دیا'' کیا یہ کافی نہیں کہ ہم غار حرا کی چھت پر بیٹھے ہیں..''

''نہیں یار''

اگر سُمیر میرے ہمراہ نہ ہوتا تو میں اُس ترک اماں کی پیروی میں کب کا اس ہجوم میں کود چکا ہوتا.. بے شک میرا انجام برا ہوتا. شائید گھٹ کے مرجاتا پھر بھی یہ دیوانگی ضرور اختیار کرتا.

لیکن اولاد ہوتی ہی اس لیے ہے کہ اپنے اباجی کو ایسی جذباتی دیوانگیوں سے باز رکھے..

چنانچہ بالآخر اباجی باز آگئے..

ہم نے وہاں سے اٹھنا تھا.. بالآخر اُتر جانا تھا.. نیچے سلوق منتظر تھا اور جانے اُس کی طبیعت اب کیسی تھی.. اور لوگ بھی ہمیں کچھ پسندیدہ نظروں سے نہ تکتے تھے کہ یہ دونوں اس مقام کو اتنی دیر سے اپنا قیام بنائے ہوئے ہیں.. اٹھنے سے پیشتر میں نے ذرا آگے ہو کر غار کے اندر جھانکنے کی ایک مرتبہ پھر کوشش کی..

پڑھ..

اگر کوئی پڑھ رہا ہے تو میں بھی اُس کی پیروی میں پڑھنے لگوں.. بے شک اتنے ہجوم میں.. اتنی بھگدڑ میں.. اس دوپہر میں کچھ بھی قیاس کرنا ممکن نہ تھا. تصور کو بھی تھوڑا سا اطمینان اور امن درکار ہوتا ہے ذہن پر وہ تصویر بنانے کے لیے جس کی وہ خواہش کرتا ہے.. اور یہاں اطمینان اور امن کہاں.. لیکن مجھے ایک سہولت حاصل تھی.. بہت بار نہیں چند بار جب میں نے اپنی توجہ مرکوز کی ہے تو جو چاہتا تھا وہ موجود رہا اور جو نہیں چاہتا تھا وہ ناموجود میں چلا گیا. عرفات میں بھی ایک دو لمحے ایسے آئے تھے کہ لاکھوں لوگ معدوم ہو گئے تھے اور صرف میں تنہا کھڑا تھا. تو یہاں بھی ایک لمحہ ایسا آترا تھا کہ جبل نور اور غار حرا کے صحن میں ایک نفس بھی موجود نہ رہا تھا.. بس اُسی لمحے میں نے آگے ہو کر سننے کی کوشش کی تھی کہ کیا اندر کسی کو پڑھنے کا حکم مل رہا ہے.. اگر کوئی پڑھ رہا ہے تو میں بھی اُس کی پیروی میں پڑھنے لگوں..

ہم وہاں سے اُٹھے.. وادی پر آخری نظر ڈالی.. دو بڑے پتھروں پر چڑھ کر وہاں اُترے جہاں ابھی تک بنگالی بابا دن کی روشنی میں ٹارچ جلائے بیٹھا تھا اور غار تک جاتے والی سرنگ ابھی تک لوگوں سے پُر تھی.. پھر سیڑھیاں طے کر کے چوٹی تک آئے تو چھپر سے ذرا پہلے سُمیر نے کہا'' ابو نفل ادا نہیں کرنے..''

دراصل طے یہی کر کے آئے تھے کہ غار حرا کے اندر نفل پڑھیں گے' یہ ممکن نہ ہوا تو دل سے یہ

خیال ہی نکل گیا.. یہ خیال نہ رہا کہ حاضری تو کسی بھی پتھر پر کھڑے ہو کر لگوائی جا سکتی ہے جس کا سلسلہ غار حرا کے پتھروں تک جا رہا ہے.. ہم جہاں رُکے تھے وہی مقام تھا جہاں سے ایک کھائی گرتی چلی جاتی تھی اور یہ مقام احتیاط تھا.. اس کے باوجود کھائی کے کناروں پر جو پتھر معلق تھے اُن پر قبضہ ہو چکا تھا اور لوگ نفل ادا کرنے میں محو تھے.. چینی.. سنٹوان.. موئی.. صرف نتھنوں والی اور اونچی ناکوں والے اور والیاں نفل ادا کر رہے تھے..

اور ان سب کا منہ ول کعبے شریف تھا..

جبل نور کی تیز ہوا کو جھیلتے.. بے ترتیب آبادیوں اور بے حساب گھروں کلیوں سے بہت پرے عمارتوں کے ہجوم میں.. غور سے دیکھنے پر ہی کعبہ نظر آتا ہے.. حرم کے دو مینار جیسے دو پکی پنسلیں.. سیاہ غلاف کا ہلکا سا شائبہ.. ایک چھوٹا سا کعبے کا ماڈل عمارتوں میں گھرا ہوا..

ایک پتھر خالی ہوا تو میں نے فوراً اس پر کھڑے ہو کر منہ ول کعبے شریف کر لیا.. نیت کرتا ہوں تو یہ پتھر قدرے متزلزل ہوتا ہے ڈولتا ہے تو میں توازن قائم رکھنے کی خاطر دم روک کر پڑھتا ہوں اور خواہ مخواہ نظر کھائی میں گرتی ہے کہ کہاں آ کھڑے ہوئے ہو.. ہوا بھی تیز ہے..

اور جب سلام پھیرتا ہوں.. تو بائیں جانب کیا دیکھتا ہوں.. دیکھتا ہوں کہ میرا الم ڈھینگ بچہ ایک ایسے پتھر پر ہاتھ باندھے بہت کھڑا ہے جو عین کھائی کے کناروں پر معلق ہے اور ذرا سی بے احتیاطی کا نتیجہ کچھ بھی ہو سکتا تھا.. میں خوف میں آ گیا.. جی چاہا کہ میں بلند آواز میں نہیں بلکہ قریب ہو کر ایک سرگوشی میں کہوں.. بیٹے احتیاط سے..

جب تک اس نے سلام نہیں پھیرا میری جان ہونٹوں تک آتی رہی..

وہ بھی پتھر سے مسکراتا ہوا اُترا ''ابو جب نیت کی ہے اور اپنے سامنے جو دو پنسل نما مینار مشکل سے دکھائی دیتے ہیں انہیں دیکھ کر نیت کی ہے تو تب مجھے خطرے کا احساس نہ ہوا.. البتہ جب دوسری رکعت کے لیے اٹھا ہوں تو اٹھتے ہوئے احساس ہوا کہ کہاں کھڑا ہو گیا ہوں کیونکہ اُٹھتے ہوئے جیسا کہ ہوتا ہے میں ذرا لڑکھڑایا تو اُدھر نظر کھائی کی طرف چلی گئی.. اب نیت کیسے توڑتا..''

وہیں ایک اور پتھر پر وہی چینی مائی جس کے ساتھ چڑھائی کے دوران مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوتا رہا تھا ہاتھ باندھے اتنی خوبصورت عاجزی سے کھڑی تھی کہ اُسے یوں دیکھنے والے کا چہرہ بھی حسین ہو جاتا تھا..

اُس کا بیٹا انگریزی سے کچھ واقفیت رکھتا تھا..

''ہم لوگ چین کے ایک بہت دور کے شہر سے آئے ہیں جس کا نام شی آن ہے..''

''ہاں میں شی آن کو جانتا ہوں.. ایک شام شی آن کی مجھے اب تک یاد ہے۔ واقعی میرے لاہور کی نسبت آپ کا شہر بہت دور ہے..''

ایسے ہی لوگ خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے پکارتے ہیں کہ ہماری طرف دیکھو ہم بہت دور کے

شہروں سے آئے ہیں۔

''میرے والد بھی ساتھ ہیں.. لیکن اماں یہاں آ کر بے قابو ہو گئی ہیں اور ہم دونوں بس انہی کا دھیان رکھتے ہیں۔''

''شی آن تو میدانی علاقہ ہے لیکن آپ کی اماں جی تو نہایت آسانی سے چڑھتی آ رہی تھیں.. اس عمر کے باوجود۔''

''ہمیں بھی حیرت ہوئی.. وہ پچھتر سال کی ہیں.. شی آن میں تو اُن میں اتنی ہمت نہ تھی کہ گلی کے پار آسانی سے جائیں.. دراصل آپ لوگ قریب رہتے ہیں اور یہاں آ جا سکتے ہیں جب کہ ہم لوگوں نے زندگی میں صرف ایک بار اِدھر آنا ہوتا ہے تو ہمت آ ہی جاتی ہے۔''

میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ چپٹی ناک والے زائر جب رو دیتے ہیں تو از حد کیوٹ لگتے ہیں.. آنسو اُن کی پھیلی ہوئی ناک کے گرد خاصا فاصلہ طے کر کے رخساروں تک آتے ہیں.. ان کی ترچھی آنکھیں نمی سے پھیل جاتی ہیں بڑی ہو جاتی ہیں تو یہ شی آن کی اماں بھی نفل ادا کرتے ہوئے روتی چلی جاتی تھیں..

یہ دور کے شہروں سے آئی ہوئی خاتون اپنی زبان سے بالکل مخالف سمت میں واقع.. لکھت، لہجے اور حرف کے حوالے سے.. سراسر مختلف زبان عربی میں یہ کیسے نماز پڑھتی ہوں گی.. ادائیگی کیسے کرتی ہوں گی..

اور یہ کیسے شی آن میں اپنے گھر کے صحن میں بیٹھے.. کیسے حضورؐ کو یاد کرتی رہی ہوں گی.. کن لفظوں میں.. اُن کا نام کیسے لیتی ہوں گی.. کس لہجے میں محمدؐ کہتی ہوں گی.

جبلِ نور سے اُترنے کے لیے پہلا قدم اٹھانے سے پیشتر میں نے حرم کی جانب منہ کر کے ایک اور نیت کی.. کہ میں دوبارہ آؤں گا اگر تو نے چاہا.. ایسے ایام میں جب یہاں ہجوم نہ ہوں گے اور غارِ حرا کے اندر جاؤں گا.. اُن پتھروں کو ہاتھ لگاؤں گا جنہیں انہوں نے ہاتھ لگائے تھے.. جھک کر داخل ہوں گا تو اس پتھر کو تھام کر جسے وہ تھام کر اندر جاتے تھے.. میرے حصے کی جو مہک ہو گی اُسے اپنے بدن میں اُتاروں گا.. آؤں گا.. اور اپنا ایک قلم بھی جیب میں ڈال کر لاؤں گا.

کوئی ایسا قلم جس میں روشنائی کا ایک قطرہ بھی نہ ہو.. جو ایک حرف بھی نہ لکھ سکتا ہو..

''آپ اُمّی ہو.. .

''بے شک صدیوں پہلے پڑھ اللہ کے نام پر.. کہا گیا تھا.. لیکن اس صدا کی گونج میں سن لوں گا اور اس کی برکت سے میرا خالی.. نہ پڑھا لکھا اور بنجر قلم روشنائی سے بھر جائے گا..

سلجوق، جبلِ نور کے دامن میں.. پارک شدہ ٹیکسیوں، بسوں اور کوسٹروں کے بھیتر میں اپنی کار میں سویا ہوا تھا..

ابھی نو بھی نہیں بجے تھے لیکن دھوپ کی تیزی بے آرام کرتی تھی اور وہ بھی فروری کے دنوں میں..
اوپر جانے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا.. میں یہاں سے غارِ حرا تک جاتی سرنگ کے نیچے جو تنہا درخت معلق تھا اُسے دیکھتا تھا اور ان سفید سفید چیونٹیوں کو دیکھتا تھا جو وہاں رینگتی تھیں اور حیرت میں مبتلا ہوتا تھا کہ کیا کچھ دیر پہلے میں بھی اتنی بلندی پر ایک چیونٹی تھا..

نیچے اُترتے ہوئے مجھے پھر وہی خیال آیا جو اُحد میں آیا تھا کہ آئے ہیں اس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں. کیا پتہ اُس پتھر پر اُن کے پاؤں آئے ہوں.. پھر سوچا کہ ہر زائر کے دل میں یہی خیال آ جائے تو جبل نور دنوں میں غائب ہو جائے.. چنانچہ میں نے ایک سنگریزہ تک نہ اٹھایا. کسی ایک تنکے کو ہاتھ نہ لگایا. خالی ہاتھ نیچے آ گیا اور نیچے سلجوق سویا ہوا تھا..

اُسے کار کے شیشے پر دستک دے کر اٹھایا..

اُس نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا "غار کے اندر گئے ابو."

"نہیں جا سکے. ممکن ہی نہ تھا.. کیا تم کل سویرے مجھے یہاں نہیں لا سکتے؟"

"کل بھی یہی حالات ہوں گے.. حج کے ایام میں روزانہ اتنا ہی رش ہوتا ہے."

"تو پھر گھر چلتے ہیں."

"ابو آپ کا واپسی کا ٹکٹ کنفرم ہو چکا ہے اس لیے آپ نے آج ہی طوافِ وداع کرنا ہے."

"صرف میں نے؟"

"جی ابو. سمیر تو ابھی کچھ روز میرے پاس ٹھہرے گا."

"یونہی ان کپڑوں میں."

"نہیں احرام باندھ کر.. ہم آج صبح جدہ سے چلتے ہوئے بھی احرام باندھ سکتے تھے لیکن آپ کے لیے جبل نور پر چڑھنا دشوار ہو جاتا."

"تو پھر."

"احرام میری کار میں ہمہ وقت موجود رہتے ہیں.. اب ہم مکہ سے باہر جہاں میقات کی حد ہے وہاں مسجد تنعیم میں جائیں گے.. غسل کریں گے اور احرام باندھ کر واپس آئیں گے."

چنانچہ مکہ سے منہ موڑ کر اُدھر کا رُخ کر لیا.. وہاں میقات کی سرحد پر ترکوں کے زمانے کے دو برج شاہراہ کے دونوں کناروں پر ایستادہ اس مقام کی نشاندہی کرتے تھے جہاں مکہ میں داخل ہونے سے پیشتر احرام باندھنے کا حکم ہے.. بائیں جانب تنعیم کی وسیع اور شاندار مسجد تھی..

غسل خانے بے حساب تھے.

اور اُن میں غسل کرنے والے بھی..

ان میں سے کسی ایک میں مَیں نے جی بھر کے غسل کیا. جبل نُور نوردی کی تھکن اُتاری اور احرام باندھ کر باہر آ گیا..

باہر آیا تو دونوں بچے احرام اپنے شاندار بدنوں پر لپیٹے ایسے لگ رہے تھے جیسے شیکسپیئر کے جولیَس سیزر میں حصے لینے والے نوخیز اداکار ہوں..

ہم تینوں نے مسجد تنعیم کے بلند گنبدوں تلے عمرے کی نیت کرتے ہوئے نفل ادا کیے.. باہر آئے تو شاہراہ کے کنارے عرب بھائیوں نے یا عربی بولتے ہوئے پاکستانی بھائیوں نے ہمیں گھیر لیا حرم حرم.. جدید سیارہ.. یعنی نئی کار ہے، آ جاؤ.. اس پر تُمیر نے انہیں یہ اطلاع فراہم کر کے مایوس کر دیا کہ ہمارے پاس اپنا ایک جدید سیارہ ہے جو شاہراہ کے پار کھڑا ہے اور ہم خود جا سکتے ہیں۔

اور ہم اپنے ذاتی سیارے میں سوار ہو کر حرم کی جانب مائل سفر ہو گئے۔

"غلافِ کعبہ پر براجمان ایک صدرنگ بھنورا"

طوافِ وداع کی ایک عجیب اُداسی تھی

ایک دُکھ تھا..

بے شک وہ اُس کا گھر تھا.. ہم پل دو پل کے مہمان تھے.. آئے تھے تو جانا بھی تھا..

اُس کے گھر کو اپنا گھر سمجھ لیا تھا اور جانے کو جی نہ چاہتا تھا..

ہمیں اس کے آس پاس رہنے کی عادت ہو گئی تھی..

تُجھ توں وِچھڑن ہویا محال نیں..

ہم ابھی باب عبدالعزیز کے باہر سنگ مرمر کے صحن میں بچھی سبز قالین کی پٹیوں پر احتیاط سے چل رہے تھے کہ کہیں یہ احرام کھل نہ جائیں کہ حج سے فارغ ہو کر اتنے روز بعد انہیں پھر زیب تن کیا تھا تو وہ پھر سے ایک اجنبی پیراہن ہو گئے تھے.. سنبھالنے سے سنبھلتے نہ تھے.. جو پہلی بار دیکھا تھا.. حرم میں داخل ہو کر ترک محرابوں کے پار خانہ کعبہ نہ دیکھا تھا اُس کے گرد گردش کرتے سفید بہاؤ کو دیکھا تھا تو اُسے آخری بار دیکھنے کی خواہش لیے.. ابھی حرم کی جانب باب عبدالعزیز کا رُخ کیے چلتے تھے.. وداع ہونے کے لیے.. جُدا ہونے کی خاطر..

اگرچہ میرے اندر پہلی ملاقات اور پہلے دکھاوے کا ہیجان نہ تھا.. آخری ملاقات کی اُداسی تھی..

ہمارے ہاں بیٹیوں کی رخصتی پر انہیں وداع کیا جاتا ہے.. تو آج رخصتی تھی.. لیکن کس کی؟

خانہ کعبہ کی دولہن کی جو سیاہ پوش تھی اس لیے کہ اُسے رخصت ہونا تھا.. لیکن وہ تو ثابت قدم تھی.. ہزاروں برسوں سے اسی مقام پر تھی.. اُس نے اگر رخصت ہونا تھا تو محض ہماری نظروں سے.. ہماری حیات سے.. یا یہ رخصتی ہماری تھی.. ہم تھے.. جو بابل کی گلیاں چھوڑ جانے والے تھے.. چڑیوں کا وہ چنبہ ہم تھے جنہوں نے اب اُڑ جانا تھا.. بابل کے اونچے سیاہ پوش محل سے بچھڑ جانا تھا..

اور ہم چڑیوں نے بھی بابل کی گلیوں میں ایسے ایسے لطف اٹھائے تھے کہ جی جانتا ہے.. جتنے روز نصیب نے بابل کے ویہڑے میں ٹھہرایا ہم نے کیسے کیسے مزے کیے تھے.. ہم کتنی خوش تھیں، ہمارے ناتواں بدنوں میں کیسی گرمی اور زندگی کی حدت تھی اور ہم کیسے چہچہاتی تھیں.. اب جو ہم اپنے دیس جا رہی تھیں تو اُس

سے شکایت تو کر سکتی تھیں کہ.... کاہے کو بیاہی بدیس..

جی چاہتا تھا کہ یہیں سے.. حرم میں داخل ہونے سے پیشتر یہیں سے لوٹ جائیں تا کہ وداع کی رسم پوری نہ ہو.. ڈولی خالی چلی جائے.. کہاروں کو بھی علم نہ ہو کہ وہ خالی ڈولی اٹھائے چلے جا رہے ہیں..

ہم اس لیے وداع کے دیہاڑے کو نہ دیکھتے تھے.. سر جھکائے اپنے قدموں کو دیکھتے تھے.. سنگ مرمر کی سفیدی کو دیکھتے تھے..

اور وہاں ایک ہزار رنگ تتلی تھی سنگ مرمر کی سفیدی میں جڑی ہوئی.. جیسے سنولیک کی برفوں میں حنوط شدہ ایک تتلی دکھائی دیتی ہے..

وہ ایک تتلی تھی.. یا بھنورا تھا جو نثار ہو چکا تھا اور بے حس و حرکت سنگ مرمر کی سفیدی پر نمایاں ہوتا تھا..

ہم تینوں نے ایک نظر اُسے دیکھا..

اور ہم تینوں اُس مردہ تصویر کو اٹھا لینا چاہتے تھے جس کے رنگ کسی مصور کے برش سے پینٹ نہیں ہوئے تھے.. کہ یہ کسی بھی مصور کے بس سے باہر تھے.. اُس کے تصور اور پیلٹ سے باہر تھے وہ رنگ ایسے انوکھے اور دل کش اور گھنے اور ان دیکھے بھی تھے.. جیسے خلانورد زمین پر واپسی پر دنیا اور کائنات میں سے پھوٹنے اور طلوع ہونے والے رنگوں کو بیان کرنے سے قاصر ہوتا ہے کہ اس سے پیشتر اس نے اُن کا کوئی ثانی دیکھا نہیں ہوتا.. وہ پروانہ تتلی یا بھنورا ظاہر ہے اُس مصور نے بنایا تھا جو نئے رنگ تخلیق کرنے پر قادر ہے۔

اگر اس کی کوئی مثال قریب آتی تھی تو وہ صدرنگ بھنورا تھا جو دیوسائی کی طرف جاتے میرے بازو پر آن بیٹھا تھا اور اس سے پیشتر کہ میں اُس کے سارے رنگ اپنی نظر میں اُتارتا اُڑ گیا تھا..

اِس بھنورے کے اُڑ جانے کا امکان نہ تھا..

اگر چہ ہم تینوں جھک کر اُسے اُٹھا لینا چاہتے تھے ایک یادگار کے طور پر لیکن جھجک گئے.. آگے بڑھ گئے۔

خانہ کعبہ کے گرد طواف کے بہاؤ میں بہتے ہوئے وہی لوگ لگے جو پہلے دن نظر آئے تھے..

وہ سب کے سب جانے پہچانے لگتے تھے..

اِن کا طواف ابھی تک مکمل نہیں ہوا تھا..

دراصل کوئی بھی شخص جب ایک بار اس سفید گرداب کا حصہ بن جاتا ہے تو عمر بھر اس میں سے نکل نہیں سکتا.. گھومتا چلا جاتا ہے.. اُس کا طواف کبھی مکمل نہیں ہو پاتا..

وہ بے شک اپنے اُس دُور کے شہر کو لوٹ جائے جہاں سے وہ آیا تھا.. اپنے گھر میں چلا جائے.. دنیا کی کشش کے آگے پھر سے ہتھیار ڈال دے.. اپنی ذات، قبیلے اور خاندان سے جُڑ جائے تب بھی اُس کا بدن اسی گرداب میں حرکت کرتا رہتا ہے..

یہ زندگی بھر کا طواف ہے..

اس کا کوئی انت نہیں..

سات پھیرے کبھی مکمل نہیں ہوتے..

اپنی مرضی سے آتو جاتے ہو پھر جا نہیں سکتے..

آج بھی حجرا سود کی نزدیکی میرے بس میں نہ تھی. چنانچہ اُسے دُور سے سلام کیا. اللہ تعالیٰ سے ہاتھ ملایا اور وداع کی رسم شروع کر دی..

مجھے پھر اپنے اباجی اور امی جی یاد آئے..اُن سے پھر ملاقات ہوگئی..

وہ میرے پاس انہی پتھروں پر چلتے تھے..

اپنے سفید بالوں کو سفید دوپٹے سے ڈھانپتی بائیں ہاتھ میں ایک سفید تسبیح پھرولتی.. میری امی..اور اباجی سرخ وسپید چہرے نیلی آنکھوں والے دراز قامت اباجی..اُن سے پھر ملاقات ہو رہی تھی..

کبھی ان کی قبروں پر کھڑے ہو کر اُن کی موجودگی اتنی شدت سے محسوس نہیں کی تھی..جیسے آج محسوس کر رہا تھا..

کیا وہ بھی اپنے بیٹے اور دونوں پوتوں کو انہی پتھروں پر چلتے دیکھتے تھے..وہ مجھ سے وداع ہو چکے تھے اور یہ طوافِ وداع تھا..

حطیم کے گرد گھوم کر جب ذرا آگے ہوا تو مجھے متحرک زائرین کے درمیان جب کبھی کوئی خلاء نمودار ہوتا تو اُس میں سے خانہ کعبہ کے صحن میں اُترتی سیڑھیاں نظر آنے لگتیں..ان میں سے کسی ایک سیڑھی پر میں ایک شام بیٹھا ہوا تھا.. بالکل خالی الذہن ہو کر..نہ کوئی حرفِ دعا تھا اور نہ کوئی حرفِ معذرت..گم صم..اپنے چار چفیرے سے لاتعلق شاید اپنے آپ سے بھی لاتعلق..خانہ کعبہ کے سیاہ سحر میں گرفتار..اُسے تکتا چلا جاتا تھا جب ایک پاکستانی میاں بیوی.. مڈل کلاس بھی نہیں اس سے نیچے اگر کوئی کلاس ہوتی ہے' تھرڈ کلاس کہہ لیجیے اُس کے نمائندے..کہ میاں کا لباس بوسیدہ اور سر پر جو سفید ٹوپی اُس کے دھاگے بھی اُدھڑے ہوئے..بیوی ایک سیاہ برقعے میں..جس کی سیاہی پژمردگی کی بے رنگی میں تھی..جانے کیسے یہاں آگئے تھے میرے پاس آئے..قریب ہو کر نہایت لجاجت سے پوچھا "آپ تارڑ صاحب ہیں؟"

"جی"

اور بیوی نے ایک بچے کو گود میں اُٹھا رکھا تھا..وہ بچہ نہ تھا..بچے سے بڑا ہو کر لڑکا ہونے کو تھا..شاید اکلوتا تھا بہت لاڈلا تھا کہ اُسے بمشکل اٹھا رکھا تھا..

"بھائی جی..یہ بچہ گیارہ برس کا ہو چکا ہے..لیکن بولتا نہیں..آپ اس کے لیے دعا کیجیے." بیوی کی آنکھوں میں جو مایوسی اور بے بسی کی کیفیت اُمڈتی تھی میں اُسے کیسے بیان کروں۔

''نہیں جی..'' میں اُس کی اس درخواست کو سمجھ نہ سکا..

''مہربانی کریں جناب..'' میاں کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

''میں..آپ..یہ سامنے اللہ کا گھر ہے..آپ دعا کیجیے..میری کیا حیثیت ہے..میں''..میں ہکلاتا چلا گیا..

اس پر وہ خاتون جن کی پشت اُس لمحے خانہ کعبہ کی جانب تھی میرے آگے جھکتی گئیں ''بھائی جی ہم تو التجائیں کرتے ہی رہتے ہیں لیکن اگر آپ میرے بچے کے لیے دُعا کریں گے تو مجھے یقین ہے کہ یہ بولنے لگے گا..''

مجھ پر کیا گزری یہ بھی کیسے بیان کروں..میری آنکھوں سے دریا بہہ نکلے بس..کہ یہ کس اور کیسے شخص سے دعا کی التجا کر رہی ہیں..اور کیسے یقین سے کر رہی ہیں..تو میرا خالی ذہن حرف دعا سے بھر گیا..اس سے جو میرے سامنے ایک سیاہ پوش گھر میں رہتا تھا اُس سے پہلی بار گڑگڑا کر دعا مانگی کہ اے اللہ..اس بچے کو قوت گویائی عطا کر دے..میرا بھرم رکھ لے..انہوں نے تو ساری ذمہ داری مجھ پر ڈال دی ہے..تو میری لاج رکھ لے..اور مجھ قبول کر نہ کر..یہ دعا قبول کر لے..

وہ میاں بیوی چلے گئے تھے..ہجوم میں گم ہو گئے تھے..لیکن جس یقین سے اس عورت نے کہا تھا کہ اگر آپ میرے بچے کے لیے دعا کریں گے تو مجھے یقین ہے کہ یہ بولنے لگے گا، مجھے بھی وہی یقین ہے کہ آج وہ دونوں میاں بیوی جہاں کہیں بھی ہیں اُن کا بچہ بول رہا ہوگا..اس کا مجھے یقین ہے

یہ تو الوداعی پھیرے تھے..آخری پھیرے تھے..اور پھر میں نے دور کے شہروں کو لوٹ جانا تھا..پھر کون جانے زندگی کی تختی سانسوں کی عبارتوں سے بھر جائے..ایک آخری سانس کا حرف اُترے اور بس..فرض کیجیے اگر کچھ سانسوں کی تحریریں باقی ہوں تو بھی ادھر آنا ہو نہ ہو..چنانچہ میں نے ضمیر سے فریاد کی کہ یار..اتنی بار آئے ہیں لیکن حطیم کے احاطے میں سجدہ کرنے کا موقع نہیں ملا..خانہ کعبہ کے اندر نہ سہی یہ بھی تو خانہ کعبہ کا ایک حصہ رہا ہے تو یہاں آج تو کچھ بندوبست کر دے..آخری بار ہے..تو پانچویں پھیرے کے بعد اس بھیے بچے نے میرا ہاتھ سختی سے پکڑا اور لوگوں کے سیلاب کو چیرتا..مجھے گھسیٹتا ہوا حطیم کے اندر لے گیا..اور اس احاطے میں بھی غار حرا کے صحن والا ہی حشر برپا تھا..لوگ ٹھنسے پڑے تھے..نہ کھڑے ہونے اور نہ جھکنے کی کچھ گنجائش تھی لیکن اس کے باوجود میں نے فوراً کانوں کی لویں چھو کر منہ وَل کعبہ شریف کیا اور اس میں چنداں دشواری پیش نہ آئی کہ کعبہ اتنا قریب تھا کہ میں اُسے ہاتھ بڑھا کر چھو سکتا تھا..

یہاں نوافل کی ادائیگی بس یوں جانئے کہ ٹوٹل پورا کرنے والی بات تھی..آپ جانے کہاں بھنچے ہوئے ہیں سجدے میں جاتے ہیں تو کسی کی پشت پر ماتھا رکھ دیتے ہیں اور وہ بھی کھڑے کھڑے..کبھی کسی کی کمر پر دستک دیتے ہیں..جھکتے ہیں تو کھڑے نہیں ہو سکتے..بیٹھتے ہیں تو کسی کی گود میں جا بیٹھتے ہیں..سلام

پھیرتے ہی تُمبیر نے مجھے ہجوم میں سے نکالنے کی خاطر پھر میرا ہاتھ پکڑنا چاہا تو میں نے کہا ''ٹھہر و یار۔''

کیونکہ دیوار کعبہ سامنے تھی.. دو چار ہاتھ کے فاصلے پر تھی.. سیاہ غلاف جس حصے پر سے اُٹھا ہوا تھا.. اُسے ڈھکتا نہ تھا اُس کی اینٹیں.. محض دو چار لوگوں کی درمیانگی کے سوا.. میرے سامنے تھیں.. میں اُنہیں چھوئے بغیر کہاں جانے والا تھا.. دونوں ہاتھ بلند کر کے جیسے ایک ہتھیار ڈال دینے والا سپاہی ہوتا ہے کہ صاحب میں ہار گیا سیدھا اُن اینٹوں کی جانب گیا اور اپنی ہتھیلیاں ان پر ثبت کیں اور ہونٹ جوڑ دیئے.. ایک خاص اینٹ پر جس پر میں نظر رکھے ہوئے تھا..

''مجھے واپس بلانا..'' یہ پہلی عرضی تھی..

شاید میں اُس لیے کعبہ کے اُس تیسرے ستون کی قربت میں تھا جس کے تلے بی بی ہاجرہ.. اللہ تعالیٰ کے گھر میں رہنے والی.. بغیر کسی کرایہ کے.. واحد ہمسائی مدفون تھیں..

حطیم بھی تو ہاجرہ کا پیراہن.. اُن کا سکرٹ کہلاتا تھا..

میں نے جو کچھ حج کے دوران ایک تسلسل سے بار بار مانگا تھا اُسے پھر سے مانگا.. اُس ایک اینٹ پر ہونٹ رکھے یاد دہانی کرا دی کہ پہلے تو دُور دُور سے مانگتا تھا اب تیرے در پر مانگتا ہوں..

اور جب کچھ بھی خواہش کرنے کی.. مانگنے کو نہ رہا تو ایک چپ لگ گئی.. پہلے تو آنکھیں بند تھیں.. پوٹے کعبے کی کُھردری اینٹوں کو چھوتے تھے یعنی پپوٹے بھی ہونٹ تھے.. اور جب مانگنے کو کچھ باقی نہ رہا.. جتنے سوال کرنے تھے کر دیئے تو میں نے آنکھیں کھولیں.. اور پہلی بار اُس زاویے سے اوپر دیکھا.. چند اینٹوں کے بعد غلاف کعبہ سمٹا ہوا نظر آیا اور اُس سے اوپر یہ سیاہ لبادہ آسمان تک جاتا دکھائی دیا..

اس خاص زاویے کو ذرا دھیان سے سمجھنا ہوگا..

جس زاویے سے میں اوپر دیکھ رہا تھا..

جب آپ باب عبدالعزیز سے داخل ہو کر حرم کے ڈھکے ہوئے حصے میں داخل ہوتے ہیں اور ترک محرابوں میں سے صحن کے درمیان خانہ کعبہ نظر آتا ہے تو گویا یہ ایک دُور کا منظر ہوتا ہے.. پھر طواف میں شامل ہوتے ہیں اور اس کے گرد چلنے لگتے ہیں اگرچہ کہا بھی جاتا ہے کہ اس دوران خانہ کعبہ کی جانب نہیں دیکھنا چاہیے اور پھر بھی براہ راست نہ سہی کن اکھیوں سے دیکھتے چلے جاتے ہیں تو غلاف سے آپ اتنے فاصلے پر ہوتے ہیں کہ اُس پر کاڑھے ہوئے حروف واضح طور پر پڑھے جا سکتے ہیں.. یہ قریب کا منظر ہے.. لیکن جب آپ کعبہ کی ایک اینٹ سے ناک چپکائے اوپر دیکھتے ہیں تو یہ حیرت میں اٹھتا فلک کی جانب جاتا نظارہ ہوگا..

میں اسی زاویے سے اوپر دیکھ رہا تھا..

غلاف کی دبیز سیاہی جیسے آسمانوں تک جاتی تھی.. اور اُس پر کاڑھی ہوئی آیات اس سیاہ سمندر میں روشن ہوتی تھیں.. کسی ایک حرف کی شناخت ممکن نہ تھی.. صرف اُن کا سنہرا پن جھلملاتا تھا.. اور وہ بھی دامن

کے قریب اُس سے اوپر اور کچھ نہ تھا سوائے ایک دبیز سیاہ تسلسل کے جس کے آخری کناروں کو آسمان اُتر کر چھوتا تھا..

اور اوپر افلاک تک اُٹھتے سیاہ غلاف کی ہموار ویرانی کے عین درمیان میں.. ایک تتلی براجمان تھی..
غلاف کی سیاہی کی شریعت کی خلاف ورزی کرتی ہوئی ایک تتلی بیٹھی ہوئی تھی..
سیاہی میں فریم شدہ ایک تتلی..

اتنے بڑے سیاہ کینوس پر آخری کناروں سے دو چار فٹ نیچے ایک چھوٹی سی تتلی کا نظر آ جانا مشکل ہے.. لیکن یہ اُس کے رنگ تھے جو اُسے ممتاز کرتے تھے.. بلکہ یہ اُس کے رنگ تھے جو غلاف کی سیاہی کو سیاہ کرتے تھے.. جیسے شکر دوپہر میں ایک سناٹے بھرے ویرانے میں زینیا کا ایک سرخ پھول بھی دور سے نمایاں ہو جاتا ہے.. اور ویرانی کو اور ویران بنا دیتا ہے..

میں اعتبار نہ کر سکا..

دم سادھے نظریں اٹھائے اُسے دیکھتا رہا.. سانس روکے اُسے تکتا رہا.. یہ ہے کہ نہیں ہے.. یہ تو ہے مگر آ کہاں سے گئی ہے..

سُمیر نے مجھے خبردار کیا تھا کہ ابا کم از کم حج کے سفرنامے میں تتلیاں نہ ڈال دینا.. میں کیا ڈالتا اللہ میاں نے اپنے گھر کے غلاف کے اوپر بھی ایک تتلی بٹھا دی تھی تو میں کیا کرتا.. انکار کر جاتا کہ وہ وہاں نہیں تھی..

یہ اُسی پروانے کی نسل کی تھی جسے ہم ہر دہ حالت میں باب عبدالعزیز کے باہر سفید سنگ مرمر پر چھوڑ آئے تھے..

ویسے ہی الوہی رنگ اور ان دیکھی شوخیاں..
کہیں وہی تو نہ تھی..

میں نے برابر میں اپنی بلند قامتی میں کھڑے سُمیر کو متوجہ کیا.. ذرا اوپر دیکھو.. تم کہتے تھے کہ ابا اس سفرنامے میں تتلیاں نہ ڈال دینا تو وہاں اوپر.. کنارے سے ذرا نیچے غلاف کعبہ پر بیٹھی ہوئی ایک تتلی ہے کہ نہیں..

تو اُس نے دیوار کعبہ سے ذرا پیچھے ہو کر دیکھا' کچھ دیر اوپر دیکھا نظروں سے تلاش کرتا رہا تو اُس لمحے میں ڈر گیا کہ کہیں یہ اس دوران اُڑ نہ جائے.. اُڑ گئی اور سُمیر کو سیاہ غلاف خالی نظر آیا تو وہ بے شک فرمانبردار بچہ ہے لیکن کبھی یقین نہ کرے گا کہ وہاں ایک تتلی تھی.. اور اسے ابا کی قوت متخیلہ کا ایک کرشمہ سمجھ کر بوڑھے ہوتے ذہن کا ایک واہمہ جان کر یا تو چپ ہو جائے گا اور یا مسکرا کر کہے گا.. ابا جی.. اور اُسی لمحے اللہ نے میری لاج رکھ لی اور وہ کہنے لگا ''ابا یہ تتلی نہیں.. کوئی بھنورا ہے..''

''ہے ناں؟''

"ہے"

"تو گواہ رہنا"

شاعروں کے لیے اگر رسول نہ بھی ہوتے تو طلوع سحر ہی ایمان لانے کے لیے کافی تھی..

اور میرے لیے.. یہ تتلی ہی کافی تھی..

اسے دیکھ کر بے ایمان رہنا مشکل تھا..

ہاتھ بلند کیے ہتھیلیاں کعبہ کی اینٹوں پر جمائے نظریں اُٹھائے میری آنکھیں اس تتلی یا بھنورے کو دیکھ دیکھ کر سیر نہ ہوتی تھیں.. رجھتی نہ تھیں.. جیسے مرشد و کیھ نہ رجھاں ہوں.. میں ایک فاتر العقل شخص کی مانند جو کہ میں تھا اسے دیکھ کر ہو گیا تھا دھیما دھیما مسکراتا تھا اور اُسے دیکھتا جاتا تھا..

میرے آس پاس کچھ زائرین مجھ پر ناراض نظریں ڈالتے تھے کہ یہ شخص دیوار کعبہ کے ساتھ بیکار کھڑا ہے.. نہ ہلتا ہے نہ فریاد کرتا ہے نہ کچھ مانگتا ہے یونہی منہ اٹھائے بیکار کھڑا ہے.. لوگ اس جگہ پر پہنچنے کے لیے ترستے دھکے کھاتے دور ہوتے جاتے ہیں کہ یہ یہاں بیکار کھڑا ہے.. تو ہٹ جائے.. جگہ خالی کر دے.. میں جگہ خالی کرتا تھا..؟

جو یہ سو رنگوں سے رنگا.. گوڑھے.. گاڑھے عجیب ان دیکھے رنگوں سے پینٹ کیا ہوا بھنورا غلاف کی سیاہی میں چپکا ہوا تھا اُس سے نظر کو خالی کرتا تھا؟

وہ بھنورا جو صرف میرے لیے وہاں براجمان تھا.. جسے میرے سوا اور کوئی نہ دیکھتا تھا.. اُسے دیکھنا اور دیکھتے رہنا موقوف کر سکتا تھا؟

حج سے واپسی پر میں نے اپنے جاننے والوں کو اس منظر میں شریک کیا تو گویا ایک شرک میں شریک کیا.. اُنہوں نے کبھی خانہ کعبہ کے غلاف پر کسی جاندار شے کو براجمان نہیں دیکھا تھا.. البتہ ایک دوست نے کچھ شک نہ کیا' ایمان لے آئے اور کہنے لگے "تم بار بار بیان کرتے ہو کہ حج کے دوران میرے ساتھ تو کوئی معجزہ نہیں ہوا.. کوئی انہونی بات نہیں ہوئی.. تو یہ کیا ہے؟ معجزے اسی نوعیت کے ہوتے ہیں.. اس پر بھی غور کرو کہ وہاں سیاہ غلاف پر وہ تتلی صرف تمہارے لیے بٹھا دی گئی تھی.. یہ محض اتفاق نہ تھا..

میں نے ابھی اسی تتلی یا بھنورے کی نسل کی ایک تتلی یا بھنورے کو خانہ خدا کی جانب بڑھتے سنگ مرمر پر اپنے قدموں میں پڑے دیکھا تھا اور اُس کے رنگ' شباہت اور شوخی کو بیان کرنے کی سعی کی تھی..

اب پھر وہی سعی لا حاصل کرتا ہوں..

میرے قلم میں اگر غار حرا کے اقراء کی روشنائی بھری ہوتی تو میں نہایت آسانی سے.. بلکہ میں نہیں میرا قلم اس بھنورے کے رنگوں کو بیان کر دیتا.. ایسا نہیں تھا تو میں اُسی روشنائی پر انحصار کرتا ہوں جس نے میں نے آج تک ہزاروں سفید کاغذ بے وجہ سیاہ کیے ہیں..

یہ تتلی.. یہ بھنورا.. حطیم کی چاردیواری کے اندر.. بی بی ہاجرہ کے پیراہن کے اندر.. خانہ کعبہ کے تیسرے ستون کی قربت میں جس کے نیچے بی بی جی دفن ہیں.. اللہ تعالیٰ کی ہمسائی ہیں.. وہاں کعبہ کی جو دیوار ہے وہاں جو کچھ مانگنا تھا مانگ کر دعاؤں سے فارغ ہو کر دیوار کعبہ سے رخصت ہونے سے پیشتر سرسری طور پر اوپر دیکھتا ہوں جب مجھے غلاف پر براجمان وہ تتلی نظر آ جاتی ہے..

اور میری آنکھیں اُس پر ثبت ہو جاتی ہیں..

شاید اسی لمحے کے لیے.. چینی شاعر لی پو نے ایک فلسفی چوانگ چو کے بارے میں کہا تھا..

''جب چوانگ چو نے خواب میں دیکھا کہ وہ تتلی بن گیا ہے تو تتلی چوانگ چو بن گئی۔

اگر اکیلی مخلوق اس طرح تبدیلی سے دوچار ہو سکتی ہے تو یقیناً ساری دنیا ہی بہاؤ میں ہو گی۔''

تو یقیناً ساری دنیا ہی خانہ کعبہ کے گرد بہاؤ میں تھی..

اور اکیلی مخلوق ایک تبدیلی سے دوچار ہوتی تھی..

تو میں بھی اسی مخمصے میں پڑا تھا کہ یہ میں خود ہوں جو خانہ کعبہ کے غلاف پر ایک تتلی کی صورت چپکا ہوا ہوں اور نیچے دیکھتا ہوں تو ایک ادھیڑ عمر سرخ آنکھوں والے شک سے بھرے انسان کو دیکھتا ہوں.. یا وہ انسان جو مجھے دیکھتا ہے تو گویا خود کو دیکھتا ہے..

اُس تتلی کے رنگ اور ذی شان پروں کی بناوٹ میرے اظہار کی گرفت میں آ نہیں سکتی.. ایک چھوٹے سے معجزے کو بھی ایک بڑے سے بڑا ادیب بیان تو نہیں کر سکتا..

ایسا معجزہ جس کی گواہی میں نے اپنے بیٹے سے لی تھی..

البتہ واپسی کے سفر میں کچھ ایسے رنگ دکھائی دیئے جو اس تتلی سے ملتے جلتے تھے..

میں اکیلا واپس جا رہا تھا..

سمیر کچھ روز بھائی کے ساتھ گزارنے.. اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے اور دل کی باتیں کرنے کے لیے جدہ ٹھہر گیا تھا..

میں سعودیہ کی ایک ایسی پرواز میں اکیلا واپس جا رہا تھا جس میں اگلے حصے میں سوار چند مسافروں کے سوا پورا جہاز گداگروں، فقیروں اور اپاہجوں سے بھرا ہوا تھا.. ان کے برسوں سے ان دھوئے بدنوں اور دریدہ دامنوں سے اٹھتی ہوئی ''مہک'' نے پورے جہاز کو ''معطر'' کر رکھا تھا.. اور ان دریدہ دامنوں میں ہزاروں

ریال پوشیدہ تھے جو انہوں نے حج کا سیزن کماتے ہوئے ہاتھ پھیلا پھیلا کر اپنے اپاہج اعضاء کی نمائش کر کے ثواب کمانے والوں سے کمائے تھے.. یہ نہیں کہ یہ بے چارے اتنے ہوشیار اور منصوبہ بند تھے کہ خود ہی پاسپورٹ بنوا کر.. ویزے حاصل کر کے.. ٹکٹ خرچ کر ادھر آ نکلے تھے.. بلکہ یہ ذمہ داری کچھ باقاعدہ ٹھیکیداروں اور ایجنٹوں کی تھی.. پاکستانی بھی اور سعودی بھی جو انہیں ایک پیکیج کے تحت بھرتی کر کے سعودی عرب پہنچاتے تھے.. انہیں ایک متعینہ رقم ادا کرتے تھے اور بقیہ صدقہ و خیرات کی مقدس دولت سے خود کو سرفراز فرماتے تھے..

چنانچہ جہاز کا ماحول ان پیشہ ور گداگروں کی مہک سے خوب "معطر" تھا..

رات تھی..

روشنیاں گل تھیں.. سبھی خوابیدہ تھے سوائے میرے کہ وہ "مہک" مجھے سونے نہ دیتی تھی..

بحیرہ عرب کی فضاؤں میں خاموشی سے رینگتے اب ہم بلوچستان کی ویرانیوں اور وسعتوں کے اوپر اُڑان کرتے جا رہے تھے..

میں کھڑکی کے شیشے سے ناک چپکائے.. وہی ناک جو دو روز پیشتر خانہ کعبہ کی ایک اینٹ سے چپکی ہوئی تھی.. جہاز کے نیچے.. بہت نیچے ایک انتہا تاریک خلاء پر نابینائی کی نظریں ڈالتا.. ہونے اور نہ ہونے کی بےخواب کیفیت میں معلق چپ تھا.. چپ..

رات گہری.. گھنی اور اندھی تھی..

تب کہیں نیچے اس گھنی تاریکی میں ایک لشکتی سی روشنی ہوئی..

کہیں اُس سیاہ سناٹے میں ایک اضطرابی چمک لہرائی جیسے سونے سے بنا ہوا ایک سانپ دیئے کی روشنی میں آ کر لہراتا ہے..

پھر وہ سب کچھ بجھ گیا..

یہ کیا تھا..

میری بےخوابی مزید بےخواب ہوئی اور میں نیچے گھورتا رہا..

بہت دیر تک نیچے تاریکی کا راج مکمل اور نابینا رہا اور میں اُس سیاہ مقام کو گھورتا رہا جہاں سے ابھی ابھی ایک عجیب روشنی کا یکدم جھما کا ظہور میں آیا تھا..

کچھ لمحوں بعد.. وہ پھر سے یکدم نمودار ہوا..

ہر سو رات تھی.. تاریکی گھنے گھنگھور ساون کے ایک بادل کی مانند سیاہ تھی اور نیچے بلوچستان کی وسعت کی ویرانی میں جہاز سے بہت دور ایک مختصر سے کوہستانی سلسلے کی پہاڑیوں کے اوپر کچھ بادل اُمڈے ہوئے تھے.. بقیہ تمام وسعت اور اس کا آسمان خالی تھا.. جیسے ایک پوری دیوار پر آویزاں بڑی پینٹنگ کے ایک کونے میں دو چار پہاڑیوں پر کچھ بادل ہوں.. اور بقیہ پینٹنگ ویران ہو.. تو ان چند اُمڈے ہوئے بادلوں میں وہ

سونے کا اژدھا روپوش تھا جو ہر چند لمحوں کے بعد اپنی کینچلی سے باہر آ کر.. تاریکی سے باہر آ کر اس مختصر پہاڑی سلسلے کو لشک کر چکا چوند کر دیتا تھا.. انہیں لمحہ بھر کے لیے عیاں اور روشن کرتا تھا اور پھر سے اپنی کینچلی میں روپوش ہو جاتا تھا..

ان بادلوں کے اندر جو گرج تھی.. جو بجلی تھی وہ مسلسل نہیں بلکہ رُک رُک کر ٹھہر ٹھہر کر سوچ سمجھ کر وقفوں سے بھڑکتی اور لہراتی تھی اور اسی لمحے بلوچستان کی وسیع کائنات کا ایک کونہ جیسے فلیش لائٹ کی زد میں آ جاتا.. نمایاں اور روشن ہو جاتا تھا..

اس پل دو پل کی بھڑک اور لشک سے جنم لینے والے کبھی سنہری، کبھی بھڑکتے گلابی اور کبھی آنکھوں کو چندھیا دینے والے سفید.. اور کبھی گہرے نیلے گہرے سمندروں سے بھی گہرے نیلے اور کبھی آتشیں سرخ..

تو بس ایسے ہی اُس بھنورے کے رنگ تھے جو غلاف کعبہ کی سیاہی میں فریم شدہ نمایاں تھا..

رنگوں کے اس زرق بھڑک چمکتے.. نگاہوں کو خیرہ کرتے.. اس عجیب شعبدے کے بعد کچھ مختصر زمانے کے بعد سویر ہونے لگی.. زمین ابھی یکسر تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی.. وہاں ابھی تک کوئی نشان' کوئی مقام' کوئی صحرا کوئی بستی دکھائی نہ دیتی تھی.. سب کچھ تاریکی کی روپوشی میں اوجھل تھا.. تو پھر یہ سویر کہاں تھی؟ جہاز کی کھڑکی اور زمین کے درمیان جو آسمان تھا وہ سویرے کے سحر کی نیم سفیدی میں نمایاں ہو رہا تھا.. میں نے سحر کے ایسے آثار کبھی نہ دیکھے تھے.. یہ ایسا منظر تھا کہ اس کی حیرت مجھے پتھر کا کر سکتی تھی..

سورج ابھی کہیں نہیں تھا کہ اس سویر میں ابھی تک کسی ایک کرن کا تیر اُس کی کمان سے نکل کر زرد روشنی کے سندیسے لے کر زمین پر نہیں تیرا تھا.. ایک نیم سفیدی کی دھندلاہٹ جہاز اور زمین کے درمیان پھیلتی جا رہی تھی..

صرف نیم سفید سویر نہ تھی اس کے رنگ بھی تھے.. آپ جن رنگوں سے آشنا ہیں یہ اُن سے پرے کسی اور کائنات سے اُترنے والے رنگ تھے.. کوئی جادو ٹونے والے رنگ تھے..

ـ ایہہ ٹُونا میں پڑھ پڑھ پھوکاں
سورج اگن جلاواں گی..

یہ کسی ٹُونے کی پھونک تھی جو ایسے اچھوتے رنگ دکھلاتی تھی.. اور بالآخر اس نے سورج کی آگ کو جلانا تھا.. جو رنگ میں نے پہلے دیکھے نہ تھے اُن کو میں کیا نام دے سکتا تھا کیسے بیان کر سکتا تھا..

اُس بھنورے کے پروں کے رنگ..

خانہ کعبہ کے سیاہ غلاف میں فریم شدہ..
اُس تتلی کے رنگ..
اگر کسی حد تک بیان میں آ سکتے ہیں تو صرف ، بلوچستان کی چند پہاڑیوں کو گھیرے میں لیے ہوئے بادلوں میں سے وقفوں سے نمودار ہوتی بجلی کی سنہری لشک اور زمین اور آسمان کے درمیان جو سویر پھیلتی تھی.. یہ رنگ بس ان معجزہ منظروں سے ہی کشید کیے جا سکتے ہیں.. ورنہ نہیں..
ابھی تو مجھے بی بی ہاجرہ کے سلگتے تلووں کی پیروی میں سعی کرنی تھی..
طواف وداع کو مکمل کر کے اُن کے نقش قدم پر چلنا تھا اور میں ابھی یہیں تھا..
پانچویں پھیرے کے بعد دیوار کعبہ پر ایک فریادی کی مانند دونوں ہاتھ بلند کیے اُس بھنورے پر آنکھیں رکھے ہوئے تھا جس کی بناوٹ اور رنگ مجھے گنگ کرتے تھے اور میں ابھی تک اسی مخمصے میں مبتلا تھا کہ کہیں وہ بھنورا میں ہی تو نہیں.. سیاہ غلاف سے چپکا ہوا اپنے عین نیچے ایک سرخ آنکھوں والے شخص کو دیکھتا جو مجھ سے ایسا مسحور ہوا ہے کہ اُس کو بھی بھول گیا ہے جس کے گھر کے سیاہ پیراہن پر میں بیٹھا ہوں اور اپنے تئیں مجھے اور میرے رنگوں کو بیان کرنے کی سعی لاحاصل میں کھویا ہوا ہے.. جیسے منطق الطیر کے پرندے اپنے سامنے ہو بہو اپنی شکل کے پرندے پاتے ہیں.. یہ نہیں جان سکتے کہ وہ وہاں ہیں یا وہ یہاں ہیں..
اب ہم ایسے گم ہوئے پریم نگر کے شہر..
پریم نگر کے شہر میں گم ہو جانے والے یہ کیسے جان جائیں کہ وہ کہاں ہیں..
وہاں سیاہ چادر پر..
یا یہاں دیوار کعبہ سے ناک لگائے اوپر دیکھتے..
رانجھا میں وچ' میں رانجھے وچ' غیر خیال نہ کوئی..
میں اُس بھنورے میں تھا اور وہ مجھ میں تھا..
وہ غلاف کعبہ پر براجمان.. گوڑھے پُر بہار رنگوں سے نچڑتا بھنورا.. یا تتلی.. یا پروانہ میری کیفیت سے غافل نہ تھا.. یہ شخص جو مجھے گہرائی سے دیکھے چلا جا رہا ہے اگر سحر گزیدہ ہے مبتلا ہے.. تو اُس نے ہونا ہے.. وہ جانتا تھا..
وہ بھنورا میرا آخری نقش تھا..
سیاہ غلاف فلک کو چھوتا.. اُس کے گھر کا پیراہن اور اُس پر بیٹھا وہ بھنورا.. آخری نقش تھا میرے حج کا..
اور حج کیا ہے؟
تمام مخلوق میں سے ایک عورت..
کونسی عورت؟

جن کے بارے میں خود رسول اللہؐ فرماتے ہیں "سدرہ کے کالے کلوٹے گھنگھریالے بال والے ذمیوں (حبشیوں) کے بارے میں اللہ سے ڈرو کہ کیونکہ اُن سے میرا نسب کا رشتہ بھی ہے اور سمدھیانہ بھی.."

غفرہ کے مولیٰ عمر نے کہا. نسب سے مراد اس طرح ہے کہ اسماعیل کی والدہ انہیں (حبشیوں) کے خاندان سے تھیں.. اور سمدھیانہ یوں کہ حضرت ابراہیم' فرزند رسول کی والدہ ماریہ قبطیہ کا تعلق بھی اسی خاندان سے تھا..

توحج کیا ہے؟
تمام مخلوق میں سے ایک عورت
اور تمام عورتوں میں سے ایک کنیز
اور تمام کنیزوں میں سے ایک سیاہ فام کنیز..
جس کا نام ہاجرہ تھا..

حج اُسی ایک سیاہ فام کنیز کے حضور ایک خراج تحسین.. ایک اقرار ہے اور اُسی ہاجرہ کی قبر کے اوپر جس کی وہ ہمسائی تھی اُس کے گھر کے سیاہ غلاف پر ایک بھنورا ہوش ربا رنگوں کا اطمینان سے ابھی تک براجمان تھا..